خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ سسپنس ڈائجسٹ

نومبر 2017

نگران اعلیٰ
معراج رسول

NOVEMBER 2017

سسپنس ڈائجسٹ

MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ — یمنیٰ احمد
نائب مدیر — اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285267

07 — جون ایلیا — انشائیہ
قرنوں کی دھول پیشانی پر سجائے ایک مسافر کی مسافرت کا احوال

08 — مدیراعلیٰ — آپ کے خط
سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

16 — علی اختر — دربان
ماضی کا آئینہ، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

45 — منظر امام — اعلیٰ ظرف
محبت کی تشنگی اور دوست برداری کی انوکھی مثال

49 — تنویر ریاض — سازش
رفتہ رفتہ میٹھے زہر سے شکار کرنے والی ایک حسینہ کی چالاکی

58 — اے آر راجپوت — رنگ آسماں
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خونریزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

93 — ثمر عباس — غلط فہمی
مخالف سمت میں چلنے والے ایک جوڑے کے ملاپ کا انوکھا انداز

102 — مرزا امجد بیگ — ٹارگٹ
ایک جرم کی ہولناک تباہی سے بچنے والے خاندان کی خوش قسمتی کا ماجرا

133 — شاہ زین رضوان — بدلہ
آستین کے سانپوں کے درمیان ادھورے مشن کی تکمیل کا ماجرا

جلد47 • شمارہ 11 نومبر2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

143 ظفر اقبال ظفر — عشق ناتمام
عشق کی منازل طے کرنے والے دو عاشقوں کی دلگداز روداد

150 قارئین — محفلِ شعر و سخن
آپ کے ہاتھوں میں ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

153 محمد الیاس — سایہ
فطرت سے دور ہونے والوں کی تباہی کا منظرنامہ

160 حسام بٹ — وقت
ایک پُرعزم بازیگر کی بازیگری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک طرحدار طویل داستان

197 ڈاکٹر شیر شاہ سید — زندگی اداس ہے
تخلیقی عمل سے گزرنے والی ایک ماں کے دل کا خوفناک ڈر

203 سلیم انور — دیدہ دلیر
پہیلی کے مانند حرفوں میں بند...... نقب زنی کی انوکھی واردات

207 رضوانہ ساجد — حضرت یوسف علیہ السلام
اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

219 شاکر لطیف — شاطر
ناحق کوئلے کی دلالی میں کالے ہاتھ کرنے والوں کی بے بسی

229 مہتاب خان — گھیراؤ
معاشرتی ناسوروں کے دلوں پر لگے گھاؤ کا پرفکر قصہ

235 محمد یاسر اعوان — دیوقامت
وراثت کے اصولوں پر پورا اترنے کے لیے ایک بے اصول انسان کا قصہ

244 طاہر جاوید مغل — شکست کی راہ فتح
قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

نومبر 2017ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ جی جناب موسم بدل رہا ہے اور نہ صرف سال کیلنڈر میں سن بدلنے کی تیاریاں کر رہا ہے بلکہ جاتی گرمیاں بھی آتی سردیوں کے حوالے ذمے داریاں سونپ کر اطمینان سے اپنے سرکل کی جانب محوِسفر ہیں۔ خدا جانے ایسا اطمینان حضرت انسان کے اندر کیوں نہیں اتر جاتا اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے...... بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنے والے قدرت کی اتنی چھوٹی سی ترکیب کو کیوں ذہن نشین نہیں کر لیتے جبکہ ہر سال 9 نومبر کی تاریخ حالات میں کسی خوشگوار تبدیلی کی امید لیے گزر جاتی ہے اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا خواب بہ زبانِ خاموشی تعبیر کے معنی تلاش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ خدا کرے اس خواب کے ثمرات اپنے معنی اور اثرات کے ساتھ عوام کے حصے میں بھی آ جائیں۔ (آمین)...... ورنہ عرصہ ہوا ہم کچھ ایسے بیمار معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کوئی نہ کوئی وبائی مرض پھیل کر عوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور سیاسی سطح پر کوئی نہ کوئی جرم شکل بدل بدل کر اس معصوم قوم کے درمیان خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے بہت سے گھروں میں ماتم بھی بپا کر دیتا ہے...... مگر سرکاری سطح پر اس کی ویکسی نیشن کے لیے کوئی پُرخلوص کوشش نہیں کی جاتی بلکہ اکثر عملی اقدامات میں اتنی تاخیر کر دی جاتی ہے کہ کتنے ہی بے گناہ انسان لقمۂ اجل بن چکے ہوتے ہیں۔ کبھی ہتھوڑا مار گروپ، کبھی ٹارگٹ کلنگ، کبھی خودکش دھماکے، کبھی معصوم بچوں کا اغوا اور اب اس چھری مار کے خوفناک وار...... جس کے مغالطے میں لاتعداد بے گناہ شہری قانون کی اندھی زد میں آ رہے ہیں۔ بہرحال اچھے دنوں کی آس لیے کتنے ہی انسان دنیا سے جا چکے اور آنے والی نسلوں کے لیے اچھے اور پُرامن ماحول کا خواب بھی موجودہ نسل کی آنکھوں میں محض ایک اذیت بن کر رہ گیا ہے۔ اس چھری مار کے بعد دیکھیے کون سی وبا معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس ارضِ وطن کو ہر مصیبت سے بچائے اور اس ملک کی قوم کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ (الٰہی آمین)۔ اب چلتے ہیں جناب اپنی اس پُربہار محفل کی جانب...... جہاں کا موسم کبھی سرد تو کبھی گرم ہوتا رہتا ہے کہ...... یہی تو زندگی ہے۔

❁ عبدالجبار رومی انصاری کی آمد قصور سے۔ ”غمگین صورت، پردے کو پکڑے، آنکھوں میں آنسو ٹھہرے، خاموشی کی زبان میں دل کا غبار، غمگین آنکھوں سے بولے، کہتے ہیں ایک تصویر ہزار لفظوں کا خزانہ ہوتی ہے جسے سمجھنے والے گہرائی تک سمجھ جاتے ہیں۔ ایسے ہی یہ من موہنی سی دوشیزہ سرورق پر اپنے تاثرات بکھیر رہی ہے لیکن ذرا ٹھہرو! ذرا دنیا کے سرورق پر بھی ایک نظر ڈال لو۔ کشمیر و فلسطین، چیچنیا، افغانستان و عراق تو اک عرصے سے لہورنگ تصویریں پیش کر رہے ہیں مگر دنیا میں آج تک ان کی شنوائی نہیں ہوئی۔ ذرا میانمار کی تصویریں بھی ملاحظہ کر لیں۔ روہنگیائی مسلمانوں کو بھی دیکھ لیں۔ ان کی حالتِ زار سے عام مسلمانوں کے دل تو خون کے آنسو رو رہے ہیں، کیا مسلم حکمرانوں کو بھی ان کا احساس ہے؟ افسوس کوئی حکمران مسلم دنیا میں ایسا نہیں ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی، نور الدین زنگی اور محمد بن قاسم کی طرح مظلوموں کی پکار پر لبیک کہے۔ جون ایلیا بھی تو سمجھا رہے ہیں کہ خود سے باہر نکلو کسی بھی طرح شاید اسی طرح ہمیں وہ مظلوم نظر آ جائیں جنہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سب سے پہلے خود کا نعرہ لگائیں گے تو پھر اسی خودی میں مر جائیں اور خودی غرور و تکبر کے زمرے میں آتی ہے جو اللہ کو پسند نہیں۔ بلقیس خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ بڑی دیر بعد حاضری لگائی، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر حالت میں صبر و استقامت عطا فرمائے۔ ریاض بٹ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ تبصرہ بہترین تھا، اسی طرح ادریس احمد خان نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ دھوپ چھاؤں کی تمازت محسوس کرتی اوشا راٹھی کا بھرپور تبصرہ بھی زبردست رہا۔ ساتھ میں زرین آفریدی بھی تبصرے کے ساتھ سسپنس کلاسک کے لیے ووٹ دیتی اچھی لگیں۔ رمضان پاشا نے بھی خوب لکھا۔ محمد قدرت اللہ نیازی اور رانا بشیر احمد ایاز کے بھرپور تبصرے عمدہ رہے۔ باقی اشفاق شاہین، محمد صفدر معاویہ، خلیق ربانی انجم، انجم کمال اور کرن عمران نے بھی بہت عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ اپنے اپنے خطوط میں سبھی نے خوب صورت الفاظ لکھے۔ غریب الوطنی سے غلامی میں اور پھر جیل میں رہے لیکن پایۂ استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خوب صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور کٹھن حالات کو من جانب اللہ جان کر مسکرا دیے۔ رضوانہ ساجد کی خوب صورت اور سبق آموز تحریر بہت عمدہ اور قابلِ تحسین ہے۔ حیا اور سانول جب میوزیم میں داخل ہوئے تو اچھا ہوتا ان کی گود میں ایک بچہ بھی ہوتا اس طرح حیا کی تشنگی بھی پوری ہوتی۔ باقی تکسی ایسی پریت نہ کر جیسی لمبی کھجور۔ یکتارا پہلے بھی یکتا تھا سانول کی صورت اب بھی یکتا رہا مہرو کی صورت۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر نے دل موہ لیا۔ صفیہ نے خود کو چالاک سمجھا اور جھورا کی گمشدگی کی اطلاع

Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech   0   Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آ سکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

---

Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech   0   Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں دنیا بھر... Readmore

---

Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech   0   Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا۔ فوٹو: حکومتِ بیٹیبٹی؛ متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

---

Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech   0   Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائل انسان چاند پر... Readmore

---

Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech   0   Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر بھیجی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائل کراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

---

Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech   0   Sep 24, 2017

سائبر لٹیرے اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کے لیے آٹو ٹیل... Readmore

انشائیہ

مخول

جون ایلیا

سرمد یہ سن کر ایک لمحے کے لیے ٹھہرتا ہے اور انھیں ان کی پیشانی میں شگاف ڈال دینے والی نگاہ سے، ایک ماجرا ناک ہنسی ہنستی ہوئی نگاہوں سے گھور کر دیکھتا ہے اور حالت حال میں ایک شعر سر کرتا ہے اور ہوا کے حاشیوں میں آگ لگا دیتا ہے۔

"دیر یست کہ افسانۂ منصور کہن شد۔ من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را۔ منصور حلاج کا افسانہ پرانا ہو چکا ہے۔ میں نئے سرے سے دار و رسن کی جلوہ دہی کروں گا۔"

وہ یہ کہہ کر قہقہہ لگاتے ہوئے، ایک اسرار آگیں اور مہیب قہقہہ لگاتے ہوئے مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر نکل جاتا ہے...... اور ایک سناٹا ہے کہ چھا جاتا ہے۔ لمحے لمحے کی گزران، اداسی اور افسوس کا سناٹا۔ تاریخ ہند کی 17ویں صدی کا سب سے اداس اور پُرافسوس سناٹا۔

مسافر اپنے پونے سات سو برس کے وطن میں مسافر اور اجنبی، اس مقدس سربلندی کو اذیت زدہ نگاہ سے دیکھ رہا ہے، دیکھے جا رہا ہے اور پھر بڑبڑا اٹھتا ہے۔

"میں ایک زندیق ہوں، ایک دوزخی ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میرا نامور بزرگ مرزا نوشہ ایک زندیق اور دوزخی تھا۔ میں نے اور میرے اس بزرگ نے اس مسجد میں کبھی نماز نہیں پڑھی پر میرا دل، مجھ زندیق کا دل اس مسجد کا دعا گو ہے۔"

مسجد کے میناروں کی سربلندی دھند میں کھو گئی ہے۔ مسافر سر اٹھائے ہوئے اس سربلندی کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کی گردن دکھنے لگی ہے مگر اپنے دل میں اپنی دلی میں ایک مسافر، ان گنبدوں اور ان میناروں کو دعا دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے؟

"اے گنبدو اور میندارو! تمہارا کوئی بھی متولی، بیسویں صدی کے پہلے دہے سے لے کر دسویں دہے تک کا کوئی بھی متولی، کوئی بھی بڑبولا متولی، کوئی بھی سیاست پیشہ متولی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔" مسافر گریہ ناک آواز میں کلام کرتا ہے۔

"تیرے گنبد، گنبد نیلی فام کے مانند ہمیشہ ہمیش فضا پرور رہیں۔ تیرے میناروں کی سربلندی اور ارجمندی پر کبھی پستی کی دراز دستی کا زور نہ چلے۔ یہ دعا ایک زندیق، ایک دوزخی کی دعا ہے، اپنے صدیوں کے وطن میں ایک بے وطن زندیق اور دوزخی کی دعا۔

"یہ گنبد اور یہ مینار ایک ہارے مارے، بے تدبیر اور دانش دشمن گروہ کے عہد عروج کی وقت آزما یادگار ہیں اور میں جو کوئی بھی نہیں ہوں، وہ "میں" ہارے مارے گروہوں کا غم گسار رہا ہوں۔ میں تاریخ کے ہارے مارے گروہوں کا نوحہ خواں رہا ہوں اور ہوں۔ سو اے گنبدو اور مینارو! میں تمہارا پرسیاہ ہوں، تمہارا نوحہ خواں، تمہارا مرثیہ گو۔" مسافر اپنے سینے میں کراہنے لگتا ہے۔

مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے کچھ نفوس عدم کی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص جب زندہ تھا تو اپنی خطابت کا بے تاثیر اور بے حاصل ہنر دکھایا کرتا تھا۔ اس نے اس مسجد شاہجہانی مسجد میں جانے کتنی بار اپنے شوقِ خطابت کی ہوس پوری کی۔

"عزیزانِ گرامی! میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی تم سے یہیں خطاب کیا تھا، جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان اور تمہارے دلوں میں شک کے بجائے اعتماد تھا۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔

"تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں یہیں سے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میرا احساس زخمی ہے۔ سوچو تو سہی، تم کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔"

مسافر اپنے سینے میں کراہے جا رہا ہے۔ اس اثنا میں اس کی نگاہ دائیں جانب اٹھتی ہے۔ دائیں جانب ایک سرخ نگینی، خم کھائی ہوئی ایک طویل نگینی سینہ پھیلائے کھڑی ہے اور وقت سے ٹھٹھول کر رہی ہے، ایک عالی شان ٹھٹھول۔ اور وقت، باجبروت وقت، اس سے ٹھٹھول کر رہا ہے۔ ایک باجبروت اور پُرجلال ٹھٹھول اور یہ سلسلہ کئی پشتوں سے جاری ہے۔ "نگاہ روبرو! نگاہ روبرو!"

دربارِ عام کی حضوری، بدبخت حضوری، حاضری اور بدانجام ترین حاضری نسل بانسل کے حافظے کا حسرت بن چکی ہے، ایک بے رحم، بے حد بے رحم اور یکسر بیجا حسرت۔ اگر وقت سے ٹھٹھول کی جائے گی تو اس کی سزا بھی بھگتنی جائے گی۔ انھوں نے وقت سے ٹھٹھول کی اور اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا کہ وقت سب سے بڑا ٹھٹھول کرنے والا ہے۔

دربارِ خاص سے ایک آواز آتی ہے۔

اگر فردوس بروئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مسافر یہ آواز سن کر ہنسی کے مارے بے قابو ہو جاتا ہے اور اتنا ہنستا ہے کہ انجام کار رونے لگتا ہے مگر نہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلتی ہے اور نہ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو۔

ویسے تھانے پہنچ گئی تاکہ پولیس باہر ہی باہر ڈھونڈتی رہے لیکن جیلا نے صفیہ اور مشتاق مہر کو عین موقع پر پکڑوا دیا۔ یوں جمورا کے قتل کا معما بھی حل ہو گیا۔ کہانی اچھی تھی۔ محترمہ اسما قادری کی فنکار میں چور کو مور پڑنے والی بات ہوئی۔ صادق احمد شائلہ کو اگر مجھے کی کالی بھیڑ سمجھتا تھا تو وہ خود بھی معاشرے کی کالی بھیڑ ہی تھا۔ باقی دونوں فنکاروں کی فنکاریاں خوب رہیں۔ اگر ایسی ہی فنکاریاں وہ کہیں مثبت کاموں میں لگاتے تو اوروں کا نقصان کرنے کے بجائے ان کے کام ہی آتے۔ بہر حال عمدہ کہانی تھی۔ جواری جرم کا ہی کھلاڑی ہوتا ہے۔ برٹ اور جارج نے لوٹی ہوئی رقم سے جوا کھیلنا شروع کیا اور بے ایمانی سے جھگڑے تک دوسرے بھاگنے والے جوڑے ایمی اور ڈیوی کو مصیبت کے وقت کورل گیا۔ وہ جان بچا کے بھاگ گئے۔ جارج اور برٹ پولیس کی تحویل میں پہنچے اور سمجھدار کورے اور پیٹرک نے بھی اپنی راہ لی۔ سارے قصبے میں سبھی کو اچھا سبق مل گیا اور کہانی ختم۔ دکھوں کے مارے ویزلی نے پوری ٹرین کو تباہ کرنے کی ٹھان لی اور پھر فرض شناس سائمن نے اپنے خون سے ٹرین کو سرخ جھنڈی دکھا کر بڑے حادثے سے بچا لیا۔ آخر میں ویزلی نے آ کے سائمن کو تھام تو لیا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ وقت کی کہانی تو اس دفعہ کپور خاندان کے گرد ہی گھومتی رہی۔ البتہ مقبول بھٹی کی گفتگو نے علی کو چونکا دیا جو لیک جیکسن میں علی کی مارا ماری سے واقف نکلا۔ دوسرا اس پوری قسط میں علی اپنی ماں سے بھی نہ مل پایا جس کا انتظار تھا۔ اب اچانک اس کی ماں سلمیٰ بھی ملنے والی ہے، اب پتا نہیں یہ وہی سلمیٰ ہوں گی یا کوئی اور...... جس کی سازش کام کر گئی وہ کچھ عرصے کے لیے معتبر ہو گیا اور جس کی ناکام ہو گئی اس کا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔ کہتے ہیں جب بچھو کے چاروں طرف آگ لگ جائے تو وہ خود کو ڈنک مار کے ہلاک کر لیتا ہے۔ اسی طرح ہنونت رائے جب رانی جی کے قابو آیا۔۔۔ اور کوئی پیش نہ چلی تو خود کو ہی خنجر سے ختم کر لیا۔ اعظم شاہ کی ضد بھی کسی کام نہ آئی۔ اسے بھی بادشاہ کا حکم ماننا پڑا اور چراہائی مکافات میں گھری پاگل ہو گئی۔ شام شب اچھی رہی۔ محفل شعر و سخن میں زرین آفریدی، سعدیہ اسلم اور مہوش خان کے اشعار اچھے رہے۔"

٭ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے شریک محفل ہیں۔ "سسپنس 2017ء اکتوبر کا شمارہ 17 ستمبر کو ملا۔ سرورق کو انتظار کرتی ہوئی خوب صورت ماڈل سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم کسی طرح کو بہت خوب صورت پیرائے میں پیش کر رہے تھے۔ آپ کا اداریہ پڑھا اللہ کا کرم ہے عید اچھی گزری ہے، باقی حکمرانوں کے کیا کہنے انہیں کسی سے کیا غرض۔ ان سب کے اپنے اللے تللے ہی ختم نہیں ہوتے تو ان کو عوام کی کیا فکر۔ برما کی صورتِ حال بہت تشویش ناک ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ دوستوں کی محفل میں آئے۔ بلقیس خان صاحبہ بہت خوب صورت انداز میں محفل کی صدارت کر رہی تھیں، بہت مبارکاں جی۔ ریاض بٹ کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ ادریس احمد خان کی بھی عمدہ تشریف آوری۔ باقی دوستوں میں زرین آفریدی، محمد قدرت اللہ نیازی، رانا بشرایاز اشفاق شاہین کے تبصرے بیسٹ رہے۔ کہانیوں کی شروعات طاہر عمیر کی باغی سے کی۔ آخر کار کو چودھری کامران نے کامیابی حاصل کی تو چودھری حشمت علی بھی اپنے حصے کا کام کر گئے۔ کہانی کا اینڈ بھی اچھا رہا پھر وقت پڑھی جو بہترین انداز میں آگے بڑھ رہی ہے اور علی تقریباً ماں کے پاس پہنچ چکا ہے مقبول بھٹی کا اضافہ بھی کافی عمدہ ہے۔ ساتھ میں حفیظ کپور کے دوستوں کو بھی متعارف کرایا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پڑھا۔ جو قید و بند کی صعوبتوں کے بعد مسندِ شاہی پر براجمان ہو گئے۔ بے شک صبر کا پھل ہمیشہ سے میٹھا ہے۔ اب کتنے سال بعد بھائی بھی آگے دست بستہ ہو گئے۔ آخری صفحات کی بہترین تحریر یکتا را عبدالرب بھٹی کے قلم سے بڑی عمدہ تحریر۔ میوزیم سے شروع ہونے والی تحریر کا اختتام بھی میوزیم پر ہوا۔ سانول کی محبت انتہا کی تھی۔ وہ مہرو کے پیار میں پاگل تھا لیکن پھر مہرو نے تو پیار کی ساری حدیں پار کیں، پر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ سانول اور حیا کا ساتھ تو لکھا تھا اور مہرو کو سانول کی جگہ پر بیٹھنا تھا۔ ملک صفدر حیات کی دوستانہ پڑھی۔ صفیہ تو ناگن نکلی جس نے مشتاق کے ساتھ مل کر اپنے سہاگ کو مار ڈالا اور آخر کار ملک صاحب نے ان کو جیلا کی مدد سے بے نقاب کر دیا۔ تحویر ریاض کی مشکل فیصلہ میں میڈیلین نے سام کے لیے بہت بہتر فیصلہ کیا۔ اسما قادری کی فنکار بھی عمدہ رہی۔ ثمر عباس کی خوش قسمت بہت اچھی تحریر تھی۔ لائم کے بارے میں کہوں گا آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی۔ محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی بہت لاجواب تحریر رہی۔ باقی کترنیں خوب رہیں۔"

٭ اشفاق شاہین، لاہور سے خط لکھ رہے ہیں۔ "عید پر لمبی چھٹی لی تھی، چھٹیوں کے آخر میں ہی نیا سسپنس آ پہنچا۔ توقع نہیں تھی کہ چھوٹے سے شہر حجرہ شاہ مقیم میں بروقت نیا شمارہ مل جائے گا۔ بہر حال مزہ دوبالا ہو گیا۔ سیدھے اپنی محفل میں پہنچے جہاں روہنگیا کمیونٹی پر ظلم و ستم کے ذکر نے خون کے آنسو رلا دیا۔ جانے مسلم امہ کب متحد ہو گی۔ مسلم اتحادی افواج کے مقاصد کیا ہیں؟ اور کب ہم خوابِ غفلت سے جاگیں گے۔ بس سوچ کر رہ گئے۔ بلقیس خان سب سے پہلے کرسیٔ صدارت پر براجمان تھیں خوب صورت خط کے ساتھ ریاض بٹ پھر سے واپس آئے، خوش آمدید۔ ادریس خان، اوشار الٰہی، زرین آفریدی، قدرت اللہ نیازی، صفدر معاویہ، اتم کمال کے سیر حاصل تبصرے محفل کا خاصہ تھے۔ کرن عمران خوش آمدید۔ خلیق ربانی، رانا بشیر، رمضان پاشا کی شرکت بھی بہت بھلی لگی اور اپنی بھی۔ "باغی" آخری حصے کے ساتھ یا حیرت اتنی جلد اختتام۔ بہر حال بہترین رہا۔ تین مہینے اپنی گرفت میں رکھا، باغی نے۔ کاش جو کامران کی سوچ ہے اگر سچ

میں ایسے چند جوان پاکستان کو میسر آ جائیں تو کالی بھیڑوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ وقت کی رفتار فی الحال سست ہی جا رہی ہے۔ ایک ہی سیشن میں پوری قسط گزر گئی اور ابھی تک ای جی سے ملاقات کو لمبا ہی کیا جا رہا ہے۔ ہاں تصوف کا رنگ ابھار رہا۔ مقبول بھٹی کی انٹری شاندار رہی۔ یکتارا آخری صفحات کی کہانی کیا بات ہے۔ سارے کردار اپنی جگہ بہترین اور مہرو سب سے لازوال کردار۔ بلاشبہ بھٹی صاحب نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ مختصر کہانیوں میں بہترین کہانی اسما قادری کی فنکار رہی۔ سسپنس بھی رہا، شائلہ کا کردار بھی خوب رہا۔ ملک صفدر حیات کی تحریر دوستانہ بہت اچھی رہی۔ کوتا سسٹم پہلی بار پڑھا۔ جیلا اور صفیہ دونوں کردار خوب تھے صفیہ تیز نکلی اور لالچی بھی۔ جلد بازی میں پکڑی بھی گئی اچھی لگی اور مختصر کہانی فرض شناس بھی بہت اچھی لگی۔ بالخصوص اینڈ بہت مزہ تھا۔ دیری گڈ وسیم بن اشرف، محفل شعر و سخن میں انتخاب بھی خوب رہا خصوصاً زین، سعدیہ اسلم اور راشم کمال کا انتخاب لاجواب تھا۔“

⊛ ریاض بٹ کا حسن ابدال سے تبصرہ۔” ماہ اکتوبر 2017ء کا شمارہ 19 ستمبر کو بے قرار نگاہوں کے سامنے آیا۔ سرورق کی حسینہ اس بار پھیکی سکراہٹ لیے ہوئے تھی۔ خیر اس زمانے میں یہ بھی غنیمت اور قبول ہے۔ آگے بڑھے تو جون ایلیا خنظر تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک چبھتی ہوئی تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ ویل ڈن۔ خطوط کی محفل میں پہنچے تو اپنا خط دیکھ کر پھر سے جوان ہو گئے کیونکہ جوانی میں ہمارے خطوط تواتر سے شائع ہوتے تھے۔ بہت شکریہ مان بڑھانے کا۔ کرسی صدارت پر بلقیس خان، بہن مانسہرہ کی خوب صورت وادی سے براجمان تھیں۔ اللہ آپ کی والدہ ماجدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ غم اور خوشی تو انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ آپ کا تبصرہ بہترین ہے۔ جن بہن بھائیوں کو آپ نے آواز دی ہے کہ محفل میں حاضری لگوائیں، میں بھی ان سے آپ والی استدعا کروں گا۔ زرین آفریدی آپ نے سسپنس کی تحریروں پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ لگتا ہے کرداروں پر آپ کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔ رمضان پاشا پرچے کے پرانے اور بڑے اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی کو ذرا تبصرہ طویل ہے لیکن اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہے میں بھی آپ سے متفق ہوں۔ ملک صفدر حیات کی پرانی کہانیاں اگر وقتاً فوقتاً شائع کر دیں تو ممنون ہوں گا۔ باقی تبصرے بھی پسند آئے۔ رانا بشیر احمد، اشفاق شاہین، محمد صفدر معاویہ، خلیق ربانی انجم، انجم کمال اور کرن عمران ویل ڈن۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ کے اوراق سے بڑی اچھی اور موثر کہانیاں لے کر آتے ہیں۔ جب تاریخ کے اوراق لفظوں کی صورت میں ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی تاریخی فلم دیکھ رہے ہیں۔ یہی ڈاکٹر صاحب کا کمال اور ہنر مندی ہے۔ بہت خوب خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ ملک صفدر حیات صاحب کی تفتیش اس بار بھی زبردست تھی۔ صفیہ نے جو کچھ کیا اس کی سزا بھی بھگت لی۔ ایسا دوستانہ کبھی کبھی بلکہ اکثر خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے لیکن ایک بات میں برملا کہوں گا کہ جیلے نے بروقت اطلاع دے کر صفیہ اور مشتاق مہر کو رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ بابر نعیم چوتھا خانہ لے کر آئے۔ انہوں نے کوزے کو دریا میں بند کر کے ایک اچھوتی اور چبھتی ہوئی تحریر ہمیں پڑھنے کے لیے دی۔ محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی ایک اچھی تحریر ہے۔ ذہر محمد یاسر اعوان کی ایک اچھی کہانی ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی یکتارا کا ایک ایک لفظ سیدھا دل میں اتر گیا۔ چوتھا خانہ بڑی دل نشین اور خوب صورت کہانی ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

⊛ ایمانے زہرہ شاہ کا خط اسلام آباد سے۔ ”سسپنس کی کچھ عرصہ قبل سے خاموش قاری ہوں۔ ”باغی“ جیسی آؤٹ کلاس کہانی نے نیند سے جگایا ہے۔ کرپشن جیسا ناسور نہ جانے کب ختم ہوگا۔ کامران تو اپنے مقصد میں کچھ کامیاب ہو گیا ورنہ اس کے پلانز کو تباہ کرنے کی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نہایت عمدہ پلاٹ و ڈائیلاگز، جاندار کردار، شاندار اختتام، ویلڈن طاہر منیر۔ ”وقت“ نئے اور پوشیدہ موضوعات کا احاطہ کرتی تحریر ہے جس میں اب کچھ ٹوئسٹ آنے کی وجہ سے کہانی کا ٹیمپو تیز ہوا ہے۔ پچھلی قسط کافی سبک خرامی سے رینگتی لگی۔ مقبول بھٹی دلچسپ کردار لگا لیکن اسد علی کی سلمیٰ بیگم سے اتنی جلدی ملاقات کی امید بر نظر نہیں آتی۔ ”فنکار“ میں چھوٹا فنکار بڑے فنکار پر بازی لے گیا۔ مزے دار تحریر تھی۔ فرض شناس میں سائمن کا فرض سیکڑوں لوگوں کو زندہ رکھتے ہوئے اپنی جان دے دینا اول کو چھو گیا ہے۔ بے شک فرض سب پر بھاری ہے۔ ”انکشاف“ میں کسی راکٹ سائنس انکشاف کی توقع تھی۔ آخری صفحات پر یکتارا نے جیسے اسٹارٹ لیا، میں امید کر رہی تھی کوئی عشق کی لازوال داستان رقم ہونے جا رہی ہے مگر صد افسوس سجاول کی محبت ریت کے ذروں سے بھی ہلکی ثابت ہوئی۔ مہرو بیچاری الجھا ہوا سجاول نے سرے سے لائف اسٹائل ہی بدل دیا، یہ کیسا عشق تھا۔“

⊛ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ”بہترین کاوشوں سے مزین سسپنس ڈائجسٹ موصول ہوا۔ سرورق سے ابتدا کی۔ اندر کے صفحے پر انشائیہ سے مستفید ہوئے۔ ناموں کی فہرست پر نظر پڑی تو سرفہرست بلقیس خان نظر آئیں۔ سو مبارک باد۔ نئے پرانے تبصرہ نگار اپنی اپنی منتخب آرا کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ سسپنس کے سب دوستوں کو پرخلوص سلام۔ آگے بڑھے تو ڈاکٹر ساجد امجد کی شام شب پڑھی۔ تاریخ کے جھروکوں تک رسائی ہوئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ سے متعارف کرا رہے تھے۔ آگاہی کے در وا ہوئے۔ اس کے بعد تنویر ریاض کی کہانی مشکل فیصلہ پڑھی بہتر تھی۔ اسما قادری کی فنکار پڑھی، ثابت ہو گیا کہ فنکار کی فنکاری کے دعوے کھوکھلے نہیں تھے جس کی وجہ سے اس کی بقا ممکن ہو سکی۔ افکار نے تربیت یافتہ ایجنٹ شائلہ کو مات دے دی۔ ہانی محمد

طاہر عمیر کی کہانی تیسری قسط میں مکمل ہوئی۔ کہانی بڑے اچھے انداز میں لکھی گئی تھی۔ دلچسپی کا عنصر آخری سطر تک برقرار رہا۔ چوتھا خانہ، محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ اس کے بعد وقت پڑھی۔ یہ قسط کچھ خاص تاثر نہ دے سکی اور آخر تک گھریلو معاملات کا ہی چرچا رہا۔ امید ہے اگلی قسط میں اس کی تلافی ہو جائے۔ فرض شناس اچھا تاثر دینے میں کامیاب رہی۔ جواری اور قدردان بھی بلاشبہ اچھی کہانیاں رہیں۔ رضوانہ ساجد کی داستان یوسف علیہ السلام ابھی جاری ہے جس میں بہت تفصیل کے ساتھ حیاتِ یوسف علیہ السلام رقم کی گئی ہے۔ زہر میں فقط ایک نکتے کے پکڑے جانے پر مجرم کے جرم کا پول کھل گیا اور مجرم لاکھ چالاک دکھائی دینے کے باوجود پابندِ سلاسل ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آخری صفحات پر لکھی گئی کہانی بہت پُراثر رہی۔ محفل شعر و سخن کے بھی اچھے اور منتخب اشعار نے محظوظ کیا۔ کترنوں نے بھی مزہ دیا۔ (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)۔"

❀ ام عبداللہ، شاہ فیصل ٹاؤن کراچی سے شریکِ محفل ہیں۔ "سب کو اسلامی سال 1439ھ بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ عزوجل آپ سب کو دونوں جہاں کی بھلائیاں عطا فرمائے آمین۔ آپ کے ادارے کے تقریباً چاروں مطبوعات ہی زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔ خاص طور پر جاسوسی اور سسپنس، پاکیزہ تا حال مل نہیں سکا ہے۔ سسپنس بھی اب جا کے 25 ستمبر کو بڑی منتوں سے (بک اسٹال والے سے) ملا ہے۔ اکتوبر 2017ء کا شمارہ پڑھ کر دل شاد ہو گیا۔ قدردان، جواری اور خوش قسمت دلچسپ کہانیاں تھیں۔ محمد فاروق انجم کے انکشاف نے چونکا دیا۔ یہی "سسپنس" کا گرویدہ کر دیتا ہے۔ محمد یاسر اعوان کی زہر بھی زبردست تھی۔ عبدالرب بھٹی کی یلغار ثقافتی و معاشرتی تمدن کو لیے ہوئے بہت اچھا لکھتے ہیں۔ چوتھا خانہ معاشرے کا سلگتا موضوع ہے۔ باجی آپ کی محفل میں دوسری بار شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میری کہانی کی اشاعت کب تک متوقع ہے۔ (جی انشاء اللہ جلد ہی ہم آپ کو مطلع کر دیں گے)۔"

❀ صادق معاویہ، خان پور سے خط لکھ رہے ہیں۔ "کافی عرصے بعد شریکِ محفل ہو رہا ہوں۔ ہوئی تاخیر، تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ بلاوجہ بے سبب جیل یاترا اور پھر رمضان کریم کی مقدس ساعتوں میں نمازِ تراویح کے لیے جاتے ہوئے روڈ ایکسیڈنٹ میں دونوں بازو اور پسلیوں سمیت بہت ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر صاحبِ فراش ہو گیا۔ سجدۂ شکر بحضور خالق کائنات کہ جان سلامت رہی اور اب رو بہ صحت ہوں۔ ہاتھ قلم پکڑنے کے لائق ہوئے اور بندہ بزم دوستاں میں حاضر ہے۔ کرسیٔ صدارت پر جلوہ فگن بلقیس خان مبارکاں جی، لائقِ تعریف و توصیف تبصرہ۔ پیاری امی مسز صدیقی آپ کے بغیر محفل اداس لگتی ہے۔ امی محفل کی رونق بڑھائیے۔ منفرد معاویہ بھائی ہمارا المیہ ہی یہی ہے کہ ہم روشنی چھوڑ کر اندھیروں کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے ہیں۔ اللہ کریم ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔ بزم دوستان سے دوری تکلیف دیتی ہے لیکن ابھی تک ہاتھ لکھتے ہوئے درد کرتے ہیں۔ (بہت شکریہ کہ آپ نے اتنی تکلیف کے باوجود سسپنس سے اپنی محبت نبھائی۔ بہت افسوس ہوا آپ کی تکالیف جان کر۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید پریشانیوں سے بچائے اور صحت و سلامتی عطا کرے۔ آمین)۔"

❀ ڈاکٹر نائلہ نصر ملک، پشاور سے محفل میں شریک ہیں۔ "ایک دفعہ قلم اٹھانے کے بعد اب بار بار خواہش ہوتی ہے کہ دوستوں کی محفل میں شرکت کی جائے جہاں پر ارضِ پاکستان کے ہر علاقے، نسل، زبان اور مذہب کے لوگ اپنی پسندیدگی اور خیالات کا برملا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ سب کا شکریہ کہ میرے خط کو پسند کیا اور میری سوچ کی حمایت کی۔ اوشا ماتھی صاحبہ نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ میں شاید ڈاکٹر بننے کے مراحل میں ہوں۔ ارے ڈیئر اتنا ظلم نہ کریں مجھ پر، میں تصحیح کر دوں کہ پشاور کے ایک معروف اسپتال میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں۔ گو کہ میری عمر اتنی زیادہ نہیں لیکن اللہ کے کرم اور میری محنت اور جذبے کی وجہ سے کم عمری میں ہی اپنی فیلڈ کا عروج دیکھ لیا۔ ہم ڈاکٹر صاحبان کا بھی تو چھٹیوں پر حق ہوتا ہے ورنہ عوام الناس نے ہمیں انسان سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے (پلیز ڈونٹ مائنڈ)۔ دوستوں کی محفل میں سرِفہرست بلقیس خان تھیں۔ تبصرہ بہت اچھا تھا اور اللہ آپ کی والدہ کو صحت دے۔ ریاض بٹ اور قدرت اللہ نیازی کے تبصرے بھی خوب تھے۔ ڈائجسٹ میں پہلا نمبر باغی کو جاتا ہے۔ محمد طاہر عمیر کو میں نے پہلی مرتبہ پڑھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔ بہت مبارک باد۔ انتہائی برق رفتار اور چکر پر چکر دیتی ہوئی تحریر تھی۔ چودھری کامران جب اپنے والد کی قبر پر آنسو بہا رہے تھے تو اس وقت ہم بھی اپنے آنسوؤں میں بھیگنے لگے۔ باپ بیٹے کی محبت کی بہت خوب صورت داستان تھی جو کہ بظاہر ایک دوسرے کے لیے سرد جذبات رکھتے تھے مگر باپ کی محبت نے کامران کی دنیا آسان کر دی اور بیٹے کی محبت نے چودھری حشمت کی آخرت آسان کر دی۔ وقت بہت مختلف نوعیت پر لکھی گئی ہے اور حسام بٹ نے بہت بہترین کوشش کی ہے۔ رفتار تو بھئی وقت کی طرح ہی تیز ہے اور کراچی آنے کے بعد کہانی بہت تجسس سے بھر گئی ہے۔ ویلڈن اس طرح کے موضوعات پر ضرور لکھنا چاہیے کیونکہ زندگی میں بھی نہ بھی ایسے حالات اور لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ خاص کر باہر کے ممالک میں بظاہر بے ضرر لوگ Zionist ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب کی یلغار نے جامشورو اور سندھ کی خوب سیر کرائی اور کہانی بھی بہترین تھی۔ کاش دونوں جدا نہ ہوتے اور مزار پر بیٹھ کر اپنی زندگی گزارتے۔ سجاول کی شادی اور مہرو کی بربادی پر بہت دکھ ہوا۔ اکثر دوست و احباب کہتے ہیں کہ ڈرامے اور کہانیاں جھوٹ ہوتی ہیں۔ میں ان کو کہتی ہوں کہ کہانیاں اور ڈرامے حقیقی کرداروں سے متاثر ہو کر لکھے جاتے ہیں۔ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ سب ہو رہا ہوتا ہے ورنہ انسان کا تخیل محدود ہے۔ نکار بہت دلچسپ کہانی

تھی۔ پڑھتے ہوئے مزہ آ گیا۔ محمد فاروق کی انکشاف اتنی مزاحیہ کہانی تھی کہ ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ سب مردوں سے درخواست ہے کہ نائی کی دکان میں ہوش سے کام لیا کریں ورنہ ہر گلی میں وگ والا پروفیسر نہیں ہوتا۔ ملک صاحب کی دوستانہ بھی خوب تھی۔ انسان اور شیطان کے بیچ فرق بہت معمولی سا ہوتا ہے اور وہ فرق ہٹ جائے تو پھر انسان ذلت کی گہرائیوں میں گر جاتا ہے جس سے شاید شیطان بھی پناہ مانگے۔ صفیہ اگر شوہر سے تنگ تھی تو طلاق لے کر مشتاق سے شادی کر لیتی۔ اپنے سر خون کیوں لیا؟ بس کچھ باتیں سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ انگریزی ادب کی کہانیاں بالکل بے تاثر تھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے صفحات زیادہ ہونے چاہئیں۔ بہرحال اکتوبر کا نمبر ہمیشہ کی طرح شاندار رہا اور سسپنس پڑھتے پڑھتے میرے اندر بھی جاسوسی اور سراغ رسانی کی حسیں بیدار ہو گئی ہیں اور میرا دماغ بھی ہر طرف بہت تیزی سے گھومتا ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر جس فیلڈ میں ہاتھ ڈالتے ہیں، بہت خطرناک بن جاتے ہیں اور تمام حجاج کرام کو مبارک باد۔ اللہ کرے کہ کراچی سے خیبر تک ہم سب صرف پاکستانی ہو کر سوچیں اور اپنی اپنی فیلڈ میں ایمانداری سے اس زمین کا حق ادا کریں۔ اشفاق احمد کے بقول کہ اللہ ہم سب کو آسانیاں بانٹنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔''

٭ رمضان پاشا کا خط گلشنِ اقبال کراچی سے۔ ''کافی عرصے سے نگرانِ اعلیٰ محترم جناب معراج رسول صاحب کی کوئی اطلاع نہیں آ رہی ہے۔ یہ عاجز...... صحت یابی اور درازی عمر کے لیے دعا گو ہے۔ (آمین)۔ لڑکے والے رشتہ طے کرنے آئے ہیں اور لڑکی چھپ کر متوقع دلہا کو دیکھ رہی ہے۔ یہ ہے سرورق کی تعریف۔ تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانی فنکار کے قلمکار کا نام دیکھ کر ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اسما قادری صاحبہ اس ٹائپ کی کہانی بھی لکھ لیتی ہیں، خوب لطف آیا، بڑا مزہ آیا۔ باقی ارے یہ کیا تین ہی قسط میں کہانی ختم، ابھی دو قسط اور لکھنا چاہیے تھی۔ کہانی کا اندازِ بیان بھی دل موہ لینے والا تھا۔ خوش قسمت بھی بہت پُرلطف کہانی تھی۔ دوستانہ اس دفعہ ملک صاحب نے کچھ زیادہ ہی سسپنس بھر دیا۔ چوتھا خانہ کہانی پراثر اور لائقِ تحسین تھی۔ کیپٹی کا صدر تو پکا بدمعاش نکلا۔ انکشاف کہانی سادہ تھی مگر اختتام میں جدت تھی۔ وقت پڑھنے کے لیے کوشش کر کے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ کہانی اب بیچ بیچ پر پہنچ گئی ہے۔ اگلی بار اسد علی پر شادمانی اور مسرت کے آبشار گرنے والے ہیں۔ روسی کہانی فرض شناس کے اختتام پر دل تڑپ تڑپ کر رہ گیا۔ جواری پسند نہیں آئی۔ قدردان نہایت مختصر نہایت دلچسپ۔ زہر کسی مغربی کہانی کو شرف بہ اردو کیا گیا ہے، کہانی اچھی تھی۔ یکتارا کہانی بہت ہی جاندار اور شاندار تھی، کافی عرصہ یاد رہے گی۔''

٭ زرین آفریدی کی حیدرآباد سے آمد۔ ''زندگی کے گزرتے لمحات کا نہ تو شمار ممکن ہے اور نہ تعین جس طرح پتا ہی نہیں چلا کہ یہ سال بھی اختتام کی طرف گامزن ہے۔ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ اکتوبر 2017ء بس اچھا ٹائم پاس دے گیا۔ جب باغی کے آخری حصے پر نظر پڑی تو دل مزید خراب ہو گیا۔ اس داستان میں سیاستدانوں اور کرپٹ لوگوں کو جو سزا مل رہی تھی اس سے کم از کم ہمیں دلی تسکین تو مل رہی تھی۔ اداریے سے مستفید ہوتے ہوئے محفل میں انٹری دی۔ بلقیس خان صدارت پر تمہیں مبارک ڈیئر۔ ریاض بٹ بھی اچھے تبصرے کے ساتھ وزارت پر تھے۔ نوازش پیاری اوشا رانی، آپ بھی اب تبصرہ کرنے میں ایکسپرٹ ہوتی جا رہی ہو۔ رمضان پاشا جی آپ صرف تبصرہ کیا کریں، طنز کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ کافی دنوں بعد بے نیازی صاحب یعنی اللہ کی قدرت سسپنس میں نظر آئے، تبصرہ خیر اچھا تھا۔ رانا بشیر احمد صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تبصرہ تو آپ کا بھی بہترین رہا۔ اشفاق شاہین صاحب بھی سدا بہار تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ تبصرہ پسند کرنے کے لیے نوازش۔ محمد صفدر معاویہ کے تبصرے کے بنا تو یہ محفل ادھوری لگتی ہے۔ تشکر تبصرے کی پسندیدگی پر۔ خلیق ربانی، انجم کمال اور کرن عمران کے تبصرے محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ کہانیاں پڑھنے کی ابتدا عبدالرب بھٹی صاحب کی یکتارا سے کی۔ وجہ ہمارے شہر حیدرآباد کے تناظر میں لکھی گئی داستان تھی جو کہ بے حد پسند آئی۔ ساتھ سندھ میالوجی میوزیم جو کہ ہم کئی بار وزٹ کر چکے ہیں، سب نظروں میں گھوم گیا۔ مہر زادی اور سانول کی عجب داستانِ عشق، زندگی جب انسان کو اپنے گھیرے میں لیتی ہے تو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ مہرو سانول کی جگہ تو سانول ڈارلنگ بن گیا۔ اسما قادری جی کی فنکار، واقعی فنکار اسٹوری تھی۔ صادق احمد پر یہ بات صادق آتی ہے کہ چوروں کو پڑ گئے مور۔ شائلہ عرف شمی بھی پکی ڈرامے باز تھی۔ مزہ آ گیا اسٹوری پڑھ کر۔ دوستانہ اور ملک صفدر حیات، کبھی کبھی مجرم ملک صاحب کو بچا کر رکھ دیتے ہیں جیسا کہ صفیہ نے کیا بالآخر جمورا مچھلی فروش کے قاتل صفیہ اور مہر مشتاق انجام کو پہنچے۔ ویلڈن ملک صاحب۔ محمد فاروق انجم کی انکشاف بھی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ ظہیر بیچارے کی شادی دوبارہ دادی کی وجہ سے اور پھر ٹنڈ والی شامت۔ پروفیسر خلیل کی وگ کے حصول میں اس پر پروفیسر کی اصلیت کا انکشاف ہوا اور اس کا رشتہ بھی طے پا گیا۔ زہر محمد یاسر اعوان بھی ہمیں متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ سراغ رساں ذوحان نے سیاہ بلیوں کے مرنے کا اور ریحانہ اور فرزانہ کے غائب ہونے کا سراغ لگا ہی لیا۔ زبردست اسٹوری میں کافی سسپنس تھا۔ فرض شناس میں وسیم بن اشرف نے سائمن کے ارادے اور حالات کافی دلچسپ پیرائے میں پیش کیے۔ شاہ زین رضوان بھی اچھے رائٹرز کی لسٹ میں آتے جا رہے ہیں۔ جواری بھی ان کی قابلِ ستائش رہی۔ شام شب ڈاکٹر ساجد امجد صاحب مغلوں کی زندگی کے ہر پہلو پر قلم اٹھایا اور بہترین معلومات سے ہم قارئین کو روشناس کروایا۔ اورنگزیب اور اس کے بیٹے اعظم شاہ اور شاہ عالم کی وفا اور غداری کی داستان لکھی اور ساتھ ہی مرہٹہ رانی تارا بائی اور چندا بائی کے کارنامے سامنے لائے۔ ہنونت رائے بھی جان سے گیا۔ باغی محمد

طاہر عمیر صاحب ویلڈن۔ بس ایک شکایت ہے ادارہ سسپنس ڈائجسٹ سے کہ جب کوئی داستان اپنے جوبن پر ہوتی ہے ہم انجوائے کر رہے ہوتے ہیں تو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ اچھا نہیں کرتے آپ۔ (اوکے آئندہ خیال تو رکھ لیں گے مگر...... جب کہانی اپنا اختتام خود ترتیب دے لے تو مجبوری ہے)۔ وقت حسام بٹ صاحب مستقل بنیادوں پر جم گئے۔ سسپنس ڈائجسٹ میں داستان بھی اے ون جا رہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حالاتِ زندگی کے بارے میں رضوانہ ساجد صاحب کے شکر گزار ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے روح پرور حالات بہت تسکین بخش ہیں۔ تیسرا حصہ بھی بہترین رہا۔ جزاک اللہ خیر۔ مراسلے معلوماتی اور تسلی بخش ہیں۔ محفل شعر و سخن ہر بار شاندار و لاجواب اشعار پر مبنی ہوتی ہے۔ تینوں اعزازی اشعار واقعی زبردست رہے۔ (کمال ہے! ہر کہانی آپ کی نظر میں پسندیدگی کی سند پا گئی پھر کیسے یہ شمارہ بس ٹائم پاس رہا؟ کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ذرا وضاحت فرمائیں)۔"

❋ اوشا راکھی، مٹھی سندھ سے شاملِ محفل ہیں۔ "یہ ہماری سسپنس ڈائجسٹ سے چاہت ہی ہے کہ ہر ماہ اس محفل میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ (مہربانی جناب کی)۔ اس ماہ کافی مصروفیات بھی ہیں۔ ابھی چند دن پہلے ہمارا رکھشا بندھن کا تہوار گزرا ہے۔ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ تینوں بھائیوں کو راکھی بندھی اور گفٹ وصول کیے۔ (بہت خوب...... مبارک ہو بھئی)۔ اکتوبر کا سسپنس 16 ستمبر کو مل گیا۔ ٹائٹل پر سٹمی گاؤں کی دوشیزہ پردہ پکڑے خوش گپائی میں کھڑی ہے انشائیہ اور اداریہ بھرپور رہے۔ محفل میں بلقیس خان جی جاسوسی ڈائجسٹ کے تبصرہ نگاروں کو یاد فرما کر کرسیِ صدارت پر تھیں۔ مبارک باد، ریاض بٹ جی آپ کے مشورے کا شکریہ۔ کوشش رہے گی مستقل طور پر حاضری ہوتی رہے۔ زرین جی، رانا بشیر جی اور محمد قدرت اللہ جی سب کا بے حد شکریہ۔ میری حوصلہ افزائی کرنے کا۔ اشفاق شاہین جی محمد صفدر جی آداب و شکریہ۔ آپ کی وجہ سے محفل میں آنے کی ہمت ہوئی اور حوصلہ بڑھا۔ ڈاکٹر ساجد کی شامِ شب بھی خوب رہی۔ مغلوں اور مرہٹوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کبھی ان کا پلڑا بھاری تو کبھی ان کا، اورنگزیب اور ان کے بیٹے بھی تاریخ میں کافی کارنامہ انجام دے گئے۔ مرہٹہ رانی چندرابائی بھی رعب دار مرہٹہ حکمران تھی۔ باغی کا اتنا جلدی اختتام کر کے حیران کر دیا، کیوں، اس کہانی میں بہت کچھ تھا جو ابھی وضاحت طلب تھا۔ ملکی سیاست کی اصلیت بھی اجاگر ہو رہی تھی۔ کامی چودھری کے ساتھ بھی بہت کچھ ہوا جیسا کہ حق سچ کے راہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ وقت اور حسام بٹ دونوں سپر جا رہے ہیں۔ اب داستان بھی واضح ہو رہی ہے۔ اس میں ہماری توجہ اور دلچسپی کا سارا مواد موجود ہے۔ عبدالرب بھٹی جی یکتارا کے ساتھ حاضر ہوئے۔ داستان بھی اے ون اور لاجواب رہی اور آخری صفحات کا حق بھی ادا ہوا۔ ہماری سندھ یونیورسٹی میں کافی وڈیروں کی بیٹیاں پڑھتی ہیں اور ہمارا گروپ سندھ میوزیم بھی جاتا رہا ہے۔ میں خود سندھ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں قیام پذیر ہوں۔ کسی کہانی میں اپنے شہر یا جگہ کا نام پڑھ کر بہت اچھا اور عجیب لگتا ہے۔ مہرزادی اور سجاول کی داستانِ عشق بھی زبردست تھی اور وڈیروں کے طرزِ عمل اور رہن سہن کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ملک صفدر حیات جی کی دوستانہ نے متاثر کیا۔ مچھلی فروش جمورا بیچارہ سادہ دل انسان صفیہ اور مشتاق مہر کی چال بازیوں میں آ گیا اور جان گنوا بیٹھا۔ ملک صاحب بھی تو بہترین و فرض شناس آفیسر ہیں۔ مجرم کو بے نقاب کر کے دم لیتے ہیں۔ اسما قادری جی کی نفکار بھی بیسٹ اسٹوری تھی۔ تھرل اور سسپنس سے لبریز۔ صادق احمد اور شمی نہلے پہ دہلا ثابت ہوئے۔ چوتھا خانہ بابر نعیم جی نے ایک بڑے معاشرتی پہلو کو اجاگر کیا۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام، صدر کیتھی صاحب نے جو کیا یہ مثال اس پر فٹ آتی ہے۔ شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے کالے کرتوت۔ انکشاف میں محمد فاروق انجم جی نے ہلکا پھلکا پُرمزاح ٹا پک لیا۔ ظہیر کی شادی کے لالے پڑ گئے ادھر پروفیسر صاحب کچھ کم نہیں تھے۔ اپنی مرحوم بیوی کی آواز سے ظہیر کو حیران و پریشان کر دیا۔ شاہ زین رضوان کی جواری اور محمد الیاس کی قدردان بہترین اسٹوریز تھیں۔ وسیم بن اشرف کی فرض شناس نے بہت متاثر کیا۔ وزیلی کی غداری اور سائمن کی وفاداری خوب رہی۔ الغرض اکتوبر 2017ء کا سسپنس بیسٹ رہا۔ محفل شعر و سخن میں ریحان خان، میمونہ علی، عمران شروانی، شاہینہ مہتاب، اسامہ جنید، اسا فیصل بہترین انتخاب کے ساتھ سرِفہرست رہے۔ کترنیں بھی سبھی کمال تھیں۔ (اتنی محبت اور اپنائیت کا بے حد شکریہ)۔"

❋ زاہد احمد، ناگن چورنگی، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "اکتوبر کا سسپنس 17 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو شاہ کار تو ذاکر صاحب نے خوب بنایا ہے لیکن میچنگ کا خیال نہیں رکھا۔ براؤن قمیص کے ساتھ بلیو دوپٹا اور ان کے ساتھ ریڈ کلر کی چوڑیاں کچھ میچنگ جچ نہیں۔ محترمہ چہرے سے جتنی دبلی ہیں ان کا ہاتھ چہرے کے مقابلے میں بہت ہی بھاری اور صحت مند لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو روہنگیا اور برما کے مسلمانوں کا ذکر ہوگا کیونکہ ان بیچاروں کی حالت بہت پتلی ہے۔ ظالم ملعون کافر ان کی نسل کشی کر رہے ہیں اور ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ بے شک وہاں پر بہت سے لوگ گئے۔ برما اور دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان ظالموں کافروں کے ظلم کا شکار ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ظلم کے بدلے میں جہاد کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ظالموں اور کافروں کو نیست و نابود فرمائے۔ باقی انشائیہ بہت ہی پُرمغز ہے واقعی جون ایلیا صاحب اپنی تحریروں کی صورت میں ہم میں زندہ ہیں۔ محفل میں پہنچے تو بلقیس صاحبہ کرسیِ صدارت پر موجود شکوہ کناں ہیں۔ بلقیس صاحبہ اللہ آپ کی والدہ صاحبہ کو صحت و تندرستی دے (آمین)۔ اس مرتبہ میں سوچ رہا تھا کہ میں تبصرہ نہیں لکھوں گا لیکن

قدرت اللہ نیازی صاحب نے میرے بیٹے عبدالکبیر جو کہ عیدالفطر سے دو دن پہلے وفات پا گیا تھا اس کی تعزیت کے سلسلے میں انہوں نے ..... چند جملے لکھے ہیں اور میں نے پڑھے تو دل بھر آیا۔ قدرت اللہ صاحب اور آپ سب لوگ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میری اہلیہ اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور صبر عطا فرمائے......

آپ کا غم بے شک بہت بڑا ہے لیکن...... بالآخر ہر انسان کو جانا تو اسی رب کے پاس ہی ہے نا)۔ واقعی باغی کی بغاوت کوئی کچل نہ سکا۔ باغی آیا اور چھا گیا اور اسی طرح اچانک چلا بنا۔ واقعی دو چار باغی ایسے اور ہو جائیں تو پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ وقت میں بھی عظیم کے والد کو وقت پڑا ہوا ہے اور ہو سکتا ہے اسد ان کی کچھ مدد کر دے۔ وقت میں ایک نئی انٹری متبول بھٹی صاحب کی ہوئی ہے جو کہ غیب کے اور ماضی کے واقعات بڑی روانی سے بتا رہے ہیں۔ کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی ہستی لگتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان جتنی بار بھی پڑھیں مزہ آتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ شام شب میں ساجد صاحب نے ہم سب کو تاریخی ادوار کی خوب سیر کروائی اور چندا بائی کے انجام پر بہت افسوس ہوا۔ دوستانہ میں صفیہ اور۔ مشتاق کی دوستی نے جمورے کی جان لے لی۔ وہ تو ملک صاحب نہ ہوتے تو جمورے بیچارے کا پتا بھی نہیں چلتا، صفیہ نے تو ملک صاحب کو بھی چکر دے دیا تھا۔ وہ تو جیلے نے ان کو گائیڈ کیا تو دونوں پکڑے گئے۔ بے وفا عورتوں سے اللہ سب کو بچائے۔ مغربی معاشرے میں ماں باپ اپنے بچوں کا بہت ہی کم خیال رکھتے ہیں۔ لیکن للی نے مشکل فیصلہ لے ہی لیا۔ سام کو بورڈنگ اسکول میں داخل کروا کر اس کا مستقبل محفوظ کر دیا مغرب سے ایک اچھی تحریر ہے۔ خوش قسمتی بھی کم ہی لوگوں کو ملتی ہے۔ لائم نے جیسے تیسے کر کرا کے خوش قسمتی حاصل کر ہی لی تھی لیکن اس خوش قسمتی میں حصہ دار بننے کے لیے بیری بھی اس کے سر پر سوار ہو گئی۔ فرض شناسی بھی کیا خوب ہے۔ لال جھنڈی نہ ملی تو اپنے خون سے ہی سفید کو لال کر لیا۔ بہت خوب۔ کہانی نے بہت متاثر کیا جواری کا تو یہ ہی ہے کہ جوا بھی کسی کا نہ ہوا مناسب ہی تھی۔ قدردان نہ جانے کس چیز کی قدردانی تھی چوری اور سینہ زوری ایک تو ڈاکوؤں نے میجر صاحب کو لوٹا ان کی زندگی بھر کی محنت کی کمائی لوٹ لی اور پھر سینہ زوری کہ آپ نے ہمیں پوری دولت کے بارے میں کیوں نہیں بتایا ان ڈاکوؤں اور چوروں کو جو معصوم لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں ایسے دولت کے ٹریپ لگا کر پکڑا جائے اور موقع پر ہی گولیوں سے بھون دیا جائے۔ یکارامحبت میں گندھی ہوئی مہرو اور سانول کی اس دور کی ماڈرن سسی اور پنوں کی کہانی ہے لیکن بھٹی صاحب نے آخر میں اس میں بہت ہی زبردست جھول چھوڑ دیا یا شاید مجھے ایسا لگا۔ حادثے میں مہرو جل جاتی ہے لیکن زندگی بھی بچ جاتی ہے گارڈ جل کر مر گیا، اس کی لاش مل جاتی ہے۔ مہرو کی لاش نہیں ملتی اُس کے گھر والے بغیر لاش ملے یہ کیسے یقین کر لیتے ہیں۔ کہانی اچھی تھی لیکن آخر میں جو گڑبڑ ہوئی وہ حلق سے نہیں اترتی۔ باقی اشعار بھی اچھے ہیں، وزیر صاحب کا شعر پسند آیا۔"

✿ محمد قدرت اللہ نیازی، جکیم آباد خانیوال سے خط لکھ رہے ہیں۔ "سرورق پر منہ بسورتی حسینہ اپنے محبوب کا انتظار کرتے کرتے مایوس نظر آئی جون ایلیا اپنی ذات میں محسور افراد پر نالاں نظر آئے۔ کیا خوب کہتے ہیں۔ "اپنے آپ میں محسور رہنے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔" اداریہ میں روہنگیا مسلمانوں کی حالت زار اور مسلم امہ کی مجرمانہ خاموشی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ خبروں سے پتا چلا کہ پاکستان سے علیحدہ ہونے والے بنگلہ دیش نے بھی لاکھوں روہنگیا مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے جبکہ پاکستان ایوان میں قرارداد جمع کروانے سے آگے نہیں بڑھا۔ محفل میں پہنچے تو بلقیس خان کو صدارت سنبھالے دیکھا۔ وہ پرسوز انداز میں پرانے تبصرہ نگاروں کو پکارنے میں مصروف تھیں۔ ان کی پکار پر ہم نے تو شمولیت کر لی محفل میں باقی سب جواب دیں کہ کیوں غائب رہتے ہیں۔ پہلی بار محفل میں شریک ہونے والوں کو کرسی صدارت پر فائز کر دینا یقیناً نئے تبصرہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے اچھا قدم اور ادارے کی پالیسی ہے۔ ڈاکٹر نائلہ نصر کو ہماری طرف سے بھی مبارک باد قبول ہو۔ ریاض بٹ! آپ کی بات درست ہے کہ کنٹرول لائن پر بھارت فائرنگ کر کے نہتے شہریوں کو نشانہ بنا رہا ہوتا ہے اور ہم سنیما میں بھارتی فلم دیکھ کر تبصرے کر رہے ہوتے ہیں۔ ادشار اٹھی کا تبصرہ حرے کا تھا ندیرہ کے جوابات شاید زیادہ ہی پسند آ گئے ہیں کہ ان کا پتا پوچھ رہی ہیں انشائیہ کے بارے میں اکثر قارئین کا یہی حال ہے اس لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ سب سے پہلے باغی پڑھی۔ اتنی جلدی آخری قسط کی امید نہیں تھی۔ باغی کے ڈائیلاگز نے کبھی ہنسایا تو کبھی رلایا۔ سچ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کام کرتے ہوئے ہمیں اس کی سنگینی کا احساس نہیں ہوتا اور جب احساس ہوتا ہے تو معافی دھلائی کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک سچویشن "باغی" میں بھی آئی جس کو پڑھتے ہوئے آنکھیں نمکین ہو گئیں۔ باغی سے ایک اقتباس آپ احباب کی بصارتوں کی نظر اور میں آنسوؤں سے تر چہرے پر ہاتھ رکھے ایک ہی منظر میں کھویا ہوا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ خانے سے باہر جا رہے تھے اور میں چاہ رہا تھا کہ انہیں روک لوں لیکن میں انہیں روک نہ سکا کاش! میں انہیں آواز دے لیتا۔ جس طرح دھیرے دھیرے وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ایک بار انہیں پکار لوں لیکن وقت کے اس لمحے میں ہم دونوں ہار گئے۔ بطور چودھری حشمت علی یا کامران کے نہیں بلکہ اس دن ایک باپ اور بیٹا ایک دوسرے سے ہار گئے تھے۔ اس کے علاوہ آشتی اور جواد کی موت بھی افسردہ کر گئی۔ مصنف کی پہلی کاوش بہترین ہے اس لیے معیار کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اسما قادری کی فنکار مغربی کہانی کا دیسی ورژن ہے۔ ثمر عباس کی خوش قسمت میں لائم کی خوش قسمتی اس وقت رخصت ہو گئی جب میری سیلی کے قتل کا

رازجان گئی۔ یہ جانکاری میری کی خوش قسمتی اور لائم کی بدقسمتی بن گئی۔ عبدالرب بھٹی اس بار مار دھاڑ اور ایکشن کے بجائے محبت کی رنگین و سنگین وادیوں کی سیر کرواتے نظر آئے۔ یہ تبدیلی اچھی لگی۔ سانول کے کردار کا بے نیازانہ انداز اور دنیا سے بے رغبتی مہرو کو اسیر کر گئے تاہم وصل کسی اور کا مقدر ٹھہرا۔ وقت میں سارا وقت باتوں باتوں میں کاٹا گیا۔ مقبول بھٹی کا کردار بھی دلچسپ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کا مشتاق رہا ہے البتہ مذہبی اعتبار سے اس کردار کی معقولیت ممکن نہیں کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ریاض بٹ کی کترنیں ہمیشہ کی طرح زبردست تھیں۔ محفل شعر و سخن میں اوشا راٹھی، مزین آفریدی اور شہباز اکرم کا شعری انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا۔"

❀ فضا شاہ، ماڈل ٹاؤن سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ "سرورق پر موجود خاتون مشرقی روایات کا پاس کرتی نظر آئی کہ اس بار دوپٹا سر پر موجود تھا۔ اس بار پہلا نمبر باغی کا لگا۔ بہت زبردست رہا کیونکہ بے جا طول نہیں دیا گیا اور کہانی تیز رفتاری سے بھاگتی رہی۔ آشتی کے مرنے کا دکھ ہوا۔ جرادا اپنے بے جا تصورات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ چند کمزور پہلو بھی نظر میں آئے لیکن مصنف کی پہلی کوشش کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ یکسار ترتیب مطالعہ میں دوسرے نمبر پر رہی۔ محبت کی ایک الم ناک داستان رانجھا کر دی کر دی میں آپ رانجھا ہو گی کی عملی تفسیر لگی۔ سانول کو تو پھر بھی چین آ گیا اس کے تصور کے مطابق مہرو اس دنیا میں نہیں رہی لیکن مہرو کا انجام المناک رہا۔ تاریخ کے جھروکوں سے شاہ شب اولین صفحات کی زینت بنی۔ اورنگ زیب کے حالات پڑھتے ہوئے ذہن اسی بات میں الجھا رہا کہ بادشاہ اور شہزادے سلطنت کے حوالے سے ایک دوسرے سے ڈرتے رہے۔ خوف اور اندیشوں نے بادشاہ سے بیٹوں کی فطری محبت چھین لی تو بیٹے باپ سے محبت کرنے سے قاصر نظر آئے۔ بھائی بھائی سے خوفزدہ و نالاں نظر آئے اور تقریباً تمام بادشاہوں کی یہی داستان رہی۔ ہنونت رائے اور چھابائی کا انجام بھی ناخوشگوار رہا۔ تارابائی کا ایک جملہ بہت اچھا لگا جسے اس نے ہنونت رائے سے کہا کہ مرہٹہ عورت جس سے پریم کا اقرار کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے خود کو برہنہ کر لیا۔ اب میں تجھے یہ کہنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی کہ تو نے مجھے برہنہ دیکھا ہے۔ اسا قادری کی فنکار میں پولیس کی اسپیشل کرائم برانچ کی ملازمہ خرچہ پورا کرنے کے لیے چھینا جھپٹی کرتی پھرتی تھی۔ فاروق انجم کی کہانی نے اچھا مزاح پیدا کیا۔ حجام کی ذرا سی غلطی نے منگنی خطرے میں ڈال دی۔ پروفیسر کی وگ کا اور ان کی بیوی کی آواز کا قصہ خوب رہا۔ محفلِ مخلوط میں بلقیس خان کو صدارت سنبھالے دیکھا تو بے حد خوشی ہوئی۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔"

❀ امتیاز احمد، بھالیہ سے ستمبر کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں۔ "ستمبر کا شمارہ خوب صورت سبز ہلالی پرچم سے مزین تھا اور ستمبر ہی کے حوالے سے خاتون کا انداز بھی فاتحانہ تھا۔ پاکستان کے شیر جوان بیٹوں نے اپنے لہو سے اپنے وطن کی لاج رکھی اور دفاعِ پاکستان سے ستمبر کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا۔ انشائیہ بہت خوب رہا۔ ہم آس پاس بھی نظر دوڑائیں تو بیگا کی ضرور نظر آ جائے، اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ سانجھ کتنا پیارا لفظ ہے۔ چپاتی اور پھول کی سانجھ نے برصغیر کے لوگوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مرد تو مرد عورتیں بھی انگریزوں کے خلاف تحریکِ آزادی میں پیش پیش رہیں۔ ایسے ہی عزیزن بائی بھی تحریکِ آزادی کے شہداء میں شامل ہو کر امر ہو گئی۔ علی اختر کا ماضی کا آئینہ سانجھ زبردست تھی اور ذرا سی بات میں بیگا کی دیکھیے۔ شاہینہ کے رشتے داروں کو ذرا سی بات ہی کھا گئی اور اس بیچاری کو ایک دن کی سہاگن بن کر طلاق کا دکھ سہنا پڑا اور اپنی بیٹی کے لیے اپنی زندگی تیاگ دی۔ ناہید سلطانہ اختر کی نصیحتوں سے بھرپور کہانی عمدہ رہی۔ محمد الیاس کی اسٹوری بازارِ حسن بچپن کی یادوں کے ساتھ اچھی تھی جہاں بڑے بزرگ بچوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ان کی اصلاح بھی کرتے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بھی مکافات میں بچپن کی شرارتیں اور معصوم محبت کو موضوع بنایا مگر ایک دوست کی مہربانی سے اسے نیلوفر کی محبت سے ہاتھ دھونے پڑے اور سب ختم مکافات کا عمل تو پھر تاریخ دہرا دیتا ہے۔ یوں اس کا دوست بھی نہ بچ پایا۔ اسے بھی بڑے صدمے سے گزرنا پڑا، عمدہ کہانی تھی۔ چوتھا درویش پڑھی تو ہے پر پہلی دفعہ سر سے گزرنے والی بات ہوئی۔ اسد علی اپنی ماں کی تلاش میں پاکستان پہنچ گیا اور اسے آتے ہی یہاں بہترین دوست مل گیا جو اسی کی طرح خطروں کا کھلاڑی لگتا ہے۔ حلیم نے سلمیٰ کا نام لے کر علی کو چونکا دیا ہے مگر دیکھو وقت علی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ وہ آسانی سے سلمیٰ نامی ماں تک پہنچ پاتا ہے یا پھر اسے یہاں بھی شاہ زیب اور شہزی کی طرح پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ بس آگے وقت دیکھو۔ آصفہ ضیا احمد کی حصار میں شاید چندو کو احساس نہ ہوتا اگر وہ انیش اور سدرشن گیگی کے درشن نہ کر لیتا۔ یوں ساری حقیقت اس پر کھل گئی اور چاندنی کی صورت اصل حق حصار کو مل گیا۔ تحریر بہت پسند آئی۔ جس نے بھی پیارے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا اپنے ہوش بھلا بیٹھا۔ رضوانہ ساجد کی خوب صورت تحریر بہت اچھی لگی۔ کترنیں لاجواب رہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

رابعہ وٹو، ننکانہ صاحب۔ محبوب مصور سومرو، ڈلاڑکانہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ انعم کمال، حیدرآباد۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ قمیر احمد، کراچی۔ اسد شیروانی، سکھر۔ آمنہ علی، منڈی والہار۔

دربان

علی اختر

یوں تو عہدِ گزشتہ کے کچھ واقعات اور ادوار قصّے کہانیوں میں ڈھل کر لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن ان ادوار کے بعض گوشے پھر بھی مخفی رہ جاتے ہیں جیسے کہ ... پرتھوی راج کی زندگی کے واقعات ... جہاں تیزی سے بدلتے حالاتؑ نہ صرف اس کی سوجھ بوجھ اور ذہنی سطح بلکہ عسکری طاقت کی بھی آزمائش کرتے رہے اور وہ ان پر پورا بھی اترتا رہا مگر ... جب دل کا معاملہ آیا تو نہ سوجھ بوجھ رہی اور نہ ہی عسکری طاقت کسی کام آئی کیونکہ ... پیار سے دل کی دنیا تسخیر کرنے والی سنجگتا نے بڑے مان سمان کے ساتھ اسے چاروں شانے چت کر ڈالا تھا ... جس کے بعد جنگی محاذوں پر اس کی تمام تدبیریں دور کھڑی پرتھوی راج کا مذاق اڑاتی رہیں البتہ زندگی کے آخری لمحے میں دل ہارنے والی سنجگتا نے خاموشی سے جان بھی ہاردی۔ کیونکہ جس اگن کے پھیروں میں اس نے پرتھوی راج کو باندھا تھا، اسی اگن میں وہ اسے تنہا کیسے جلنے دیتی۔

Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی ہے۔ (World's Most Expensive Poison) دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایک قسم "ل... Readmore

Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو : فائلپچھلے سال [illegible] 29... Readmore

Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو، فائلکراچی: اچھی صحت اور خ... Readmore

Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کوئنزیونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھروں میں ... Readmore
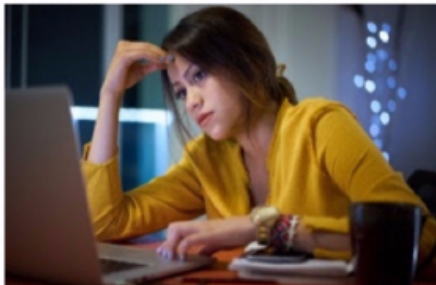
Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کئے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی س... Readmore

Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر دوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائلکراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore

معاملہ جب ذاتی پسند اور ناپسند پر آ کر رک جائے تو ترجیحات کے بدلنے سے انسانی دشمنیاں اور دوستیاں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ اس وقت پورے ہندوستان کے مختلف صوبوں، ریاستوں اور علاقوں میں یہی ترجیحات راج کر رہی تھیں۔ مختلف علاقوں، ریاستوں میں مختلف خاندانوں اور شخصیات کی اپنی اپنی راج دھانیاں قائم ہو چکی تھیں۔ جو طاقتور تھے، ان کے زیر نگین زیادہ علاقہ تھا۔ اس کے قرب و جوار میں قائم چھوٹی ریاستوں کے راجے مہاراجے اسے نذرانے اور خراج دیتے کہ ان کا وجود قائم رہے اور طاقتور ریاستوں کے راجے مہاراجے ہمیشہ اس بات کی ٹوہ میں رہتے کہ کہیں ان سے بھول چوک، کوتاہی یا غلطی ہو تو وہ ان پر چڑھ دوڑیں اور اسے بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیں۔ پورے ہندوستان میں اس وقت کوئی راجا، مہاراجا یا شہنشاہ ایسا نہ تھا جو یہ دعویٰ کرسکتا کہ وہ یا اس کا خاندان پورے ہندوستان کا یک و تنہا مالک ہے۔ اوپر سے جو حملہ آور بھی آتے، وہ کچھ عرصہ لوٹ کھسوٹ کرتے اور واپس پلٹ جاتے۔

اس وقت شمالی ہند میں بھی راجپوتوں کی چار بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ تنوار راجپوتوں کی بڑی راج دھانی دہلی تھی۔ چوہان کی اجمیر، راٹھوروں کی قنوج اور بگھیلوں کی گجرات میں اپنی اپنی حکومتیں قائم تھیں چونکہ تنوار خاندان کی راج دھانی سب سے بڑی تھی اس لیے وہ ان تینوں ریاستوں کا بڑا سمجھا جاتا تھا۔ آپس میں رشتے داری کی وجہ سے بھی تنوار خاندان دوسروں سے بڑا تھا۔ اس کے تمام احکامات کو دوسری ریاستوں کے راجے تسلیم کرتے تھے۔ راجوں، مہاراجوں اور اس کے ساتھ ساتھ بادشاہوں، شہنشاہوں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ ریاست کو اپنی نجی جاگیر سمجھنے لگتے ہیں اور جونہی کسی بڑے کی موت واقع ہوتی تو اس کے بیٹے ہی اس جاگیر اور ریاست کے وارث بنتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جن راجاؤں کی اولادِ نرینہ نہ ہوتی، وہ شادی پر شادیاں کیے جاتے یا پھر اپنے کسی رشتے دار سے اس کا بچہ گود لے لیتے اور پھر وہی ان کی ریاست کا وارث بنتا۔ قدرت نے تنوار راجا اننگ پال کو اولادِ نرینہ سے نہیں نوازا تھا جس کی وجہ سے دہلی جیسی بڑی ریاست پر وراثت کا معاملہ اس کے لیے بہت غور و فکر کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس کے حل کے طور پر اس نے اپنے ایک نواسے... پرتھوی راج کو گود لے لیا۔ پرتھوی راج چوہانوں میں سے تھا۔ ان کی راج دھانی اجمیر پہلے سے موجود تھی۔ پرتھوی راج خوبصورت اور بہادر نوجوان تھا اور چوہان خاندان میں بااثر اور مقبول تھا۔ راجا اننگ پال نے جب اس کو اپنا متبنٰی بنالیا تو قنوج کے راجا جے چند کو اس کا بے حد رنج ہوا کیونکہ رشتے میں وہ بھی راجا اننگ پال کا نواسہ ہی لگتا تھا۔ سب سے پہلی بات جو اس کے ذہن میں آئی، وہ یہی تھی کہ اگر نواسوں ہی میں سے تنوار راجے نے اپنا متبنٰی چننا تھا تو پرتھوی راج ہی کیوں...... اسے کیوں نہیں چنا گیا؟ جے چند کے ذہن میں تنوار راجا کی یہ پسند دشمنی کا روپ دھار گئی اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، یہ دشمنی گھٹنے کے بجائے دوچند ہوتی چلی گئی۔

جب دہلی کا راجا مرا تو پرتھوی راج کی سلطنت خود بخود وسیع ہوگئی۔ اب پرتھوی راج دہلی اور اجمیر دونوں گدیوں کا مالک ہو چکا تھا۔ جے چند اپنی حق تلفی کو کبھی بھی نہیں بھول پایا تھا۔ اس بات کا آہستہ آہستہ پرتھوی راج کو بھی علم ہو گیا تھا۔ اب اس کے دل میں بھی جے چند کے لیے نفرت پروان چڑھ چکی تھی اور ہر دو کا نہ صرف خاندانی معاملات بلکہ سیاسی طور پر بھی مخاصمت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ دونوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ہر معاملے میں ایک دوسرے کو نیچا دکھائیں۔ پرتھوی راج چونکہ زیادہ بہادر، خوب صورت اور چوہانوں کا سردار بھی تھا اس لیے وہ جے چند سے زیادہ طاقتور جانا جاتا تھا اور ہر معاملے میں وہ جے چند مہاراجا قنوج کو نیچا دکھا جاتا تھا جس پر جے چند تلملا کر رہ جاتا۔ چوہانوں اور تنوار خاندانوں کی حمایت بھی پرتھوی راج کو حاصل تھی مگر جے چند اندر ہی اندر اس سے دشمنی میں بہت آگے بڑھ چکا تھا مگر اس کا کہیں بس نہ چلتا تھا جبکہ پرتھوی راج نے اب برملا یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ بہت جلد وہ قنوج کی راج دھانی بھی جے چند سے چھین کر اپنی راج دھانی میں شامل کرلے گا۔ قنوج کے راجا کو بھی اس کے مصاحبین یہ خبریں پہنچا رہے تھے۔ حسد کے مارے جے چند پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا مگر پرتھوی راج کا کچھ بگاڑ نہ پاتا تھا۔

انہی دنوں ہوا یہ کہ غور خاندان کے محمد شہاب الدین نے جو محمد غوری کے نام سے مشہور تھا اور غور (افغانستان) کا بادشاہ تھا، اس کے ذہن میں یہ بات سمائی کہ شمالی ہند پر قبضہ کرکے اسے بھی اپنی سلطنت کا مستقل حصہ بنالے۔ چنانچہ شہاب الدین نے 1191ء میں ہند پر حملہ کیا اور سیدھا دہلی کی طرف جا پہنچا۔ پرتھوی راج جو دہلی اور اجمیر کا راجا تھا، اس نے بہت سے راجپوت راجاؤں اور اپنے حمایتیوں

سمیت بھاری فوج لے کر دہلی سے اسّی میل دور تھانیسر کے مقام پر شہاب الدین کو جالیا۔ دونوں کے درمیان خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ راجپوت بڑی بے جگری سے لڑے اور افغانوں کو شکستِ فاش دی۔ شہاب الدین خود بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔ راجپوتوں نے شہاب الدین کے بھاگتے ہوئے فوجیوں کا چالیس میل تک پیچھا کیا۔ جو افغان زندہ بچے، وہ سندھ پار بھاگ گئے۔ شہاب الدین کو شکست دینے کے بعد پرتھوی راج کی بہادری کی اور بھی دھوم مچ گئی جس کا جے چند کو بے حد رنج ہوا۔ اردگرد کے دوسرے راجاؤں اور خود چوہان خاندان نے اس فتح کا جشن منانے کا پروگرام طے کرنے کا سوچا۔ جے چند کے ہاں بھی پرتھوی راج کی اس بہادری کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا۔ پرتھوی راج نے جہاں اپنے دشمن کو عبرتناک شکست دی تھی، وہاں اس نے اور بھی چھوٹے موٹے بہت سے کارنامے سرانجام دیے تھے جن کی وجہ سے اردگرد کی چھوٹی ریاستیں اس سے دبنے لگی تھیں مگر جے چند خود کو ہمیشہ پرتھوی راج کا مدمقابل سمجھتا تھا اور جب بھی اس کے سامنے پرتھوی راج کا نام آتا تو وہ شعلے کے مانند بھڑک اٹھتا تھا۔ دشمنی کی آگ میں وہ جل بھن جاتا۔

جے چند کی پرتھوی راج سے رشتے داری ہونے کے سبب اس کا اکثر ذکر اس کے اپنے گھر میں ہوتا رہتا تھا۔ جے چند کی اکلوتی بیٹی سنجگتا بڑی خوب صورت اور حسین و جمیل تھی۔ قدرت نے جہاں اسے بے پناہ حسن سے نوازا تھا، وہیں اس میں سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ بھی بے تحاشا بھری ہوئی تھی۔ وہ کارِ حکومت میں اپنے باپ کا ساتھ دیتی اور جے چند بھی اپنی بیٹی کے مشوروں پر ہمیشہ عمل کرتا تھا۔ شہاب الدین کے جانے کے بعد جب اس نے سنا کہ اس کے دشمن پرتھوی راج کی فتح کے سلسلے میں کوئی جشن منانے کا پروگرام بنانے کا سوچ رہے ہیں تو اس نے سنجگتا سے اس بارے میں مشورہ کیا۔

''یہ بات تو خاندان بلکہ پورے شمالی ہند کی خوشی کا باعث ہے کہ اس نے اتنی بڑی یلغار کا مقابلہ کر کے اسے شکست سے دوچار کیا ہے۔ ہمیں بھی اس کے جشن میں شریک ہونا چاہیے۔ ہم جنگ میں اس کے حلیف بھی تو تھے مگر بیٹی تم تو جانتی ہو، میں پرتھوی راج سے نفرت کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی فتح میں منائے جانے والے جشن کا حصہ بنوں۔ میں یہ جشن الگ سے منانا چاہتا ہوں۔''

سنجگتا نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا ایسا کرنے سے آپ کی اہمیت بڑھ جائے گی؟''

''مگر میں پیچھے ہٹنے والا بھی نہیں ہوں۔ میں ان کے پروگرام سے پہلے جشن منانا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے کوئی بہانہ ہونا ضروری ہے۔'' جے چند نے بیٹی سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

''پتا جی! راجاؤں اور بادشاہوں کا کیا ہے۔ وہ کسی بھی بہانے سے جشن منا سکتے ہیں اور کسی بہانے قتل و غارت کا بازار بھی گرم کر سکتے ہیں۔'' سنجگتا نے صلاح دی۔

''تو پھر ایسا کیوں نہ کریں، میں اپنے راجا دھیراج ہونے کا جشن منا ڈالوں۔ میں اردگرد کے تمام مہاراجوں اور سرداروں کو اس میں مدعو کروں گا اور ایسا جشن مناؤں گا کہ چوہانوں کو پتا چل جائے گا کہ کسی راجے نے یہ جشن منایا ہے۔'' جے چند نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''یہ بات درست ہے مگر اس جشن میں پرتھوی راج کو بھی شامل ہونے کی دعوت دینا ضروری ہے کیونکہ اس طرح ایک تو اس پر واضح ہوگا کہ یہ جشن اس کی فتح کے سلسلے میں ہے اور ہم بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہیں...... دوسرے اس کے ذہن میں آپ کے خلاف پلنے والی دشمنی بھی ہو سکتا ہے ختم ہو جائے۔'' سنجگتا نے مشورہ دیا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، مگر اس دل کا کیا ہو جس میں پرتھوی کا نام آتے ہی دشمنی کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں؟ بہرحال تمہاری بات اور سوچ دونوں اچھی ہیں۔ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔''

☆☆☆

پرتھوی راج چوہان ایک حوصلہ مند، خوب صورت اور بہادر جنگجو نوجوان تھا۔ اجمیر کے دارالحکومت میں اس کی بہادری اور جنگجوانہ قیادت کی دھومیں تو تھیں ہی مگر جب اس نے دہلی کی حکمرانی سنبھالی اور تھانیسر کے مقام پر مسلمان حملہ آور شہاب الدین کو شکست دی تو اسے اپنی زندگی ہی میں لوک داستانوں کے کردار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ شمالی ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں چہار دانگ اس کو اچھے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ سلطان محمود کے بعد کی دو صدیوں کے دوران ان علاقوں کے سرداروں نے اپنے علاقے کے کسانوں اور دستکاروں سے اچھا خاصا لگان وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ زیادہ آمدنی ہوئی تو انہوں نے طاقتور افواج تیار کیں اور آپس کی خون ریز لڑائیوں میں فاضل پیداوار سے حاصل ہونے والی دولت کو خوب لٹایا مگر پرتھوی راج نے جہاں دہلی اور اجمیر کی حکومتوں کو اپنی

دانشمندی سے چلایا، وہیں اپنی دونوں ریاستوں کو نواحی اور بیرونی حملہ آوروں سے بھی بچائے رکھا۔ اس لیے وہ عوام میں خاصا ہر دلعزیز ہو چکا تھا۔ آدمی بہادر ہو خوب صورت بھی ہو تو وہ عورتوں میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کر ہی لیتا ہے اور خاص طور پر وہ حکومت کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے دلوں پر بھی راج کرنے لگتا ہے۔ لڑکیاں تو بسنت رت کی طرح ہوتی ہیں، جب وہ من ہی من میں کسی کو چاہنے لگتی ہیں تو اس وقت ان کے دلوں کی دھڑکن رنگ برنگی پتنگوں جیسی اونچے آسمانوں میں اڑنے لگتی ہیں۔

نہ جانے اس وقت سنجگتا کی عمر کیا تھی۔ بہر حال یہ بات تو دل کو لگتی ہے کہ وہ تربیتوں کی عمر سے گزر چکی تھی۔ شاید حیرتوں کی عمر تھی جب اس نے محل میں اور ارد گرد ہونے والی سرگوشیوں میں پرتھوی راج کا نام سنا۔ اس کی بہادری کے قصے جہاں ہر کسی کی تعریفی زبان پر تھے، وہاں اس کی خوب صورتی کے چرچے بھی عام تھے۔ اگرچہ دشمنی کی بنا پر اس کے پتا جے چند ہمیشہ اس سے نفرت کرتے تھے اور جب بھی اس کی بات ہوتی تو ان کا رویہ اور لہجہ ہمیشہ مخاصمانہ ہوتا لیکن جتنی نفرت اس کے والد پرتھوی راج سے کرتے تھے، نہ چاہتے ہوئے بھی سنجگتا کے من میں اس کے لیے اتنی ہی چاہت کیوں پیدا ہوتی جارہی تھی۔ اس کے کان اس نام کو سننے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اس کے من میں یہ نام سنتے ہی نہ جانے کیوں مدھر آواز میں بکھرتی گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں۔ وہ اپنے محل میں اکیلی تو ہوتی تھی مگر اس کی نگاہیں اپنے ارد گرد پرتھوی راج کے ہیولے کو کیوں دیکھنے لگی تھیں۔ جب بھی پرتھوی راج کا ذکر ہوتا تو سنجگتا کو یوں لگتا جیسے اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آ کر دھڑکنے لگا ہو۔

اس نے ابھی تک پرتھوی راج کو اپنے سامنے نہیں دیکھا تھا بس تصور میں وہ اس کے ہر وقت آس پاس رہتا تھا۔ ایک خاکہ تھا جو اس نے اپنے دل میں بسا لیا تھا اور دھیرے دھیرے وہ اس کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرنے لگی تھی۔ چونکہ پرتھوی راج چوہان اور اس کے والد جے چند کی آپس میں رشتے داری بھی تھی، اس لحاظ سے سنجگتا کو اپنی پسند کے ملنے کی امید نے اس کے دل میں پرتھوی راج کی محبت کو اور بھی دو چند کر دیا تھا۔ سنجگتا اگرچہ والد کی حکومت میں اسے مشورے بھی دیتی تھی اور اس کے ہمراہ امورِ سلطنت بھی سرانجام دیتی تھی لیکن اس سلسلے میں اسے اپنے والد کے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے اس معاملے کو اپنی والدہ کے سامنے اٹھانے کی جرأت کر ہی لی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس بارے میں اس کے والد سے بات کرے۔ بات سنتے ہی اس کی والدہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''لڑکی! یہ کیا بات کرتی ہو۔ جانتی ہو، تمہارا باپ اس سے کتنی نفرت کرتا ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں مگر میں بھی تو یہ چاہتی ہوں کہ ہمارے خاندان کے درمیان جو یہ فضول سی دشمنی ہے، اس کا خاتمہ ہو۔ پرتھوی راج اپنے خاندان ہی کا تو ہے۔ اس کے ساتھ میری شادی پر کوئی پابندی یا رکاوٹ بھی تو نہیں ہے۔''

''نہیں بھیا...... رام رام! میں تو یہ بات تمہارے باپ سے کرنے کا وعدہ نہیں کرتی۔ مجھے اس کے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' اس کی والدہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

''واہ ماں! ایک اتنی سی بات منوانے کی ہمت بھی نہیں رکھتی ہو۔ تم تو میری دوست ہو، ماں ہو۔ تم نے تو مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ اپنی بیٹی کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتیں؟ ماں! سچی بات یہ ہے کہ میں پرتھوی راج کو بے حد چاہنے لگی ہوں۔ اگرچہ میں نے تمہاری قسم اسے آج تک نہیں دیکھا۔ ہمیشہ یہ سوچتی رہی ہوں کہ وہ کتنا خوب صورت، اونچا لمبا اور بہادر نوجوان ہے جس کے قصے لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ میں نہیں جانتی کیسے اس کی محبت نے میرے دل میں آن بسیرا کیا۔ ماں! تو وعدہ کر کہ ابا جان سے اس بارے میں بات کرے گی۔'' سنجگتا نے کچھ اس انداز سے یہ باتیں کیں کہ اس کی والدہ پسیج گئی اور بولی۔

''اچھا اچھا...... کسی شبھ موقع پر بات کر کے دیکھوں گی۔ ویسے مجھے امید کم ہی ہے!''

پھر دو ایک روز بعد وہ گھڑی بھی آ ہی گئی۔ اس روز راجا جے چند محل میں آیا تو مہارانی نے ڈرتے ڈرتے بات شروع کی۔

''وہ اپنی سنجگتا ہے نا۔ اس کے بارے میں بات کرنی تھی۔''

''کیا بات کرنی تھی؟ بہت پیاری سمجھدار اور ذہین بچی ہے۔ میرے امورِ سلطنت میں اس کا ہمیشہ عمل دخل رہا ہے۔'' راجا جے چند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہی کہ اب وہ اس عمر میں پہنچ چکی ہے......'' اس سے پہلے کہ مہارانی اپنی بات مکمل کرتی جے چند بول اٹھا۔

''ہاں ہاں، جانتا ہوں۔ میری آنکھیں اس کی طرف سے بند نہیں ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملا تو ہم یہ بوجھ بھی

آسانی سے اتار دیں گے۔"

"رشتہ ہے میری نظر میں۔ گھر کا لڑکا ہے۔ اپنے خاندان سے۔" جانے یہ کہتے کہتے مہارانی کا حلق کیوں خشک ہونے لگا تھا۔

"کون ہے...... کس کا بیٹا ہے؟" راجے نے پوچھا۔

"پرتھوی راج......اور سنجگتا بھی اسے پسند کرتی ہے۔"

یہ سنتے ہی راجا جے چند کا پارہ آسمانوں کو چھونے لگا۔ وہ غصے میں دہاڑا۔

"آپ کو اس خبیث کا نام میری بیٹی کے ساتھ لینے کی ہمت کیسے ہوئی؟ اگر ایسا ہے جیسا آپ نے کہا تو بھگوان کی قسم میں سنجگتا کو انہی ہاتھوں سے ختم کر دوں گا لیکن اس کی شادی پرتھوی راج سے نہیں ہونے دوں گا۔"

"لیکن ہم نے اپنی سنجگتا کو ایک نہ ایک دن تو بیاہنا ہی ہے۔ رہ گئی بات دشمنی کی تو یہ بات ہمارے بڑوں سے چلی آرہی ہے کہ ہم ہمیشہ بیٹیاں دے کر، رشتے لے کر دشمنیاں ختم کرتے ہیں۔ اگر ہم بھی یہ کرلیں تو کوئی انہونی بات تو نہ ہوگی۔" مہارانی نے ڈرتے ڈرتے دلیل پیش کی۔

"اگر آپ مہارانی نہ ہوتیں تو میں بتا دیتا کہ انہونی اور ہونی میں کیا فرق ہوتا ہے۔" مہاراجا نے اپنا ہاتھ اپنی کمر سے بندھی تلوار کے مرصع دستے پر رکھ کر جواب دیا۔

"کوئی اور ایسی بات کرتا تو اس کا کٹا ہوا سر اب تک میرے قدموں میں پڑا ہوتا۔"

"م......م ...... میں......" رانی شاید کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔

"بس۔ آپ عورتوں کو اگر دشمنیاں ختم کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو جایئے پرتھوی سے اس کی بہن کا رشتہ لے آیئے۔ ہم بخوشی اسے اپنی حرم سرا کا حصہ بنالیں گے اور ایسے ہماری اس کے ساتھ دشمنی بھی ختم ہوجائے گی۔" راجا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ پھر وہ غصے میں واپس پلٹا اور جاتے جاتے ایک بار پھر دہاڑا۔ "اور ہاں، ایک بات اور کہتا ہوں۔ سمجھا لینا اپنی لاڈلی کو اور بتانا کہ ہم اپنے دشمنوں کا نام محلوں کی چار دیواری میں نہیں جنگ کے میدانوں میں لیا کرتے ہیں۔ پرتھوی ہمارا دشمن ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کا نام ہمارے محل کی دیواریں بھی سنیں۔ جب بھی اس سے آمنا سامنا ہوگا، جنگ کے میدان میں ہوگا۔ شادی کے منڈپ میں نہیں۔"

مہارانی خوف اور حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ "اور یہ بھی سنجگتا کو بتا دینا......" وہ جاتے جاتے مڑا اور اسی غصے میں بولا۔ "اگر اس نے اپنے ذہن سے پرتھوی کا نام نہ نکالا تو ہم اس کی سوچوں پر پہرے بھی بٹھا سکتے ہیں۔ ہم اسے اپنے ہاتھوں سے مار کر نرک بھجوانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ دلی نہیں بھجوائیں گے۔"

مہارانی، راجا کے غصے سے واقف تھی۔ وہ جی جان سے اس بات کو سن کر لرز اٹھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجے مہاراجے ایسے مواقع پر کیا کرتے ہیں۔ قتل و غارت تو ان کے نزدیک ایک کھیل سے بھی کم ہوتا ہے۔ پھر حرم سرا میں ایک عورت کے کم ہونے سے کونسی قیامت گزر جانی تھی۔

راجا جے چند غصے میں پیر پٹختا ہوا محل سے چلا گیا۔ اس کے جانے سے مہارانی کی جان میں جان آئی۔

☆☆☆

قنوج کی مہارانی کتنے ہی دن اپنے من ہی من میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔ راجا جے چند غصے کا برا ضرور تھا مگر وہ اتنے غصے میں کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ ضد کا پکا تھا۔ اب مہارانی کو اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ آخر اس نے ایسی بات کی ہی کیوں۔ نہ وہ سنجگتا کے کہنے پر کہتی اور نہ اس کی اتنی تذلیل ہوتی۔ راجوں، مہاراجوں کا کیا ہے۔ ذرا سی ان کے من میں آئی تو انہوں نے پہلی عورت پر دوسری لا بٹھائی۔ جے چند بھی غصے میں کہہ گیا ہے کہ وہ پرتھوی کی بہن کو بیاہ لائے گا۔ ہوسکتا ہے، وہ یہ بات کسی نہ کسی طرح سچ ہی کر دکھائے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ پرتھوی اس کے مقابلے میں زیادہ بہادر، زیادہ ذہین اور جری نوجوان ہے جبکہ جے چند اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ بہادر ضرور تھا مگر پرتھوی راج کی طرح ذہین اور معاملہ فہم نہ تھا اور جلد غصے میں آجاتا تھا۔ وہ ضدی بھی بہت تھا۔ یہی ضد سنجگتا کو بھی اپنے باپ کی طرف سے وراثت میں ملی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی وہی راجپوت خون دوڑ رہا تھا جو اس کے خاندان کے لیے باعث فخر تھا۔

اب مہارانی کو دہری مصیبت کا سامنا تھا۔ ایک طرف اس کا شوہر تھا اور دوسری طرف اس کی بیٹی اور طرفہ ستم یہ تھا کہ دونوں انتہا کے ضدی تھے۔ اگر اس کے ذہن میں یہ خیال آتا کہ اس کا شوہر اسی پرخاش کو مدنظر رکھتے ہوئے پرتھوی پر حملہ آور ہوسکتا ہے تو دوسری طرف اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ جب اس کی بیٹی کو اپنے والد کے انکار کا پتا چلے گا تو وہ بھی کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہوجائے۔ دونوں طرح سے تباہی اسے نظر آرہی تھی۔ اسے اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی اور سنجگتا بھی تو

دوبارہ اس سے ملی نہیں تھی۔ شاید اسے اس بات کا علم ہو گیا ہو یا پھر ہو سکتا ہے ریاست کے معاملات میں وہ اس قدر الجھی ہوئی ہو کہ اسے وقت ہی نہ ملا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بات کر کے بھول ہی گئی ہو۔ طرح طرح کے خیالات تھے جو مہارانی کے من ہی من میں خود بخود سر اٹھا رہے تھے کہ ایک روز سجکتا سے دوبارہ اس کا سامنا ہو گیا۔ ملتے ہی پہلا سوال جو سجکتا نے کیا وہ یہی تھا۔

"ماں! وہ میں نے ایک کام آپ کے ذمے لگایا تھا؟"

"کیا؟" مہارانی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ریاست کی مہارانی باتیں کب سے بھولنے لگی ہے۔" سجکتا نے ہنستے ہوئے کہا تو مہارانی خود بخود شرمندہ ہو گئی۔ اس کی بیٹی یقیناً اتنی ذہین ہے کہ وہ ریاست کے معاملات کو بخوبی چلا سکتی ہے۔ اس نے سوچا اور فوراً بولی۔

"وہ...... ارے ہاں۔ مجھے یاد آیا۔" مہارانی بات کو ادھر ادھر گھمانا چاہتی تھی۔

"لگا دیں کوئی بہانہ کہ پتاجی محل میں تشریف نہیں لائے۔ وہ آئے تو تھے مگر بات کرنا آپ کو یاد نہیں رہا یا پھر...... انہوں نے بات سنتے ہی انکار کر ڈالا۔ ماں! جو بھی ہے، مجھے سچ سچ بتا دیں، مجھ میں سب سننے کا حوصلہ ہے۔" سجکتا نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم یہ بھول کیوں نہیں جاتیں۔ خاندان میں پرتھوی سے زیادہ بہادر، خوب صورت اور ذہین و فطین نوجوان موجود ہیں پھر پرتھوی ہی کیوں؟ جبکہ تمہارا کہنا ہے کہ تم نے اسے دیکھا بھی نہیں۔" مہارانی نے رکتے رکتے بات مکمل کی۔

"ماں! یہ آپ کا خیال ہے یا آپ کے منہ میں پتاجی کی زبان بول رہی ہے۔" سجکتا نے دوبارہ پوچھا۔

"یونہی جان لو۔ یہ ہم دونوں کا خیال ہے۔" مہارانی نے حوصلے سے کہا۔ "سجکتا...... میری بچی! تم نہیں جانتیں۔ جہاں دشمنی کا خود سر پودا اپنا سر نکال چکا ہو، وہاں بہتر موسموں کی ہوائیں نہیں گزرا کرتیں۔ تمہارے ذہن میں بھی شاید نہ ہو کہ تمہارا باپ پرتھوی سے کس قدر نفرت کرتا ہے۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا۔ ایک دوبار ان دونوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ جھڑپیں جنگ کا روپ نہ دھار سکیں۔ ایسے میں یہ دشمنی اور یہ سوچ کہ منافقتیں ختم ہو جائیں، بھلا کیونکر ممکن ہے!" مہارانی نے دلیل سے سجکتا کو قائل کرنا چاہا۔

"لیکن ماں جی! بڑے بڑے خاندانوں کی دشمنیاں اسی طرح ختم ہوتی آئی ہیں کہ ان کے درمیان رشتے داریاں قائم ہو گئیں۔ بہنوں، بیٹیوں کے رشتے دے کر یا ان کو اپنے حرم میں شامل کر کے...... پھر یہ بھی تو سوچیں کہ پرتھوی دوسرے خاندان سے تو نہیں۔ اپنے ہی خاندان کا لڑکا ہے۔ میں نے اگر اسے نہیں بھی دیکھا تو یہ آپ کی نیک نامی اور بہتر پرورش کا نتیجہ ہے کہ میں نے اسے بنا دیکھے پسند کیا ہے اور چاہتی ہوں کہ بہتر انداز سے یہ بیل منڈھے چڑھ جائے۔" سجکتا نے آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"بات تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ میرے من کو بھی لگتی ہے مگر تمہارے باپ کو کون سمجھائے۔" مہارانی نے ایک آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"بات تو مکمل سنائیں۔ آخر کیا گفتگو ہوئی تھی آپ کے اور پتاجی کے درمیان تاکہ میں بھی اپنا کوئی لائحہ عمل بنا سکوں۔ زندگی تو میں نے ہی گزارنی ہے۔" سجکتا نے سنجیدگی اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

"تو سنو...... میں نے تمہارے پتاجی سے بات کی تھی۔ انہیں مختلف دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہاں تو وہی ڈھاک کے تین پات والا معاملہ ہے۔ میری بات سن کر وہ غصے سے اکھڑ گئے بلکہ مجھے دھمکی دے ڈالی کہ اگر تم عورتوں کو یہ دشمنی ختم کرنے کا اس قدر شوق ہے تو مجھے پرتھوی کی بہن لا دو۔ یہ ضروری تو نہیں کہ یہ چند اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر ہی دشمنی ختم کرے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔ پھر راجوں مہاراجوں کی عمریں کون دیکھتا ہے۔ اگر اس میں تمہارا ارادہ بھی شامل ہے تو یہ جان لو، راجے کی تلوار اور تمہارے سر کے درمیان دو ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ میں تم دونوں کو ختم کر دوں گا مگر اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا۔ پرتھوی میرا دشمن ہے اور دشمن ہی رہے گا۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے اور آئندہ میں اس بارے میں تمہاری زبان سے یہ بات سننا پسند نہیں کروں گا۔ بھگوان کی قسم اگر تم میری پتنی نہ ہوتیں تو ابھی تمہارا سر تمہارے جسم سے الگ ہو کر میرے قدموں میں لوٹ رہا ہوتا!"

مہارانی تمام باتیں سنا کر خاموش ہو گئی۔ دونوں ماں بیٹی کے درمیان کچھ توقف کے لیے خاموشی یونہی تیرتی رہی پھر جیسے سجکتا نے اپنے من ہی من میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ بڑے خوفزدہ کرنے والے لہجے میں گویا ہوئی۔

"ماں! تو میرا فیصلہ بھی پتاجی کو سنا دینا۔ میری رگوں میں بھی وہی خون بہتا ہے جس پر انہیں فخر ہے اور جو انتہائی ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ اکھڑ بھی ہے۔ اگر وہ اپنی دشمنی نہیں بھول سکتے تو میں بھی اپنی پسند نہیں بدل سکتی۔ میں نے

پرتھوی کو زندگی بھر نہیں دیکھا مگر اس کی خوبیوں اور اس کی بہادری کے چرچے تو سنتی رہی ہوں۔ وہ میرے من کے سنگھاسن پر ایک آسن بنائے جما بیٹھا ہے جسے نکالنا میرے اپنے بس میں بھی نہیں رہا۔ میں اسے ہر حال میں حاصل کر کے رہوں گی۔ یہ میری ضد ہے۔"

وہ یہ کہہ کر پیر پٹختی ہوئی چلی گئی اور مہارانی کو سوچوں کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا چھوڑ گئی۔

مہارانی اپنی چھلکتی آنکھیں لے کر سامنے رکھی بھگوان کی مورتی کے قریب چلی گئی۔ اپنی پانی بھری آنکھوں کو بند کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کانپتے ہوئے لبوں سے الفاظ کا دھارا خود بخود بہنے لگا۔

"اے بھگوان! تو ہی میری اس ضدی بیٹی کی لاج رکھنا اور اسے آنے والے دکھوں سے بچانا۔ یہ بہت معصوم اور سادہ سی لڑکی ہے۔ بھگوان تو ہی اس کی حفاظت کرنا!"

شاید یہ دعا مانگ کر اس کے من کو سکون مل گیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ جلد ہی اپنے جڑے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر کر وہاں سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

سنجوگتا پیر پٹختی ہوئی مہارانی سے لڑ جھگڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور آتے ہی اپنے بستر پر گر گئی تھی۔ غصے سے اس کی کن پٹیاں جل رہی تھیں، اب وہ کیا کرے؟ وہ اپنے والد راجا جے چند کے غصے اور اس کی ضد سے واقف تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اس کی خواہش کو پورا نہیں ہونے دے گا مگر اب پرتھوی جو بڑی دیر سے اس کی سوچوں کا محور بنا ہوا تھا، اس کے خیالوں پر قابض تھا، اب اس کی ضد بن چکا تھا۔ وہ کیسا ہو گا؟ آیا وہ اس کی سوچوں اور اس کے خیالوں جیسا ہی ہو گا۔ اسے ایسا ہونا ہی چاہیے۔ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ وہ اس کی ایک جھلک دیکھ لے اور کیا اسے بھی اس بات کا علم ہے کہ ایک پاگل سی لڑکی اسے اپنی سوچوں کا محور بنائے ہوئے ہے؟ وہ دن رات اس کے خواب دیکھتی ہے مگر اسے یہ کیسے علم ہو سکتا ہے؟ وہ اس کے من میں پلتے خیالات کو کیسے جان سکتا ہے؟ وہ سوچتی رہی کہ سب سے پہلے اسے اس بات کا احساس دلوانا ہو گا کہ راجا جے چند جو اس کا جانی دشمن ہے، اس کی لڑکی سنجوگتا اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ اتنی کہ وہ اس کے لیے کسی بھی امتحان سے گزرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ ہو سکتا ہے جیسے خیالات اس کے من میں پیدا ہوئے ہیں، ایسے ہی خیالوں میں وہ بھی کھویا ہوا ہو۔ وہ بھی دل ہی دل میں اس کی چاہت میں مبتلا ہو۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہو تو اس کا مزہ ہی دوگنا ہوتا ہے۔ یک طرفہ طور پر محبت کی چنگاریاں سوچوں کو سلگاتی رہیں تو اس کا فائدہ......

پھر اچانک جیسے اس کی سوچوں میں کوئی بجلی سی اچانک چمکی ہو جس سے وہ نہال ہو کر رہ گئی۔ اس درمیانی راستے کے بارے میں وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اپنے

غور و فکر

☆ برائی کو خود میں اور اچھائی کو دوسروں میں تلاش کرو۔ یہ آپ کی سب سے بڑی اچھائی ہے۔

☆ جب مجھے پتا چلا کہ مخمل کے بستر اور زمین پر سونے والوں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں تو مجھے اللہ کے انصاف پر یقین آ گیا۔

☆ شیطان کربلا میں کھڑا حسین علیہ السلام کا آخری سجدہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک آسمان کی طرف دیکھا اور کہا کہ اے اللہ! تیری خدائی کو غور سے تو آج دیکھا ہے۔ کہاں معلوم تھا کہ نور عالم ایسے ہوتے ہیں۔ اے خدا میں سجدے سے کبھی انکار نہ کرتا۔ اگر مجھ کو پتا ہوتا انسان ایسے بھی ہوتے ہیں۔

☆ خوشگوار زندگی اور جھگڑے سے بچنے کے دو اصول ہیں۔ جب آپ غلطی پر ہوں تو اسے تسلیم کر لیجیے مگر جب آپ درست ہوں تو خاموش رہیں۔

☆ محبت کس سے کی جائے؟ دنیا سے؟ مگر یہ تو رلاتی ہے۔ پھولوں سے؟ مگر یہ تو مرجھا جاتے ہیں۔ پیسے سے؟ مگر یہ تو رشتے توڑتا ہے۔ بلندیوں سے؟ مگر یہ تو منہ کے بل گراتی ہیں۔ خوشی سے؟ مگر یہ تو وقتی ہوتی ہے۔ لوگوں سے؟ مگر یہ تو بے وفا ہوتے ہیں تو پھر آخر محبت کس سے کی جائے؟ محمد ﷺ جو اس دن بھی ساتھ نبھائیں گے جب ماں، باپ، بھائی، بہن سب اپنی اولاد اور فرشتوں کو بھول چکے ہوں گے۔

☆ تین مشہور فلسفی (ایک فلسفی) قابلیت کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ (دوسرا فلسفی) توہین سے زیادہ گہرا کوئی زخم نہیں ہوتا۔ (تیسرا فلسفی) ٹینشن (پریشانی) کا پیدا ہونا ذہانت کی موت ہے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف...... جہلم

سیاق وسباق کے لحاظ سے یہ منصوبہ ہر حال میں جب مکمل ہوگیا تو اس نے اس بارے میں پختہ فیصلہ کرلیا۔ یہ درمیانی راستہ پرتھوی سے ہر حال میں رابطے کا تھا۔ کرناٹکی اس کی ملازمہ جو اس کے ساتھ پیار بھی کرتی تھی اور اس کا... ہر حکم بجالانے کو اپنا ایمان جانتی تھی...... کیا وہ اس سلسلے میں اس کی ممد ومعاون ثابت ہوسکتی ہے؟ اس نے سوچا۔

مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ دوسرے ملازموں کی طرح وہ بھی دہرے معیار کی ثابت ہو اور انعام واکرام کے لالچ میں آکر اس کے والد کو سب بتادے۔ دوسری سوچ نے سر اٹھایا۔

آزمالینے میں تو کوئی حرج نہیں پھر اگر وہ بے وفائی کرتی بھی ہے تو کیا۔ اس کا تو یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ ہر حال میں پرتھوی کو اپنائے گی اور اس کی راہ میں آنے والے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چنے گی...... پھر اسے کس بات کا خوف یا کس بات کا ڈر ہے؟ اس کے دل نے فیصلہ صادر کردیا تو اس نے کرناٹکی کو اپنا ہم راز بنانے کا سوچ لیا۔ اس روز کرناٹکی اپنے کاموں سے فارغ ہوکر اس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ سنجکتا بھی کاروبار سلطنت نمٹا کر فارغ تھی تو اس نے بات چلائی۔

"کرناٹکی! ایک بات پوچھوں...... سچ سچ بتانا۔"

"جی چھوٹی رانی! پہلے کچھ چھپایا ہے آپ سے۔ میں تو اپنے من کی ساری باتیں آپ کے سامنے کھول دیتی ہوں۔ وہ بھی جو آپ نہ بھی سننا پسند کریں۔" کرناٹکی نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔

"مگر سوچ لو۔ اس بات کی بھنک بھی دوسرے کانوں تک پہنچی تو یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ سنجکتا اپنے سے بے وفائی کرنے والوں کو کبھی نہیں بخشتی۔" اس نے کہا۔

"مجھے اس کا بھی احساس ہے!" اس نے نظریں جھکا کر مختصر جواب دیا۔

"آنکھیں ملاکر مجھ سے وعدہ کرو۔" سنجکتا نے حکم دیا۔

"جی آپ کہیں...... یہ میرا وعدہ ہے۔" کرناٹکی نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم نے کبھی پرتھوی کو دیکھا ہے؟ میرا مطلب ہے کسی تقریب میں...... کسی جنگ میں...... یا یونہی اچانک؟" سنجکتا نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

"چھوٹی مہارانی! بھلا یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ خاص کر میرے جیسی ملازمہ کے لیے جس نے کبھی محل کے باہر اڑتی خاک کو بھی نہیں دیکھا۔ میرے لیے تو یہ محل ہی پوری دنیا ہے۔ ہاں البتہ اس کی شہرت بہت سنی ہے۔ اس کے کارناموں کے چرچے بہت سنے ہیں۔ چھوٹی مہارانی! وہ تو آپ کے رشتے داروں میں سے ہے۔ آپ نے تو اسے دیکھا ہوگا۔ اس سے ملی بھی ہوں گی۔" کرناٹکی نے الٹا اس سے سوال کردیا تو سنجکتا ایک آہ بھر کر بولی۔

"کرناٹکی! یہی تو المیہ ہے، یہی تو دکھ ہے۔ ہم رشتے دار ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پائے۔ وہ اپنی ریاست کا راجا تھا پھر دہلی بھی اس کی دسترس میں آگئی۔ پتاجی کو اسی بات کا قلق تھا کہ ان کے بڑوں نے ان کے ساتھ دشمنی کی ہے۔ یہی بات ان کی دشمنی کا سبب بنی اور پھر پتاجی کا...... میں تو اسے ان کا پاگل پن ہی کہوں گی۔ انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے دلی پر حملہ کردیا کہ وہ اسے جیت کر اپنی سلطنت کا حصہ بنالیں گے حالانکہ انہیں علم نہیں تھا کہ پرتھوی ان سے زیادہ بہادر، جری اور ذہین حکمران ہے۔ اس نے پتاجی کی ایک نہ چلنے دی اور پتاجی اپنی شکست سے جھنجلا اٹھے۔ اس کے اور بھی بیری ہوگئے۔" سنجکتا نے آہستہ آہستہ بتاتے ہوئے کہا۔

"تو اب......؟" کرناٹکی نے اگلا سوال کرڈالا۔

"کرناٹکی! میں نہیں جانتی یہ کیونکر ہوا۔ ہر لڑکی کی طرح میری سوچوں پر بھی پرتھوی نے ایک روز اچانک قبضہ جمالیا اور میرے دل کی سلطنت کو جیت لیا۔ میں نہیں جانتی۔ میں جتنا بھی اب اپنے دل سے اس کا خیال نکالنے کی کوشش کرتی ہوں، اتنا ہی اس کے حصار میں جکڑی جاتی ہوں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ جب میرے پتاجی کو اس بات کا علم ہوگا، وہ دن میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہوگا۔ شاید وہ لمحے بھی میرے لیے آخری لمحے ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس بات کو سن کر وہ عملی طور پر کوئی بھی قدم اٹھاسکتے ہیں لیکن کیا کروں۔ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ یہ بھی نہیں جانتی کہ پرتھوی کو میری اس خاموش محبت کا علم کیسے ہوگا...... یا اگر اسے علم ہوجائے تو اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اب اسے اپنی ضد بنا بیٹھی ہوں۔" سنجکتا نے بتایا۔

"سمجھائیں چھوٹی رانی اپنے دل کو کہ وہ یہ پاگل پن

نہ کرے۔ اس کا بہت زیادہ نقصان ہوسکتا ہے۔ آپ کی جان بھی جاسکتی ہے۔ دونوں ریاستوں میں ایک نہ رکنے والی جنگ کا بھی احتمال ہے۔ بہت تباہی ہوگی، اس چھوٹی سی ضد کو پورا کرتے ہوئے۔ میری مانیں تو اپنے دل کو سمجھائیں۔'' کرناکی نے کسی دانا عورت کی طرح اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں مانتا یہ کم بخت۔ کہاں مانتا ہے۔ بہت کوشش کی ہے اسے سمجھانے کی مگر یہ ہے کہ میری ایک نہیں سنتا۔ اب چاہے قیامت آجائے، دنیا برباد ہوجائے مگر میں نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ میں پرتھوی کو اپنا آپ ہار کر بھی اپناؤں گی۔ بتاؤ اس سلسلے میں تم میرے لیے کیا کرسکو گی؟'' سجکتا نے آخری بات کی۔

''چھوٹی رانی! میں بہت دنوں سے آپ کی آنکھوں میں اداسی اور رت جگوں کے ڈورے لرزتے کانپتے دیکھ رہی تھی۔ اتنی تو سوجھ بوجھ میں بھی رکھتی ہوں مگر کبھی پوچھنے کی جرأت نہ کرسکی تھی۔ ڈر لگتا تھا۔ یہ محبت، یہ عشق کم بخت جب دل کے تخت پر آبیٹھتا ہے تو پھر اس کا فسوں اس کا جادو آہستہ آہستہ انسانی حسیات پر قابض ہوکر اپنا آپ ظاہر کرنے لگتا ہے۔ پھر انسان چاہے کچھ نہ کہے مگر اس کا انگ انگ اس کے اندر کا راز کھولنے لگتا ہے۔ مجھے حکم کریں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟'' کرناکی نے یہ کہا تو سجکتا کو یوں لگا جیسے بھرے دریا میں اسے ڈوبنے سے بچانے کو ایک سہارا مل گیا ہو۔ جیسے اسے ایک رازدار سہیلی مل گئی ہو جس کے ساتھ اب وہ دکھ سکھ کرسکتی ہو۔

''تم پرتھوی سے ملوگی۔ جس طرح بھی ممکن ہو اور اس سے میرے من کی ساری باتیں کروگی پھر اس کا ردعمل دیکھ کر مجھے بتاؤ گی۔ اگر وہ بھی ہمارے بھگوان کی طرح پتھر کا نکلا تو ساری عمر سر پھوڑنے سے بہتر ہے۔'' سجکتا اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''مگر چھوٹی رانی اگر اس بات کی بھنک بھی راجا کو پڑ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' کرناکی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ایسی قیامت آنے سے پہلے میں اس کا رخ اپنی طرف موڑنے کی جرأت رکھتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ، میرا یہ کام کرسکو گی؟ میں تمہارا منہ موتیوں سے بھردوں گی۔'' سجکتا نے دوبارہ کہا۔

''چھوٹی رانی! تم نے کرناکی کو دیکھا ہے مگر اس کے

مصلحت آمیز جھوٹ

میں نے ایک بادشاہ کے بارے میں سنا کہ اس نے ایک قیدی کو قتل کردینے کا حکم جاری کیا۔ بے چارے قیدی نے اس ناامیدی کی حالت میں بادشاہ کو گالیاں دینا اور برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ کہتے ہیں جب کسی انسان کی جان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو جو کچھ اس کے دل میں آتا ہے، کہہ دیتا ہے بادشاہ قیدی کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے وزیروں سے پوچھا یہ قیدی کیا کہہ رہا ہے تو ایک نیک خصلت وزیر نے بادشاہ سے عرض کی کہ اے بادشاہ سلامت! قیدی کہہ رہا ہے وہ لوگ اچھے ہوتے ہیں جو غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں۔

بادشاہ نے یہ سنا تو اسے قیدی پر رحم آگیا اور اسے معاف کردیا مگر دوسرا وزیر جو اس کے مخالف تھا، فوراً بول اٹھا۔ بادشاہ سلامت! اس نے آپ کو گالیاں دی ہیں، آپ کی شان میں نازیبا باتیں کی ہیں۔

بادشاہ نے جب اس وزیر کی باتیں سنیں تو بہت ناراض ہوا اور بولا کہ وہ جھوٹ جو اس وزیر نے بولا ہے تمہارے سچ سے زیادہ مجھے پسند آیا ہے کیونکہ اس کا رخ نیکی کی طرف تھا جبکہ تیرے سچ کی بنیاد خیانت پر ہے۔ اسی لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ برپا کردینے والے سچ سے بہتر ہے۔

(شیخ سعدی شیرازیؒ کی حکایات سے انتخاب)

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

بجو

ایک نوجوان شاعر جب پہلی بار عینک لگا کر نظم پڑھنے آیا تو میزبان بوڑھے شاعر نے کہا!

عینک لگا کر تم بالکل بجو لگتے ہو۔

نوجوان شاعر بولا۔

عینک اتاردو تو پھر آپ مجھ کو بجو لگیں گے۔

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی)

اندر دھڑکتے دل کو نہیں دیکھا۔ یہ دل دولت کے لیے نہیں پیار کے لیے دھڑکتا ہے۔ اب اگر آپ نے ایک چھوٹی بہن سمجھ کر مجھ پر اعتماد کیا ہے تو کیا میں یہ کام چند سکوں کی خاطر کروں گی؟ اگر ایسا خیال بھی میرے من میں آئے تو لعنت ہے میری زندگی پر۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی جان پر کھیل کر بھی آپ کی ملاقات پرتھوی سے ضرور کرواؤں گی۔'' کرناکی نے عزم سے کہا تو سجکتا نے پیار سے اس کا منہ چوم لیا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' سجکتا نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ایک روز کرناکی بھیس بدل کر محل سے نکلی اور پرتھوی تک کس طرح پہنچی، یہ ایک الگ کہانی ہے مگر وہ کسی نہ کسی طرح پرتھوی سے جا ملی۔ پرتھوی کے سپاہیوں کو اس کی مشکوک حرکات پر شک گزرا تو اسے گرفتار کر کے پرتھوی کے پاس لے جایا گیا۔ پرتھوی نے بڑے تحکمانہ لہجے میں سوال کیا۔

''کون ہو تم اور محل کے اردگرد کیوں چکر لگا رہی ہو؟''

''انسان ہوں اور دل کے ہاتھوں مجبور بھی۔'' کرناکی نے ترت جواب دیا۔

''جانتی ہو جھوٹ کہو گی تو اس کی سزا کس قدر بھیانک ہوگی؟'' پرتھوی نے دوسرا سوال کیا۔

''جانتی ہوں۔ سچ بھی بولوں گی تو کون اعتبار کرے گا۔'' کرناکی کا جواب تھا۔

''کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں..... کس کے کہنے پر آئی ہو؟'' پرتھوی نے دوبارہ سوال کیا۔

''کچھ باتیں دل کی ہوتی ہیں اور دل کی باتیں سب کے سامنے اس لیے نہیں کی جاتیں کہ اس سے رسوائی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر تخلیہ مل جائے تو یقین کریں سب کچھ سچ سچ بتادوں گی۔ اگر جھوٹ کا شک گزرے تو یہ گردن حاضر ہے۔'' کرناکی نے اپنی گردن کو جھکاتے ہوئے کہا۔

''ہوں! خود پر اتنا یقین ہے۔ موت سے ڈر نہیں لگتا؟'' پرتھوی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''اگر ڈرتی تو اتنی ہمت کہاں سے لاتی۔'' یہ کہہ کر کرناکی نے ایک بار پھر اپنے اردگرد کھڑے سپاہیوں کو دیکھا۔

پرتھوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ کیا تو وہ سارے انہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

''ہوں، اب کہو.....'' پرتھوی نے تخلیہ دیکھ کر پوچھا۔

''آپ یقین کریں گے یا میں بھگوان کی قسم اٹھا کر یا دیوی دیوتاؤں کا حلف اٹھا کر اپنے سچ کا یقین دلواؤں؟'' کرناکی سنجیدگی سے بولی۔

''نہیں، تم کہو۔ ہمیں تمہاری باتوں کا یقین ہے۔ تمہارا انداز، بات کرنے کی چستی ہی تمہارے سچ کے لیے کافی ہے۔''

☆☆☆

زندگی کی وہ شام سجکتا کے لیے بہت بھاری تھی۔ کتنی دیر سے وہ اپنے کمرے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر پھر رہی تھی اور اس کے من میں عجیب و غریب وسوسے جنم لے رہے تھے۔ کرناکی کو محل سے گئے دوسری شام ہو چکی تھی مگر ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

کیا وہ پرتھوی تک پہنچ بھی پائی ہوگی؟ کیا پرتھوی کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا ہوگا یا کسی ظالم راجے مہاراجے کی طرح اس نے غصے میں آ کر کرناکی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہوگا؟ دشمن کے علاقے سے دوسرے علاقے میں جانا، گویا جانتے بوجھتے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے اور کرناکی تو پرتھوی کے دشمن راجا جے چند کے محل کی خاص ملازمہ تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے پاس جاسوسی یا کسی خاص مقصد کو لے کر پہنچی تھی یا پہنچائی گئی ہوگی۔ پرتھوی کو یہ خیال بھی آ سکتا ہے۔ سجکتا نے سوچا۔

وسوسوں کی چنگاریں اس کی سوچوں سے نکل پھڑپھڑا رہی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا ذہن خود اپنے آپ پر لعنت اور پھٹکار بھیجتا کہ اس نے ناحق ایک جیتی جاگتی زندگی کو اپنے مفاد کی خاطر نرک (دوزخ) میں دھکیل دیا۔

اسے اب تک واپس پلٹ آنا چاہیے تھا۔ ایک سوچ آتی تو فوراً دوسری سوچ پہلی کا گلا گھونٹ دیتی۔ ان خیالوں نے سجکتا کی سوچوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا دھیان اسی طرف لگا ہوا تھا۔ امورِ مملکت میں اس کا دھیان نہیں لگ رہا تھا پھر جب سے راجا جے چند کو سجکتا کی محبت کا پتا چلا تھا، اس کا رویہ بھی سرد مہری پر جا لگا تھا۔ جس طرح وہ پہلے سجکتا سے باتیں کرتا، مشورے دیتا اور مشورے مانگتا تھا، اب سجکتا نے محسوس کیا کہ اس کے رویے میں تبدیلی آ چکی تھی وہ بھی دربار میں بس ایسے ہی جاتی۔ چند ثانیے وہاں بیٹھتی اور پھر اٹھ کر محل میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ جاتی۔

دو مکمل راتیں بیت چکی تھیں اور تیسرے دن کا سورج نکل کر اپنی تمازتیں بکھیرنے لگا تھا۔ آج اس کا من نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ دربار میں پہنچے مگر اس کا جانا اس لیے بھی ضروری

ہو گیا تھا کہ آج اس کے اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کے وفود راجا کے پاس تاوان اور تحفے تحائف لے کر آنے والے تھے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ جتانا تھا کہ وہ راجا جے چند کی برتری کو مانتے ہوئے طے شدہ تاوان ادا کررہے ہیں۔ وہ کسلمندی سے اٹھی اور دربار میں آ گئی حالانکہ اس کا آنے کو من نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ ان امور کی نگرانی کرتی رہی۔ جب تھک کر اٹھی تو اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی وہ ذرا کمر سیدھی نہ کر پائی تھی کہ کرناکی مسکراتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ "کہاں مرگئی تھی...... کہاں رہ گئی تھی؟ پتا ہے، میری جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔" سنجکتا نے جلدی سے اٹھ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے ایک ہی سانس میں پوچھا۔

"دھیرج چھوٹی رانی! بتاتی ہوں...... سب بتاتی ہوں۔" کرناکی نے سکون سے کہا۔ تو سنجکتا نے اس کو چھوڑ دیا اور آرام سے اپنے بستر پر آ بیٹھی۔ کچھ دیر وہ ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔

"ہوں!" تب تک کرناکی بھی سانس لے چکی تھی۔

"چھوٹی رانی! پرتھوی آپ کی سوچوں سے بھی زیادہ شجیع، بہادر اور خوب صورت ہے۔ یہ اونچا لمبا قد، آنکھوں میں چمکتی ہوئی ذہانت کی روشنی...... بس یوں سمجھ لیں کہ اس کے متعلق جتنے بھی لوگ باتیں کرتے ہیں، وہ ان سے کہیں بڑھ کر ہے۔" کرناکی مزے لے لے کر بتارہی تھی جبکہ سنجکتا چاہتی تھی کہ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بتادے۔ وہ اکتا کر بولی۔

"آگے بتاؤ۔ کیا ہوا تمہارے ساتھ؟"

"چھوٹی رانی! ہونا کیا تھا، میں دل میں ہزاروں وسوسے، خوف اور ڈر لے کر ان کی حدود میں پہنچی۔ گرتے پڑتے محل تک پہنچی تو ایک سپاہی نے مجھے روک کر پوچھا۔

"اے لڑکی! کیوں گھوم رہی ہے محل کے اردگرد؟"

"ملنا چاہتی ہوں پرتھوی مہاراج سے۔" میں نے حوصلے سے جواب دیا۔

"کیوں ملنا چاہتی ہو؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"تم مجھے وہاں تک پہنچا سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرا راستہ چھوڑ دو اور مجھے جانے دو!" میں نے اسی انداز میں کہا۔

"جب تک تم بتاؤ گی نہیں، میں جانے نہیں دوں گا۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے تم خود وہاں تک لے جاؤ۔ میں اپنے آنے کا مقصد تو پرتھوی کو ہی بتاؤں گی۔"

"پھر وہ مجھے پرتھوی کے پاس لے گیا۔ میں نے بھی اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ چند لمحوں تک تو میں بت بنی اس کے سامنے کھڑی رہی پھر اس نے تحکمانہ انداز میں یہاں آنے کا مقصد اور میرے بارے میں پوچھا۔"

"تم نے سب کے سامنے کہہ دیا ہوگا...... سب کچھ۔ ہائے رام! کروادی ہوگی بدنامی۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ؟" سنجکتا نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا جس میں احساس شرمندگی بھی شامل تھا۔

"چھوٹی رانی! کیا تم کرناکی کو اس قدر بے وقوف سمجھتی ہو۔ اتنی عقل تو ہے تمہاری اس باندی کو۔ جس گھر کا بھوجن (کھانا) کھاتی ہوں، اس کی بدنامی اور سبکی ہونے دوں گی؟" کرناکی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں...... آگے کہو!" سنجکتا نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے جب بتایا کہ میں قنوج کے راجا جے چند کے محل کی شہزادی کی ملازمۂ خاص ہوں تو وہ مارے غصے کے تقریباً اچھل ہی پڑا تھا۔ میں نے اس کے اردگرد کے مردوں سے تخلیہ چاہا تو اس نے سب کو بھیج دیا۔ پھر میں نے آپ کے من کی ساری باتیں اس پر کھول دیں۔"

"پھر......؟" سنجکتا کے لہجے میں سب جلدی سننے کی آرزو مچل رہی تھی۔

"میری بات سن کر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کچھ دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ دشمن کے آنگن میں محبت اور چاہت کا پھول اگ آیا ہے۔ کیا راجا جے چند کو اس کا علم ہے اور اس میں اس کی مرضی بھی شامل ہے؟ کہیں لڑکی یہ سازش تو نہیں اور اگر جھوٹ ہوا تو؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

"مہاراجا! کرناکی آپ کی دسترس سے دور تو نہیں۔ کسی وقت بھی دبوچ کر اس کی گردن مار سکتے ہیں۔ رہی بات راجا کی تو راجا تو ایک طرف، محل کے درودیوار کو بھی اس بات کا علم نہیں۔ ماسوائے اس ناچیز اور شہزادی عالیہ کے۔" میں نے یقین دہانی کروائی۔

کچھ دیر تک وہ سوچتے رہے پھر فرمانے لگے۔

"میرا اپنی شہزادی کو اس کی جرأتِ اظہار پر سلام کہنا اور بتانا کہ ہم نے اسے سویکار (قبول) کیا۔ ہمیں اس کا انداز پسند آیا۔ ہم یہ وچن (وعدہ) دیتے ہیں کہ ہم ایسی بہادر لڑکی کو اپنے حرم کی زینت بنانا پسند کریں گے۔"

"ایک اور بات!" میں نے پھر جرأت کی۔

''کہو......!'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''شہزادی درشن کی خواہش بھی رکھتی ہیں۔'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ہوں...... ان کی یہ خواہش بھی جلد پوری کر دیں گے مگر تھوڑا وقت لگے گا۔ تم آتی جاتی رہنا اور اپنی شہزادی کے من کی کتھا کھولتی رہنا۔ بہت جلد ہم تمہیں اگلا عندیہ بھی دے دیں گے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے نہ صرف مجھے اجازت دے دی بلکہ آپ کی محبت کو بھی سند قبولیت عطا کر دی۔''

''کرناکی...... کرناکی......'' سنجکتا نے کرناکی کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر جذبات میں آتے ہوئے گھمانا شروع کر دیا اور پھر گلے سے لگالیا۔

''کرناکی! آج میں خوشی سے نہال ہوئی جا رہی ہوں۔ اب کم از کم مجھے یہ گلہ تو نہ رہے گا کہ میری محبت، میری چاہت یک طرفہ تھی۔ ایک تشنگی اور ایک پیاس کی طرح تھی جو صرف میرے ہی ہونٹوں کی سکری بنی ہوئی تھی۔ اب اگر چاہت کی چنگاریاں میری سوچوں کو جلائیں گی تو پرتھوی بھی اس آگ میں جلے گا۔ اب میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ اپنی محبت کو حتمی طور پر عملی جامہ پہنا سکوں۔''

☆☆☆

کتنا عجیب لگتا ہے کہ ایک راجا محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس سے ملنے کے لیے جائے۔ وہ دو ریاستوں کا یکہ و تنہا مالک تھا۔ دہلی اور اجمیر دونوں ریاستیں اس وقت شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاستیں تصور ہوتی تھیں جن پر قابض ہونے کے لیے ہر راجا اور حملہ آور جتن کر رہا تھا۔ اس کا راجا ایک لڑکی کے حصول کے لیے مارا مارا پھرے۔ جب سے کرناکی اسے مل کر اور اسے سنجکتا کے دل کا حال بتا کر گئی تھی، وہ انہی سوچوں میں جتلا تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ صرف اور صرف قنوج کے راجا جے چند کی کوئی سیاسی چال ہو۔ دوسری سوچ نے سر اٹھایا۔ یہ ممکن ہے کیونکہ جے چند اس کا دشمن ہے اور دشمن ان ہونی بات کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس نے اس بہانے اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا پروگرام بنایا ہو۔ وگرنہ ایک لڑکی اور وہ بھی قنوج کی شہزادی میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ وہ بلا خوف و خطر اس سے محبت کرنے کا اعتراف کرے جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جب وہ سنجکتا کی جرأت اظہار اور بے باکی کو دیکھتا تو اسے اپنی اس سوچ پر شرمندگی ہوتی۔ بہر حال اس نے اب پیغام لانے والی سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنے حرم کی زینت بنا کے رہے گا تو اب راجا کے وعدے کو ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ اسے ہر حال میں اپنی بات کا پالن (پورا) کرنا ہوگا۔ وہ جب جب اس بات کو سوچتا، اس کے سیاسی خدشات خود بخود مرتے چلے گئے اور ان پر سنجکتا کی محبت قبضہ جماتی چلی گئی۔

کرناکی، سنجکتا کے پیغام لے کر پرتھوی کے پاس آتی جاتی رہی اور دونوں کی محبت پروان چڑھتی گئی۔ ان ہی دنوں پرتھوی اور کرناکی کی ملاقاتوں کی افواہیں بھی اڑنے لگیں۔

''دشمن ریاست کے راجا نے اس راج دھانی پر قبضہ کرنے کو یہ ایک نیا اور دلفریب منصوبہ بنایا ہے......'' کسی نے کہا۔

''لڑکی تو اس قدر خوب صورت نہیں، اس سے ہزار درجہ بہتر لڑکیاں راجا کے حرم میں داخل ہو سکتی ہیں پھر یہی لڑکی کیوں؟'' دوسرے نے جواب دیا۔

باتیں تھیں جو آہستہ آہستہ جوان ہو رہی تھیں۔ پھر اس کی سن گن پرتھوی کو بھی ہو گئی تو اسے اپنے رویے پر بے حد شرمندگی ہوئی لیکن سنجکتا سے محبت اتنی دیر میں اس کی سوچوں پر پوری طرح قابض ہو چکی تھی۔ اس رات وہ بڑی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے اس کا حل بھی نکال ہی لیا۔ وہ ایک بار سنجکتا سے ضرور ملے گا تاکہ اسے اس کی محبت کا نہ صرف اندازہ ہو جائے بلکہ وہ آنے والے دنوں کے لیے کوئی لائحہ عمل بھی اختیار کر سکیں۔ اس روز کرناکی سنجکتا کا پیغام لے کر پرتھوی کے مہمان خانے میں بیٹھی تھی۔ پرتھوی ابھی محل میں ہی تھا۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد وہ مہمان خانے میں آیا تو کرناکی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی۔

''دھن بھاگ۔'' کرناکی سلام کرتے ہوئے بولی۔

''آنکھوں کو رت جگے دینے والی تمہاری شہزادی کیسی ہیں؟'' پرتھوی نے مسکرا کر پوچھا۔

''بھگوان کی کرپا ہے۔'' کرناکی نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''آج پھر وہی خواہش اور وہی تمنا لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ شہزادی سنجکتا آپ کے درشن کی تمنائی ہے۔ اگر ان کی یہ خواہش پوری کر دیں تو ان کا کہنا ہے کہ وہ بھی خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی جاننے لگیں گی۔''

''دیکھو کرناکی! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم فضول کاموں میں اسے ضائع کرتے پھریں۔ یہ محبت اور یہ عشق وغیرہ کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ وہ تو ان کی چاہت کو

دیکھتے ہوئے ہم نے اس کو قبول کرلیا تھا۔ ہمیں تو ریاست کے دھندوں سے چھٹکارا نہیں ملتا۔"

"مگر شہزادۂ عالم! آپ نے اس ناچیز سے وعدہ فرمایا تھا۔" کرناکی نے پرتھوی کی بات کاٹی۔

"ہاں، ہمیں یاد ہے اور ہم اس پر قائم بھی ہیں۔" پرتھوی نے جواب دیا۔

"اگر صرف ایک بار ہماری التجا کو قبول کرتے ہوئے شہزادی کو اپنے درشن کروادیں تو ان کی زندگی آسان ہوجائے گی۔ یقین کریں، ان کا تڑپنا ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"اچھا کرناکی! تم مجبور کرتی ہو تو کوشش کرکے دیکھیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم گجرات جانے والے ہیں۔ وہاں کے راجا بھیم دیو کے متعلق پتا چلا ہے کہ وہ دوبارہ سے سر اٹھانے کی کوششوں میں ہے۔ راستے میں رک کر آپ کی شہزادی سے ملاقات کرلیں گے۔ بتادینا انہیں۔" پرتھوی نے سکون سے کہا۔

"مگر یہ کب ہوگا؟" کرناکی نے سوال کیا۔

"جب ارادہ ہوگا تو اردگرد کی تمام ریاستوں کو خودبخود علم ہوجائے گا۔ جنگ اور محبت چھپائے نہیں چھپتی۔" پرتھوی نے عزم سے جواب دیا۔

"خواہش کو اجازت دینے کا شکریہ۔ میں جاکے شہزادی کو یہ خوشخبری دیتی ہوں۔"

"مجھے اور میری سپاہ کو آج بھی خدشہ ہے کہ کہیں یہ سب تمہارا راجا جے چند کا منصوبہ نہ ہو...... ہمیں پھانسنے کا۔ کیونکہ ہم اس کی خصلت سے واقف ہیں۔" پرتھوی نے اپنے خدشے کا ایک بار پھر اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شہزادہ عالم۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ راجے کو ہماری ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ صرف میرے اور شہزادی صاحبہ کے درمیان کی باتیں ہیں جن سے محل کا کوئی دوسرا واقف نہیں۔ مجھے اجازت دیں۔ ہم آپ کے بڑی شدت سے منتظر رہیں گے۔"

آہستہ آہستہ چاروں طرف یہ خبریں گردش کرنے لگیں کہ گجرات کے راجا بھیم دیو نے دلی کو لگان دینے سے انکار کردیا ہے اور عنقریب پرتھوی اس پر یورش کرنے والا ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یہ خبر بڑی تیزی سے اڑی کہ بھیم دیو نے اپنے کچھ آدمی دلی میں تجدید وفا کے لیے زروجواہرات دے کر بھیجے ہیں۔ اس روز قنوج کے راجا جے چند کے دربار میں بھی یہ خبر پہنچی۔ درباری اس بارے میں چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ راجا اپنی مسند پر بیٹھا بے چینی سے ان خبروں کو سن رہا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ بھیم دیو نے دوبارہ صلح کے لیے اپنے آدمیوں کو دلی روانہ کردیا ہے تو بڑے غصے سے اس کے منہ سے نکلا۔

"بزدل کہیں کا...... ایک چھوٹے سے چھوکرے کا سامنا کرنے سے ڈرتا ہے۔ ویسے بہت بہادر بنا پھرتا ہے۔"

سنجگتا بھی اپنے باپ کے برابر بیٹھی اس کی بات سن کر ہنس دی تھی۔

"پتاجی! آپ کو اس کی فکر کیوں لگ رہی ہے۔" اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔

"بہادروں کو ہر جگہ بہادری دکھانا چاہیے۔ اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو تخت وراج کسی بہتر کے لیے چھوڑ کر خود الگ ہوجانا چاہیے۔" جے چند نے نخوت سے جواب دیا۔

"میں نے بھی کوشش کی تھی کہ اس ڈرپوک اور بزدل آدمی سے گجرات کی فرماں روائی چھین لوں مگر پرتھوی کے آڑے آنے سے میں نے اپنا ارادہ ترک کرڈالا ورنہ آج یہ بھی ہماری سلطنت کا حصہ ہوتا۔"

ایسی خبریں سن کر سنجگتا کا من اندر ہی اندر سے ڈوبنے لگا تھا۔ تو کیا اب پرتھوی گجرات کی طرف جانے کے لیے نہیں آئے گا؟ اگر ایسا ہوگیا تو ان کی ملاقات کا کیا ہوگا؟ بڑی مشکلوں سے پرتھوی اس ملاقات پر رضامند ہوا تھا۔ یہ خبر اس کے لیے بجلی بن کر گری تھی۔ وہ فوراً دربار سے اٹھ کر اپنے محل میں آگئی اور آتے ہی ایک بار پھر کرناکی کو بلالیا۔

"کچھ سنا تم نے...... گجرات کے راجا نے ڈر کے مارے اپنے چند آدمی زروجواہرات سے آراستہ کرکے دلی بھجوادیے ہیں۔"

"کیوں؟" کرناکی نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ کہیں پرتھوی گجرات پر چڑھائی نہ کردے۔ اپنی پیش بندی کے طور پر اپنا وفد دلی بھجوادیا ہے۔ کرناکی! اب ہماری ملاقات کا کیا ہوگا؟" سنجگتا نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"یہ تو بہت بری خبر ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ گجرات جاتے ہوئے ملاقات کریں گے۔" کرناکی نے جواب دیا۔

"تم اس طرح کرو، ایک بار پھر دلی جاکر ان سے ملو اور کوئی نیا طریق کار وضع کرکے آؤ۔ میرا جی بہت پریشان ہورہا ہے۔" سنجگتا نے جلدی سے کہا۔

"مگر شہزادی صاحبہ! میرا روز روز محل سے یوں

اچانک غائب ہونا کہیں کوئی نئی قیامت نہ ڈھادے۔'' کرناکی نے جواب دیا۔

''یہ میں سنبھال لوں گی۔ بس تم جلدی سے جانے کی تیاری کرو اور فوراً واپس آنے کی کوشش کرنا۔ مجھ سے یہ لمحات کاٹے نہیں کٹتے۔''

''ہے بھگوان! اگر تم نے یہ ملاقات کرائی تھی تو پھر راستے کی یہ رکاوٹیں بھی دور کردیتا۔ تو اسے میری بے صبری جان یا بے چینی...... میں بنتی کرتی ہوں تو اس مشکل کو دور کردے۔'' اس نے بھگوان کے آگے ہاتھ جوڑ کر دعا کرتے ہوئے کہا اور پھر بے چینی سے کمرے میں گھومنے لگی۔

☆☆☆

پورے چاند رات کی رات تھی وہ، جب کرناکی اور سنجکتا بھیس بدل کر محل سے باہر نکلیں اور دلی سے قنوج آنے والے راستے کی طرف گھوڑوں پر سوار جانے لگی تھیں۔

''تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے آج ہی کے دن آنے کو کہا تھا؟'' سنجکتا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ہاں ہاں چھوٹی رانی! بالکل آج ہی کے دن کا کہا تھا۔''

چٹیل اور سائیں سائیں کرتا میدان پورے چاند کی چاندنی میں اور بھی عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ بکھرے بکھرے دور دور کھڑے درختوں کے سائے زمین پر کسی ماورائی مخلوق کی طرح جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر سنجکتا نے ذرا خوفزدہ لہجے میں کرناکی سے پوچھا۔

''تمہیں کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا؟ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کوئی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔''

''ارے نہیں شہزادی صاحبہ! یہ صرف آپ کا وہم ہے۔ ہم اکیلے ہیں، اس وقت ہمارے ساتھ اور کون ہوسکتا ہے۔'' کرناکی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ذرا غور سے سنو۔ بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں کہیں دور سے سنائی دے رہی ہیں۔'' سنجکتا اسی خوف سے بولی۔

''ہاں شہزادی صاحبہ! ہوا کے دوش پر اڑتی دور سے آتی ٹاپوں کی آوازیں کبھی مدھم اور کبھی تیز اب مجھے بھی سنائی دینے لگی ہیں۔'' کرناکی کی آواز میں بھی اب خوف کا عنصر ظاہر ہونے لگا تھا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پرتھوی کے گھوڑوں کی آوازیں ہوں۔'' تھوڑے توقف کے بعد کرناکی نے کہا۔

''یہ دل کمینہ بھی بہت ہی نڈر ہو جاتا ہے محبت میں۔ اب اگر اس کے علاوہ کوئی مجھے اپنی پوری ریاست بھی دے دے تو میں اس وقت کبھی محل سے نہ نکلوں مگر آج دیکھ لو۔ ہم کتنے نڈر ہو کر باہر نکل آئے ہیں۔ ہمیں نہ تو اپنے بڑوں کا خوف لاحق ہے اور نہ ہی تنہائی میں کوئی اور خوف۔'' سنجکتا نے دھیرے دھیرے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں شہزادی عالیہ۔''

''سنو۔ ذرا غور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اب نزدیک سے آنے لگی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں ادھر ادھر ہو جانا چاہیے۔ راستہ چھوڑ کر...... کہیں اترائی میں...... یا درختوں کے پیچھے ہو جانا چاہیے۔ اگر پرتھوی نہ بھی ہوئے تو ہمیں خطرہ نہ ہوگا اور اگر پرتھوی ہوئے تو ہم نکل کر ان کے سامنے آجائیں گے۔'' سنجکتا نے تجویز پیش کی۔

''آپ کی تجویز درست ہے۔ اب تو اس تنہائی میں مجھے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ وہ ادھر دو تین درخت اکٹھے ہیں اور ان کے تنے بھی کچھ چوڑے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے خود کو چھپایا جاسکتا ہے۔ آیئے ادھر چلتے ہیں۔'' کرناکی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر دونوں جلدی سے اپنے گھوڑوں کو لے کر ان درختوں کی اوٹ میں جا کھڑی ہوئیں۔

آنے والے گھوڑے بھی تعداد میں دو تھے اور ان کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے آکر انہوں نے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔ گھوڑے دم لگانے کو ذرا رکے تو وہ دونوں ادھر ادھر میدان میں چاروں طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک نے اپنے چہرے سے ڈھاٹا اتارا تو کرناکی کی جیسے چیخ ہی نکل گئی ہو۔

''پرتھوی...... وہ پرتھوی ہے چھوٹی رانی۔'' اس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور فوراً اپنے گھوڑے کو ان کی طرف گھما دیا۔ اس کو دیکھ کر سنجکتا نے بھی اپنے گھوڑے کو اس کے پیچھے لگا دیا۔

کرناکی پرتھوی کے پاس پہلے جا پہنچی تھی۔ اس نے بھی اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا تو پرتھوی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''تو آپ پہنچ گئی ہیں؟''

''ہم تو کتنی دیر سے آپ کے انتظار میں تھے۔ یہ رہی شہزادی سنجکتا۔'' کرناکی نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کا نقاب بھی شوخی سے اتار دیا۔

وہ دونوں زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے اور دونوں ہی مبہوت کھڑے تھے، بت بنے ہوئے۔ ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھے جارہے تھے۔ چند ثانیے وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پرتھوی کے ساتھ آنے والا دوسرا سوار بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے سنجگتا کو ہوش آگیا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ کو ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے پرتھوی کو سلام کیا اور ڈرے ڈرے انداز میں اٹکتے ہوئے بولی۔

”آج ایک عرصے بعد زندگی کی آس پوری ہوئی ہے۔ لگتا تو یہ تھا، شاید اس ادھوری زندگی کی وسوسوں میں گھری ڈولتی کشتی کو کہیں کنارہ نہ مل سکے گا۔ یونہی تشنگی کی حالت میں مرجاؤں گی مگر آج لگ رہا ہے، پوری کائنات اپنی ساری خوب صورتیوں سمیت میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہو۔“

”مجھے نہیں علم تھا کہ ظاہری خوب صورتی کے ساتھ ساتھ آپ کی زبان سے اترتے لفظ بھی اسی قدر خوب صورت ہوں گے۔“ پرتھوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ان دونوں کو محوِ گفتگو پاکر کرناٹکی اور دوسرا سوار ایک طرف ذرا ہٹ کر دور جا کھڑے ہوئے۔ ”مجھے آپ کے جذبات کا اندازہ کرناٹکی کی باتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ کیا واقعی یہ سب آپ کے دل کی باتیں ہوتی ہیں جو کرناٹکی مجھ تک پہنچاتی رہتی ہے؟ کیا آپ میرے بارے میں اس طرح سوچتی ہیں؟“ پرتھوی نے سنجگتا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”اس سے کہیں زیادہ۔ یقین کریں، میرے شعور پر جو پہلا حرف جاگا تھا، وہ صرف آپ کے نام کا تھا۔ میرے گھر میں آپ کے جس نام سے نفرت کی جاتی ہے، یہ اتنا ہی چمک دمک کے ساتھ میرے من میں روشن ہے۔ یہ تو آپ کو بھی علم ہے کہ میرے والد راجا جے چند آپ سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ نام تک سننا پسند نہیں کرتے مگر پتا نہیں میرے اندر یہ ضد کہاں سے تناور ہوتی گئی کہ میں اگر زندگی گزاروں گی تو اسی کے سنگ جو میرے والدین کا جانی دشمن ہے اور یہی ضد آج تک میرے من میں گھر کرتی چلی گئی۔ میں نے اپنے طور پر بڑی کوشش کی کہ دشمنی کی یہ دیوار گرجائے مگر میرے پتاجی......“ وہ بات کرتے کرتے ذرا رکی تو پرتھوی بول اٹھا۔

”میں تو کیا، سارے لوگ، ساری ریاستوں کے راجوں کو علم ہے کہ جے سنگھ اپنی ہٹ کا کس قدر پکا ہے۔ اسے اپنی ضد نبھاتے ہوئے جتنا مرضی نقصان اٹھانا پڑے وہ نقصان کرلیتا ہے مگر ضد نہیں چھوڑتا۔

”کئی بار میرے من میں بھی آئی تھی کہ میں ضد کی اس دیوار کو کسی صورت گرادوں مگر میری کوشش بیکار گئی۔ بہرحال یہ الگ بات ہے۔ آپ کا ہاتھ ایک راجپوت کے ہاتھ میں ہے اور آپ کو بھی علم ہے کہ راجپوت ہاتھ پکڑ کر کبھی چھوڑا نہیں کرتے پھر یہ تو میری محبت کا ہاتھ ہے۔ تم یقین رکھو۔ میں ہر حال میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا اور کسی بھی صورت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لیے اجمیر تو کیا دلی کی راج دھانی بھی قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔ میں اپنا قول ضرور نبھاؤں گا اور تم پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دوں گا۔“ پرتھوی نے جذبات میں آکر کہا۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔ لگتا ہے، میرے خوابوں کو آج اس کی تعبیر مل گئی ہے اور یہ کہ میرا چناؤ غلط نہ تھا۔ آج تک صرف اندازوں پر زندگی گزار رہی تھی لیکن آج اس میں آپ کے یقین نے وہ تمام رنگ بھر دیے جن کی میں نے خواہش کی تھی۔“ سنجگتا نے اتنا کہہ کر اپنا سر پرتھوی کی چھاتی سے لگادیا۔

پرتھوی نے آہستہ آہستہ اس کے لمبے اور گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے ایک بار پھر یقین دلایا کہ وہ بھی اس کے ساتھ اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی وہ اس کے ساتھ کرتی ہے پھر ہلکے سے انداز میں اس نے سنجگتا کا سر اپنی چھاتی سے الگ کرتے ہوئے دوسروں کو آواز دی۔ جب وہ دونوں ان کے نزدیک آگئے تو پرتھوی نے کرناٹکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو کرناٹکی! آج کے بعد تم کبھی میرے پاس سنجگتا کا پیغام لے کر نہیں آؤ گی۔ تمہارے آنے سے میری سپاہ میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میری محبت کے دامن پر رسوائیوں کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ یہ چاند باردی ہے۔“ اس نے اپنے ساتھ آنے والے نوجوان کو کندھے سے پکڑ کر سامنے کرکے کہا۔ ”یہ میرا دوست، میرے دربار کا شاعر اور گویّا ہے اور اس سلسلے میں میرا اہم رازدار بھی ہے۔ یہ کسی نہ کسی طرح تمہارے دربار میں آئے گا اور اسے دربار تک رسائی دلانا تمہارا کام ہے بلکہ ہوسکے تو اسے محل تک جتنی ممکن ہو، رسائی دلوانے کی کوشش کرنا تاکہ یہ مجھ تک باتیں پہنچاتا رہے۔ اس پر اعتبار کرنا کہ یہ پرتھوی کا خاص آدمی ہے۔ باقی کام یہ خود کرلے گا۔ یہ کسی بھی

طرح تمہارے دربار تک پہنچ جائے گا۔ باقی سنجکتا اتم کسی قسم کا خیال دل میں مت لانا۔ اب پرتھوی کا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔ اپنی محبت کو میرے لیے زندہ رکھنا۔ اب ہم جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر دونوں نے چھلانگیں لگائیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر انہیں ایڑ لگا دی۔ کرناٹکی اور سنجکتا انہیں جاتے بڑی دیر تک دیکھتی رہیں پھر وہ بھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر واپس محل میں آ گئیں۔

☆☆☆

اب سنجکتا کے لیے اور بھی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ چاند باردی نے بھی اپنے مالک کا خوب حق ادا کیا۔ وہ قنوج پہنچا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب بہت جلد جے چند کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی چرب زبانی اور الفاظ کی جادوگری کے ساتھ ساتھ سنجکتا کی خفیہ امداد کے ذریعے راجا جے چند کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ رنگ محل میں بھی اس کی آزادانہ آمدورفت ہونے لگی تھی جس سے سنجکتا کو پہلے سے زیادہ آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چاند باردی کے ذریعے پرتھوی راج تک پیغام پہنچانے لگی تھی۔ اگرچہ اس پہلی ملاقات کے بعد اسے دوبارہ ملاقات کا موقع نہ ملا تھا لیکن پھر بھی رنگ محل میں اب ایک خفیہ تکون بن چکی تھی جس کے تین کونے چاند باردی، سنجکتا اور کرناٹکی تھے۔ ان کی ہی وجہ سے پرتھوی کو اب رنگ محل کی پل پل کی خبریں ملنے لگی تھیں۔

چاند باردی اپنا بھیس بدل کر جب چاہتا رنگ محل سے غائب ہو جاتا اور پرتھوی کو خبریں پہنچا کر، سنجکتا کے لیے پیغام محبت لے کر واپس آ جاتا اور اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ چاند باردی خود شاعر تھا۔ وہ بھرے دربار میں لطائف اور اپنی شاعری سے ماحول کو گرمانے کا فن جانتا تھا۔ اس لیے جلد ہی وہ جے چند کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ امورِ سلطنت میں بھی چھوٹے موٹے مشورے دینے لگا تھا۔ سنجکتا خوش تھی کہ اب اس کی محبت اور اس کی چاہت بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی تھی۔

اس دوران جے چند نے اپنے اردگرد کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر لڑائیوں کے ذریعے یا زور جبر کے ساتھ قبضہ کر لیا تھا۔ کئی ایک نے اپنی راج دھانی بچانے کی خاطر تاوان دے کر اپنی ریاست کو بچا لیا تھا اور آئندہ بھی اس کے باج گزار رہنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ راجا جے چند بہت زیادہ خوش تھا کہ اس کی سلطنت کی حدود اب خاصی پھیل چکی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ پرتھوی پر بھی کسی طرح دباؤ ڈال کر یا حملہ کر کے اسے شکست سے دوچار کر دے اور اجمیر کے ساتھ ساتھ دلی بھی اس کی دسترس میں آ جائے مگر اس کے ساتھیوں اور سپاہ نے اسے اس بات سے روکے رکھا تھا۔ دشمنی کی چنگاریاں اس کے من کو دھیرے دھیرے سلگا تو رہی تھیں لیکن وہ اپنے اندر ہمت نہ پا رہا تھا۔ پھر بھی وہ پرتھوی کو نیچا دکھانے کے کسی حربے کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ اپنی بے پناہ کامیابیوں کے اظہار کا اب قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا۔ چنانچہ اس روز اس نے بھرے دربار میں اپنے مصاحبین اور ساتھیوں کے آگے ایک تجویز رکھی۔ اس وقت سنجکتا بھی دربار میں موجود تھی۔ جے چند نے موقع غنیمت جانا۔ اس نے بھرے دربار میں بڑی خوشی کے ساتھ یہ اعلان کیا۔

"بھگوان کی کرپا سے اب قنوج کی راجدھانی اس قدر طاقت ور ہو چکی ہے کہ کسی دشمن کو اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو گی۔ اپنے اردگرد کی تمام ریاستیں یا تو قنوج کی باج گزار ہو گئی ہیں یا ان پر قبضہ کر کے ہم نے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان کامیابیوں کی دھاک دشمنوں کے دلوں میں بٹھانے کی خاطر ایک شاندار جشن منایا جائے۔ اس جشن کا نام راج سوجگ ہو گا۔ آپ لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

یہ کہہ کر راجا جے چند خاموش ہو گیا تو مصاحبین اور رفقائے خاص میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اس دوران جے چند خوشی سے تمتماتے چہرے اور چمکتی آنکھوں سے ان کی گفتگو سنتا اور ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔

"لیکن پتاجی! آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کے خزانے میں یہ جشن منانے کے لیے اتنی چاندی موجود ہے؟" سنجکتا نے سوال کیا۔

"اس کے متعلق تم بھی جانتی ہو۔ کیا تم امورِ سلطنت اور دربار کے مسائل سے واقف نہیں ہو؟" راجا جے چند نے الٹا سنجکتا سے سوال کر ڈالا۔

"اس بے جا مصارف سے خزانہ کمزور ہو جائے گا۔" سنجکتا نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم عوام پر لگائے ٹیکسوں اور لگان میں اضافہ کر دیں گے اور پھر جب ہم اس جشن میں اپنی باج گزار ریاستوں کو مدعو کریں گے تو وہ بھی تو ہمارے لیے تحفے تحائف، نقدی یا زر و جواہر کی شکل میں لائیں گے۔ بڑے مصارف تو اس طرح پورے ہو جائیں گے۔" راجا جے چند

نے آہستگی کے ساتھ سنجکتا کو ہنستے ہوئے بتایا تو سنجکتا خاموش ہوگئی۔ اسے پتا تھا کہ باپ کے ساتھ زیادہ بحث سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا۔ صرف ان کی ضد پختہ ہوگی، اس لیے وہ بھی خاموش ہوگئی۔

کچھ دیر اور اسی طرح گزر گئی پھر راجا جے چند نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''میرے مصاحبین اور رفقائے کار کو شاید میری یہ تجویز اچھی نہیں لگی۔ تبھی تو فیصلے میں تاخیر ہو رہی ہے۔''

''تجویز بہت اچھی ہے مگر کہیں یہ اس بات کی دلیل تو نہ بن جائے گی کہ ہم اپنے دشمنوں کو للکار رہے ہیں۔ انہیں غصہ دلا رہے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ طاقتور ہیں اور جب چاہیں ان پر بھی حملہ آور ہو سکیں گے۔'' ان میں سے ایک بولا تو جے چند قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''خوب...... بہت خوب! ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ ہماری دھاک ہر طرف بیٹھ جائے۔ پھر یہ صرف ہماری سلطنت کا فیصلہ ہے۔ ہر ریاست اپنے معاملات میں آزاد ہے۔ وہ جو چاہے اپنی ریاست میں کرے، کسی کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' جے چند نے دلیل پیش کی تو کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''کیا اس جشن میں دوسری ریاستوں اور اپنے دوستوں کو بھی مدعو کیا جائے گا؟'' ایک دوسرا اٹھ کر بولا۔

''بالکل...... جشن تو ہوتا ہی دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ ہم اپنے اردگرد کی ریاستوں کے فرماں رواؤں کو بھی اس جشن میں باقاعدہ دعوت نامے بھجوائیں گے۔'' جے چند نے وضاحت کی۔

''پرتھوی راج کو بھی بلائیں گے؟'' کسی اور نے سوال کیا تو پہلی بار سنجکتا نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بالکل...... جب ہمارے جشن منانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ ہم اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کریں تو پھر کیا دوست کیا دشمن...... ہر کسی کو دعوت نامے بھجوائے جائیں گے۔ اس میں شمولیت کا اختیار ان کے پاس ہے۔ وہ چاہیں تو جشن میں شریک ہوں یا نہ ہوں، ان پر ہمارا اختیار تو نہیں۔ ہمارا کام تو دعوت نامے دے کر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتے اور ہر کسی کے ساتھ دوستی کرنے کے خواہش مند ہیں۔'' سنجکتا نے بات ختم کی تو جے چند کی آنکھوں میں کچھ اور سوچ کر چمک پیدا ہوئی جو ایک ہی لمحے بعد معدوم ہوگئی اور وہ بولا۔

''ہماری پتری کی ذہانت کی داد دیں۔ اس نے ایک اور بھاری دلیل سے مجھے بھی اس بات کا قائل کر لیا کہ ہم اس کی دی ہوئی تجویز کے تحت اس جشن میں شمولیت کی ہر کسی کو دعوت دیں گے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس جشن میں دعوت نامے صرف دوست ریاستوں کے راجاؤں کو بھیجے جائیں گے مگر اب میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ دعوت نامے دور و نزدیک ہر ریاست کے فرماں رواؤں اور شہزادگان کو بھجوائے جائیں گے۔ اس میں شامل ہونا یا نہ ہونے کا اختیار ان کا اپنا ہے۔'' راجا جے چند کے اس فیصلے سے سارے مصاحبین خوش ہوئے۔'' تو پھر آج سے جشن راج سو جگ کی تیاریاں ریاست کے طول و عرض میں شروع کردی جائیں۔ جونہی یہ تیاریاں مکمل ہوجائیں تو اس کی اطلاع مابدولت کو دی جائے تاکہ جشن کی تاریخ کا باقاعدہ اعلان کیا جاسکے اور دعوت نامے جاری کیے جاسکیں۔''

یہ کہہ کر راجا جے چند اپنی مسند سے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی سنجکتا بھی اٹھی اور دونوں رنگ محل میں آگئے۔

''بھئی یہ کمال کی تجویز تھی۔ بھلا تمہارے ذہن میں کیسے آئی؟''

راجا جے چند بہت دنوں کے بعد خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس نے چلتے چلتے سنجکتا سے پوچھا۔

''آخر بیٹی کس باپ کی ہوں۔'' سنجکتا نے مزید حمایت حاصل کرنے کو کہا۔

''یہ تو ہے۔'' راجا جے چند نے ہنس کر کہا۔

''جب ہم نے اپنی شان و شوکت ہی دکھانی ہے تو پھر کیا دوست، کیا دشمن! اب دیکھنا تو یہ ہے کہ میری اس تجویز پر کس قدر عملدرآمد ہوتا ہے۔'' سنجکتا نے آخر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

''کیوں نہ ہوگا۔ تم اس ریاست کی شہزادی ہو اور میری چہیتی بیٹی ہو۔ اگر تمہاری خواہش پر عملدرآمد نہ ہوگا تو اور کس کی بات یہ بوڑھا مانے گا۔ ویسے اس جشن کے حوالے سے ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آئی ہے لیکن ابھی نہیں۔ یہ بات تمہیں جشن والے دن ہی بتاؤں گا۔ یہ نہ صرف تمہارے بلکہ سب کے لیے حیرانی اور خوشی کی ہوگی۔ یقیناً یہ دیکھ کر تمہاری خوشیاں بھی دوچند ہوجائیں گی۔''

''وہ کیا خوشی ہوگی، ابھی سے نہیں بتائیں گے؟'' سنجکتا نے اپنے والد کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اچک لی۔

''نہیں۔ وہ اچانک اور حیران کردینے والی ہوگی۔ ابھی بتاؤں گا تو اس کا مزہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔'' راجا جے چند نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی لیکن ایک بار پھر کہوں گی بھرے

دربار میں میری کہی ہوئی بات کی لاج ضرور رکھے گا!"

سنجکتا نے کہا اور رنگ محل میں اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

☆☆☆

سنجکتا اور جے چند کے دل کا چور الگ الگ تھا مگر دونوں کا محور صرف ایک ہی ذات تھی اور وہ ذات پرتھوی کی تھی۔ پرتھوی راج چوہان والیِ اجمیر اور دلی۔

سنجکتا کے دل میں یہ بات تھی کہ ایک عرصے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر مل پائیں گے۔ راز و نیاز کی باتیں ہوں گی۔ دل کے بھید ایک دوسرے پر آشکار کریں گے۔ محبت دل کے پالنے میں پڑے بچے کی طرح ہوتی ہے جو اپنی من مانی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے اور ریں ریں کرتی رہتی ہے، جب تک اس کے من کو تسلی نہیں ہوجاتی۔ ایک عرصے تک سنجکتا اکیلی ہی محبت کی اس آگ میں جلتی رہی۔ اس وقت وہ ہمیشہ گومگو کی حالت میں رہی تھی کہ پتا نہیں اس کی محبت اور چاہت کی یہ آتش پرتھوی کے من میں بھی سلگتی ہے یا نہیں مگر اب ان کی ملاقات کے بعد سے یہ آتش دو چند ہوچکی تھی۔ دونوں اطراف کے دل ایک دوسرے کے نام پر دھڑکنے لگے تھے۔ ایسے میں ہر اس لمحے کا بھرپور طریقے سے استقبال کرنے کی آرزو مچلتی رہتی تھی جس میں ملاقات کا کوئی لمحہ ہی میسر آجائے۔

سنجکتا نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس روز بھرے دربار میں یہ تجویز تو پیش کردی تھی کہ جشن میں شرکت کا دعوت نامہ پرتھوی کو بھی بھجوایا جائے۔ اس کے پیشِ نظر جہاں پرتھوی سے ملاقات ہونے کا امکان تھا، وہاں وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ شاید اس طرح کرنے سے دشمنی ختم ہوجائے۔ گوکہ اس کا امکان بہت کم تھا پھر بھی ایک کوشش تو تھی...... کر گزرنے میں کیا قباحت تھی۔

بڑی دیر تک وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ اس نے تجویز تو دے ڈالی، اب اگر اس پر عملدرآمد نہ ہوا تو...... کیونکہ اسے اپنے والد کی طبیعت کا علم تھا۔ وہ کسی وقت بھی اپنا ارادہ تبدیل کرسکتا تھا لیکن پرتھوی کی عادت سے بھی وہ واقف ہوچکی تھی۔ اگر اس نے آنے سے انکار کرڈالا تو کیا اس کی امیدیں اور کوششیں بیکار تو نہیں چلی جائیں گی؟ اب اس نئی سوچ نے اسے پریشان کررکھا تھا۔

دوسری طرف جے چند اپنے من ہی من میں خوش ہورہا تھا کہ اس بہانے وہ پرتھوی پر اپنا رعب داب جمانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اسے کم از کم اس بات کا احساس تو ہوجائے گا کہ جے چند بھی اب اس کی ٹکر کا حکمران بن چکا ہے۔ وہ اگر اجمیر اور دلی جتنی بڑی ریاستوں پر حکمرانی نہیں کرتا تو قنوج کو بھی اپنی فہم و فراست اور جنگی حکمتِ عملی سے اس قدر وسعت تو دے چکا ہے۔ وہ اب ہر طرح سے اس کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس نے سنجکتا کی تجویز کو بھی صرف اسی لیے قبول کیا تھا کہ اس بہانے وہ پرتھوی کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن ایک بات رہ رہ کر اس کے ذہن میں آرہی تھی۔ اگر پرتھوی نے آنے سے انکار کردیا تو اس طرح اس کی سبکی ہوجائے گی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی جسے سوچ کر وہ بے حد خوش ہوگیا۔ وہ کتنے دنوں تک اپنی اس ترکیب کو من ہی من میں عملی جامہ پہناتا رہا۔

ریاست کے طول و عرض میں جشن راج سوجگ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ دعوتی کارڈ بھی بن چکے تھے اور جشن کی مقررہ تاریخ کا اعلان بھی کیا جاچکا تھا لیکن ابھی تک دعوت ناموں کو سنجکتا نے نہیں دیکھا تھا جس میں یہ واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ جشن کے آخری روز قنوج کی شہزادی سنجکتا کا سوئمبر ہوگا۔ اردگرد کے ریاستی شہزادگان خاص طور پر اس تقریب کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔

سوئمبر میں شہزادی اپنے ہاتھوں میں مہکتے اور کھلے پھولوں کی خوب صورت مالا لے کر تمام قطار میں کھڑے شہزادگان اور امیدواروں کے آگے سے گزرتی تھی۔ وہ جس کو چاہتی یا جسے پسند کرتی پھولوں کی یہ مالا اس کے گلے میں ڈال دیتی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کو شہزادی نے پسند کرلیا ہے اور آئندہ وہی اس کا شوہر ہوگا۔ ہندوؤں میں یہ روایت کب سے چلی آرہی تھی۔ اس روایت کو معتبر اور متبرک سمجھ کر نبھایا جاتا تھا۔

سنجکتا تو دعوت نامے کے مندرجات کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ جب یہ دعوت نامے بھجوائے جارہے تھے تو کرناکی بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچی۔ اس کی سانس اس طرح پھولی ہوئی تھی گویا وہ بہت دور سے بھاگتے ہوئے آرہی ہو۔

"خیریت ہے کرناکی جو یوں بدحواس ہورہی ہو۔" سنجکتا نے پوچھا۔

"ہاں شہزادی صاحبہ! میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ خوش خبری کسی اور وسیلے سے آپ تک پہنچے اور انعام و اکرام کی حق دار وہی بن جائے۔" کرناکی نے سانس بحال ہونے پر کہا۔

"کونسی خوشخبری۔ کیا پرتھوی نے جشن کی تقریبات میں آنے کی ہامی بھر لی ہے؟" سنجکتا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"نہیں چھوٹی رانی۔ ریاستوں کے راجاؤں اور شہزادگان کو جو دعوت نامے بھجوائے جا رہے ہیں، اس میں یہ بات بڑی وضاحت سے لکھی گئی ہے کہ جشن کے اختتام پر آپ کے ہاتھوں سوئمبر رچایا جائے گا۔" کرناکی نے بتایا۔

"کیا...... کیا کہا تم نے؟ کس نے بتایا ہے تمہیں؟" سنجکتا نے بولائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"لو، یہ تو دعوت نامے میں درج ایک خاص تقریب ہے۔"

"اچھا۔ ابھی پوچھتی ہوں۔" یہ کہہ کر سنجکتا غصے میں پیر پٹختی ہوئی رنگ محل کے کمرائے خاص میں اپنی والدہ کے پاس چلی گئی۔

"یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ کس نے میری زندگی کا فیصلہ میرے پوچھے بغیر کرنے کا اختیار دیا ہے۔" وہ غصے میں بپھر کر بولی۔

"کیا بات ہے...... کونسا فیصلہ؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔" مہارانی نے دلار سے پوچھا۔

"جشن منانا بجا...... جنگ کرنا آپ کی عادت۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سنجکتا سے پوچھے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کرلیا جائے۔ میرا سوئمبر رچانے کا فیصلہ کس کا ہے؟" سنجگتا اسی غصے میں بولی۔

"یہ پرکھوں سے ہوتا آیا ہے۔ لڑکیاں جب بیاہ کی عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو ان کی شادیوں کا فیصلہ ان کے والدین ہی کرتے ہیں اور ریاستوں کی شہزادیوں کا اسی طرح سوئمبر رچایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ شہزادی اپنی پسند کے دُلہا کا خود سے فیصلہ کرلے۔ اگر یہ ہورہا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" مہارانی نے بڑے اطمینان سے سمجھایا۔

"مگر اس کے لیے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ اگر عین موقع پر آکر میں سوئمبر رچانے سے انکار کردوں تو۔۔۔" سنجکتا نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"کیوں اپنے والد کی پیاسی تلوار کو دعوت دیتی ہو۔ تمہارا انکار تمہاری موت کی صورت میں ہوگا۔ اپنے باپ کی ضد جانتی ہو۔" مہارانی بولی۔

اپنی والدہ کی بات سن کر سنجکتا غصے سے بھری واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ اسی غصے میں بھری کمرے میں ادھر ادھر گھومتی سوچتی رہی۔ آخر یہ دعوت نامہ پرتھوی کو بھی تو مل گیا ہوگا۔ اسے بھی پتا چل گیا ہوگا کہ سنجکتا کا اس جشن کے اختتام پر سوئمبر رچایا جائے گا تو اسے اپنے وعدے کے مطابق جشن میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ بہرحال اسے اپنے طور پر ایک بار پھر اسے مطلع کرنا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے کرناکی کو مشورے کے لیے بلوایا۔

"تمہاری بات ٹھیک نکلی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ پرتھوی کو کس طرح رضامند کیا جائے کہ وہ اس جشن میں اپنی شرکت کو یقینی بنائے؟ ورنہ یہ سب کچھ برباد ہوجائے گا۔ پرتھوی کے بغیر تمہاری یہ سہیلی، تمہاری شہزادی مرجائے گی کرناکی...... مرجائے گی۔" سنجکتا اس کے سامنے پھوٹ پڑی۔

"بھگوان نہ کرے۔ آپ فکر مت کریں۔ میں ابھی چاند باردی کو بلواتی ہوں اور آپ کی درخواست ایک بار پھر پرتھوی کو بھجواتی ہوں بلکہ میں اسے لاتی ہوں۔ آپ خود اس سے کہیں کہ وہ جا کر پرتھوی کو آپ کی خواہش کے بارے میں بتا کر اس کے یہاں آنے کو یقینی بنائے۔" کرناکی نے کہا اور محل سے چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد چاند باردی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم فوراً پرتھوی کے پاس جاؤ اور اسے اپنی زبانی سارے حالات کی خبر دو۔ اسے بتاؤ جشن راج سوجگ کے آخری روز سنجکتا کا سوئمبر رچایا جائے گا۔ اس لیے اس موقع پر اس کا دربار میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے انکار کردیا تو یہ میرا آخری دن ہوگا اور میرا جنازہ اٹھے گا سوئمبر نہیں ہوگا۔ فوراً جا کر اس کی تصدیق کرکے آؤ کہ اس کا کیا ارادہ ہے اور اس کے جواب سے مجھے مطلع کرو۔" سنجکتا نے سمجھاتے ہوئے اسے روانہ ہونے کا کہا۔

"جیسا آپ کا حکم شہزادی صاحبہ۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر چاند باردی رنگ محل سے نکل گیا اور سنجکتا ایک بار پھر بڑی دیر کے بعد انہی وسوسوں میں گھر گئی کہ اگر پرتھوی نے آنے سے انکار کردیا تو پھر اس کا کیا لائحہ عمل ہوگا۔ کیا وہ اپنا وعدہ نبھا پائے گا؟

☆☆☆

دربار مصاحبین، حفاظتی سپاہیوں اور ساتھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پرتھوی راج اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا اور سلطنت کے اہم امور پر گفتگو ہورہی تھی جب ایک درباری نے اٹھ کر پرتھوی کی توجہ مبذول کروائی۔

"شہزادہ عالم! اتوج کی ریاست کے راجا جے چند کا ایک ہرکارہ دربار میں حاضری کی تمنا لیے آیا بیٹھا ہے۔"

"اسے دربار میں حاضری کی اجازت ہے۔"

وہ درباری اٹھا اور اس نے ایک دوسرے خدمت گار کو اشارہ کیا۔ وہ دربار سے باہر گیا اور چند لمحوں بعد ایک شخص کو ساتھ لے کر دربار میں آ گیا۔ آنے والے نے سلام کرنے کے بعد قنوج کے راجا کا خط پرتھوی کو پیش کر دیا۔ پرتھوی نے خط کے مندرجات پڑھنے کی اجازت دی جس میں درج تھا۔

''میں قنوج کا راجا اپنی راج دھانی میں منائے جانے والے جشن راج سوجگ میں آپ کو شرکت کی دعوت دیتا ہوں جو میری رعایا کی پرزور خواہش پر منایا جارہا ہے اور اس جشن کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی آخری تقریب میں شہزادی سنجگتا کا سوئمبر بھی رچایا جائے گا۔ آپ سے شمولیت کی درخواست ہے!''

''ہوں......'' دعوت نامے کے مندرجات سن کر پرتھوی نے ایک لمبی سی ہنکاری بھری۔

''تو اس بڑھے کو جا کر کہو کہ ابھی تلوار کو اپنی میان میں ہی رکھے۔ اس طرح کے فریب میں پرتھوی آنے سے رہا۔ بہرحال تم جاؤ اور میرا یہ پیغام اسے پہنچا دو۔ پھر بھی ہم مشورہ کریں گے۔ اپنے مصاحبوں سے، اپنی سپاہ سے کہ ان کا اس بارے میں کیا مشورہ ہے۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ دشمنوں کے دوستی کے لیے بڑھائے جانے والے ہاتھ میں بھی کوئی نہ کوئی فریب ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارے پہلے فیصلے ہی کو آخری جانا جائے۔'' یہ کہہ کر پرتھوی نے دربار برخاست کر دیا اور پیغام لانے والے کو رخصت کر دیا گیا۔

اس سے اگلے روز اس بات پر سوچنے کے لیے دوبارہ دربار سجایا گیا۔ قنوج کے راجا کا پیغام سب کے سامنے تھا جس پر سب اپنے اپنے انداز میں تنقید کر رہے تھے۔

''اتنی دشمنی کے بعد قنوج کے راجا کا جشن میں شمولیت کا دعوت نامہ کسی فریب اور دھوکے کا پیش خیمہ نہ ہو۔'' ایک درباری نے بات شروع کی۔

''ہمارے راجا کا مرتبہ جے چند سے زیادہ بلند ہے۔ لہٰذا اگر مہاراج، راج سوجگ میں شرکت کے لیے جاتے ہیں تو اس کا مطلب راجا جے چند کی بالادستی، حکمرانی اور برتری کو تسلیم کرنا ہوگا جبکہ مہاراج، قنوج کے راجا سے کہیں بلند مرتبہ اور اعلیٰ منصب راجپوت ہیں۔ اس لیے جے چند کو چاہیے کہ بجائے آپ کو بلا بھیجے، وہ خود آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہو۔'' دوسرے درباری نے مشورہ دیا۔

''یہ سراسر مہاراج کو نیچا دکھانے کے لیے ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس جشن میں مہاراج کو شرکت نہیں کرنا چاہیے۔''

ان کی باتوں میں کافی وزن تھا جنھیں سن کر پرتھوی نے جذبات میں آ کر فیصلہ کرلیا کہ وہ قنوج میں ہونے والے جشن میں شریک نہ ہوگا۔ دربار برخاست کر دیا گیا۔ پرتھوی بھی اٹھ کر اپنے محل میں آ گیا مگر اب وہ ایک اور مخمصے میں پھنس چکا تھا۔

ادھر سنجگتا کا پیغام لے کر چاند باردی بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے پرتھوی کو تمام صورتِ حال سے باخبر کیا اور ساتھ ہی شہزادی کے اصرار کے بارے میں بتایا کہ پرتھوی کو ہرحال میں جشن کی تقریبات میں حصہ لینا ہوگا۔ اگر وہ ان تقریبات میں حصہ نہیں بھی لیتا تو کم از کم اسے اس وقت وہاں ضرور حاضر ہونا چاہیے جب سوئمبر کی رسم ادا ہو رہی ہو۔

اس کے لیے دونوں فیصلے اہم تھے مگر ان میں سے صرف ایک پر ہی عملدرآمد ہوسکتا تھا۔ اس نے یہی مسئلہ اپنے دوست اور ہمراز چاند باردی کے سامنے رکھا تو وہ بھی اس کی طرح سوچوں میں پڑ گیا۔

''لیکن مہاراج شاید آپ بھول گئے ہیں۔ آپ نے شہزادی کو دھوکا نہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ آپ نے ان کا ساتھ ہرحال میں دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے اور یہ راجپوتی خون و عمل دونوں کے متضاد ہے۔ اس لیے آپ جشن میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر شہزادی سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ میرا آپ کو یہی مشورہ ہے۔''

''ہوں......وقت آنے دو، کچھ سوچتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پرتھوی نے جان تو چھڑالی مگر اس کی نگاہوں میں بار بار سنجگتا کا معصوم اور پیار بھرا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ شہزادی کے ساتھ کیے گئے قول و قرار اسے کسی کل چین نہیں لینے دے رہے تھے۔

دوسری طرف قنوج کے راجا جے چند کو جب پرتھوی کا اہانت آمیز جواب ملا تو وہ بپھر گیا۔ اس نے فوراً اپنے درباریوں اور مصاحبین کو بلایا اور نئی صورتِ حال سے مطلع کیا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ پرتھوی بڑی آسانی سے جشن میں شمولیت پر آمادہ ہوجائے گا۔ اس کی اب تک پرتھوی سے کوئی براہِ راست جنگ نہ ہوئی تھی مگر اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ پرتھوی کو نیچا دکھائے۔ راج سوجگ کا جشن ایک بہترین موقع تھا کیونکہ اس جشن میں پرتھوی کی شرکت کا مطلب تھا کہ گویا اس نے جے چند کی برتری کو بغیر جنگ کے تسلیم کرلیا۔ جے چند کے اقتدار کو مان کر وہ شکست خوردہ قرار پاتا لیکن اس کے اہانت آمیز رویے اور یکسر انکار نے معاملہ ہی الٹ

کر رکھ دیا۔ وہ پرتھوی کا جواب سن کر غصے میں تلملا اٹھا۔ طیش میں آ کر اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا تاکہ دلی پر حملہ کر کے پرتھوی کو عبرتناک شکست دے بلکہ زبردستی اسے جشن میں شرکت پر مجبور کرے۔

ایسا کرنے سے نہ صرف اس کی انا کی تسکین ہو جاتی بلکہ وہ اپنی بیٹی سنجگتا کو بھی یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا کہ جس شخص کی محبت کا وہ دم بھرتی ہے، وہ اس کے باپ کے قدموں پر سرنگوں ہے اور وہ اس قابل نہیں ہے کہ قنوج کی اکلوتی راج کماری کو اس کے حرم سرا کی زینت بنا دیا جائے۔ یہ جے چند کا اپنا جذباتی فیصلہ تھا۔ ممکن تھا وہ اس پر عملدرآمد بھی کر بیٹھتا مگر جب اس نے دلی پر فوج کشی کی تجویز درباریوں کے سامنے رکھی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ ان کی دلیل تھی کہ اب جبکہ جشن بالکل قریب ہے، ایسے میں راجا کا اپنی ریاست میں نہ ہونا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ چند دنوں تک دور ونزدیک کے مہمانوں کی آمد بھی شروع ہونے والی تھی اور ایسے میں ان کے استقبال کے لیے موجود نہ ہونا آداب میزبانی کے مطابق نہ تھا۔ یہ سوچ راجے کے ارادے کو تبدیل تو کر گئی مگر اس کے من میں اٹھنے والے نفرت کے گرداب کو کم نہ کر سکی۔ راجا جے چند شروع سے ہی سازشی ذہن کا مالک تھا۔ ایک سوچ یہ بھی تھی کہ اچھا ہوا، پرتھوی نے جشن میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اس میں شریک ہوتا اور سوئمبر کی رسم کے موقع پر شہزادی سنجگتا پھولوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال دیتی جس کا قوی امکان تھا تو ہندو دھرم اور پرم پرا (روایت) کے مطابق سنجگتا کو اس کے حوالے کرنا پڑتا جو کہ اسے کسی طور پر بھی گوارا نہ تھا مگر اس کا نہ آنا بھی نقصان دہ تھا کیونکہ وہ سنجگتا کی ضد کو بھی جانتا تھا۔ بہرحال وہ خوش تھا اور اس دوسرے امکان کا حل بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

آخری عشرہ تھا 1191ء کا...... جب ریاست قنوج کے طول و عرض میں راج سو جگ کا جشن منایا جا رہا تھا۔ ملک کے ہر قریہ میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ رنگ محل کا ہر چھوٹا بڑا ملازم بھاگ بھاگ کر اپنی ذمے داریاں نبھا رہا تھا۔ اردگرد کی ریاستوں کے راجے، مہاراجے، ولی عہد اور شہزادے آنے شروع ہو گئے تھے جن کا استقبال راجا جے چند کر رہا تھا اور انہیں ان کی حیثیت کے مطابق مہمان خانے میں کمروں تک لے جانے کے لیے ایک درباری تعینات تھا جو انہیں لے جاتا اور ان کے کمروں تک پہنچا کر واپس پلٹ آتا۔

رنگ محل کے داخلی دروازے پر مہمانوں کے استقبال کے لیے ایک انوکھا طریقہ نکالا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ راجا جے چند کے درباریوں کی تجویز تھی اور کچھ کا کہنا ہے کہ یہ خالصتاً راجا جے چند کے اپنے ذہن کی اختراع تھی۔ اس نے پرتھوی راج کا ایک طلائی بت بنوایا اور بطور دربان جشن داخلی دروازے پر نصب کر دیا۔ جشن کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ ملک بھر سے آئے ہوئے مہمان خاص طور پر ولی عہد اور شہزادے دروازے پر نصب اس بت پر قہقہے لگاتے، ہنستے اور طنز و تضحیک کے کٹیلے جملے کستے ہوئے پنڈال میں داخل ہوتے۔ ایک ولی عہد نے تو ازراہ مذاق بت سے ہاتھ ملا کر ہیلو ہائے بھی کیا جس کی حرکت دیکھ کر دوسرے زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

راجا جے چند ان باتوں کو دیکھ کر اور سن سن کر خوش ہو رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ اس نے پرتھوی سے خوب انتقام لیا ہے۔ اچھے خاصے حکمران کو دربان بنا ڈالا۔

سنجگتا تو پہلے ہی پریشان تھی۔ اس کی نظریں بار بار آنے والے دروازے پر پرتھوی کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر ہر بار ناکام ہو کر رہ جاتیں۔ جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا، اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار کرناٹکی سے پوچھا بھی جو ہمہ وقت اس کے آس پاس رہتی تھی لیکن وہ بھی مایوسی سے انکار میں سر ہلا دیتی۔ ادھر چاند باردی کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے۔

''دیکھ لو کرناٹکی پرتھوی نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔'' سنجگتا نے کرناٹکی سے بظاہر گلہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو مہاراجا نے کونسا اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔ اس کا طلائی بت بنوا کر دربان کی جگہ رکھ دیا تاکہ آتے جاتے مہمان اس کا مذاق اڑا سکیں اور اس کی تذلیل کر سکیں جو کہ ہو رہی ہے۔ اب اگر پرتھوی کو اس کی بھنک پڑ جائے تو ایک قیامت ہی تو آ جائے گی۔'' کرناٹکی نے آگے سے جواب دیا۔

''پتا جی کو کون سمجھائے۔ ان کی ہر بات نرالی ہوتی ہے۔ بہرحال پرتھوی کو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ پیار ہی تو کیا تھا، کچھ مانگا تو نہ تھا۔ پیار کے بدلے پیار کی تمنا کی تھی۔'' سنجگتا نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب اسے سوئمبر رچانا تھا۔ سنجکتا کو خوب سجایا سنوارا گیا۔ منادی کرنے والے نے رنگ محل اور مہمان خانوں میں اعلان کردیا کہ کچھ ہی دیر بعد سوئمبر کی رسم ادا کی جائے گی۔

مختلف راج دھانیوں اور ریاستوں کے شہزادے اور ولی عہد بن سنور کر ایک قطار میں کھڑے ہوچکے تھے۔ سنجکتا کو پھولوں کی مالا لے کر ان کے سامنے سے گزرنا تھا۔ جو راج کمار یا شہزادہ اسے پسند آجاتا، وہ اس کے گلے میں پھولوں کی مالا پہنا دیتی۔ وہی اس کے جسم و جاں کا مالک بن جاتا۔ سنجکتا جب بن سنور کر اس جگہ پہنچی جہاں اس کے تمام امیدوار کھڑے تھے تو وہ اس کا حسن دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت پھولوں سے گندھی ہوئی بڑی سی مالا پکڑا دی گئی۔ راجا جے چند ان سب سے دور مسند پر بیٹھا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب پھولوں کی مالا اپنے ہاتھوں میں تھامے سنجکتا قدم بہ قدم راج کماروں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ادھر سنجکتا بڑے بجھے دل سے آگے بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف پرتھوی کو بھی اڑتے اڑتے اپنی تضحیک کا علم ہوچکا تھا۔ بتانے والوں نے اسے بتایا تھا کہ داخلی دروازے پر جو طلائی بت کھڑا کیا گیا اور جسے دربان کا خطاب دیا گیا ہے، اس کی شکل ہوبہو پرتھوی سے ملتی جلتی ہے۔ اکثر راجے اور مہاراجے اسے پہچانتے تھے۔ چنانچہ وہ جشن میں داخل ہوتے وقت پرتھوی راج کو اس شکل میں دیکھ کر ہنستے تھے۔

پرتھوی سے بھلا اپنی تذلیل کہاں برداشت ہوتی۔ وہ غصے میں لال پیلا ہوگیا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جے چند کو اپنے قدموں تلے روند ڈالے یا اپنے نیزے میں پرو ڈالے۔ اس کے اندر کا بہادر سورما اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ اس نے سب کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود پانچ سو سواروں کا ایک دستہ لیا اور آندھی طوفان کی طرح قنوج کی طرف بڑھا۔ خلاصۃ التواریخ کے مطابق وہ عین اس وقت وہاں پہنچا جب جشن اپنے عروج پر تھا۔ جے چند کو اس بات کا احساس تھا کہ جیسے ہی پرتھوی کو اپنی تذلیل کا علم ہوگا، وہ اس پر ضرور حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس نے پہلے سے اس طلائی بت "دربان" کی حفاظت کے لیے کچھ سپاہی بھی وہاں رکھ چھوڑے تھے۔ اسے پرتھوی راج کی آمد کا گمان تو نہ تھا۔ ہاں البتہ یہ امر خارج از امکان نہ تھا کہ اس کے بھیجے ہوئے ہرکارے کسی قسم کی شرارت یا دراندازی نہ کریں۔

شہزادی سنجکتا مایوسی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی راج کماروں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ہر راج کمار اور شہزادہ پُرامید تھا کہ سوئمبر کی مالا اسی کے گلے میں پڑے گی۔ سب دم بخود اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسرے شہزادے کے سامنے سے گزرتی۔ چند لمحے رک کر اس کے چہرے پر مسکراتے ہوئے نظر ڈالتی اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ دھڑکتے دلوں کو اپنے قدموں تلے روندتی وہ بڑے غرور کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ آخری راج کمار کے سامنے نہیں پہنچ گئی۔ اس راج کمار کو بھی یہی یقین تھا کہ مالا اسی کے گلے میں پڑے گی۔ سنجکتا کچھ دیر کے لیے اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ چند ثانیے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی ہاتھ میں مالا لیے آگے بڑھ گئی۔ راج کمار ختم ہوچکے تھے لیکن مالا بدستور سنجکتا کے ہاتھ میں تھی۔

یہ دیکھ کر جے چند کا دل دھڑک اٹھا۔ ہزاروں وسوسے ایک ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھے کہ نجانے اس کی بیٹی اب کیا حرکت کرنے والی ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سنجکتا اچانک بڑی تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی راہ میں مداخلت کرتا، اس نے ہاتھ میں پکڑی مالا پرتھوی راج کے طلائی مجسمے کے گلے میں ڈال دی۔

جے چند اضطراری حالت میں فوراً اپنی مسند سے اٹھا اور سنجکتا کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک جانب سے گھوڑے پر سوار ایک وجیہہ نوجوان بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ سنجکتا کو دبوچ کر گھوڑے پر بٹھایا اور ہوا کی طرح اڑا کر لے گیا۔ جشن میں شریک ہر شخص جے چند سمیت حیران رہ گیا۔ کوئی بھی کچھ نہ کرسکا تھا۔ حتیٰ کہ خود سنجکتا کو خبر نہ تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ نوجوان پرتھوی راج تھا جس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا اور اپنی محبت کو جیت کر لے گیا تھا۔

اس کی اس جرأت پر ہر طرف ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ افراتفری مچ گئی۔ سوئمبر کے لیے لگا ہوا میدان اجڑ کر رہ گیا اور جشن کی تمام تقاریب ختم ہو کر رہ گئیں۔

دلی پہنچ کر پرتھوی راج نے سب سے پہلے سنجکتا کے ساتھ سات پھیرے لیے اور اسے باضابطہ اپنی رانی بنالیا۔ سنجکتا پرتھوی کے اس عمل سے بہت خوش تھی۔ آج اس کے من کی مراد پوری ہوچکی تھی۔ اس کے دل میں برسوں سے

پلنے والی خواہش شرمندۂ تعبیر ہو چکی تھی۔
"دیکھ لو، ایک دربان نے اپنی حفاظتی ذمے داری کو پورا کرہی ڈالا۔" پرتھوی نے ہنستے ہوئے سنجکتا سے کہا تو اس نے بڑے پیار کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پیار سے بولی۔
"ہم نے اپنے ماضی کو جشن راج سوجگ کے پنڈال ہی میں دفن کردیا ہے۔ اسے چھیڑنے سے زندگی بدمزہ ہوگی پھر اسے حرزِ جاں کیوں بنائیں۔ اپنے حال کو خوشگوار بناتے ہیں۔"
سنجکتا کی صورت میں پرتھوی کو ایک ذہین اور باوفا عورت مل گئی تھی جسے پاکر پرتھوی راج عیش وعشرت میں کچھ ایسا مشغول ہوا کہ سلطنت کے امور اور لشکر کی ترتیب وتشکیل تک سے غافل ہوگیا۔ وہ سنجکتا کو لے کر خواب گاہ میں کئی کئی روز بند رہتا۔ اب اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوچکی تھیں۔
پہلے وہ دشمنوں کے سر قلم کرکے اور انہیں میدانِ جنگ میں شکست دے کر خوشی محسوس کرتا تھا لیکن اب وہ ہر وقت سنجکتا کی دل جوئی میں مصروف رہتا۔ وہ دن رات عیش و عشرت کی محافل جماتا۔ رقص وسرود اور لہو ولعب میں وقت گزارنے لگا تھا جو لمحے ان مشاغل سے بچتے وہ سنجکتا کی ہمراہی میں گزر جاتے۔ سنجکتا بھی ان خوشیوں کو ہر طرح سے سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈالنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔ وہ پرتھوی راج کو پاکر دنیا کو بھلا بیٹھی تھی۔ ریاستی امور پرتھوی کی عدم توجہی کے باعث بگڑنے لگے تھے مگر پرتھوی کو اب اس کی کیا پروا تھی۔

☆☆☆

راج سوجگ کے جشن میں جس طرح سے قنوج کے راجا جے چند کی جگ ہنسائی ہوئی تھی، وہ اسے نہیں بھولا تھا۔ اب وہ ہر قیمت پر پرتھوی راج سے بدلہ لینا چاہتا تھا مگر اس کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ پرتھوی سنجکتا کو پاکر ریاستی امور سے ہاتھ کھینچ بیٹھا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے حمایتی اور باج گزار ریاستوں نے بھی لگان دینے سے انکار کرڈالا تھا۔ اجمیر اور دلی کی ریاستوں کی حالت دن بدن پتلی ہوتی جارہی تھی۔
کتنے دنوں کے بعد اس کے مصاحبین اور درباریوں کے مجبور کرنے پر اس نے دربار لگایا تو ایک درباری نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔
"مہاراج! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس سورما نے بغیر کسی ہتھیار کے شیر کو مار ڈالا ہو جس نے محض 13 سال کی عمر میں گجرات کے مغرور طاقتور راجے بھیم دیو کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرڈالا ہو، آج اس قدر بے بس اور تھک کیسے گیا؟ اس کی ہمت کیسے جواب دے گئی کہ محض ایک عورت کی خاطر وہ سب تیاگ بیٹھا ہے اور اسے اپنے اردگرد کی بھی خبر نہیں رہی۔"
"کیا کوئی بری خبر ہے؟" پرتھوی نے عام سے لہجے میں پوچھا۔
"بری ایسی بری۔ آپ کو پتا ہے کہ جشن راج سوجگ میں رچائے جانے والے سوئمبر سے آپ نے جوانمردی دکھاتے ہوئے قنوج کے راجا کی بیٹی کو اٹھالیا اور اپنے محل کی زینت بنالیا ہے۔ راجا جے چند اسی روز سے بولایا پھرتا ہے اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہے جب وہ اس کا بدلہ لے سکے گا اور آپ کے اس تھکے تھکے انداز کو دیکھتے ہوئے ہماری باج گزار ریاستوں نے بھی لیت ولعل سے کام لینا شروع کردیا ہے۔ لگان اور محصولات میں کمی کی وجہ سے ریاستی امور چلانا بھی دن بدن مشکل ہوتے جارہے ہیں۔"
"اور تو اور اڑتی اڑتی خبریں یہ بھی ہیں کہ شہاب الدین نے ایک بار پھر ان ریاستوں کے راجاؤں اور مہاراجوں سے رابطہ قائم کرکے انہیں اپنے ساتھ ملالیا ہے۔ جس کی شہ پر وہ بھی شیر ہونے لگے ہیں۔ قنوج کے راجا اور آپ کے ازلی دشمن جے چند نے بھی شہاب الدین سے رابطہ قائم کرلیا ہے۔" بتانے والے نے پوری تفصیل کے ساتھ پرتھوی راج کو بتایا۔
"ہوں......" پرتھوی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔
"تو پھر آپ لوگ بھی تیاری کریں۔ واقعی مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔ بہرحال......" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔
ادھر راجا جے چند اسی وقت سے شہاب الدین کی ٹوہ میں تھا جب سے وہ شکست خوردہ ہوکر واپس پلٹ گیا تھا۔ جب راج سوجگ جشن اپنے پورے عروج پر تھا تو اس وقت راجا جے چند کو شہاب الدین کا پیغام ملا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر دہلی پر حملہ آور ہونے کی تیاری کرے۔ راجا جے چند تو خود ایسے موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ اپنے تمام پرانے بدلے اتارنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ زندگی میں ایک بار وہ پرتھوی کو شکست دے کر اس کی راجدھانی کو اپنی ریاست میں شامل کرلے۔
قنوج میں جے چند کے خلاف فتح کو سنجکتا اور پرتھوی نے زندگی کا سب سے بڑا۔۔ اور آخری معرکہ سمجھ کر خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ان کے نزدیک اب شاید جے چند پوری

زبرگی ان کی طرف نہ دیکھے لیکن انہیں اس بات کی توقع ہی نہ تھی کہ آنے والے دنوں میں کسی قسم کی کوئی مصیبت ان پر اتر سکتی ہے۔ جے چند اپنی بیٹی کے معاملے میں پرتھوی راج سے اٹھانے والی ذلت کو بھولا نہ تھا۔ ایسے میں شہاب الدین کی طرف سے کیا جانے والا رابطہ اس کے لیے بھگوان کی دین تھی۔ اس نے فوراً اس دعوت کو قبول کیا اور اس کے ساتھ مل کر 1192ء میں ایک بار پھر دلی پر حملہ آور ہوا۔ سلطنت دلی کا محافظ اپنی بری عادات میں پڑنے کے سبب کمزور ہو چکا تھا اور اپنے ماضی وحال سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

ایسے میں شہاب الدین کا لشکر منزلیں مارتا ہوا دلی کی جانب بڑی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

ادھر پرتھوی نے جب سے سنجگتا کو پایا تھا تو وہ اس کے حسن گرہ گیر کا اس قدر اسیر ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے محل کے تمام ملازموں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی اس کی اور سنجگتا کی خلوت میں دخل انداز نہ ہو اور کسی قسم کی ناخوشگوار خبر اس کی چہیتی رانی کے گوش گزار نہ کی جائے۔

شہاب الدین کے حملے پر بھی پرتھوی کے اس حکم کی پابندی کی جاتی رہی اور مصاحبین وسپاہ مملکت کا دفاع کرتے رہے مگر شہاب الدین کی افواج کو روکنا ان سے جب ممکن نہ رہا اور دلی سرنگوں ہوتا دکھائی دینے لگا تو انہیں مملکت بچانے کی فکر ہوئی۔ انہوں نے خاصی سوچ بچار کے بعد چاند باردی سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح پرتھوی کو خوابِ خرگوش سے جگا کر حالات سے آگاہ کرے۔

چاند باردی اس خبر کو سن کر خود سوچ میں پڑ گیا۔ وہ پرتھوی کا منہ چڑھا اور ہم راز تو تھا لیکن راجوں مہاراجوں کے موڈ سے بھی واقف تھا کہ انہیں بدلنے میں دیر ہی کہاں لگتی ہے اسے بھی اپنی جان پیاری تھی۔ وہ معمولی سی غلطی کر کے اسے گنوانے کے حق میں نہ تھا۔ بہرحال کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے پرتھوی کو آگہی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

محل کی سات راہداریاں عبور کر کے وہ اس وقت محل میں پہنچا جب پرتھوی آرام کر رہا تھا۔ اس نے ملازمۂ خاص سے سنجگتا سے ملنے کی خواہش کی۔ کتنی دیر تک تو خادمہ انکار کرتی رہی اور اسے مہاراج کی غصیلی طبیعت کا حوالہ دے دے کر ڈراتی رہی۔ بالآخر وہ شہزادی کو پیغام دینے پر رضامند ہو گئی۔ چاند باردی کو سنجگتا جانتی تھی اور اپنی محبت کے معاملے میں اس کی طرف داری کرنے پر اس کی شکر گزار بھی

تھی مگر اس حالت میں چاند باردی کا محل میں آنا اور اس سے ملاقات کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی افتاد آ پڑی ہو۔ یہ سوچ کر وہ جلدی سے چاند باردی سے ملنے کے لیے آ گئی۔

''مہارانی! حالات مملکت کے مصاحبین اور سپاہ کے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔ شہاب الدین کی افواج دلی کو تہ تیغ کرنے کے لیے دوڑی چلی آ رہی ہے۔ آپ کے والد محترم قنوج کے راجا جے چند بھی شہاب الدین کی حمایت میں لڑنے پر تلے بیٹھے ہیں اور شہاب الدین کی سپاہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ادھر پرتھوی آپ کے حسن کا اس قدر اسیر ہو چکا ہے کہ وہ کسی کی بات نہیں سنتا۔ مملکت کی سپاہ کی نظریں پرتھوی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ان کے لیے اب آپ ہی کا سہارا ہے۔ انہیں کیا جواب دوں؟'' چاند باردی نے اس انداز سے اپنی درخواست پیش کی کہ سنجگتا بھی پریشان ہو گئی۔

''تم فکر نہ کرو۔ پرتھوی ابھی آ کر اپنی سپاہ کے ساتھ شامل ہوں گے۔ ہم بھی یہ برداشت نہ کریں گے کہ بغیر مہاوت کے ہاتھی نکلے۔''

سنجگتا نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پرتھوی راج کو جگایا اور شہاب الدین کی بڑھتی ہوئی افواج کے بارے میں آگاہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی پریشان ہوا مگر پھر عزم نو لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سپاہ کے ساتھ ملنے کی تیاری کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑا رہا تھا کہ اس بزدل میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی۔ کیا وہ اپنی پہلی شکستوں کو بھول گیا۔''

''مہاراج! اس میں غلطی ہماری بھی ہے۔ آپ نے امورِ مملکت سے نظریں چرانی شروع کر دیں تو بھیڑیں بھی شیر ہو گئیں اور اس سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ آپ کی عدم توجہی کے سبب اردگرد کی ان ریاستوں نے جو کبھی آپ کی باج گزار تھیں سلطان کا ساتھ دیا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور تو اور میرے بھائی جی جو سلطان کے ساتھ پچھلی جنگ میں طوعاً وکرہاً آپ کے ساتھ تھے اب کھل کر سلطان کے ساتھ شامل ہیں۔ انہیں ابھی تک میرا آپ کے ساتھ شادی کرنا برداشت نہیں ہوا۔ وہ اسے اپنی تذلیل جان کر آپ کی دشمنی میں کھل کر آ چکے ہیں مگر آپ نے تو کارِ مملکت کو ایک بوجھ جان کر اپنی گردن سے اتار پھینکا تھا۔ اس لیے وہ لوگ نئے جوش اور ولولے سے سلطان کی شہ پر اس کے ساتھ مل چکے ہیں۔'' سنجگتا نے تفصیل سے بتایا۔

''ہوں...... شاید انہیں علم نہیں کہ شیر اونگھتے ہوئے بھی

شیر ہی رہتا ہے۔ تم ادھر کے معاملات دیکھو، میں نکلتا ہوں۔"
پرتھوی نے اپنے اسلحے کو ترتیب کے ساتھ اپنی وردی پر سجایا۔

"نہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" سنجگتا نے عزم سے کہا۔

"جنگ میں......" پرتھوی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ جنگ میں آپ کے کاندھے کے ساتھ دوسرا کاندھا آپ کی اس محبت کا ہوگا جس نے ہمت دی اور مجھے جینے کا حوصلہ دیا۔ آپ کے بغیر تو یہ ادھوری ہے۔" سنجگتا نے حوصلے اور جرأت سے کہا۔

"نہیں سنجگتا! پرتھوی اپنی فتح عورتوں کے ماتھے پر نہیں سجانا چاہتا۔" پرتھوی نے جواب دیا۔

"یہ اعلان ایک عورت کا نہیں، ایک محبت اور ایک عشق کا ہے۔ میں دنیا کو بتادینا چاہتی ہوں کہ سنجگتا اور پرتھوی کے جسم دو ہیں لیکن ان میں دھڑکنے والا دل ایک ہے۔ جان ایک ہے پھر یہ بھی کہ میرے والدین کو پتا چل جائے کہ سنجگتا کا عشق صادق تھا...... ہے اور رہے گا۔ میں جانتی ہوں، دوسری جانب میرے والد جنگ کرتے ہوں گے۔ اس لیے تو چاہتی ہوں کہ ان کی تلوار سے ان کی بیٹی کا سر اس حالت میں کٹے کہ انہیں احساس ہوجائے کہ ان کی بیٹی اپنی محبت میں ثابت قدم رہی ہے۔" سنجگتا نے جواب دیا۔

"سنجگتا! ایک تو تمہاری دلیلوں کے آگے میں نے ہمیشہ ہار مانی ہے۔ پتا نہیں، اتنا ذہن بھگوان نے تمہارے سر کے اندر کیوں رکھ دیا ہے۔" پرتھوی نے ہنستے ہوئے سنجگتا کے سر کو اپنی انگلی سے بجا کر کہا۔

وہ دونوں محل سے باہر آکر سپاہ سے ملے تو سپاہ کی سانسیں بحال ہوئیں۔ اس نے بڑی جلدی سے سپاہ کو ترتیب دیا اور ترائن کے میدان میں سلطان کے مقابل آگیا۔

راجا جے چند پہلے ہر جنگ میں پرتھوی راج کا حلیف ہوا کرتا تھا جس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اس کی وجہ تو یہ تھی کہ دونوں کے باپ دادا ایک تھے۔ اگرچہ بعد میں ان کی دور دراز کی رشتے داریوں کی وجہ سے اعلیٰ اور ادنیٰ کے درجات پیدا ہوگئے تھے لیکن راجا جے چند ابھی تک اس رشتے داری کی لاج نبھا رہا تھا مگر اس کی اپنی دشمنی الگ سے اس کے دل میں پل رہی جو اسے پرتھوی سے نفرت پر مجبور کرتی رہی پھر راج سوجگ جشن میں ہونے والے سانحے نے پرتھوی کے خلاف اس کی دشمنی کو اور بھی ہوا دے ڈالی تھی۔ سنجگتا کو اس طرح بھرے پنڈال سے اٹھالے جانا راجا جے چند کی توہین کے مترادف تھا۔ اس لیے وہ شہاب الدین کے ساتھ مل کر اپنی ازلی دشمنی کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا اور وہ سلطان کی صفوں میں پرتھوی کا دشمن بن کر کھڑا تھا۔ اسے قطعاً علم نہ تھا کہ پرتھوی کی جس فوج سے وہ لڑنے جارہا ہے، اس میں بھیس بدل کر خود اس کی بیٹی سنجگتا اس کی حریف بنی لڑرہی ہے۔

1191ء میں تو سلطان شہاب الدین کو پرتھوی راج نے شکست دے دی تھی مگر اب سلطان مایوس نہیں ہوا تھا بلکہ پھر سے 1192ء میں دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ساتھ اس مرتبہ ایک لاکھ بیس ہزار گھڑسوار تھے۔ اس بار بھی اس نے ترائن کے میدان ہی کو چنا تاکہ اپنی پچھلی شکست کا بدلہ چکا سکے۔ پرتھوی راج چوہان نے بھی بڑے پیمانے پر فوجی تیاریاں کیں۔

شہاب الدین نے اس بار اپنی جنگی حکمت عملی تبدیل کرلی تھی۔ اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ ایک وقت میں فوج کا صرف ایک حصہ دشمن کے ساتھ برسرپیکار ہوگا جبکہ باقی آرام کرے۔ جونہی پہلا دستہ کمزور پڑنے لگے تو دوسرا اس کی جگہ لے لے۔

پرتھوی راج کی سپاہ پہلے کی طرح بے جگری سے لڑی لیکن انہیں شہاب الدین کی نئی حکمت عملی اور نئی تکنیک کی کچھ سمجھ نہ آسکی۔ انہیں یہ سمجھ نہ آسکی کہ شہاب الدین کی تازہ دم فوج کہاں سے آتی ہے۔ چنانچہ سلطان کے یکے بعد دیگرے "تازہ دم" حملوں نے اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملادیا۔ اب شکست اسے صاف نظر آنے لگی تھی۔ پرتھوی راج نے میدان جنگ سے فرار ہونے کی پوری کوشش کی مگر پکڑا گیا!

تاریخی حوالوں میں جگہ جگہ آیا ہے کہ سلطان اور پرتھوی کے درمیان گھمسان کا معرکہ ہوا۔ اس کی زبان میں "وہ کھانڈے (تلواریں) بجے کہ دلاوروں کے خون سے زمین سرخ ہوگئی!"

خوب جنگ ہوئی جس میں کشتوں کے پشتے لگ گئے لیکن اس بار قسمت نے چوہانوں کی یاوری نہ کی۔ دلی کی سپاہ کے بے شمار جوان کام آئے۔ سنجگتا کو تو بچالیا گیا مگر پرتھوی کو شکست کے ساتھ اسیری کا صدمہ بھی سہنا پڑا۔ پرتھوی اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کرکے سلطان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اسے جیل میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ڈال دو اس سورما کو جیل میں۔ ذرا دشمنوں سے نپٹ لوں تو بعد میں ان کے بارے میں سوچوں گا۔"

چنانچہ سلطان شہاب الدین چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو زیر کرتا ہوا دلی کو بھی فتح کر کے لوٹا اور اپنے ساتھ ان قیدیوں کو بھی لے گیا۔

ایسی مصیبت میں بھی پرتھوی راج کے قابلِ اعتماد ملازم اور ہم راز دوست چاند باردی نے پرتھوی کے ساتھ اپنی وفاداری کا بھرپور ثبوت دیا۔ اس نے بھیس بدلا اور دلی سے غزنی پہنچا۔ بڑی تگ و دو کے بعد وہ سلطان کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بنیادی طور پر وہ چونکہ فنکار اور گویا تھا اس لیے جلد ہی سلطان کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ کسی طرح اپنے دوست پرتھوی کو سلطان کی اسیری سے رہائی دلائے۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت اس نے دربار میں اتنا عمل دخل بڑھالیا کہ اس کی آمدورفت زندان تک بھی شروع ہوگئی۔

سلطان شہاب الدین جنگ فتح کر کے واپس غزنی آچکا تھا اور دلی کے ساتھ ساتھ اجمیر پر قطب الدین کو حکمران بناچکا تھا۔ واپس آ کر اس نے اس جنگ کے قیدیوں پر دھیان دیا۔ پرتھوی راج کو قید سے نکال کر اس کی آنکھوں میں سرخ ہوئی گرم سلائیں پھروادی گئیں اور اسے ہمیشہ کے لیے اندھا کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ اسی طرح کے ظالمانہ سلوک دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی روا رکھے گئے۔

☆☆☆

سلطان شہاب الدین نے پرتھوی راج کی حسن پرست آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا کردیا۔ اس کا دوست اور ہم راز چاند باردی اس تک پہنچا۔ جب پہلے روز چاند باردی اس سے ملا تو اسے یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا۔ اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ ہر حال میں پرتھوی راج کو سلطان کی قید سے نکال کرلے جائے گا۔ وہ اکثر قید خانے جاتا اور موقع پا کر پرتھوی راج سے مختلف منصوبوں پر تبادلہ خیال کرتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر اس نے پرتھوی راج سے کہا۔

''مہاراج! میں ایک منصوبہ بنارہا ہوں کہ آپ کو اس قید سے چھڑالے جاؤں۔''

''کیا کروں گا میرے دوست۔ آنکھوں کے دیے بجھ چکے ہیں۔ اب زندگی ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔ کیا فائدہ ہوگا۔ کیسا بے چراغ چہرہ لے کر سنجوگتا کے پاس جاؤں گا۔ یہ تو بھلا ہوا کہ وہ سلطان کی قید میں نہیں آئی۔ ورنہ اس کا کیا حشر ہوتا، یہ سوچ سوچ کر خوف آتا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ سلطان مجھے ہمیشہ کے لیے ختم کردیتا۔'' پرتھوی راج نے مایوس اور اداس لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے افسوس ہورہا ہے نہ ایک بہادر شخص اس قدر مایوسی کی باتیں کررہا ہے۔ کہانی یہیں ختم تو نہیں ہوتی۔ آپ کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ جنگیں جیتی بھی جاتی ہیں اور ہاری بھی جاتی ہیں مگر یوں ہمت ہارنا بزدلی کی علامت ہے جو کم از کم پرتھوی راج کو زیب نہیں دیتی۔'' چاند باردی نے اس کی ہمت بندھائی تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

''کہو، میں اندھا کیا کرسکتا ہوں؟'' اس نے دوبارہ سے پوچھا۔

''آپ مجھے میرے منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت دے دیں۔ باقی کام میرا ہے!'' چاند باردی بولا۔

پھر اس نے دھیرے دھیرے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانا شروع کردیا۔ جب وہ اپنی بات ختم کرچکا تو پرتھوی راج نے نہ صرف اس کے منصوبے کی تعریف کی بلکہ اس کے ساتھ مکمل تعاون کا یقین بھی دلایا۔ دونوں نے مل کر اس پر عملدرآمد کرنے کا نہ صرف فیصلہ کرلیا بلکہ چاند باردی نے اس سے کہا۔

''مہاراج! میں آج سے اس منصوبے پر عمل کررہا ہوں۔ بہت جلد میں اس کے دن اور وقت کا تعین کر کے آپ کو بتادوں گا۔''

''میں بڑی شدت کے ساتھ تمہاری کامیابی کی دعا کروں گا۔'' پرتھوی راج نے جواب دیا۔

پھر چاند باردی نے ایک روز سلطان شہاب الدین پر ایک نیا انکشاف کیا۔

''جہاں پناہ! کیا آپ کو علم ہے کہ کوئی آپ کی آواز سن کر آپ کو نشانہ بناسکتا ہے۔''

سلطان کے لیے یہ نیا انکشاف تھا۔ اس نے چاند باردی کی بات سن کر حیرت سے کہا۔

''نہ تو میں نے آج تک کسی ایسے نشانہ باز کے متعلق پڑھا ہے اور نہ ہی اسے دیکھا ہے۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص آپ کی آواز سن کر آپ کو نشانہ بنا سکے؟''

''ایسا ممکن ہے جہاں پناہ! بالکل ممکن ہے بلکہ میں ایسے شخص سے آپ کی ملاقات بھی کرواسکتا ہوں اور آپ اس کے ہنر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔'' چاند باردی نے جواب دیا۔

''کون ہے وہ ایسا تیرانداز؟'' سلطان نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ شخص آپ کی قید میں ہے اور اس کا نام پرتھوی راج ہے۔" چاند باردی نے مزید تجسس کو ابھارتے ہوئے بتایا۔

"کیا واقعی ایسا ہے؟ پھر تو ہم کسی روز اس کا یہ ہنر بھی دیکھیں گے۔ دیکھتے ہیں وہ اندھا ہو کر محض آواز پر کیسے کسی کو نشانہ بنا پاتا ہے۔"

"جی ضرور! آپ دن اور وقت کا تعین فرمالیں۔ مجھے اجازت دیں تو میں اس سے بھی بات کرلوں۔"

"ہوں......ضرور کرنا لیکن میں ابھی تک اس بات سے حیران ہوں کہ وہ آواز کی سمت کا تعین کرکے کیسے کسی کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ کیا وہ میری آواز پر میرا بھی نشانہ لے سکتا ہے؟"

سلطان نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ خود اس روز اس کا اندازہ کرلیں۔ مجھے اس کے اس ہنر کا علم تھا تو میں نے ضروری جانا کہ آپ کو بھی اس کی تیر اندازی کا یہ ہنر دکھاؤں۔" چاند باردی نے کہا اور پھر سلطان سے اجازت لے کر پرتھوی راج کے زندان میں آپہنچا۔

"لیجیے مہاراج! اب آپ کے ہنر کو آزمانے کا موقع آگیا ہے۔ میں نے سلطان کے تجسس کو اس قدر بھڑکا دیا ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھنے کو نہ صرف تیار ہوگیا بلکہ آپ کا یہ ہنر خود اپنے آپ پر آزمانے کی اس نے اجازت بھی دے دی ہے۔ میں سلطان کے ساتھ دور کھڑا باتیں کروں گا۔ آپ میری آواز تو پہچانتے ہیں۔ آپ سلطان کی آواز سن کر اس پر نشانہ آزمائیں گے۔ اگر سلطان آپ کے تیر سے مرگیا تو پھر آپ کو اس قید سے نکالنا بہت آسان ہوگا۔ بس بھگوان کرے اس روز آپ کا نشانہ کہیں خطا نہ جائے۔" چاند باردی نے پرتھوی راج کو سمجھایا۔

"آج تک زندگی میں آنکھیں بند کرکے میں نے جو بھی نشانہ بنایا وہ کبھی خطا نہیں ہوا۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" پرتھوی راج نے بے بسی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

پھر مقررہ دن اور تاریخ کو سلطان شہاب الدین اپنے مصاحبین اور درباریوں کے ساتھ ایک میدان میں اپنی مخصوص نشست پر آبیٹھا۔ چاند باردی اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا۔ اس سے دور سلطان کے ساتھی اور مصاحبین بیٹھے اور کھڑے تھے۔ سپاہ کا ایک اسلحہ بند دستہ بھی قریب کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر تیار کھڑا تھا۔ جب سارے انتظامات ہوچکے تو پرتھوی راج کو جیل سے نکال لانے کا حکم سلطان نے ایک درباری کو دیا۔

درباری فوراً گیا اور جیل سے پرتھوی راج کو نکال کر لے آیا۔ درباری اور مصاحبین اس انوکھے تماشے کو دیکھنے کے منتظر تھے اور آپس میں اونچی آواز سے چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ پرتھوی راج کو لاکر ایک فاصلے پر کھڑا کردیا گیا پھر سلطان کے کہنے پر ان سب نے اپنی گفتگو بند کردی۔ اس کے دوسرے اشارے پر اس درباری نے تیر کمان پرتھوی راج کو پکڑادی۔ اب صرف ایک بار چاند باردی نے سلطان کو مخاطب کرکے گفتگو کا آغاز کیا۔

سلطان نے اس کی بات کا جواب دیا لیکن اس کی نظریں پرتھوی راج پر لگی ہوئی تھیں۔ سلطان نے جونہی چاند باردی کی بات کا جواب دیا، ایک سنسناتا ہوا تیر کمان سے نکلا اور اڑتا ہوا سلطان کی جانب آیا۔ سلطان کی نظریں اگر پرتھوی راج پر نہ ہوتیں تو ممکن تھا، یہ تیر اس کے جسم میں پیوست ہوجاتا اور سلطان وہیں موت کے منہ میں چلا جاتا۔ جیسا کہ بعض تواریخ میں درج ہے کہ تیر سلطان کے سینے میں لگا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ سلطان کے گرتے ہی محافظوں نے پرتھوی راج اور چاند باردی کو ماردیا۔ جب پرتھوی راج غزنی کی قید میں مارا گیا اور اس کی لاش جلانے کے لیے شمشان گھاٹ لے جائی گئی تو اس کی ارتھی کے پیچھے پیچھے ایک عورت سفید لباس پہنے، پورے سنگار اور بناؤ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ننگے قدموں کے ساتھ چلی جارہی تھی پھر جب اس کی لاش کو آگ دکھائی گئی اور آتش پوری طرح بھڑکنے لگی تو اس خوبصورت ـــ جوان عورت نے فرطِ جذبات میں انتہائی خاموشی لیکن تیزی کے ساتھ اس آگ میں چھلانگ لگادی اور لاش کے ساتھ ہی ستی ہوگئی۔ یہ جوان عورت سنجکتا تھی جو اپنے دربان کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

ماخذات

1۔ تاریخ ہند۔ ای مارسڈن (اردو ترجمہ)۔ 2۔ خلاصۃ التواریخ۔ سبحان رائے بٹالوی۔ 3۔ تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)۔ 4۔ پنجاب کی ذاتیں۔ سر ڈینزل ابٹسن (اردو ترجمہ)۔ 5۔ چہار باغ پنجاب۔ منشی گنیش داس وڈیرا

اعلیٰ ظرف

منظر امام

اعلیٰ ظرفی ہر ایک کا چلن نہیں ہوسکتی... لیکن جس کے اخلاق میں شامل ہوجائے اسے انسانیت کی معراج پر پہنچادیتی ہے۔ جو اس کے در پر دل کی مراد بر لانے کے لیے پہنچا تھا... اپنی اعلیٰ ظرفی کے ہاتھوں اسے خالی دامن لوٹنا پڑا لیکن دل میں ڈھیروں اطمینان بھی اتر آیا کہ یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

محبت کی تشنگی اور دست برداری کی انوکھی مثال

رات کا وقت تھا۔ دسمبر کی سرد رات تھی۔ ہوائیں بولائے بولائے پھر رہی تھیں۔ کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ہوائیں دیواروں سے سرایت کرتی ہوئی کمرے میں چلی آرہی ہوں۔

اس بڑے سے کمرے میں الیکٹرک ہیٹر جل رہا تھا جس سے کچھ فاصلے پر کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب ان ہی کرسیوں پر بیٹھے شدید سردی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ملازم ابھی ابھی کافی بنا کر دے گیا تھا۔

وہ سب ایک ہی خاندان کے لوگ تھے۔ ان میں سے ایک اس گھر کا مالک تھا محتشم اور اس کی بیوی زرینہ۔ یہ دونوں ادھیڑ عمری کے دور سے گزر رہے تھے۔ ایک ان کی بیٹی تھی جویریہ، جو شہر سے چھٹیاں گزارنے ماں باپ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک دوسرا آدمی احتشام بھی تھا جو محتشم کا چھوٹا بھائی تھا لیکن وہ بھی چالیس کے لگ بھگ ہو چکا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کے برعکس اس کے چہرے کے نقوش بہت سخت تھے۔ ایک عجیب قسم کی کرختگی تھی۔ ایک اور نوجوان تھا ارشد۔ وہ اور جویریہ شہر میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ جویریہ اس کو پسند کرتی تھی۔ ارشد ایک اچھے خاندان کا معقول نوجوان تھا۔

جویریہ نے اپنے باپ کو لکھا تھا۔ ''ڈیڈ! میں یہ چاہتی ہوں کہ ایک نظر ارشد کو دیکھ لیں اس سے مل لیں۔ اگر وہ آپ کی سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ میں وہی کروں گی جو آپ لوگوں کی خواہش ہوگی۔ ارشد بھی ہمارے علاقے کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو وہ میرے ساتھ آجائے۔''

محتشم نے زرینہ سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لڑکے کو تو دیکھنا ہی ہوگا۔ بلا لیا جائے۔ ویسے بھی یہ لوگ کھلے دل و دماغ کے لوگ تھے۔ محتشم ایک سرکاری آفیسر رہ چکا تھا۔ ایک بڑا بیوروکریٹ۔ اپنی سروس کے دنوں میں اس کی ایمانداری اور اصول پسندی پورے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھی۔

یہ بنگلا اور اس کے آس پاس کی زمینیں اس کے باپ کی وراثت میں اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو ایک جیسے مواقع دیے تھے۔ ایک جیسا حصہ...... لیکن احتشام نے ساری دولت ادھر ادھر اڑادی تھی۔ جبکہ محتشم نے اپنی حکمتِ عملی سے اس میں اضافہ ہی کیا تھا۔

اس کے باوجود بھی احتشام کے پاس شہر میں کچھ دکانیں اور فلیٹس تھے جن کے کرائے آجایا کرتے اور اس کی بھی زندگی بس ٹھیک ہی گزر رہی تھی۔

جویریہ جب ارشد کے ساتھ پہنچی تو یہ نوجوان پہلی نگاہ میں دونوں کو پسند آگیا تھا۔ وہ ایک مہذب انسان تھا۔ کمپرڈ۔ محتشم کی تجربہ کار نگاہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ نوجوان آگے جاکر ایک بڑا آفیسر بن سکتا ہے۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت شاندار تھا۔

دو چار دنوں میں ہی ارشد ان لوگوں کے ساتھ اتنا گھل مل گیا تھا جیسے وہ اسی خاندان کا فرد ہو اور برسوں سے ساتھ رہتا چلا آیا ہو۔

اسی دوران احتشام بھی کچھ دنوں کے لیے وہاں چلا آیا تھا۔ اسے بھی ارشد پسند آگیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ اسے ارشد اور جویریہ کا یہ رشتہ اچھا نہیں لگا ہے۔ لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس رات وہ سب سردی کا لطف اٹھانے کے لیے بڑے کمرے میں ہیٹر کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت محتشم نے اپنی زندگی کے قصے سنانے شروع کردیے تھے۔ یہ اس زمانے کے قصے تھے جب وہ ملازمت پر تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ کیسے کیسے لوگ اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ کیسے کیسے واقعات ہوتے رہے تھے۔

سب اس کی باتیں دلچسپی سے سن کر ہنستے رہے تھے۔ اس کا انداز بیان بھی بہت اچھا تھا۔

''ارشد میاں۔'' زرینہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ جگہ تمہیں کیسی لگی؟''

''بہت خوبصورت اور بہت مختلف۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں فطرت اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں جو کچھ ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہاں آکر روح میں ایک تازگی سی آگئی ہے۔ اس کے علاوہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''رک کیوں گئے؟ اس کے علاوہ کیا؟''

''انکل۔'' اس نے جویریہ کی طرف دیکھا۔ ''اس کے علاوہ یہاں میرے سپنے بھی پورے ہونے والے ہیں۔''

محتشم اور زرینہ دونوں مسکرا دیے تھے۔ ارشد کا اشارہ جویریہ کی طرف تھا۔

''اچھا کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔'' محتشم نے کہا۔ ''ہم نے ابھی تک صرف تمہیں دیکھا ہے اور تم ہی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرلیا کہ جویریہ کا انتخاب بہت بہتر ہے لیکن ابھی تک ہمیں تمہارے گھر والوں اور بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''مجھے اسی لمحے کا خوف تھا انکل۔'' اس نے کہا۔ ''کہ مجھ سے میرا بیک گراؤنڈ پوچھا جائے گا جو ابھی تک جویریہ کو بھی نہیں معلوم۔''

جویریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ محتشم بھی کچھ الجھا ہوا دکھائی دینے لگا۔ ''کیا تمہارا بیک گراؤنڈ اتنا بھیانک ہے کہ تم اس کو بتاتے ہوئے پریشان ہو رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

’’نہیں انکل، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ ارشد نے کہا۔’’بات صرف اتنی ہے کہ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ میرے ابا خالد ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے لیکن ان کو کسی وجہ سے نوکری چھوڑنی پڑی تھی۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں اس وقت کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہمارے پاس زندگی گزارنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ صرف ابا کی آمدنی تھی۔ وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ گھر بھی کرائے کا تھا۔ ایسی صورت میں اندازہ لگالیں کہ ہم پر کیا گزر رہی ہوگی۔‘‘

’’ہاں مجھے احساس ہے لیکن کیا یہ ایسی بات ہے جس کے لیے تم اپنے ماضی کو اندھیروں میں رکھو؟‘‘

’’نہیں انکل! بات کچھ اور بھی ہے۔‘‘ اس نے جویریہ کی طرف دیکھا۔’’معاف کرنا جویریہ۔ میں نے پہلے یہ سب تمہیں نہیں بتایا تھا کیونکہ اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اس وقت بتانا پڑ رہا ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ جویریہ صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

’’انکل! بات یہ ہے کہ میں والد صاحب کی نوکری ختم ہو جانے کے بعد بری طرح ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ گھر میں بہن بھائیوں اور والدین کا ساتھ تھا اور انکم کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو ایسے کاموں میں جھونک دیا جو عام حالات میں کبھی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ میں نے ایک معمولی سے ہوٹل میں بیرے کا کام شروع کر دیا۔ گاہکوں کے سامنے کھانا رکھتا۔ ان کی الٹی سیدھی باتیں سنتا۔ ان کے جھوٹے برتن اٹھا کر لے جاتا لیکن میں یہ کام شام کے وقت کرتا تھا پارٹ ٹائم کے طور پر۔ جبکہ دن میں اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔‘‘

’’تم یہ کہانی سنا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟‘‘ احتشام نے درمیان میں ہی پوچھ لیا۔’’اگر تمہارا بیک گراؤنڈ اچھا ہوتا تو خاندان والے کبھی تمہیں ایسا کام نہیں کرنے دیتے۔‘‘

’’انکل میں نے کبھی خاندان والوں سے مدد نہیں مانگی۔ میں حلال روزی کمار ہا تھا۔ میرے لیے یہی بہت تھا۔‘‘

’’بھائی۔‘‘ محتشم نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ ’’اس نے اپنے بارے میں سچائی کے ساتھ جو کچھ بھی بتایا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اس کی بڑائی ہے کہ اس نے ایسے حالات میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور آج ایک اچھے مقام پر ہے۔ اسی قسم کے نوجوان اپنے اندر اسپارک رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ بن کر دکھا دیتے ہیں۔‘‘

احتشام کا منہ بن گیا۔ شاید اسے ارشد کی ایسی طرف داری اچھی نہیں لگی تھی۔

’’چلو میاں ختم کرو۔‘‘ محتشم نے کہا۔’’مجھے تمہارے ماضی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں ذرا دوسرے مزاج کا انسان ہوں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے اس وقت جو بیٹھا ہے، وہ آج کیسا ہے۔‘‘

’’بس تم اسی بات سے گھبرا رہے تھے؟‘‘ جویریہ نے پوچھا۔

’’نہیں جویریہ، ایک اور بات بھی ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس بات کو کبھی ظاہر نہیں کروں اور کسی کو پتا بھی نہیں چل سکتا لیکن یہ میرا مزاج نہیں ہے۔ انکل اور آنٹی اتنے اچھے ہیں کہ انہیں اندھیرے میں رکھ کر تمہیں نہیں اپنا سکتا۔ انکل...‘‘ اس نے محتشم کی طرف دیکھا۔’’میری پرورش خیرات کے پیسوں سے ہوئی ہے۔‘‘

سب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ احتشام کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ جویریہ سن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب تک سب ٹھیک تھا۔ ارشد کا معمولی کام کرنا۔ گھر میں فاقوں کا ہونا۔ گھر والوں کی پریشانی۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن یہ

خیرات کے پیسوں سے پرورش اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

جبکہ خود اس کے والدین ایک شاندار بیک گراؤنڈ رکھتے تھے۔ اس کے خاندان کے زیادہ تر لوگ اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں۔ دو تو سفیر تھے۔ ایک تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ جج تو نہ جانے کتنے تھے اور اس بیک گراؤنڈ رکھنے والی کا امیدوار یہ بتا رہا تھا کہ اس کی پرورش خیرات کے پیسوں سے ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو بھی تھا اس کا ماضی تھا۔ اس نے بہت بُرے حالات میں خیرات کو قبول کیا ہوگا۔ اس کے باوجود یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر فخر کیا جاسکے۔

"اور یہ خیرات کس ادارے سے آتی تھی؟" احتشام نے پوچھا۔

"کسی ادارے سے نہیں بلکہ کوئی اللہ کے نیک بندے تھے جنہوں نے خود کو میرے والد کا دوست ظاہر کیا تھا۔ وہ ہر ماہ ہمیں ایک معقول رقم بھیج دیا کرتے اور اس سے ہمارا گزارہ ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ان کا پتا چلانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا نام تک نہیں معلوم ہو سکا۔ انہوں نے فون پر کہا تھا کہ وہ میرے والد کے دوست ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ماہانہ بھیجنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک میں کسی پوزیشن پر نہ پہنچ گیا۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے۔" احتشام نے کہا۔ اس نے محتشم کی طرف دیکھا۔ "بھائی اس دور میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اب کوئی کسی کی اس طرح مدد نہیں کرتا۔ وہ بھی بغیر کسی سبب کے۔ بغیر کسی فائدے کے اور مدد بھی اس طرح کہ گمنام رہا جائے۔ سامنے نہ آیا جائے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس نے جو گمنام فرشتے کی کہانی سنائی ہے، وہ جھوٹی ہے۔ اصل بات یہ ہوگی کہ اس کی مدد کسی خیراتی ادارے نے کی ہوگی اور یہ کسی گمنام فرشتے کا نام لے رہا ہے۔"

"محترم!" ارشد نے اس کو مخاطب کیا۔ "ایک بات بتائیں۔ اگر میں یہ بات نہیں بتاتا تو کیا آپ کو یہ معلوم ہوسکتا تھا؟ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ کیا مجھے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کا شوق ہے جو میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہا ہوں؟"

"میں یہ تو نہیں جانتا کہ تمہیں شوق ہے یا نہیں لیکن تم جو کچھ بتا رہے ہو، وہ ہو نہیں سکتا۔"

"ہوسکتا ہے احتشام ہوسکتا ہے اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔" محتشم نے کہا۔

"آپ کس طرح جانتے ہیں؟"

"اس لیے کہ ان کے والد جس محکمے میں کام کرتے تھے، اس کا سربراہ میں ہی تھا۔" محتشم نے بتایا۔

"کیا؟" ارشد نے حیران ہو کر محتشم کی طرف دیکھا۔ "یعنی میرے والد صاحب کی بربادی میں آپ کا ہاتھ تھا۔"

"ہاں بیٹے ایسا ہی سمجھو لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں پیروں پر کھڑا کرنے کا فرض بھی میں نے ہی انجام دیا تھا۔" محتشم نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ گمنام شخص جو تمہاری اور تمہارے خاندان کی مدد کرتا رہا تھا وہ میں ہی تھا۔"

اب ایک سناٹا تھا۔ بے نام سا سناٹا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اب کیا کہوں۔" ارشد نے کہا۔

"بیٹا تم نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں کہاں اسٹینڈ کر رہا ہوں۔ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں اس شخص سے انتقام لوں گا جس نے میرے باپ کو تباہ کیا تھا لیکن اب میں بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔ آپ ایک طرف میرے دشمن بھی ہیں اور دوسری طرف میرے محسن بھی ہیں۔"

"اب ایک بات اور سن لو۔" محتشم نے کہا۔ "تم مجھے بہت پسند آئے ہو۔ تم میں ایک اسپارک ہے جو بہت کم نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ ایمانداری کا اسپارک۔ سچائی کا اسپارک لیکن بیٹا زمینی حقائق کچھ اور ہی ہوتے ہیں اور وہ حقائق یہ ہیں کہ انسانی نفسیات بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس کی یادداشت ایسے موقع پر ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی ہے۔

"اگر جویریہ سے تمہاری شادی بھی ہو گئی تو اس کے باوجود یہ خلش تمہارے یا جویریہ کے دل میں رہے گی۔ تم کو اس بات کا دکھ ہوگا کہ جویریہ کے باپ نے تمہارے باپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور جویریہ کو اس بات کا احساس رہے گا کہ اس کے باپ نے تمہاری پرورش کی تھی۔ اسی لیے یہ شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ تم دونوں ساری زندگی الجھے رہو گے۔ بہتر یہی ہے کہ اس کہانی کو یہیں ختم کردیا جائے۔"

ارشد نے اپنی گردن جھکالی۔ باہر سردی اچانک بڑھ گئی تھی اور کمرے میں جلتا ہوا آتش دان بھڑکنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ میٹھے زہر سے شکار کرنے والی ایک حسینہ کی چالاکی

انتقام ایک ایسا جذبہ... جو دھیرے دھیرے پہلے انسان کے اندر جال بُنتا ہے پھر اس کی لپیٹ میں وہ اپنے ہدف کو لینے کی کوشش کرتا ہے۔اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا... جس نے بچپن میں اسے احساسِ محرومی کے جنگل میں دھکیلا رفتہ رفتہ اس نے رسوائی کا طوق اسی کی گردن میں ڈال دیا اور بالآخر وہ اپنی سازشوں میں کامیاب ہوگئی۔

سازش

تنویر ریاض

وہ اس کیس کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ ایموتی ٹیلر بھی دوسرے اراکین جیوری کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ ان کی تعداد کل بارہ تھی اور ان میں سے بیشتر بزرگ شہری تھے جن کے لیے اس جیوری میں شامل ہونا ایک دلچسپ مشغلہ تھا تاکہ زندگی کی یکسانیت میں کچھ تبدیلی آسکے۔ وہ کمرا بلکہ پوری عمارت اس کی توقع کے مطابق نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے کی اونچی دیواروں پر وارنش کی ہوئی لکڑی کے تختے لگے ہوں گے۔ اونچی چھت

اور دیواروں پر پُرشکوہ پہاڑیوں کی تصاویر آویزاں ہوں گی یا پھر کم از کم انصاف کی دیوی کا مجسمہ ضرور نصب ہوگا جو انصاف کا ترازو پکڑے وہاں آنے والوں کو منصفانہ سماعت کا یقین دلا رہی ہوگی۔ جیسا کہ ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اس نے دیکھا کہ کمرے کی چھت انتہائی نیچی اور بوسیدہ تھی۔ دیواروں پر لگے ہوئے تختے دیکھ کر ستر کی دہائی کے کسی سٹ کام کے سیٹ کا گمان ہوتا تھا اور کرسیاں گرد آلود تھیں۔

جب بیلف انہیں ہدایات دینے کے بعد چلا گیا تو سات نمبر والے شخص نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اپنے ترجمان کا انتخاب کرلینا چاہیے جو اس جیوری کی کارروائی کو آگے بڑھائے۔“

سب لوگوں نے اپنی کرسیاں میز کے نزدیک کرلیں۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے سب لوگ اپنا تعارف کروادیں۔“ سات نمبر نے کہا۔ اس نے خود ہی ترجمان کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کے بائیں جانب سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ سب لوگوں نے باری باری اپنے نام، ملازمت یا کاروبار، شادی شدہ زندگی اور تعلقات کے بارے میں مختصر تعارف پیش کیا، ماسوائے نمبر ایک کے جس نے صرف یہ بتانے میں چار منٹ لگادیے کہ اس کے پاس سات بلیاں ہیں۔ وہ کیوں اور کیسے یہاں آئی۔ اس کا پہلا شوہر، دوسرا شوہر...... مجبوراً نمبر سات کو اسے ٹوکنا پڑا، تب وہ خاموش ہوئی۔

ایمونی کو ان کے نام، پیشے اور ذاتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انہیں ان کے نمبر سے جانتی تھی اور یہی اس کے لیے کافی تھا۔ وہ اس کے دوست نہیں تھے اور نہ ہی وہ انہیں دوست بنانا چاہتی تھی۔ وہ اس جیوری میں شامل ہونے کو اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک مقصد کے تحت یہاں آئی ہے۔ جج نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ بحث مباحثہ کرنے سے پہلے کوئی رائے قائم نہ کریں لیکن وہ پہلے ہی اپنا ذہن بنا چکی تھی۔

”نمبر آٹھ......“ نمبر سات نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا نام ایمونی ٹیلر ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں اور ایک انٹرنیٹ کمپنی میں سافٹ ویئر ڈیولپر کے طور پر کام کرتی ہوں۔“

جب وہ اپنا تعارف کرواچکی تو سات نمبر نے کہا کہ سب ایک کاغذ پر اپنا ابتدائی فیصلہ لکھیں اور اسے تہ کرکے اس کے حوالے کردیں گو کہ کوئی رسمی انتخاب نہیں ہوا لیکن وہ حقیقت میں ترجمان لگ رہا تھا۔ ساری پرچیاں جمع ہونے کے بعد اس نے دونوں کی گنتی کی۔ آٹھ لوگوں نے ملزمہ کو بے قصور ٹھہرایا تھا۔ تین کوئی فیصلہ نہیں کرپائے تھے جبکہ ایک رکن کی نظر میں ملزمہ قصوروار تھی اور اس رکن کے بارے میں صرف ایمونی ہی جانتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جن لوگوں نے اسے بے قصور سمجھا ہے، ان پر اسے کافی کام کرنا ہوگا۔ لہٰذا اسے پہلے ان لوگوں سے شروع کرنا چاہیے جنہیں اس بارے میں پورا یقین نہیں ہے۔ اگر وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی تو اس کے ساتھ اور آوازیں بھی شامل ہوجائیں گی۔

پہلے روز انہیں زیادہ بحث کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ تعارف اور رسمی کارروائی میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ جب بیلف نے کہا کہ جیوری کے اراکین جاسکتے ہیں تو وہ ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔

ایمونی جانتی تھی کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اسے پورے عزم کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیوری کے دوسرے اراکین کو اپنا ہم خیال بناسکے گی یا نہیں لیکن اسے ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ گھر پہنچ کر اس نے غسل کیا اور ڈنر کرنے کے بعد سوگئی۔

دوسرے دن وہ عدالت پہنچی ہی تھی کہ ایک آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ نمبر دو تھا۔ ”تم نمبر آٹھ ہو نا؟“

وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ لاٹ سے عدالت کی عمارت تک آئے۔ ایمونی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ بولو کیا بات ہے؟“

”ہم دونوں ایک ہی جیوری میں ہیں۔ سیرینا ہیوبٹ کیس کے سلسلے میں۔“

ایمونی پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں نمبر آٹھ اور تم......؟“

”میں نمبر دو ہوں۔ ہیرس کوسلوسکی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ وہ نمبر دو ہے۔ اگر اس کا نام یاد نہ رہا تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اب اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ ملزمہ کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔

”کیا یہ تمہارا پہلا مقدمہ ہے؟“ اسے یہ سوال کچھ احمقانہ لگا جیسے وہ پہلی بار ڈیٹ پر آئی ہو اور پوچھ رہی ہو کہ تمہارا ستارہ کون سا ہے اور تم کس قسم کی موسیقی پسند کرتے ہو؟

''نہیں۔ میں اس سے پہلے بھی تین مرتبہ جیوری کے رکن کے طور پر کام کر چکا ہوں۔''
''یعنی تم پیشہ ور جیورر ہو۔''
وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میرا اندازہ تھا کہ تم بھی کہو گی۔ اس کیس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''
''ہمیں اس پر قیاس آرائی نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ بھولپن سے بولی تاکہ اسے پہل کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ بھی اس کے منصوبے کا حصہ تھا۔
''کوئی بھی اس جانب توجہ نہیں دے رہا۔'' وہ آواز نیچی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ استغاثہ نے الزام ثابت کر دیا ہے اور دوسری جانب وکیلِ صفائی بھی کوئی معقول وجہ نہیں پیش کر سکا۔''
''گویا تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔'' وہ بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ پولیس نے سیرینا بیسیٹ کو جائے وقوعہ سے چند بلاک کے فاصلے پر کیوں روکا؟ اور اس کے پاس اس علاقے میں موجود رہنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔''
''ایسا لگتا تو نہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو؟'' کوسلوسکی نے کہا۔
''میں نہیں جانتی البتہ میں صحیح فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ قصوروار نہیں تو اسے مجرم قرار دینا نہیں چاہتی لیکن اگر وہ مجرم ہے تو اسے معاف بھی نہیں کیا جا سکتا اور وہ بہت تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہی تھی۔ کیا یہ مجرم ہونے کی نشانی نہیں؟''
''اس علاقے میں سب لوگ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔
ایسوئی نے اپنی رائے محفوظ رکھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''دوسرے اراکین بھی آ رہے ہیں۔ ہمیں اندر چلنا چاہیے۔''
''کیا تم میرے ساتھ لنچ کرو گی؟''
''یقیناً۔'' اس نے کہا۔ وہ اس کے یا جیوری کے کسی بھی رکن کے ساتھ لنچ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ کر بھی سکتی تھی، اگر اس کا کوئی فائدہ ہوتا۔ کیا وہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا؟ اسے اب بھی یہ بڑا عجیب لگتا اگر کوئی مرد اس کی جانب متوجہ ہونے لگتا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور اسے بوبی بریٹ یاد آنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مشابہت بہت خفیف سی تھی۔
وہ جیوری کے کمرے میں پہنچے۔ تمام اراکینِ جیوری وہاں موجود تھے۔ نمبر سات نے میٹنگ کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آج ہم واقعی اس مسئلے پر مزید غور کر سکیں گے۔''
کسی نے کچھ نہیں کہا۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
''کیا کسی نے گزشتہ شب اپنا ذہن تبدیل کیا؟'' نمبر سات نے کہا لیکن کسی نے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا۔
''پہلے ہمیں تحریری ریکارڈ دیکھنا چاہیے۔'' نمبر پانچ نے کھڑے ہو کر کہا۔ وہ ایک درمیانے قد اور جسامت کی ہسپانوی عورت تھی اور ایک بینک میں کام کرتی تھی۔ شاید اسی لیے یہ بات کر رہی تھی۔
''ہمیں اس بارے میں بحث کرنی چاہیے۔'' نمبر نو نے کہا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، سفید بالوں والا شخص تھا جو پوسٹ آفس سے ریٹائر ہوا تھا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ ہمیں سب لوگوں کی رائے کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔''
''ایک رکن نے اسے قصوروار اور تین نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا، اگر وہ تینوں اسے بے قصور قرار دیتے ہیں تو ہم اطمینان سے گھر جا کر سو جائیں گے۔'' نمبر گیارہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ جب وہ بول رہا تھا تو اس کی نظریں ایسوئی پر تھیں۔ کیا وہ جانتا تھا کہ اس نے ملزمہ کو قصوروار قرار دیا ہے...... لیکن کیسے؟ اس نے اسے پہلی ہی نظر میں ناپسند کر دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے دیکھ کر کوئی ایسا شخص یاد آ گیا جس کا اس کے ماضی سے تعلق تھا۔
''میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی مناسب طریقہ ہے۔'' نمبر بارہ نے کہا۔ یوں لگا جیسے اسے نمبر گیارہ کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے اس نے حال ہی میں فوجی وردی اتار کر شہری زندگی میں قدم رکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ویسی ہی سختی تھی۔
''ہمیں صرف باتیں نہیں بلکہ اس کیس پر بحث کرنی چاہیے۔''
''کیا یہ بحث نہیں ہو رہی؟'' نمبر گیارہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
''تم جانتے ہو، میرا کیا مطلب ہے۔'' نمبر بارہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
''میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اگلے ہفتے یہاں نہیں آنا چاہتا۔ ہمیں کوئی فیصلہ کر کے اس کیس کو ختم کر دینا چاہیے۔'' نمبر گیارہ نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
دن کا بقیہ حصہ اسی طرح گزر گیا۔ نمبر گیارہ اور نمبر بارہ آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے سے الجھتے رہے اور نمبر سات بیچ بچاؤ کراتا رہا۔ جیوری کے دیگر اراکین بھی موقع

ملنے پر بولتے رہے۔ بالآخر سات نمبر نے لنچ کے وقفے کا اعلان کردیا۔

”ہمیں یہاں سے باہر نکلنا چاہیے۔“ نمبر دو نے ایمونی سے کہا۔ وہ بھی اس وقفے سے خوش تھی اور اس کے ساتھ کھانا نہیں بلکہ باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ انہیں دو بلاک کے فاصلے پر ایک چینی ریستوران مل گیا۔

”مجھے وہاں تھوڑی سی بے چینی محسوس ہورہی تھی۔“ ایمونی نے سوپ کا چمچہ منہ میں لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ ایسا ہوتا ہے، کوئی بھی عدالت میں آنا نہیں چاہتا۔“

”مگر تم تو آگئے ہو۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”یہ تمہارا چوتھا مقدمہ ہے۔“

”ہاں۔ میں اسے ایک طرح سے کام سے چھٹی سمجھتا ہوں۔“

”تم کیا کام کرتے ہو؟“

”میں استاد ہوں۔“

”استاد ہوکر تم نے یہ ٹیٹو بنوایا ہے؟“ اس نے آستین سے جھانکتے ہوئے سانپ کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آج کل کوئی ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اس کے باوجود میں کلاس میں پوری آستین کی قمیص پہن کر جاتا ہوں۔“

وہ اس بے معنی گفتگو سے اکتاہٹ محسوس کررہی تھی اور چاہتی تھی کہ مطلب کی بات کی جائے۔ ویٹر کھانا لے کر آیا تو گفتگو کا سلسلہ وقتی طور پر منقطع ہوگیا۔ اس نے چکن کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی تک کسی نتیجے پر کیوں نہیں پہنچے؟“

”وکیل استغاثہ کا کہنا ہے کہ مس ہیویٹ جائے وقوعہ سے فرار ہورہی تھی۔“

”اسی سے اس کے جرم کا اظہار ہوتا ہے۔“

”لیکن وکیل صفائی کا کہنا ہے کہ غالباً وہ وہاں نہیں تھی۔“ کوسلوسکی نے کہا۔ ”بہرحال وہاں اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے اور نہ اس کی کار میں لوٹ کا مال تھا۔“

”وہ ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی اس نے کار چلادی اور اس کے ساتھیوں کو یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ لوٹ کا مال کار تک پہنچاتے چونکہ وہ ڈرائیور تھی اس لیے اندر نہیں گئی اور وہاں اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں۔ ساری گڑبڑ اس وقت ہوئی جب گھر کے مالک نے اس کے دو ساتھیوں پر گولی چلائی اور جب پولیس نے اسے پکڑا تو وہ بہت جلدی میں تھی۔“

”ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس پر یقین کرسکتا ہوں۔“

”اس کے علاوہ وہاں ایک عینی شاہد بھی تھا جس نے اسے شناخت کرلیا۔“

”عینی شاہد اکثر غلط بیانی بھی کرتے ہیں۔“

”جیوری کے لوگ اپنے تجربے کی بنیاد پر اسے پرکھ سکتے ہیں۔“

اس نے قہقہہ لگایا تو وہ بولی۔ ”عینی شاہد نے جو حلیہ بتایا، وہ اس سے ملتا ہے، اس کے علاوہ اس کا سیل فون بھی ایک قریبی ٹاور سے سگنل لے رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وہاں موجود تھی۔“

”یقیناً لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس علاقے سے گزر رہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف اس کا فون ہی وہاں ہو۔“

”اس کے بغیر۔“ ایمونی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں سوفٹ ویئر پروگرامر ہوں اور بتاسکتی ہوں کہ سوفٹ ویئر کے ذریعے فون رکھنے والے کی لوکیشن کا سو فیصد درست تعین کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا تمہاری رائے میں وہ مجرم ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے یہ بات چھپانا مناسب نہ سمجھی۔ ”میری خواہش تھی کہ صرف میں ہی تنہا یہ بات نہ کہہ رہی ہوتی۔“

انہوں نے کھانے کے دوران مقدمے کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی باتیں کیں۔ وہ اتنا برا نہیں تھا۔ البتہ اس کا دماغ دوسری طرف لگا ہوا تھا۔

نمبر دو اور ایمونی ایک ساتھ جیوری روم میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے دو اور اراکین بھی آئے۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور ان کے درمیان بحث شروع ہوگئی تو اس کے اختتام پر ایک بار پھر ووٹنگ ہوئی۔ اس مرتبہ سیرینا کو قصوروار قرار دینے والوں میں ایک کا اضافہ ہوگیا۔

نمبر گیارہ غصے سے بولا۔ ”ہم کبھی یہاں سے نہیں جاسکیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے کن انکھیوں سے ایمونی کی طرف دیکھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ وہ نمبر دو کے ساتھ لنچ پر گئی تھی اور اس کا ذہن تبدیل کردیا؟ کیا اس نے صرف ایمونی کو ہی دیکھا یا دوسرے لوگوں کو بھی اسی طرح دیکھ رہا تھا جس پر

ایمونی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بہر حال اس کا ساتھ دینے والوں میں ایک کا اضافہ ہو چکا تھا۔ دس ابھی باقی تھے۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

تیسرے دن بحث کا آغاز ہوا۔ نمبر گیارہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اکثریت کی رائے سے اتفاق نہیں کیا ورنہ ہم یہ کیس ختم کر کے گھر جا چکے ہوتے۔ اب تم نے نمبر دو کو بھی اپنی طرف کر لیا ہے۔''

''مجھے وہی کرنا ہے جو میں مناسب سمجھتی ہوں۔''

''گویا تم اپنے آپ کو صحیح سمجھتی ہو اور ہم دس اراکین غلط ہیں۔'' اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''بعض اوقات اکثریت بھی غلط ہو سکتی ہے۔'' ایمونی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''ہاں لیکن اس کیس میں نہیں۔ سیرینا ہویٹ بے قصور ہے۔''

''ممکن ہے۔'' ایمونی نے کہا۔ ''لیکن جہاں تک میں سمجھتی ہوں، استغاثہ اسے مجرم ثابت کر چکا ہے اور وکیلِ صفائی نے بھی کوئی معقول دلائل پیش نہیں کیے۔''

وقفہ ہوا تو وہ ریسٹ روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔ وہاں جیوری کی رکن نمبر پانچ آئینے میں اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔

''اندر تھوڑی سی گرما گرمی ہو گئی تھی۔'' ایمونی نے کہا۔

''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ میں ایک اور جیوری میں بھی رہ چکی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ مجھے لڑاکا معلوم ہوتا ہے۔''

''مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے۔''

''مجھے بھی۔'' نمبر پانچ نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رینا نوریس۔''

ایمونی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ایمونی ٹیلر۔''

''خوب صورت نام ہے۔'' رینا بولی۔

''دراصل یہ میرا پیچ کا نام ہے۔ پہلا نام لیزا مجھے پسند نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اسے ترک کر کے قانونی طور پر ایمونی رکھ لیا۔''

اس نے اکیس سال کی عمر میں ہی اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس انوکھے نام سے اس کی شخصیت میں تبدیلی آسکے گی اور اس طرح لوگوں سے بات کرنے اور انہیں دوست بنانے میں مدد ملے گی۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ نمبر پانچ کیس کے بارے میں کوئی بات کرے پھر خود ہی بولی۔

''ایک عورت کو اور کیا چاہیے کہ وہ گھر پر اپنے والدین کے ساتھ رہے۔ اسے مکان کا کرایہ دینا ہو اور نہ ہی لانڈری کے اخراجات برداشت کرنا پڑیں پھر سیرینا نے ڈاکوؤں کا ساتھ کیوں دیا؟''

''اس پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ کیا تم واقعی اسے مجرم سمجھتی ہو؟''

''ہاں۔'' ایمونی نے پورے وثوق سے کہا۔ ''جانتی ہو، میں اس نتیجے پر کیوں پہنچی؟ وہ اپنی زندگی سے اکتا چکی تھی اور اسے کسی ایڈونچر کی تلاش تھی، جیسا کہ استغاثہ نے کہا کہ وہ ملازمت تلاش کرنے کے بجائے رات گئے پارٹیوں میں شریک ہوتی اور دیر سے گھر آتی۔''

''مجھے یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔'' نمبر پانچ نے کہا۔

ایمونی کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ واقعی استغاثہ نے یہ بات کہی تھی۔ البتہ اسے یاد آگیا کہ نمبر پانچ نے جرح کے دوران وکیلِ صفائی سے پوچھا کہ کیا وہ محسوس کرتی ہے کہ بے روزگار لوگ سست ہو جاتے ہیں جس کا اس نے نفی میں جواب دیا لیکن ایمونی نے رینا کا فیس بک پیج دیکھا تو اس نے اپنی ایک پوسٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ زیادہ تر لوگ جنہیں کوئی کام نہیں ملتا، وہ سست ہو جاتے ہیں اور کوئی کام کرنے کے بجائے بے روزگاری الاؤنس پر انحصار کرتے ہیں۔

رینا کی آنکھوں میں حیرت جھلک رہی تھی۔ ایمونی کو لگا کہ وہ کامیاب ہو گئی ہے اور جب دن کے اختتام پر ووٹنگ ہوئی تو تین اراکین نے ملزمہ کو مجرم قرار دیا۔ ایک نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور باقی آٹھ اسے بے قصور سمجھ رہے تھے۔

شام کو گھر پہنچ کر اس نے حسبِ معمول غسل کیا اور ڈنر کے بعد اپنی پسندیدہ موسیقی سننے بیٹھ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دو اراکین کو اپنے ساتھ ملا چکی تھی جبکہ نو ابھی باقی تھے۔ اگر وہ روزانہ ایک رکن کو اپنی طرف کرے تو نو دنوں میں اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ کیا سیرینا واقعی مجرم تھی؟ ایمونی کو یہ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس کی پروا تھی۔

چوتھے روز ایمونی نے نو نمبر کو کریدا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فیصلہ کرنے میں ڈانواں ڈول ہو رہا ہے لیکن اس نے کہا کہ سیرینا ایک اچھی لڑکی لگتی ہے۔

''کیا تم اسے محض اس لیے بے گناہ سمجھتے ہو کہ وہ

پچاس کی دہائی کے کپڑے پہنتی ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ اسے اس کے وکیلوں نے ایسا بنا دیا ہے کہ وہ اپنے لباس، بالوں اور ہلکے میک اپ کی وجہ سے فرشتوں جیسی معصوم نظر آئے۔"

اسے اس بات سے شدید نفرت تھی کہ کسی کو اس کی ظاہری وضع قطع کے لحاظ سے پرکھا جائے۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتی تھی کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اسے یاد تھا کہ اسکول میں اس کی سب سے بہترین دوست ہی اس کا مذاق اڑاتی تھی۔ "اسے دیکھو یہ اپنی ماں کی جینز پہن کر آ گئی ہے۔" ایموئی کی ماں نے اسے ڈھیلی ڈھالی جینز بنا کر دی جبکہ دوسری لڑکیاں ڈیزائنر جینز پہن کر آتی تھیں۔ وہ اس کے چشمے، جسمانی خطوط اور پتلی ٹانگوں کا مذاق اڑاتیں۔ ایموئی گھر جا کر روزانہ رات کو روتی۔ یہاں تک کہ اس نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا لیکن اس کے دادا نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اسکول کے بعد بھی بہت زندگی باقی ہے جس میں وہ تتلی بن کر اڑے گی۔ کسی حد تک یہ بات درست ثابت ہوئی تاہم اس کے زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔

چوتھے روز اس کے ہم نواؤں میں کسی کا اضافہ نہیں ہوا۔ ایموئی جانتی تھی کہ وہ مزید چند لوگوں کو اپنی طرف کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے اسے تدبر سے کام لینا ہوگا اور وہ اس معاملے کو مزید طول دینے کے لیے تیار تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ حسب معمول نہانے کے لیے باتھ ٹب میں بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں ایک فلم چل رہی تھی اور جیوری کے اراکین کے چہرے ایک ایک کر کے پرانے زمانے کی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی طرح اس کے سامنے آتے رہے جن میں فلم کے آخر میں ہر کریکٹر کا کلوز اپ اس کے اصل نام کے ساتھ پردے پر آتا تھا۔ رکن نمبر ایک ایوراموس، رکن نمبر دو ہیرس کوسلوسکی اور آخری چہرہ نمبر گیارہ ڈین شلٹر کا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کبھی بھی اس کا ذہن تبدیل نہیں کر سکے گی۔

پانچواں اور چھٹا دن بھی غیر اہم رہا البتہ اگلے دو دنوں میں کچھ تبدیلیاں نظر آئیں اور ایموئی اپنے دو ساتھیوں نمبر دو اور نمبر پانچ کی مدد سے نمبر ایک اور چھ کی رائے تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن نمبر گیارہ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور وہ پھٹ پڑا۔

"آخر تم کیوں اس عورت کو مجرم قرار دینے پر تلی ہوئی ہو؟" ایموئی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں جج کو بتا دینا چاہیے کہ یہ ایک معلق جیوری ہے لہٰذا ہمیں یہ معاملہ کسی احمق جیوری کے سپرد کر دینا چاہیے۔"

"ہم معلق نہیں بلکہ صرف بحث کر رہے ہیں۔" نمبر چھ نے کہا۔ میریلین نامی اس عورت کی گرووشاپنگ سینٹر میں ایک چھوٹی سی مگر اچھی چلنے والی دکان تھی۔

"کیا تم ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہو؟" نمبر گیارہ نے تلخی سے کہا۔

"میں صحیح فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

گنجے سر والا نمبر نو جسے دیکھ کر ایموئی کو اپنے دادا کی یاد آ جاتی تھی، اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "ہمیں قائل کرو۔"

وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور میز کے گرد بیٹھے گیارہ افراد کو دیکھا۔ اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی اور اسے یقین نہیں تھا کہ وہ انہیں قائل کر سکے گی لیکن اب اس کے لیے موقع تھا کہ وہ فوراً ہی ان پر حملہ کر دے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، نمبر دو بیچ میں کود پڑا۔ "مجھے ہینڈل کرنے دو۔ ہمیں شروع سے اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔"

ایموئی اس مدد کے ملنے پر خوش تھی۔ اب وہ تنہا نہیں رہی بلکہ اس کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"میں مختصراً بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ہیرس نے کہا۔ "سیرینا ہیویٹ پر قتل کا الزام ہے۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ جوناتھن لینڈو کے مکان میں داخل ہوئی۔ انہوں نے لوٹ مار کی اور مسٹر لینڈو پر بے پناہ تشدد کیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے لیکن مرنے سے پہلے انہوں نے ڈاکوؤں پر گولی چلا دی۔ سیرینا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور پولیس نے اسے جائے وقوعہ سے چند بلاک کے فاصلے پر پکڑ لیا۔ اس کے فرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجرم تھی ورنہ وہ کیوں بھاگتی۔"

ایموئی دل ہی دل میں مسکرا دی۔ وہ اسی کی زبان بول رہا تھا۔

"یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔" سات نمبر بروس شیڈر نے کہا۔

"وکیلِ صفائی کا کہنا ہے کہ اس کی شناخت میں غلطی ہوئی۔" نمبر دو نے کہا۔

"جبکہ استغاثہ کا کہنا ہے کہ سیرینا ہی وہ عورت ہے جو وہاں سے بچ نکلی لیکن ایک عینی شاہد مورینا کا کہنا ہے کہ سیرینا ہی وہ عورت ہے جسے اس نے مجرموں کی کار میں بیٹھے دیکھا۔"

"کار کے شیشے آدھے کھلے ہوئے تھے۔ اس کی محض جھلک ہی نظر آئی ہوگی۔" نمبر گیارہ نے اعتراض کیا۔

"ممکن ہے لیکن میں نے مس موریتا کی گواہی کو قابلِ اعتبار پایا۔" نمبر دو نے نمبر گیارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مکان میں اس کی انگلیوں کے نشانات بھی نہیں پائے گئے۔" نمبر گیارہ نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

"اگر وہ کار میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی تو ممکن ہے کہ وہ گھر میں نہ گئی ہو لیکن اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے دو ساتھی مکان میں گئے اور انہوں نے مسٹر لینڈو پر تشدد کیا پھر اس کا سیل فون بھی قریبی ٹاور سے سگنل وصول کر رہا تھا۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں کا انتظار نہیں کر رہی تھی تو اس کی اس علاقے میں موجودگی کا کیا جواز ہے؟" نمبر دو نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں نہیں معلوم کہ وہ وہاں موجود تھی۔" نمبر گیارہ نے کہا۔

ایمونی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "موجودہ ٹیکنالوجی کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس کا سیل فون کہاں تھا؟"

اس نے اس امید پر جھوٹ بولا کہ لوگ ہر اس بات پر یقین کر لیتے ہیں جو کہ کسی نام نہاد ماہر کی طرف سے کہی جائے۔

"یہ سچ ہے۔ میں نے کرائم سین انویسٹی گیشن شو میں دیکھا تھا۔" نمبر نو نے کہا۔

"اور استغاثہ نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ وہاں موجود تھی۔" نمبر دو بولا۔ "کیونکہ گواہوں کے بیانات اور مسٹر لینڈو کے گھر کے باہر لگے ہوئے سیکیورٹی کیمرے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" ایمونی نے کہا۔ "استغاثہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ملزمہ کم از کم ایک ڈاکو کو پہلے سے جانتی تھی۔"

"اسکول کے زمانے سے۔" نمبر گیارہ نے طنزاً کہا۔

"ممکن ہے کہ وہ پہلے سے رابطے میں ہوں۔" ریتا بولی۔

نمبر نو ایمونی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ پہلے ہی اس بارے میں جھوٹ بول چکی ہے کہ وہ شہر کے اس علاقے میں کیا کر رہی تھی۔ اس نے جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کے بارے میں بھی غلط بیانی کی۔ اگر وہ قصوروار نہیں تو اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"ممکن ہے کہ وہ وہاں دوائیں خریدنے کے لیے رک گئی ہو یا کسی دوست سے ملنے گئی ہو۔ اس نے اسی لیے غلط بیانی کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس ہنگامے سے الگ رکھنا چاہتی تھی۔" نمبر گیارہ نے کہا۔

"میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں کیا کرتی اگر یہ حملہ میرے دادا پر ہوا ہوتا۔ کیا ہم اپنے گھروں میں محفوظ ہیں؟" ایمونی نے کہا۔

بحث کے خاتمے پر ووٹنگ ہوئی۔ اس بار نو نمبر نے بھی ملزمہ کو مجرم قرار دے دیا۔ ایمونی اس کامیابی پر مسکرا دی۔ اس کی منزل قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔

آٹھویں دن کوئی بھی وہاں مزید رکنے کا خواہش مند نہیں تھا اور سب گھر جانا چاہ رہے تھے۔ "مجھے اپنے کام پر واپس جانا ہے۔" نمبر چار نے بحث کے دوران نمبر ایک سے کہا۔

ایمونی جانتی تھی کہ وہ اسٹاک بروکر ہے اور جیوری میں آنے سے اسے مالی نقصان ہو رہا تھا لیکن اس کی کمپنی چاہتی تھی کہ وہ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں پوری کرے۔ اسے اس خدمت کا بہت معمولی معاوضہ مل رہا تھا۔

دوپہر کے وقفے میں باہر نکلتے ہوئے وہ جان بوجھ کر نمبر چار سے ٹکرا گئی۔ "معاف کرنا۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ دراصل یہاں آنے کی وجہ سے مجھے کمپنی سے تنخواہ نہیں مل رہی۔" اس نے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔

"مجھے بھی۔" نمبر چار نے کہا۔ "مجھے کمیشن نہیں مل رہا۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اسے جلدی ختم کر کے گھروں کو لوٹ جائیں؟"

دن کے اختتام پر ووٹنگ ہوئی تو نمبر چار نے بھی ملزمہ کو قصوروار قرار دے دیا۔ یہ محض اس سرگوشی کا نتیجہ نہیں تھا جو ایمونی نے وقفے کے دوران اس سے کی تھی بلکہ وہ گزشتہ شب ہی اپنے آئی پیڈ پر نمبر چار سے متعلق وہ معلومات حاصل کر چکی تھی جو اس کا ذہن تبدیل کرنے کے لیے ضروری تھیں۔

نواں دن سب سے اچھا رہا۔ اس روز ایمونی کے ہم نواؤں میں تین اراکین کا اضافہ ہوا۔ یہ نمبر تین، سات اور دس تھے۔ ان کے نام شریڈر، ریمسی اور لیو تھے۔ وہ تینوں پہلے یا دوسرے دن سے ہی آپس میں گھل مل گئے تھے اور کھانا کھانے بھی ایک ساتھ ہی جاتے۔ ایمونی جانتی تھی کہ

اگر اس نے شریڈر کو اپنی طرف کرلیا تو باقی دونوں بھی اس کا ساتھ دیں گے چنانچہ اس نے شریڈر پر اپنا داؤ آزمایا۔
''میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی لیکن میرا خیال ہے کہ سیکیورٹی کیمرے کی مدد سے اس کے چہرے کی شناخت ہو رہی ہے۔''
''لیکن کیمرا مسٹر لینڈو کے دروازے پر لگا ہوا تھا اور ملزمہ وہاں سے کچھ فاصلے پر اپنی کار میں بیٹھی ہوئی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ سیرینا ہی تھی البتہ تصویر میں وہ تھوڑی اس جیسی لگ رہی ہے۔''
''لیکن ماہرین......'' ایمونی نے کہا۔
''وہ غلط بھی ہو سکتے ہیں اور یہ تصویر اتنی صاف بھی نہیں ہے بلکہ دھندلی لگ رہی ہے۔'' ریمسی نے کہا۔
ایمونی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کافی معلومات ہیں۔ وہ حساب کتاب کے ذریعے دھندلی تصویر کا موازنہ چہرے کے نقوش سے کر سکتے ہیں اور اس میں ننانوے فیصد کامیابی کے امکانات ہیں۔ اگر تماشائیوں سے بھرے ہوئے فٹ بال اسٹیڈیم میں کسی دہشت گرد کی شناخت ہو سکتی ہے تو مس ہیوٹ کی کیوں نہیں؟''
وہ دیکھ رہی تھی کہ شریڈر کا دماغ تیزی سے کام کر رہا ہے۔ اس نے ریمسی اور لیو کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح ملزمہ کو قصوروار سمجھنے والوں میں تین اراکین کا اضافہ اور ہو گیا۔
جب وہ چھوٹی تھی تو اسے بتایا گیا تھا کہ عدالتوں سے انصاف ملتا ہے لیکن اب وہ جان گئی تھی کہ ایک مقدمہ جھوٹی لڑائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس میں زنجیروں اور ہتھیاروں کی جگہ سوٹ اور ٹائیوں نے لے لی تھی۔
دسویں دن صرف نمبر گیارہ اور نمبر بارہ ہی اپنی اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کسی بھی وقت جھڑپ ہو سکتی تھی۔ نمبر سات خطرہ محسوس کرتے ہوئے درمیان میں آ گیا اور بولا۔ ''پُرسکون ہو جاؤ۔''
ایمونی نے بارہ نمبر سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
''اگر تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ تو آج کا دن تمہارے نام ہو جائے گا۔''
شاید وہ ملزمہ کو بے قصور سمجھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس طرح ملزمہ کو مجرم سمجھنے والے اراکین کی تعداد گیارہ ہو گئی جو کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بہت زیادہ تھی۔ وہ نمبر گیارہ کے علاوہ ہر ایک کو اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ اب اسے کچھ اور سوچنا تھا۔ اس شام ٹب میں نہاتے ہوئے اسے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔
گیارھویں روز جج نے اراکین جیوری کو کمرۂ عدالت میں طلب کیا۔ وہاں صرف ملزمہ، وکیلوں، عدالتی عملہ، بیلف اور جیوری کے علاوہ کوئی غیر متعلقہ شخص موجود نہیں تھا۔ ''مجھے آج صبح ایک دلچسپ خط ملا ہے۔'' اس کی آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔ ''فی الحال میں یہ نہیں بتا رہی کہ اس میں کیا لکھا ہے لیکن یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ کیا کوئی رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرے گا؟''
سب خاموش رہے۔ جج اپنے کمرے میں واپس چلی گئی اور اس نے فرداً فرداً جیوری کے ہر رکن کا انٹرویو کیا۔ بظاہر کسی نے بھی نوٹ بھیجنے کا اعتراف نہیں کیا لیکن نمبر گیارہ کو شکریہ کے ساتھ واپس جانے کے لیے کہا گیا۔
''میں نے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔'' وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے بولا، جاتے ہوئے اس نے ایمونی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ آئندہ کبھی تم لوگوں سے ملاقات نہیں ہو گی۔ خاص کر تم سے۔''
اس رات غسل کرتے ہوئے ایمونی کو جھرجھری آ گئی۔ اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ حالانکہ نمبر گیارہ سے نجات مل چکی تھی۔ ایمونی نے گزشتہ شب اس کا کمپیوٹر ہیک کر کے معلوم کر لیا تھا کہ اس کا بیٹا جیل میں ہے۔ اسے یاد تھا کہ وکیلِ استغاثہ نے پہلے ہی دن تمام اراکین جیوری سے پوچھا تھا کہ ان کا کوئی قریبی رشتے دار کسی جرم میں ملوث تو نہیں تو نمبر گیارہ خاموش رہا۔ شاید وہ اسی لیے ملزمہ کو بے قصور قرار دینے کے موقف پر سختی سے قائم تھا۔ اسے اس نظام انصاف سے نفرت تھی۔ وہ بھی ملزمہ کو مجرم قرار نہ دیتا اور وہ اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے پوری جیوری کو ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ ایمونی نے گمنام بن کر یہ تمام معلومات جج کو بھیج دیں اور اس طرح نمبر گیارہ کو جیوری سے الگ کر دیا گیا۔
بارھویں روز کی کارروائی میں نمبر گیارہ کا متبادل رکن بھی شریک ہوا۔ جوش لینگرون ایک پلمبر تھا اور اپنے کام پر واپس جانا چاہتا تھا۔ ایمونی جانتی تھی کہ وہ آسانی سے قابو میں آ جائے گا۔ اس نے اس کی زندگی میں جھانک کر اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ کھانے کے وقفے

تک وہ بھی ایمونی کا ہم نوا بن چکا تھا۔ اس طرح جیوری ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ گئی۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو جیوری کے ترجمان نمبر سات نے تحریری موقف بیلف کے حوالے کیا جس میں متفقہ طور پر ملزمہ کو مجرم قرار دیا گیا تھا۔ وکیلِ صفائی کے مطالبے پر بھی اراکین نے اپنی رائے کو تسلیم کیا اور جج نے ان کا شکریہ ادا کر کے عدالت برخاست کر دی۔

سیرینا کے علاوہ سب لوگ مقدمہ ختم ہونے پر خوش تھے۔ وہ ایک طویل عرصے کے لیے جیل جا رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے بازو میں زہر کا انجکشن لگا دیا جاتا لیکن کیلی فورنیا میں موت کی سزا ختم ہو چکی تھی۔ اب اسے ساری زندگی جیل میں گزارنا تھی۔

اسے سیرینا پر تھوڑا سا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں مڈل اسکول تک بہترین سہیلیاں تھیں لیکن ہائی اسکول میں سیرینا نے سنجیدہ لڑکوں سے دوستی کر لی جبکہ ایمونی احمق لڑکوں سے ملتی رہی۔ جس پر سیرینا اسے طعنے دیتی اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اس طرح دوستی دشمنی میں بدل گئی۔

تاہم وہ اسے اب بھی دوست سمجھتی تھی۔ لہٰذا اس نے سیرینا کو رازدار بناتے ہوئے بوبی بریٹ کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ بوبی اسکول کا سب سے معقول لڑکا تھا۔ سیرینا نے اسے اذیت دینے کے لیے کہا۔

”تم بوبی بریٹ سے محبت کرتی ہو۔ کیا تمہیں بچے پیدا کرنے ہیں؟“

سیرینا کے الفاظ میں صرف طنز ہی نہیں چھپا ہوا تھا بلکہ وہ صریحاً ایمونی کی بے عزتی کر رہی تھی۔ اگلے دن پورے اسکول کو یہ بات معلوم ہو گئی اور ایمونی سمیت سب لوگوں کو پتا چل گیا کہ ان کی رفاقت ختم ہو گئی ہے لہٰذا لوگوں نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا اور وہ ہر ایک کے مذاق کا نشانہ بن گئی۔ سیرینا اور اس کے دوست اسے بے رحمی سے چھیڑتے اور پوچھتے کہ کیا وہ بوبی کے ساتھ فلم دیکھنے یا گھومنے پھرنے جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اسکول کے آخری دن تک کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہا۔

لہٰذا جب اسے جیوری کا رکن بنایا گیا اور اس نے اپنی پرانی دوست کو وہاں دیکھا تو وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ سیرینا شاید اسے پہچان لے۔ گو کہ اس نے کافی حد تک اپنے آپ کو تبدیل کر لیا تھا لیکن پھر بھی اس کا امکان موجود تھا۔ سیرینا اسے لیزا پاول کے نام سے جانتی تھی لیکن اس کی ماں کو طلاق ہو گئی تھی تو اس کے سوتیلے باپ نے اسے قبول کر لیا۔ اب اس کا نام ایمونی ٹیلر تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی شکل صورت میں بھی تبدیلی کی۔ بالوں کو ڈائی کر کے ترشوا لیا۔ لیزر آئی سرجری کے بعد اسے چشمہ لگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس کی شخصیت بالکل بدل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی اندر سے لیزا ہی تھی لیکن دیکھنے میں کافی مختلف نظر آتی تھی۔ نام کی تبدیلی کی وجہ سے سیرینا بھی اسے نہ پہچان سکی۔ ویسے مقدمے کی سماعت کے دوران میں بیشتر وقت اس نے اپنی نظریں نیچی رکھیں اور جیوری کے لوگوں کو بالکل نہیں دیکھا۔

سیرینا پر گھر میں گھس کر ڈکیتی کے دوران ایک بوڑھے شخص کو قتل کرنے کا الزام تھا جس پر اسے موت کی سزا ہو سکتی تھی لیکن ایمونی کے دماغ میں اس کے خلاف تنگ کرنے، اسے دکھی کرنے اور اس کی زندگی برباد کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔ کیا یہ سزا ان جرائم کے لیے موزوں تھی؟ کیا ان جرائم کو دیکھتے ہوئے سزائے موت کچھ زیادہ نہیں؟ شاید ہاں یا شاید نہیں۔

ایمونی جانتی تھی کہ اس سزا پر کبھی عمل نہیں ہوگا۔ وہ چالیس سال کی عمر میں بیس برس بعد قید سے رہا ہو جائے گی۔ اس کے بعد بھی اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کافی وقت ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپیل کرنے پر وہ جلد رہا ہو جائے۔ بہرحال وہ بے قصور تھی اور ممکن ہے کہ ایک اچھا وکیل اپیل کی سماعت کے دوران اسے بے گناہ ثابت کر دے۔ اس دوران اسے چند ماہ جیل میں رہ کر پتا چل جائے گا کہ ساتھی قیدی اسے کس طرح تنگ کرتے ہیں اور وہ ان کا مقابلہ کیسے کرتی ہے۔

وہ کسی کے ساتھ اپنی جیت کی خوشی منانا چاہتی تھی لیکن اس کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا کوئی قریبی دوست نہیں تھا جس پر وہ بھروسا کر سکتی چنانچہ اس نے اس خوشی کو بھی اپنے تک ہی محدود رکھا اور اپنے معمولات سے لطف اندوز ہونے لگی۔ وہ ٹب میں لیٹی اپنی من پسند غذا اور موسیقی کے مزے لے رہی تھی اور حیران تھی کہ بعض اوقات زندگی اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس نے محض ذاتی انا اور دشمنی کی خاطر سازش کر کے ایک بے گناہ عورت کو ایسے جرم میں سزا دلوا دی جو اس نے نہیں کیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دی کران کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ ... وہ فرنگی حسینہ دلّی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

یہ ریاست ناگرہ...... کے مضافاتی علاقے میں ایک خوبصورت پہاڑی وادی کا منظر تھا جس کے دائیں جانب ہرو دار کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی دم کو بھادوں مینہ برسنے والی تھی۔ وہ مختصر قافلہ جس کا سالار ایک برطانوی باشندہ تھا جو نہ فوجی تھا، نہ اس کا تعلق انگریزوں کی کسی ایسی کمپنی سے تھا جو بچے کھچے باغیوں کے سرفروش گروپ سے نبرد آزما تھی بلکہ اس کا ان سیاسی ریشہ دوانیوں سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ اس کا نام پروفیسر ہنری برنارڈ تھا۔ وہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت، ماہر لسانیات اور پروفیسر تھا۔ اپنی ایک علمی ریسرچ کے سلسلے میں وہ لندن سے ہندوستان آیا تھا اور دلی میں ایک انگریز لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کے ہاں مقیم تھا۔ اس کے مختصر قافلے میں ہر نسل و قومیت کے لوگ شامل تھے، جن کی حیثیت ملازموں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ ماسوائے اس کے خاندان کے ایک فرد کے...... اور وہ فرد اس کی جواں سال اور گل رعنا بیٹی ریتا تھی۔ وہ ضد کر کے لندن سے باپ کے ساتھ آئی تھی۔ وہ فطرتاً ایڈونچر پسند تھی۔ باقی دیگر ملازمین کی تعداد پانچ تھی۔ دو تو انگریز فوجی تھے، جنہیں ساتھ لینے پر پروفیسر ہنری برنارڈ مُعترض ہوا تھا، مگر مائیکل شا نے احتیاطاً انہیں اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک نوجوان فرنگی جوڑا بھی تھا۔ دو بوڑھے میاں بیوی ملازم تھے۔ یہ ہندو تھے اور پانچواں شخص ایک خوبرو اور مسلمان نوجوان شوکت حسین تھا۔ یہ مائیکل شا کے گھوڑوں کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا تھا۔

ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی کی تو بات تھی جب پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی جواں سال خوبصورت بیٹی ریتا کے ہمراہ لندن سے دلی پہنچا تھا۔

''ویل مسٹر ہنری! ہم آپ کو یہاں تاجِ برطانیہ کی حکومت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔''

دلی کی ایک قلعہ بند، قابض حویلی میں لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا، جو ایک سرخ فوجی وردی میں ملبوس تھا، نے پروفیسر ہنری برنارڈ اور اس کے مختصر خاندان کا پرتپاک استقبال کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے غاصبانہ نخوت کی بو آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شیشے کی چھوٹی سی ''گلاسی'' تھمی ہوئی تھی جس میں انگوری مشروب تھا۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ایک ایسی ہی گلاسی اس نے ہنری کو بھی تھما رکھی تھی۔

جنرل مائیکل شا، ہنری برنارڈ کا ہم عمر اور اسی کی طرح دراز قامت تھا۔ ہنری نے اسے اپنی یونیورسٹی کا این او سی اور تاجِ برطانیہ کا وہ خط دکھا دیا تھا جو وہ لندن سے روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا۔

''تمہیں ان کاغذات کی بھلا کیا ضرورت تھی...... مائی ڈیئریسٹ فرینڈ!'' مائیکل کا بیان جاری تھا۔ وہ چست فوجی لباس میں ملبوس تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ دونوں پرانے دوست تھے۔

''بعض راہداریوں کو پار کرنے کے لیے ایسے پروانے لازمی ہوتے ہیں، تاکہ ہم جیسے کسی پردیسی کو قانونی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' حلیم طبع اور اپنی قوم سے یکسر مختلف سوچ کے حامل پروفیسر ہنری برنارڈ نے بھی دوستانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''ہاہاہا...... قانون...... راہداری...... پروانہ......''

لیفٹیننٹ جنرل شا نے اپنے حلق سے ایک بے ہنگم سا قہقہہ خارج کیا۔ ''یہاں صرف گریٹ برٹن کا قانون چلتا ہے اور ہمیں یہاں داخلے کے لیے کسی بھی قسم کے پروانوں کی ضرورت نہیں۔''

پروفیسر ہنری کو اس ثقیل موضوع سے کوفت ہونے لگی۔ وہ اپنی جس ریسرچ کے سلسلے میں آیا تھا وہ کام نمٹا کر واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کسی بحث میں پڑے بغیر مسکرا کر کہا۔

''اچھی بات ہے لیکن...... میری کوہ شمالیہ کی طرف روانگی کا جلد بندوبست کر دو تو بہتر ہوگا۔''

''ارے...... ابھی تمہیں آئے چند ہی روز تو ہوئے ہیں مائی ڈیئر فرینڈ! کیا اتنی جلدی تم نے ٹیم بھی بنالی؟'' مائیکل کے لہجے میں حیرت تھی۔ اس نے اپنی گلاسی ختم کی اور پاس ایک اونچی کھٹولی پر رکھے ٹونٹی والے بڑے سے پیتل کے جگ کی طرف بڑھ گیا اور اپنی گلاسی اسی مشروب سے بھرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے ہنری کو بھی اشارہ کیا تھا مگر اس نے اپنی خالی گلاسی قریب دھری ایک تپائی پر رکھ کر انکار میں سر کو جنبش دی۔

''میں اپنی ٹیم بنانے کا نصف کام پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہاں کچھ ایسے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی، وہ بھی تمہاری مدد سے میں ہائر کر چکا ہوں۔ اب بس مجھے روانہ ہونا ہے۔''

''ویل......! کچھ دن اور مجھے دے دو، ابھی حالات بہتر نہیں ہیں۔ بٹ...... ڈونٹ وری! جلد ہی بہتر ہو جائیں گے...... کلیئرنس ملتے ہی تمہیں آگاہ کر دوں گا۔''

اس کی بات پر ہنری کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ مودکر آئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر یہ بات آتے آتے رہ گئی کہ...... ''کمال ہے مسٹر شا! یہاں آپ نے کیسی حکومت بنا رکھی ہے، جہاں قلعہ بند رہنے کو محفوظ اور باہر نکلنے کو خطرہ سمجھا جاتا ہے؟'' مگر وہ خاموش رہا۔

اسی وقت ایک وردی پوش سپاہی اندر داخل ہوا اور جھک کر مؤدبانہ انداز میں جنرل مائیکل سے بولا۔ ''سر لال چند اور گرکھ سنگھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ...... ہمارے وفادار آ گئے۔ ضرور کوئی خاص خبر لائے ہوں گے، فوراً بھیجو انہیں......'' جنرل مائیکل شا نے کہا۔ سپاہی الٹے پیروں لوٹ گیا۔ ہنری ایک گہری سانس لے کر وہاں سے جانے کی غرض سے بولا۔

''تم اپنے وفاداروں کے ساتھ میٹنگ کرو، میں ذرا......''

''نہیں......'' مائیکل نے اس کی بات کاٹ دی اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ذرا تم بھی اس میٹنگ کا حال آنکھوں سے دیکھ لو...... اور دیکھو کہ ہماری چالوں نے کس طرح یہاں لوگوں کو ہمارا مطیع اور فرماں بردار بنا رکھا ہے۔''

''دماغی چالوں سے یا بزورِ طاقت......'' ہنری نے زیرِلب کہا تھا جسے مائیکل شا سن نہ سکا تھا کیونکہ اسی وقت دو افراد فدویانہ انداز میں ہاتھ جوڑے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان دونوں نے سفید ململ کی دھوتی اور اوپر لمبا کرتہ پہن رکھا تھا۔ چہروں پر چاپلوسانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ رنگ سانولے تھے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا اور دوسرا پختہ العمر تھا۔ یہ دونوں ہندو بنیے ان لوگوں سے تعلق رکھتے تھے جو انگریز حکمراں کے مراعات یافتہ اور راتب خور تھے۔ یہی نہیں، بلکہ انگلشیہ آرمی میں ان دونوں کو ایک خاص عہدہ بھی انگریز سرکار نے تفویض کر رکھا تھا۔

''میجسٹی کی جے ہو...... میجسٹی زندہ آباد......'' کہتے ہوئے وہ دونوں ''ڈرائنگ روم'' اندر داخل ہوئے اور نہایت مؤدبانہ انداز میں انہوں نے مائیکل سمیت ہنری کو بھی کورنش کیا۔

''بیٹھو...... بیٹھو، مائی ڈیئر فرینڈز!'' جنرل مائیکل شا نے ان دونوں سے کہا۔ لال چند اور گرکھ سنگھ سامنے والے ایک صوفے پر دھنس کر بیٹھ گئے جبکہ جنرل مائیکل پہلے ہی اپنے صوفے پر براجمان ہو گیا تھا اور ہنری کو بھی اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

انہیں لانے والے ملازم کو مائیکل نے اشارہ کیا تو اس نے جلدی سے ایک خوبصورت شیلف پر رکھی دو گلاسیوں میں مشروب انڈیل کر ان کے سامنے میز پر رکھ دیا اور ایک طرف مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''لگتا ہے تم دونوں کوئی خاص خبر لائے ہو......؟'' مائیکل شا نے ان کے سامنے دھری گلاسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل سرکار...... اخبر کیا ہے بس ایک نیا کھٹراگ سمجھ لو......'' چندی چندی مکار آنکھوں اور لمبوترے چہرے والے لال چند نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''کیسا کھٹراگ......؟'' مائیکل نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سرکار......! جنگِ آزادی تو اپنے آخری دم پر ہے مگر ان مسلوں کے دلوں میں ایک نئی تحریک پروان چڑھنے لگی ہے......''

''ذرا کھل کر بات کرو مسٹر چند تا کہ ہم کچھ سمجھ سکیں۔''

تب ہی لال چند نے اپنے ساتھ بیٹھے ساتھی گرکھ کی طرف دیکھا تھا جو اس کی نظروں کا مطلب بھانپ کر جنرل مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سرکار......! مسلمانوں کے دلوں میں دو قومی نظریے کی بنیاد پڑنے لگی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک دبلا پتلا پارسی نوجوان ہے جو طلبا تنظیم کا لیڈر بھی ہے، وہی دھیرے دھیرے یہ بیج بو رہا ہے۔ آگے چل کر وہ ان مسلمانوں کا راہنما (قائداعظم محمد علی جناح) بھی بن سکتا ہے اور سرکار کے لیے تو سب سے بڑا خطرہ بننے والا ہے وہ مسلا...... وہ وکالت پڑھ رہا ہے۔ بہت قابل طالبِ علم ہے اور قانونی جنگ کرنا جانتا ہے۔'' گرکھ سنگھ نے اپنی بات ختم کی تو جنرل مائیکل کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور بولا۔

''مسلمانوں میں اب کوئی دم خم نہیں رہا ہے۔ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو ہم کالے پانی کی سزا پر بھیج چکے ہیں۔ یہ بجھتے چراغ کی وہ آخری روشنی ہے جو ٹمٹمانے کے بعد سرد ہو جاتی ہے۔ تم لوگ اس کی فکر نہ کرو......''

''لیکن سرکار......! ہمارے لوگ چاہتے ہیں کہ اس تحریک کو ابھرنے سے پہلے ہی اس کی پہلوٹھی میں ہی نشٹ کر دو...... یہ آگے چل کر آپ کے لیے بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔''

اس بار لال چند نے کہا تو مائیکل چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد اپنی جیب سے ایک سگار کیس نکال کر بولا۔

''تو ٹھیک ہے پھر...... برصغیر کے ہندو مسلم جو ابھی آزادی کی جنگ میں معروف ہیں، انہیں مسلمانوں کے دلوں کے میل سے آگاہ کر دو...... پھر آزادی کی یہ طاقت

منقسم ہوکر ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گی۔‘‘
’’ارے واہ...... سرکار! کیا غضب کی ترکیب سوجھی ہے، ہم آج ہی سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور مسلوں کی اس سازش سے اپنوں کو آگاہ کرتے ہیں۔‘‘ لال چند نے خوش ہوکر کہا اور پھر وہ دونوں رخصت ہوگئے۔
’’دیکھا تم نے مائی ڈیئریسٹ فرینڈ! کس طرح ہم لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر چلتے ہیں۔‘‘
’’مجھے اب اجازت دو تو بہتر ہوگا......‘‘ پروفیسر ہنری برنارڈ نے خاصی بیزاری سے کہا اور اٹھ کر اوپری منزل کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اپنے عقب سے مائیکل کے بدمست قہقہے کی گونج سنائی دی تھی۔ جو عنقریب پورے برصغیر میں فسادات اور کشت و خون کی ایک نئی قیامت لانے کا بگل بجا رہی تھی۔

☆☆☆

کوہِ شمالیہ...... کی وہ رات کسی لاش کی طرح سرد اور خاموش تھی...... مبہوت اندھیاروں میں سنگلاخ پہاڑیوں کے ہیولے خوابیدہ عفریت کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے دامن میں کل پانچ نفر کا پڑاؤ تھا۔ وہ پانچوں جوان الاؤ کے گرد جمع تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔
الاؤ پر ایک چوبی قینچی میں جنگلی خرگوش کے دو سالم پھنور...... پک کر بوٹی کی طرح سرخ ہوگئے تھے اور وہ باتوں کے دوران اس پر سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ چوبی قینچیوں کی لکڑی کو کنڈ باوری کے درخت کے بیروزے سے تر کیا گیا تھا اسی لیے وہ آگ میں جلنے سے قدرے بچی ہوئی تھیں۔ یہ مخصوص لکڑی اور بیروزا مل کر ایک ایسا تیل نما مواد بھی خارج کر رہی تھی جو خرگوش کے گوشت کو لذیذ بنائے ہوئے تھی۔
ان کے سروں پہ کھلا تاریک آسمان تھا، وہاں بھی کہرے اور دھند کے بادل سے ٹھہرے ہوئے نظر آتے تھے۔ قرب وجوار کی سنگلاخ گھاٹیوں اور دروں میں سرد ہوائیں سرسراتی گونج پیدا کر رہی تھیں۔ کبھی دور کسی آوارہ جانور کی آواز ابھرتی تھی اور پھر وہی دم بہ خود سا سکوت طاری ہو جاتا۔
’’میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔‘‘ ان میں سے ایک نے ہولے سے کہا۔ اس نے کھدر کا پرانا مگر گرم لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال چھوٹے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بوسیدہ سی شال اوڑھ رکھی تھی۔ چہرہ قدرے دبلا، جبڑے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں مگر جسم کسرتی تھا۔ آنکھیں ایک عزم صمیم کی چمک سے روشن محسوس ہوتی تھیں۔ شانے چوڑے تھے۔
’’اتنی جلدی کیا ہے، شاہ زمان! ہم خطرے سے باہر اور منزل کے قریب ہیں۔ تھوڑا اور ستالینا چاہیے ہمیں۔ سہ پہر سے ہم مسلسل سفر میں ہیں۔ انگریز کمپنیوں کے چھاپوں کے ڈر سے ہم کہیں بھی نہیں ٹھہر سکے۔‘‘
اس کے دائیں جانب بیٹھے ایک دوسرے نوجوان نے کہا۔ یہ علی ریحان تھا۔ فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل ثمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ دراز قامت مگر چھریرے جسم کا مالک جس کے جسم کی حرکات و سکنات سے ایک خاص قسم کا جنگجوانہ انداز ٹپکتا تھا۔ جنرل ثمیر خان کے گروپ میں اسے ’’بارودی ماہر‘‘ کہا جاتا تھا۔
’’یہ تو شکر ہوا کہ راستے میں انڈین ٹاٹا ٹرک مل گیا، ورنہ تو تھک کر چور ہی ہو جاتے۔‘‘
پہلے والے نے کہا۔ اس کا نام احسان جامو تھا۔ یہ کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی اور ایک پورے گروپ کا انچارج تھا جبکہ ان کا تیسرا ساتھی شاہ زمان بذات خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا گروہ ’’کاروانِ مجاہد‘‘ کہلاتا تھا۔ باقی دو بھی اسی کے ساتھی تھے جو اپنے لیڈر کے ہمراہ آئے تھے۔ ان میں ایک شرجیل شکری اور دوسرا قیصر شاہ تھا۔ ان میں گروپ لیڈر علی ریحان تھا۔
ان پانچوں کو ایک خطرناک اور اہم مشن سونپا گیا تھا جو مکمل طور پر گوریلا ایکشن تھا۔ ان کے پاس اسلحے کے نام پر دو توڑے دار بندوقیں، ایک کیلی بارز رائفل اور برطانوی گن مارک تھی۔ علاوہ ازیں تین عدد بارودی تھیلے، تین سنگینیں بھی تھیں۔ ان کی منزل قریبی ریاست ناگرہ تھی۔
یہاں کا مہاراجا چندر گپتا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز لیفٹیننٹ کیپٹن کمانڈر مائیکل شا کو دو مسلم ریاستوں کے خلاف مکمل سپورٹ کر رہا تھا۔ اگرچہ مذکورہ دو ریاستوں میں سے ایک ریاست تریپال میں مسلمان نواب شہباز خان کی حکومت تھی جبکہ اس سے ملحقہ ریاست پالن پور تھی جس کا مہاراجا مہندر سنگھ نواب شہباز خان کا حلیف تھا۔ اگرچہ اس ’’دوستی‘‘ میں بھی اس کا اپنا مفاد کارفرما تھا تاہم وہ نواب شہباز خان کی دوستی کا دم بھرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز سامراج نے چندر گپتا کو شہ دے رکھی تھی کہ وہ ان دونوں ریاستوں پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو جائے، اس کی مکمل سپورٹ کی جائے گی۔ اس کے لیے وہ اپنے نائب

کمپنی افسر جان پال کو روانہ کرنے والا تھا اور عنقریب اسی سلسلے میں وہاں کے مہاراجا چندر گپتا کی محل نما حویلی میں فرنگی کمانڈر جان پال کی اپنے خاص ساتھیوں کی معیت میں مہاراجا کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں مہاراجا چندر گپتا کے سینا پتی (سپہ سالار) موج سنگھ نے اس فرنگی افسر نائب کو ضروری بریفنگ دینا تھی، تاکہ وہ تریپال اور پالن پور پر چڑھائی کرنے کے لیے اپنی رجمنٹ اور عسکری نفری بھیجنے کا بندوبست کرسکے۔ اسی ''خصوصی نشست'' کو سبوتاژ کرنے کے لیے ان پانچوں مجاہدوں کو گوریلا مشن پر روانہ کیا گیا تھا تاکہ ایک طرف مہاراجا چندر گپتا فرنگیوں کے ساتھ اس غاصبانہ گٹھ جوڑ سے باز آجائے اور اسے دھمکی بھی مل جائے کہ اس طرح کی حرکت اسے مہنگی پڑسکتی ہے اور باغی مجاہدین کا رخ اس کی ریاست کی طرف ہونے سے ان کا اپنا امن تباہ ہوجائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان مذکورہ پانچوں مجاہدین نے وہاں بغیر کسی جانی نقصان کے بدامنی پھیلانے کے لیے کچھ کارروائیاں بھی انجام دینا تھیں اور جاسوسی کے لیے انہیں وہیں کچھ عرصے کے لیے ڈیرا بھی ڈالنا تھا۔

اس ''خصوصی نشست'' کی خبر شہباز خان کے ہی ایک جاسوس شاکل نے انہیں دی تھی جو وہیں خفیہ طور پر مقیم تھا اور انہوں نے ناگرہ پہنچ کر سب سے پہلے اسی سے رابطہ کرنا تھا۔

کوہ شالیہ کی ان تینوں قریبی ریاستوں نے دیگر ریاستوں کی طرح اسی وقت آزادی اور خودمختاری حاصل کرلی تھی جب انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں نے مغلستان کو کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم کرکے رکھ دیا تھا۔

ملک کے ایک بڑے حصے پر انگریز قابض تھے اور مغلستان کے آخری تاجدار ظفر شاہ کو بھی اپنے راستے سے ہٹا کر پورے ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تنگ نظری، تعصب اور ناروا حکمت عملی سے پورے ملک میں اشتعال پھیل گیا تھا اور محب وطن عناصر نے جگہ جگہ تھوڑی بہت قوت مجتمع کرکے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ جسے انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دے رکھا تھا۔ باغیوں میں زیادہ تعداد مسلمان مجاہدین کی تھی۔ کچھ ہندو بھی تھے، مگر وہ زیادہ تر غدار اور مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ رویے کے باعث انگریزوں کی پس پردہ پشت پناہی کررہے تھے جس کے باعث انہیں بڑی بڑی مراعات حتیٰ کہ ریاستیں تک ملی ہوئی تھیں۔ یہیں پر دوقومی نظریے کی بنیاد پڑی تھی اور مسلمانان برصغیر کے اذہان میں الگ ملک کے مطالبے کا تخم آزادی نمو پانے لگا تھا۔ اگرچہ ابھی اس میں بہت دیر تھی۔

انگریزوں نے جو شرق الہند سے ایک تجارتی گروہ کے روپ میں آئے تھے بلکہ نکالے گئے تھے، ان کی سازشوں کو محسوس کرتے ہی ولندیزیوں نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔ یہ تجارتی ادارے کی صورت درحقیقت برصغیر میں برطانیہ کے قبضے کی راہ ہموار کرنے آئے تھے اور اپنے ادارے کا نام انہوں نے ''برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی'' رکھا تھا۔ اب ان کی ساری توجہ کا مرکز انڈیا تھا۔ بمبئی ان کے حلقۂ اثر میں آچکا تھا۔ یہیں پر جنگ حریت نے زور پکڑا اور ان مجاہدوں کو تنظیم کامیابیاں بھی ملیں مگر کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی، کوئی موثر حکمت عملی اور مرکزی قوت نہ ہونے اور سب سے زیادہ کچھ بڑے لوگوں کی غداری کے باعث یہ جنگ حریت ناکام ہوگئی۔ باہمی نااتفاقی نے بھی اس عظیم مقصد کو نقصان پہنچایا اور اسی نااتفاقی کی بنا پر اپنوں کی مخبریوں کی وجہ سے مایوس اور بددل ہوکر مجاہدین کے بڑے بڑے ٹولے شمالیاتی پہاڑیوں کی طرف نکل گئے۔

انگریز فوجیوں کی کمپنیاں ان باغیوں (حریت پسندوں) کے تعاقب میں تھیں اور مجاہدین کی ان سے جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

فرنگیوں کو ہنوز باغیوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔

بہرکیف...... پانچوں مزید کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ روانہ ہوگئے۔ ایک درّے سے گزرنے کے بعد وہ ریاست ناگرہ کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔ پہاڑیوں کی سنگلاخ بلندیوں سے سپیدۂ سحر کی لکیر ابھرنے لگی تھی۔

وہ اب پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہوکر آگے بڑھ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ دشمن علاقے کی سرحد کے قریب تھے اور کسی وقت بھی چوب دار یا مہاراجا کے مسلح چوکیداروں کی نظروں میں آسکتے تھے۔ ان کے مخبر نے ریاست میں داخلے کے لیے ایک خانہ بدوشوں کی بستی کا پتا بتایا تھا جو کرتب کے تہوار پر قافلے کی صورت میں ریاست ناگرہ میں بغیر تلاشی اور رکاوٹ کے داخل ہونے کی اجازت رکھتے تھے۔ اس قبیلے میں شامل ہونے کے لیے راہ پہلے ہی ہموار کی جاچکی تھی۔ اس شخص کا نام تارا تھا۔ وہ ایک لالچی شخص تھا اور پیسے لے کر حریت پسندوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس نے ان سے ترمائی کی ایک گھاٹی کے پاس، پو پھوٹتے ہی ملاقات کا وعدہ

کرر کھا تھا۔ یہ پانچوں ذرا ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے تھے۔
انہیں وہاں ایک دبلا پتلا سا خاکستری رنگت کا شخص دکھائی دیا۔ اس نے جھلنگا سا چولا ٹائپ لباس پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں سے تھوڑا ہی نیچے جھول رہا تھا۔ شکل اس کی لبوتری تھی۔ گلے میں منکوں کی مالا تھی۔ ہاتھ میں کوئی ڈنڈا سا پکڑ رکھا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے درمیان ہی لگتی تھی۔ یہ تارا تھا۔

''آگئے ہو تم......'' اس نے ان تینوں کو پہچانتے ہی نیچی آواز میں کہا۔

''کیا یہ محفوظ جگہ ہے؟ میرا مطلب ہے ہم یہاں کچھ دیر کھڑے ہو کر بات کر سکتے ہیں؟'' علی ریحان نے اس سے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

''اس طرف آجاؤ......'' تارا نے ادھر ادھر گردن گھما کے کہا اور ایک دائیں جانب کی چٹان میں بنی گپھا کی طرف بڑھا۔ یہ تینوں بھی اس کے پیچھے ہولیے۔

وہ گپھا سامنے سے تنگ مگر اندر سے کشادہ تھی، البتہ اس کی چھت کافی نیچی تھی اور وہاں جابجا سنگلاخ رخنے نظر آرہے تھے جن میں سے جھاڑ جھنکاڑ، عمر رسیدہ درختوں کی جٹاؤں جیسی سوکھی شاخوں کے مانند جھولتا نظر آرہا تھا۔ اسی وقت دور سنگلاخ ویرانوں میں کوئی جنگلی جانور چیخا۔ اس کے بعد وہی دلوں میں ہیبت طاری کر دینے والا سناٹا تھا۔

پو پھٹنے کی روشنی، کسی حد تک اندر پڑ رہی تھی۔ تارا ایک تاریک سے کونے میں جا کر دوبارہ نمودار ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک میلی چیکٹ سی گٹھڑی نظر آرہی تھی۔ وہ اس نے ان تینوں کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

''اس میں وہ تو ہارے مطلب کا سب سامان موجود ہے۔ جلدی سے پہن لو، میں تب تک باہر کھڑا ہوتا ہوں۔'' تارا یہ کہہ کر گپھا سے باہر جانے لگا تو شاہ زمان نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، تم ادھر ہی رکو کہیں باہر کھڑے ہو کر دیکھ نہ لیے جاؤ......''

تارا وہیں ٹھہر گیا۔ احسان جامو نے شاہ زمان کی طرف دیکھ کر مسکرا کے کہا۔

''پسند آئی دوست! تمہاری یہ احتیاط پسندی......''

اس کے بعد شاہ زمان نے اپنے دونوں قریبی ساتھیوں شرجیل شکری اور قیصر شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں حرکت میں آئے اور گٹھڑی کھول ڈالی۔ اس کے اندر اسی طرح کے گندے سندے چولے نما کپڑے، ٹوپیاں اور رنگین مالائیں بکھری پڑی تھیں۔

''اب ترنت کام نپٹالو......دیری ہو رہی ہے۔ آگے بھی جانا ہے ہمارکو......'' گپھا کے دہانے کے پاس کھڑے محتاط انداز میں باہر جھانکتے ہوئے تارا نے ان سے کہا۔

وہ پانچوں حرکت میں آگئے اور ذرا ہی دیر بعد وہ سب بھی تارا جیسے نظر آنے لگے۔ البتہ اپنا اسلحہ انہوں نے ان لٹکتے جھولتے چولوں کے نیچے جسموں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

''ہاں......یہ بات ہوئی نا......'' تارا ایک دم چہک کر بولا۔ ''نکلو باہر اور جیسا سمجھایا ہے ویسا ہی کرنا......'' یہ کہہ کر سب سے پہلے وہی گپھا سے باہر نکلا کیونکہ دہانے کے قریب وہی کھڑا تھا پھر جیسے ہی یہ پانچوں بھی اس کے عقب میں گپھا سے باہر نکلے، اچانک ہی ایک گرج دار آواز نے ان کے قدموں کو منجمد کر ڈالا......

''ہالٹ......اینڈ ڈونٹ بی موو......تم سب کے سب ہمارے نشانے پر ہو......''

پانچوں کو یکلخت سانپ سونگھ گیا۔ تارا تو وہیں سینہ تھامے زمین پر لیٹ گیا۔ وقت کی سنگینی صرف چند ثانیے کے لیے بھاری سل کی طرح ان کے سروں پر مسلط رہی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے اس اہم مشن کو سبوتاژ ہونے سے بچانے کے لیے ''کاروانِ مجاہد'' کے شاہ زمان نے سردھڑ کی بازی لگا دینے کا اٹل ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں شرجیل اور قیصر کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کیا اور اسی وقت دونوں جوانوں نے اپنے لیڈر (کاروانِ مجاہد) کے اشارے کو بھانپتے ہی خود کو اس مشن پر دیوانہ وار قربان کر دینے کی ٹھان لی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے۔

لمحاتی توقف اور کسی ساتھی کی جاں فروشانہ حرکت کا انتظار یہ ان گوریلوں کی تربیت کا حصہ تھا۔ ایسے کسی بھی خطرناک موقع پر دو ہی باتیں ان کی منتظر ہوتی تھیں۔ یا تو ہتھیار ڈال دو یا پھر سردھڑ کی بازی لگا دو......اور شاہ زمان نے اپنے دونوں مذکورہ ساتھیوں کو اسی بات کا اشارہ کیا تھا۔

ان کی عقابی نظروں کے احاطے میں سردست پانچ سے چھ گن بردار تھے، انہی دھڑکتے ہوئے لمحات میں شرجیل اور قیصر نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے اپنے باقی تینوں ساتھیوں کو اپنے جسموں کی ڈھال پہنا دی۔ اسی وقت گولیوں... کی بھیانک تڑتڑاہٹ

ابھری۔ شرجیل اور قیصر رقص اجل کے نرغے میں آچکے تھے مگر یہ ان کا جذبۂ حریت تھا کہ انہوں جس خاص مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا چاہا تھا اس کے لیے وہ دونوں گولیوں سے چھلنی ہونے تک تنے کھڑے رہے تھے، جب تک کہ ان کے باقی ساتھیوں کو دشمن کے خلاف کچھ کرنے کا موقع نہ مل گیا۔ وہ دونوں جیسے ہی جام شہادت نوش کرتے ہوئے زمین پر گرے، اسلحہ پوش دشمن کا یہ گشتی گروپ ایک لمحے کو دنگ رہ گیا۔ کیونکہ باقی تینوں حریت پسند غائب تھے۔ ایک لمحے کو تو انہیں اس چالا کی کا پتا ہی نہ چل سکا مگر دوسرے ہی لمحے گپھا کی سنگلاخ دیواروں کی آڑ لیتے ہی علی ریحان، احسان جامو اور شاہ زمان اپنی گنیں نکال چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کی قربانیوں کو ضائع نہ جانے دینے کی جیسے قسم کھالی تھی اور دشمن کو اسی لحاتی حیرت میں مبتلا کرتے ہی ان پر گولیاں برسادیں۔ وہ سب حلق سے بھیانک چیخیں اگلتے ہوئے گرے۔ کچھ نے پیچھے کو ہٹ کر گرتے ہوئے کسی چٹانی آڑ میں جانے کی بھی کوشش چاہی تھی مگر بے سود...... مجاہدین کی گولیوں نے انہیں چاٹ ڈالا تھا۔

اس مختصر سی گمن گرج کے تھمتے ہی کوہ شمالیہ کی ان سنگلاخ فضاؤں میں ایکا ایکی سناٹا طاری ہو گیا۔ تارا ہنوز اوندھے منہ پتھریلی زمین پر پڑا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ گدی پر تھے۔ علی ریحان نے اسے ٹھوکر لگائی۔

”تارا...... ! کھڑے ہو جاؤ...... وقت نہیں ہے ہمارے پاس......“

اس کی آواز سن کر تارا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان تینوں کی طرف اور زمین پر خون کی چھپڑی میں پڑی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد انہیں اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف ہولیا۔ تینوں بھی اس کے پیچھے ہولیے۔ انہیں اپنے دونوں ساتھیوں کی موت کا از حد دکھ تھا اور اسی دکھ نے ان کے کوہ شکن حوصلوں اور عزم صمیم کو مزید پختہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے مشن میں ہر قیمت پر کامیاب ہوں گے......

☆☆☆

دلی کے وسط میں واقع ”سرداراں والا محلہ“ کے ایک تنگ و تاریک مکان میں کریم بخش اپنے مختصر کنبے کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ یہاں زیادہ تر مزدور تائپ اور غرباء کا طبقہ رہتا تھا۔ کریم بخش کا ایک ہی بیٹا تھا شوکت حسین۔ وہ جوان تھا۔ عمر انیس سال تھی۔ قد کاٹھ کا اچھا تھا اور صحت بھی اچھی تھی۔ شکل و صورت کا بھی خوبرو تھا۔ رنگ گورا اور اس کے سر کے بال گھنے اور بھورے تھے۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ ماں کی کاپی تھا۔ اس کی ماں .... ایک خوب صورت خاتون تھیں۔ شوکت اسپیشل میٹرک پاس تھا۔ (اس زمانے میں میٹرک کے بعد بھی ایک سال اور پڑھنا پڑھتا تھا، جو اسپیشل میٹرک کہلاتا تھا۔ وہ پاس کرنے کے بعد ہی آگے کالج، فرسٹ ایئر یا انٹر میں داخلہ ملتا تھا۔) اس کے بعد اس کا آگے پڑھنے کو جی نہ چاہا تھا۔ باپ نے اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ خود کریم بخش ایک انگریز فوجی افسر کا سائیس تھا۔ وہ اس کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور اب اپنے بیٹے شوکت کو بھی کام پر لگا لیا تھا۔ وہ بھی باپ کے کام میں دلچسپی لینے لگا لیکن ”کام“ میں دلچسپی کی وجہ کچھ اور تھی جسے اس نے ابھی خود تک محدود کر رکھا تھا۔

ایک فرنگی کے ہاں نوکری کرنے پر اس مختصر سے کنبے کو کچھ ”اپنوں“ کی مخالفت کا سامنا بھی تھا مگر انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ کریم بخش کا کہنا تھا کہ وہ غریب اور حق حلال کی روزی کمانے والے لوگ تھے جبکہ اس کا اصل پیشہ بھی یہی تھا، مگر ایک عرصے سے اس کے پاس مطلب کی کوئی نوکری نہ تھی۔ چھوٹی موٹی مزدوری کبھی مل جاتی تھی کبھی نہیں۔ اکثر اس گھرانے پر فاقوں کی نوبت بھی آئی تھی اور فاقہ کشی کے ساتھ بیماریاں بھی لازم و ملزوم ہوتی ہیں، اس کی بیوی سخت بیمار ہو گئی تھی۔ سکینہ بے چاری مرتے مرتے بچی تھی۔ تب ہی ایک ہندو دوست کی معرفت اسے ایک اس انگریز افسر کے بنگلے میں نوکری مل گئی اور وہ بھی اس کے مطلب کی، یعنی گھوڑوں کی دیکھ بھال۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ بس، وہ دن تھا اور آج کا دن اس کے معاشی مسائل زیادہ نہیں تو کافی حد تک حل ہو چکے تھے اور اب تو اس نے اپنے بیٹے شوکت کو بھی اس کام میں لگا دیا تھا۔

لیکن ساتھ ہی کریم بخش ایک اور فکر میں بھی تھا۔ وہ ایک پختہ العمر اور جہاندیدہ و زمانہ چشیدہ شخص تھا۔ اس نے ملک کے دن بہ دن بگڑتے ہوئے سیاسی حالات اور فسادات کا اندازہ لگا لیا تھا اور اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح اس فرنگی آفیسر کے سرونٹ کوارٹر تک رسائی حاصل کر لے۔ جہاں وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ محفوظ اور مامون زندگی بسر کر سکتا تھا۔

اس نے اپنی درخواست دے رکھی تھی۔

”ابا...... ! ہم اس بنگلے کے کوارٹر میں کب تک چلے جائیں گے؟“

یہ اسی روز کا ذکر تھا۔ دونوں باپ بیٹے مختصر سے صحن میں بچھی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھے رات کی بچی ہوئی روٹی چائے سے کھا رہے تھے۔ سکینہ نے روٹیوں پر تیل لگا کر انہیں گرم کیا تھا جو انہیں بہت پسند تھیں۔ شوکت نے نوالہ منہ میں ڈال کر چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے باپ سے پوچھا تھا۔

''دیکھو، بیٹا! آج جواب مل جائے گا۔'' کریم بخش نے جواب دیا۔

''کیا ہماری درخواست وہ انگریز آفیسر قبول کرلے گا؟''

''کرنا تو چاہیے، آخر کو ہمارے کام سے بہت خوش ہے۔'' کریم بخش نے امید دلائی اور شوکت ریٹا کے خیالوں میں کھو گیا۔

ریٹا ایک سترہ اٹھارہ سالہ فرنگن دوشیزہ تھی جس پر شوکت کا دل آ گیا تھا۔ بنگلے میں اگرچہ اور بھی خواتین اور لڑکیاں تھیں مگر شوکت کے دل کو ریٹا بھا گئی تھی۔ اس کی مخمور کردینے والی نیلی آنکھیں، سیب جیسے پرکشش بھرے بھرے گورے گال اور سنہرے گھنے ریشمی بالوں والی یہ معصوم صورت گڑیا سی دوشیزہ اسے بھا گئی تھی۔ وہ اسے گھڑسواری سکھاتا تھا۔ وہ جب اس کے سامنے گھڑسواری کے چست لباس میں آتی تو اس کے سیم تن وجود کی حشر سامانیاں شوکت کے لیے ایک امتحان سی بن جاتی تھیں۔ لانگ بوٹ، شارٹ کوٹ اور کارڈرائن کی چست پتلون میں ملبوس وہ فرنگن دوشیزہ اس کے حواسوں پر بجلیاں سی گرانے لگتی۔ گھنے ریشمی بالوں پر اس نے خاصے اسٹائل سے کیپ پہن رکھی ہوتی تھی۔ شوکت جب تک اس کے ساتھ رہتا، اپنے ساتھ اپنے دل کو بھی اسے سنبھالے رکھنا پڑتا تھا۔ اسے ایک بات پر اکثر الجھن ہوتی تھی۔ ریٹا اس کے خلاف توقع ایک خاموش طبع لڑکی تھی۔ حالانکہ شوکت کے خیال کے مطابق اس عمر کی لڑکیاں خاصی تیز طرار اور شوخ و چنچل ہوتی ہیں۔ جیسی حویلی کی اور انگلش دوشیزائیں تھیں، بلکہ اس نے تو یہاں بیشتر انگریز خواتین کو بھی بھدے انداز میں چہلیں اور ہنستے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ شوکت کی شخصیت خوبرو اور ہینڈسم ہونے کے سبب بعض خواتین اور لڑکیاں اس کے ساتھ بھی فری ہونے کی کوشش کرتی تھیں یا پھر یہ کہ ان کا چلن ہی ایسا تھا۔ تاہم شوکت اپنی ''اوقات'' سے واقف تھا اس لیے وہ اپنے کام سے کام ہی رکھتا تھا۔ جانتا تھا کہ ذرا سی بھی خوش فہمی اس کے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔ یہ باتیں اس کے جہاندیدہ باپ کریم بخش نے بھی اشاروں کنایوں میں اسے سمجھا رکھی تھیں۔

اکثر یہاں تقاریب ہوا کرتی تھیں اور وہ مہمانوں کو ''سرو'' کرنے کے فرائض بھی انجام دے لیا کرتا تھا۔

لیکن...... شوکت نے جب سے ریٹا کو دیکھا تھا، وہ باپ کی نصیحت فراموش کرنے لگا تھا۔ ریٹا اسے دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ پہلے پہل وہ اسے مغرور حسینہ سمجھا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ اسے احساس ہونے لگا کہ ایسی بات نہیں تھی۔ ریٹا اس سے گھڑسواری سیکھتی تھی اور اس کے رموز سے آگاہی حاصل ہونے کی حد تک ہی اس سے گفتگو کرتی تھی۔ شوکت نے آج تک اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی نہ ہی اس کے گالوں پر کسی جذبے کی چمکتی تپش کا شائبہ تک دیکھا تھا۔ بارہا اس کے جی میں تو آئی کہ وہ کبھی گھڑسواری سکھانے کے دوران اس سے اس کی اس آزردہ آزردہ سی خاموشی کا راز پوچھ لے لیکن وہ اس کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔

تاہم ایک بات پر اسے بے حد افسوس ہوتا تھا۔ وہ اس انگریز آفیسر کے خاندان کی لڑکی نہیں تھی بلکہ وہ یہاں مہمان بن کر آئی تھی اور شوکت کو اس تلخ حقیقت کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ مہمان پردیسی ہوتا ہے اور اسے ایک دن جانا ہوتا ہے۔

''میں اسے جانے نہیں دوں گا...... ہرگز نہیں......''

ناشتا کرتے کرتے اس کے دل میں ایک جوش تلے ابھرنے والے الفاظ زبان پر بھی آ گئے۔ اس وقت تک سکینہ بھی ایک ڈلیا میں اپنے لیے گھی میں تلی ہوئی روٹی اور چائے کا پیالہ لیے چارپائی پر آ گئی تھی۔

اسے یوں اپنے آپ بولتا دیکھ کر کریم بخش اور سکینہ دونوں ہی بے اختیار چونک گئے تھے۔

''کیا ہوا بیٹا!؟ کسے نہیں جانے دو گے......؟'' سکینہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

شوکت زیرک دماغ تھا۔ سمجھ گیا کہ اس کے منہ سے کیسے الفاظ نکل گئے ہیں۔ یک دم بات بناتے ہوئے اور بغیر گڑبڑائے بولا۔

''مارگریٹ کو...... وہ مجھ سے بن کے نہیں دیتی...... بابا کہتے ہیں اسے جانے دو، میرے حوالے کردو...... مگر میں نے بھی تہیہ کرلیا ہے، اسے سدھا کر ہی چھوڑوں گا۔''

''آخر بیٹا کس کا ہے۔'' کریم بخش اپنے گبرو بیٹے کی بات کا مطلب سمجھ کر فخر سے اپنی گردن اونچی کرکے بولا۔ ''شاباش بیٹے ایسی حوصلہ اور عزم رکھنا، جانور سے بھی شکست مت کھانا......''

''یہ تم کیا باتیں کررہے ہو؟ کون جانور؟ اور...... اور یہ

شوکی کس فرنگن عورت کی بات کر رہا ہے؟'' سکینہ نے الجھے ہوئے انداز میں کہا تو شوکت ہنسنے لگا۔ کریم بخش بیوی سے بولا۔

''مارگریٹ سرکار کی سب سے زیادہ پسندیدہ گھوڑی ہے۔ دو دن ہی ہوئے ہیں، پانی والے جہاز سے انگلستان سے لائی گئی ہے۔ مگر ایسی ہے کہ پٹھے پر ذرا ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔''

''گھوڑی جو ہوئی......'' سکینہ منہ دبا کر ہنس دی۔

بات آئی گئی ہوگئی اور شوکت نے بھی تہیہ کرلیا کہ آئندہ وہ محتاط رہے گا۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ دونوں باہر نکلے اور یکے میں سوار ہوگئے۔ دونوں باپ بیٹوں کے کام پر نکلنے کا چونکہ یہی وقت یعنی علی الصباح کا ہوتا تھا اسی لیے عموماً انہیں چاچا عثمان کا ہی یکہ ملتا تھا۔ چاچا عثمان ''یکے والا'' سے ہی معروف تھا۔ لہٰذا وہ دونوں باپ بیٹوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ شوکت نے دیکھا تھا کہ چاچا عثمان اکثر اس کے باپ سے کہا کرتا تھا۔

''دیکھ رے کریمے! فرنگی کی چاکری اپنی جگہ پر ضمیر کا سودا کبھی مت کریو...... یاد رکھنا! ان فرنگیوں کے ہاتھ ہمارے مجاہدوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔''

کریم بخش جواب میں کبھی کچھ بول لیتا، کبھی خاموش رہتا۔ تاہم اس کا جواب بھی ایک ہی ہوتا۔

''مجھے پتا ہے عثمان بھائی! میں صرف اپنی روزی روٹی پر ہی نگاہ رکھتا ہوں اور بس...... تو، تو جانتا ہے کہ میرے حالات کتنے خراب تھے۔''

اور چاچا عثمان جواب میں گھوڑے کو ہولے سے چابک رسید کردیا کرتا تھا۔ گویا وہ اپنا فرض پورا کرکے مطمئن ہوجایا کرتا تھا۔

''ابا! کیا یہ انگریز بُرے ہوتے ہیں...... مگر کیوں؟'' شوکت نے ایک دن باپ سے پوچھ ہی لیا تھا اور کریم بخش جواب میں کہا کرتا۔

''نہیں بیٹا! انسان بُرا نہیں ہوتا۔ اس کی سوچ اسے بُرا بنا دیتی ہے۔''

''ہم جس انگریز فوجی افسر کی نوکری کرتے ہیں، تو کیا وہ بھی بری سوچ رکھنے والا انگریز ہے؟'' شوکت پوچھتا۔

''میرا خیال ہے اس کی سوچ کے پیچھے بھی کوئی بری سوچ ہے۔'' کریم بخش کہتا۔ ''تم بیٹا! بس، اپنے کام سے کام رکھو، ہمارے لیے یہی بہتر ہے۔''

یکے والے نے انہیں ایک میدانی علاقے کے وسیع و عریض حویلی نما بنگلے کے بڑے گیٹ کے سامنے پہنچا دیا اور لوٹ گیا۔ وہ وہاں ٹھہرنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔

گیٹ پر لمبے دستوں والی بندوقیں تھامے اور سرخ اور گولڈن کلو والی وردی میں ملبوس فرنگی سپاہیوں نے دونوں باپ بیٹوں کو پہچان کر گیٹ کا بغلی دروازہ وا کردیا۔

اندر وسیع و عریض گھاس کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف اصطبل نظر آرہا تھا۔ دائیں جانب حویلی نما بنگلے کی بڑی سی چار منزلہ عمارت تھی۔ ایک جانب سوئمنگ پول تھا۔

شوکت یہاں جب بھی آتا تو اسے نئی دنیا سمجھنے لگتا تھا۔ ہر طرف ہریالی، باغات، خوش رنگ پھول اور دیدہ زیب پودے مگر انہیں طویلے کی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں بھی پہرے دار مٹرگشت کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اسی وقت ایک گھڑسوار پہرے دار ان کی طرف بڑھا اور انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

''نئے حکم نامے کے مطابق تم آج کے بعد اس عمارت سے باہر نہیں جاؤ گے۔''

یہ سن کر کریم بخش خوش بھی ہوا اور تھوڑا سا پریشان بھی، بولا۔

''میں نے تو خود سرکار کو یہ عرضی دے رکھی تھی کہ میں یہاں کوارٹر میں اپنے کنبے سمیت رہنے کے لیے آجاؤں......''

''عرضی کو چھوڑو...... حالات کے پیش نظر اور جاسوسوں کے خطرے کے باعث یہ حکم نامہ جاری کیا گیا ہے۔ جنہیں یہ حکم نامہ منظور نہیں ہے، وہ نوکری چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔''

دونوں نے فوراً سر کو اثبات میں ہلا کر اپنے اقرار کا اظہار کردیا۔

اچانک ایک چیخ کی آواز ابھری۔ دونوں چونک پڑے۔ آواز کی سمت دیکھا تو ان کے چہروں کے رنگ فق ہوگئے۔

دوسرے ہی لمحے شوکت نے ایک عجیب حرکت کرڈالی، اس نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور فرنگی پہرے دار پر اچھل کر جا پڑا۔ پہرے دار اس اچانک اور غیر متوقع ٹکر سے سنبھل نہ پایا اور گھوڑے کی پشت سے نیچے زمین پر گر پڑا۔ ایک نوکر کی اس حرکت نے اس کا دماغ گھما دیا اور اس نے فوراً اپنی توڑے دار بندوق سیدھی کرلی اور چاہتا تھا کہ شوکت کو اپنی دھواں دھار گولی کا نشانہ بنائے

مگر دوسرے ہی لمحے بندوق کی لبلبی پر اس کی انگلی ساکت ہوکر رہ گئی اور اب وہ بہ غور شوکت کو اپنے گھوڑے پر اس طرف دوڑتے ہوئے جاتا دیکھنے لگا جدھر مارگریٹ نامی گھوڑی طوفانی رفتار سے میدان کے ایک جانب دوڑی جارہی تھی اور اس کے پائے رکاب پر رینا کی ایک ٹانگ پھنسی ہوئی تھی۔شوکت جانتا تھا کہ مارگریٹ (گھوڑی) ان کے مالک فرنگی آفیسر لیفٹیننٹ مائیکل شا کو کس قدر پسند تھی مگر شوکت کے مطمح نگاہ رینا کی جان بچانا تھا۔وہ بری طرح زمین پر گھسٹتے ہوئے جارہی تھی اور اب شاید خوف و دہشت کے مارے بے ہوش ہوچکی تھی۔

شوکت پہرے دار سے چھینا ہوا گھوڑا دوڑاتا ہوا آن کی آن میں مارگریٹ کے سر پر جاپہنچا۔اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے مارگریٹ کے ہوا میں لہراتے ہوئے دراز ایال دبوچنے کی کوشش کی تو اس طرح وہ خود بھی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گرتے گرتے بچا کیونکہ ایال ہاتھ میں آتے ہی پھسل گئے تھے۔رینا کا نرم و نازک جسم مارگریٹ کے پچھلے دونوں پیروں کے بالکل قریب ہی زمین پر گھسٹتا جارہا تھا اور شوکت جانتا تھا کہ کسی وقت بھی اگر مارگریٹ کا نعل لگا سم رینا کے سر سے ٹکرا گیا تو وہ پاش پاش ہوکر مغز سمیت میدان میں بکھر جائے گا۔لہٰذا اس نے پل کے پل ایک اور فیصلہ کیا......ایک خطرناک فیصلہ......جو اس کی جان بھی لے سکتا تھا مگر اس کے دل و دماغ میں بھڑکنے والی رینا کی محبت کی شمع نے اسے ہر خوف سے عاری کر رکھا تھا۔

اب اس کا گھوڑا مارگریٹ کے بالکل ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس نے مارگریٹ کو اپنے گھوڑے سے تھوڑا آگے جانے دیا اور جیسے ہی وہ رکاب کے قریب متوازی ہوا،اس نے درانہ وار اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے چھلانگ لگادی۔ایک ہاتھ رکاب میں دے دیا اور خود بھی خطرے کی زد میں آگیا۔اس کے جسم کو دوڑتی ہوئی مارگریٹ نے ایک طوفانی جھٹکا دیا تھا مگر وہ سنبھلا رہا اور اس نے اپنے نچلے وجود کو بھلا کر،جو زمین پر بری طرح گھسٹنے لگا تھا،رکاب سے رینا کا نرم و نازک پاؤں چھڑا دیا۔ وہ ایک ماہر اور تربیت یافتہ سائیس کا بیٹا تھا، جانتا تھا کہ اس کوشش کی کامیابی کے بعد...... رینا تو خطرے سے نکل جائے گی مگر وہ طوفانی رفتار سے دوڑتی ہوئی مارگریٹ کے نعل زدہ سموں تلے آجائے گا۔

یہ خطرناک کھیل شوکت کا بوڑھا باپ کریم بخش تو اپنا کلیجا تھامے ایک سکتے کی سی کیفیت میں دیکھ ہی رہا تھا مگر اب وہاں میدان میں دیگر مکین بھی آن موجود ہوئے تھے اور گویا سانسیں روکے یک ٹک نظریں گاڑے کھڑے تھے۔

مارگریٹ پورے میدان کا قوس کی صورت میں چکر لگا رہی تھی اور کوئی اس سرکش گھوڑی کے آگے آنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا، چہ جائیکہ اسے گولی ماردی جاتی اور یہ کام لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کرنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا کیونکہ اپنی پسندیدہ گھوڑی کے مقابلے میں اس کے مہمان دوست پروفیسر ہنری برنارڈ کی لاڈلی بیٹی رینا زیادہ عزیز اور پیاری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی بندوق ''چھتیا'' دی تھی لیکن یہی وہ وقت تھا جب عقب سے اسی پہرے دار نے،جس کا گھوڑا شوکت لے کر بھاگا تھا،جنرل شا کے عقب سے نمودار ہوکر ہولے سے مؤدبانہ انداز میں اس کے کاندھے کو تھپتھپا دیا تھا۔

ادھر رینا کا پاؤں رکاب سے آزاد ہوا،ادھر شوکت خطرے میں گھرا تھا کہ شاید اس کے بوڑھے باپ کی دعائیں کام آگئیں۔اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے اپنا سر بچا لیا تھا مگر سم کی ایک جاں کش ٹھوکر اس کے پہلو پر ضرور لگی تھی اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پیٹ کھل گیا ہو۔

رینا اور شوکت دونوں زمین پر لڑھکتے گھسٹتے ہوئے قریب بھوسے کے ایک ڈھیر پر جا پڑے۔اس طرح ......کہ دونوں کے وجود بھوسے اور آپس میں رل مل کر ایک جگہ جا پڑے۔

رینا کے نرم و گداز اور شاخ گل سے جسم کا لمس اس نے جب اپنے مضروب مگر مضبوط وجود میں محسوس کیا تو جیسے سارے درد اور تکلیف کو پی گیا۔رینا کے ریشمی سنہری بال اس کے خراش زدہ چہرے کا مرہم بن گئے۔دوریاں جیسے وصل کا امرت بن کر جسم و جاں کی نزدیکیاں بن گئیں اور وصلِ شب جیسی خمار آلود ساعتیں اس پل کو پل کے پل امر کر گئیں۔

دونوں یک جان دو قالب میں ڈھلے،بھوسے میں خلط ملط پڑے رہے۔ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح تیز تیز چل رہی تھیں۔دونوں ہی نیم بے ہوشی میں تھے یا قربتوں کے نشے میں تھے کہ بے اختیار ان ''اپنے بنے'' لمحات کو مالِ غنیمت جان کر شوکت نے رینا کے گلاب رنگ چہرے کو چومنا شروع کردیا۔اسی وقت جب شور بلند ہوا......اور لوگ باگ انہیں تلاشتے ہوئے وہاں پہنچنے لگے تو

شوکت بھی دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کوہ شمالیہ کی پہاڑیوں میں شام جھکنے لگی تھی۔ تارا نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی اور مہارت سے نمٹایا تھا۔ وہ ان تینوں کو اپنی بستی میں لے آیا تھا اور کھیا کرجیت سے ملوانے اور اسے ان کے بارے میں یہ جھوٹ بتا کر کہ یہ لوگ بھی انہی کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں سے انہیں اپنے جھونپڑے میں لے آیا تھا۔ وہاں یہ تینوں ان بنجاروں میں رل مل گئے۔ وہاں جوان اور عمر رسیدہ بنجارنیں بھی تھیں، کئی جوان اور پرکشش بنجارنوں نے ان تینوں کا دل لبھانے کی کوشش کی اور ان کے قریب ہوئیں مگر وہ تینوں کمال ہوشیاری کے ساتھ انہیں طرح دے گئے تھے کہ وہ ناراض بھی نہ ہوں اور انہیں کسی کی بھی محسوس نہ ہو۔

انہیں قافلے کے کوچ کرنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ یہ تارا ہی کی ہدایت پر ایسے وقت میں یہاں پہنچے تھے کہ آج کل میں یہ ناگرہ ریاست کی طرف اپنے سالانہ گرنتھ تہوار پر روانہ ہونے ہی والے تھے۔ معلوم ہوا کہ دو روز بعد ریاست کے چوب دار اعلیٰ سے اجازت نامہ یا بہ الفاظِ دیگر پروانۂ راہداری ملتے ہی انہوں نے کوچ کر جانا تھا۔

یہ سفر زیادہ طویل نہ تھا۔ بہ مشکل آدھے دن کا تھا۔ سفری صعوبتوں اور دشوار گزار پہاڑی راستوں کو پاٹنے کے لیے ان کے پاس خچروں کی کمی نہ تھی، مگر وہ اتنی تعداد میں نہ تھے کہ سبھی ان پر سوار ہوتے۔ یہ خچر بوڑھے، بچوں اور عورتوں کے لیے تھے۔ گویا یہ پیدل سفر تھا۔ اگلے دن صبح کھیا کرجیت کے قاصد نے ریاست ناگرہ کے دروازے سے واپس آ کر جو اطلاع دی اس نے نہ صرف لوگوں کو چونکا دیا بلکہ پریشان بھی کر ڈالا تھا۔ کیونکہ آج تک ایسا نہ ہوا تھا کہ انہیں مہاراجا چندر گپتا نے اجازت نامہ دینے سے انکار کیا ہو۔

یہ لوگ پچھلے کئی برسوں سے اپنے سالانہ گرنتھ تہوار پر ناگرہ کی جنوبی سمت میں واقع کالی کے مندر میں جاتے، پوجا پاٹ کرتے، شادیوں اور سوئمبر کی رسمیں کرتے، وہاں ایک قدرتی نالے جو "پون آشا" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، اشنان کرتے، حتیٰ کہ اپنے مردوں کو بھی وہیں نہلانے کے بعد قریب واقع ایک شمشان گھاٹ میں جلانے کی رسم بھی ادا کیا کرتے تھے بشرطیکہ اس دوران سفر میں یا ہجرت سے ایک آدھ روز پہلے کسی کی موت واقع ہو جاتی۔ ایسے دنوں میں مرنے والوں کو "خوش نصیب" سمجھا جاتا تھا کہ اس کے مردے کو پون آشا میں نہلایا جاتا اور پھر چتا چڑھا دی جاتی۔

بہرطور...... کھیا کرجیت کو پہلے تو اپنے قاصد توڑی رام کی بات پر یقین ہی نہ آیا تو توڑی رام نے ایک چھتر (کھال کا ٹکڑا) اپنی ڈب سے نکال کر تھما دیا۔ اس میں چوب دار اعلیٰ نے مہاراجا چندر گپتا کا چند سطری پیغام دیا تھا کہ اجازت ضرور ملے گی مگر اس سے پہلے حویلی سے ایک وفد کھیا کرجیت سے آ کر ملنا چاہتا ہے۔ جو کل صبح تڑکے تیز رفتار گھوڑوں کے ذریعے پہنچ جائے گا۔

اس ---- پیغام کے ساتھ ہی بنجاروں کی اس بستی میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی رائے دریافت کرنے لگا کہ آخر کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟ کھیا کرجیت نے فوراً بستی کے چند معتبروں کی نشست بلوالی۔ اگرچہ ان میں دیگر لوگ بھی موجود تھے۔

"یہ فرنگیوں کی شرارت ہے۔" ایک نے کہا۔

"لیکن پتا تو چلے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ اجازت کیوں نہیں ملی؟"

"پہلے کبھی تو ایسا نہیں ہوا۔"

"وفد آ جانے دو...... تب ہی بات کھلے گی۔"

نشست، اس آخری بات پر اتفاق رائے سے برخاست ہو گئی۔

اس بستی میں مقیم صرف چار افراد ہی پروانۂ راہداری نہ ملنے کی وجہ سے واقف تھے اور اس وقت اسی سلسلے میں سر جوڑے ایک جھونپڑی میں بیٹھے تھے۔

"معاملہ گمبھیر ہو گیا ہے۔" تارا نے سرگوشی میں ان تینوں سے کہا۔ وہ بھی سن گن لے کر ان کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے ان سے یہ کہتے ہوئے ساری بات گوش گزار کر دی۔ وہ خاصا پریشان اور تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔

"ریاست ناگرہ سے جو وفد آ رہا ہے وہ درحقیقت کھیا کرجیت سے ملنے نہیں...... بلکہ بستی کے لوگوں کو کھنگالنے کے لیے آ رہا ہے...... جس کا مطلب ہو کا تم تینوں کے ساتھ میں بھی گیا......"

تارا کی فکرمندی اور تشویش اپنی جگہ مگر تینوں مجاہدین کو اپنے مشن کی فکر ستانے لگی، جو پہلے ہی مرحلے میں بری طرح ناکامی سے دوچار ہونے لگا تھا۔

"تم تینوں جلدی سے اور اسی وقت کوئی فیصلہ کر لو۔" وہ ان تینوں کو گمبھیر اور پُرسوچ خاموشی کے

بھنور میں مستغرق پا کر دوبارہ بولا۔ ’’لیکن...... بات تو سسری پھر وہی میری گردن پر ہی آتی ہے، تم تینوں اگر یہاں سے چلے بھی جاتے ہو تو...... ضرور انہیں ان تین نو وارد افراد کی بھنک پڑ جائے گی اور پوچھا جائے گا کہ وہ کون تھے اور انہیں یہاں لایا کون تھا؟ سب کی انگلیاں میری جانب اٹھ جائیں گی۔ ہائے رام...... لالچ نے مجھے مار دیا۔ وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔‘‘ تارا نے رونا دھونا ڈال دیا۔

’’ابے چپ ہوجا...... کیوں وقت سے پہلے ہم پر وقت ڈال رہا ہے......‘‘ علی ریحان نے اسے ہولے سے جھڑکا۔ ’’ہم کہیں نہیں جا رہے ...... ادھر ہی رہیں گے۔ کیا خبر معاملہ کچھ اور ہو......‘‘

’’کچھ اور معاملہ ہو ہی نہیں سکتا......‘‘ شاہ زمان بولا۔ ’’ان کی آدھی پلٹن ہمارے ہاتھوں ماری گئی ہے، ضرور ان کے ساتھی ان کی تلاش میں وہاں گپھا تک پہنچے ہوں گے اور انہیں خفیہ گوریلا لڑائی اور ہماری دراندازی کا ادراک ہو چکا ہوگا۔‘‘

احسان جامو نے اس کی بات کی تائید میں کہا۔ ’’تمہاری بات معقول ہے، ہمیں کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر ہی کچھ کرنا ہوگا۔‘‘ اس کے بعد اس نے کچھ سوچا۔ علی ریحان نے کچھ کہنا چاہا تو احسان جامو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرایا اور پھر تارا کی طرف دیکھ کر گہری متانت سے بولا۔

’’تارا...... ! تم تھوڑی دیر کے لیے ہمیں کچھ سوچنے دو، پھر تمہیں بلا کر ہم اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ فکر نہ کرو، ہم تمہیں بھی بچانے کی کوشش کریں گے۔‘‘

تارا خاموشی سے باہر آ گیا۔ وہ شاطر دماغ تھا۔ ان تینوں کے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور اس سے پہلے کہ بہت سا وقت گزر جاتا وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے دوڑ پڑا تو کھیا کرجیت کے پاس آ کر ہی دم لیا اور مکاری سے روتے ہوئے اس کے قدموں میں جا گرا۔

’’مم...... مجھے بچا لو...... کھیا جی...... ! انجانے میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی......‘‘

کھیا کرجیت کی کٹیا نما جھونپڑی میں دو تین اور افراد بھی تھے۔ کھیا ایک سانٹھا پاٹھا آدمی تھا۔ سر کا گنجا، رنگ کا کالا اور ناک موٹی تھی۔ آنکھیں کسی بیل کی طرح ابھرواں۔ وہ انہی آنکھوں سے تارا کو گھورتے ہوئے بولا۔

’’کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی پاپ کیا ہے تو نے؟ کسی کی ہتھیا کی ہے یا دھرم شٹ کیا ہے۔‘‘

’’رام...... رام...... ! ایسا کچھ نہیں کیا ہے میں نے کھیا جی ! ...... پر......‘‘ تارا اسی طرح ہاتھ جوڑے بولا۔

’’پھر کسی بات کی چنامت کر، باقی گناہ معاف ہیں۔ اب بول ایسی کیا غلطی ہوئی ہے تیرے سے......؟‘‘

’’مجھے لکشمی کی طمع نے مار دیا......‘‘ تارا روتے ہوئے بولا اور تینوں مسلم مجاہدوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی روداد بیان کر دی اور رات ہونے والے حملے کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ سب سن کر کھیا کو یکلخت سانپ سونگھ گیا۔

’’اب بدھی مان میں سمائی کہ ماجرا کیا تھا۔ کیوں ہمیں اجازت نامہ نہیں دیا گیا تھا؟ ورنہ تو آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہوں......‘‘ خود کلامیہ انداز میں یہ الفاظ بڑبڑاتے ہوئے بولا اور کچھ لمحے کے لیے سوچ میں رہا پھر بولا۔

’’کتنے ٹاکے کھرے کیے تو نے ان سے......؟‘‘

’’ایک ہزار......‘‘

’’ایک ہزار...... !‘‘ کھیا کے لہجے میں حیرت تھی۔ یہ معمولی رقم نہیں تھی۔

کھیا کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ وہاں موجود مذکورہ تینوں افراد کی آنکھوں میں بھی ایک خاص سی چمک ابھری، تب ہی ان میں سے ایک نے کھیا کرجیت کے قریب آ کر کان میں کچھ کھسر پسر کی اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس کے بعد تارا سے کہا۔

’’وہ رقم کدھر ہے؟‘‘

’’میرے پاس ہے۔‘‘

’’ترنت جا کر ادھر لے آؤ......‘‘

تارا اپنی تکتی جان کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور جب تک وہ لوٹا، اس سے تک کھیا اپنے قرابت داروں سے صلح مشورہ کر چکا تھا۔

تارا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی میلی چیکٹ تھیلی تھی۔ وہ اس نے کھیا کرجیت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’کھیا جی ! اس میں سے دو روپے بارہ آنے میں خرچ کر چکا ہوں، باقی یہ حاضر ہیں۔‘‘

کھیا نے تھیلی اس کے ہاتھ سے لی اور اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کی ہتھیلی میں کئی چھوٹے بڑے چاندی اور نکل کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں کاغذی روپے بھی تھے، اس سے پہلے ’’گولڈ اسٹینڈرڈ لا‘‘ کے تحت سونے کے سکے اور اشرفیاں ہندوستان کی کرنسی کہلاتی

تھی، مگر انگریزوں نے برصغیر کی دولت لوٹنے کی غرض سے یہاں "معیار نقرہ" (سلور اسٹینڈرڈ) کا قانون رائج کر دیا تھا۔

کھیا کر جیت نے گٹھڑی ایک طرف سنبھال کر رکھ دی اور تارا سے بولا۔

"اب وہ تینوں کدھر ہیں؟"

"وہ جھونپڑی میں ہیں اور اس تازہ صورتِ حال پر سر جوڑے بیٹھے ہیں۔"

"ان سے جا کر کہو کہ تم تینوں اگر مکتی چاہتے ہو اور اپنا کام بھی تو فرار ہونے کے بجائے ترنت یہاں چلے آؤ...... ہم ان کی پوری پوری مدد کریں گے۔"

"ہیں...... کھیاجی......؟" تارا ششدر آنکھوں سے کھیا کر جیت کا چہرہ تکنے لگا، جس کے بدہیت ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"فوراً جاؤ...... جو کہا گیا ہے...... جلدی کرو...... پر ٹھہرو...... میں دو آدمی تمہارے ساتھ کیے دیتا ہوں۔" کھیا نے تحکمانہ کہا۔

ادھر علی ریحان، شاہ زمان اور احسان جامو آپس میں سر جوڑے بیٹھے اس مشکل صورتِ حال کا حل تلاشنے میں لگے ہوئے تھے کہ ان کی جھونپڑی میں تین افراد دندناتے ہوئے گھسے چلے آئے۔ یہ تینوں بری طرح ٹھٹک گئے اور پھر تارا کے ساتھ جب دو افراد کو بھی دیکھا تو انہیں خطرے کا احساس ہوا۔ ان کی بندوقیں ذرا فاصلے پر تھیں۔

"کسی چنتا کی ضرورت نہیں ہے۔" تارا نے ان کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "تم تینوں بہت خوش نصیب ہو کہ بیٹھے بٹھائے تمہارا کام ہو گیا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" علی ریحان نے اس کی طرف گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ علی ریحان کو ہی نہیں بلکہ اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی تارا کی بدنیتی پر یقین کی حد تک شبہ ہو چلا تھا۔

تارا نے جب ساری بات ان سے سچ سچ گوش گزار کر دی تو تینوں کو یہ سب سن کر ایک جھٹکا سا لگا اور وہ چند لمحے ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہے۔

"کہا نا...... کسی چنتا کی ضرورت نہیں ہے۔ کھیاجی سے مل لو، اس میں تمہارا بلکہ ہم سب کا فائدہ ہے۔" تارا کے ساتھ آئے ہوئے دو میں سے ایک نے انہیں متردد پا کر کہا۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ...... ہی آنکھوں میں پیغام رسانی کا اور اک عمل گزرا تو علی ریحان نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ یہ لوگ اسی وقت کھیا کر جیت کے پاس پہنچ گئے۔

"ایک ہزار اور دینے کی بات کرو تو رازداری کے ساتھ تم تینوں کو نہ صرف اس مسئلے سے بہ آسانی نکال دیا جائے گا، بلکہ جہاں کہو گے وہاں بہ خیریت پہنچا بھی دیے جاؤ گے۔"

مکار اور لالچی کھیا کر جیت نے کھڑے کھڑے ان سے دو ٹوک لہجے میں بات کر ڈالی۔ شاہ زمان نے جواب دیا۔ "رقم کا دوبارہ بندوبست کرنا اتنی جلدی آسان نہیں ہو گا اور نہ ہی ہم اتنی بڑی رقم ادا کر سکتے ہیں۔ پانچ سو کیے جا سکتے ہیں، مگر اس میں بھی وقت لگ سکتا ہے۔"

"ہمیں قبول ہے۔" کر جیت فوراً چالاکی سے بولا۔ "رقم کی ترسیل کے لیے تم لوگ کیا اقدام کرو گے؟ تاکہ ہم بھی اس سلسلے میں ضمانت رہیں۔"

"اپنے مشن کے دوران ہم تم سے رابطے میں رہیں گے۔ ابھی تو تمہارا قافلہ کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں کافی دن ڈیرا ڈالے رہے گا...... تب تک رقم بھی منگوالیں گے۔" علی ریحان نے جواب دیا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" کھیا نے تسلی سے جواب دیا تو احسان جامو اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"مگر...... اب تم یہ بتاؤ کہ اس تازہ صورتِ حال کے سلسلے میں کیا اقدامات کرنے والے ہو؟"

"ہم مہاراجا چندر گپتا کے وفد کی آمد کے منتظر ہیں۔" کر جیت بولا۔ "ہم انہیں یہ کب بتائیں گے کہ ان کے دشمن جاسوس ہمارے بیچ رل مل گئے ہیں۔ اصل بات تو ہماری ہی آخری ہو گی ناپر بھو!"

علی ریحان نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو ہلایا تھا۔ اس کے بعد وہ تینوں واپس اپنے ٹھکانے پر پلٹ آئے۔

"اس بدذات تارا نے سارا کھیل بگاڑ دیا ہمارا......" احسان جامو جھلا کر بولا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس "ڈیل" سے مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی ریحان بولا۔

"میرا خیال ہے تارا نے ایسی حرکت خود کو اور ہم سب کو آنے والے ایسے خطرے سے بچانے کے لیے کی ہو گی۔"

"ہرگز نہیں، میں تمہاری اس بات سے اختلاف کروں گا دوست!" شاہ زمان بولا۔

"تارا اگر ایسی کوئی حرکت کرتا تو وہ سب سے پہلے

ہمیں اعتماد میں لیتا پھر یہ سب کرتا، مگر وہ تو سیدھا سبھاؤ ناک کی سیدھ میں قبیلے کے مکھیا کے پاس چلا گیا۔ جس سے صاف لگتا ہے کہ وہ وہاں معافی مانگنے اور ہمارا راز فاش کرنے کی نیت سے ہی گیا تھا مگر ان کا مکھیا بھی پکا لالچی اور حریص بنیا ثابت ہوا۔"

"مجھے بھی تارا کا چہرہ اترا اترا اور مایوس لگ رہا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا۔" احسان بولا تو علی ریحان نے کہا۔

"چلو مان لیا کہ ہمارے یہ قیاسات غلط نہیں، مگر اب دوستو! تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا مکھیا مکر جیت پر بھروسا کرلیا جائے یا پھر فرار کا راستہ اپنایا جائے؟"

"اب ہمارے پاس فرار کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔" شاہ زمان گہری متانت سے بولا۔

"یہ کام تارا کے بھانڈا پھوڑنے سے قبل کرلیا جاتا تو اور بات تھی، لیکن اب ہمارے راز میں ایک قبیلے کا مکھیا بھی شامل ہو چکا ہے۔ جس کی بات ناگرہ ریاست کے ایوانوں میں اثر رکھتی ہے۔ اس کے ایک اشارے پر ناگرہ کی وادی ہمارے لیے تنگ کردی جائے گی۔ معاملہ ایک آدمی کا ہوتا، مثلاً تارا کی حد تک محدود رہتا تو اسے پلک جھپکتے ہی موت کی نیند سلا دیا جاتا۔" شاہ زمان نے ایک ذرا توقف ہونے کے بعد دوبارہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے مزید کہا۔

"ہمیں اب مجبوراً مکر جیت کی بات ماننا پڑے گی۔ لیکن کلی طور پر اس پر بھروسا کرنا بھی بے وقوفی ہوگی۔ کم از کم وفد آنے تک ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔"

وہ تینوں دھیمے دھیمے لہجے میں آئندہ کی حکمت عملی مرتب کرنے لگے۔

☆☆☆

شوکت کو ہوش آیا تو اسے اب بھی اپنے کہیں آس پاس رینا کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی، حالانکہ ہوش میں آنے تک انسان کے اپنے حواس ذرا ثانیے کو مختل رہتے ہیں لیکن یہاں ایسا کچھ نہ ہوا۔ شوکت کو اپنا ہوش کب تھا، وہ تو اب تک رینا کے تصور میں مدہوش تھا۔ اسے اپنے وجود میں کسی کے نرم و گداز جسم کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ کسی کی ریشمی گھنی زلفوں کی مہک اور شبنمی سی چھایا ہنوز اپنا آپ یاد کرا رہی تھی۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی وہ اپنے ہونٹوں تک میں اس پری جمال رینا کے گل بدن کے ان حصوں کی حلاوت ثبت محسوس کر رہا تھا جہاں جہاں اس نے بےخودی و بےاختیاری میں بوسے دیے تھے۔

جب "اپنا" یارا ہوا تو اس نے کسمسا کر گردن گھمائی اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے خود کو نسبتاً آرام دہ حالت میں پایا۔ بستر تو عام سا ہی تھا، جس پر وہ پڑا تھا جگہ بھی بس ایسی ہی تھی، جیسی کسی سرونٹ کوارٹرز کی ہونی چاہیے تھی۔ یہ جھکی جھکی چھت والا چھوٹا سا کمرا، جہاں بہ مشکل ایک چارپائی اور ایک پرانی سی کرسی سما دی گئی تھی۔ پاس ایک دیوار سے سلیب نکلی ہوئی تھی جس پر صراحی اور سٹیل کا گلاس دھرا پڑا تھا۔ چھت پر دو پنکھے مناسب رفتار سے گھوم رہا تھا۔ کھڑکی اس کے بستر کے دائیں جانب تھی، جس کی دیوار سے اس کی چارپائی لگی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے مضطرب جسم کو حرکت دینا چاہی تو جیسے سارا دکھتا ہوا بدن ٹیس بن گیا، اسی باعث اس کے منہ سے بےاختیار سسکاری نکل گئی مگر اس نے ذرا سستا کر دوبارہ بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک گیا۔ کوئی دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ اس کا باپ کریم بخش تھا۔ بیٹے کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ فوراً اس کی جانب بڑھا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے میرے بچے!" بوڑھا باپ اپنے گبرو جوان بیٹے کو ایسی ہیت کذائی میں دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔

"میں ......اب ٹھ......ٹھیک ہوں...... بب...... بابا......! آہ......ہ......ہ......"

یہ کہتے ہوئے شوکت بری طرح کراہ گیا۔

"میرے بچے! تو ٹھیک نہیں ہے۔" بوڑھا کریم بخش اپنے کڑیل بیٹے کو سسکتے پاکر پریشان ہوگیا اور الٹے قدموں پلٹ گیا۔ بستر پر صاحب فراش شوکت کو اپنے کانوں میں باپ کی داد و فریاد کرتی آواز سنائی دینے لگی جو اس کی دیوار کی کھڑکی سے آرہی تھی۔

"کوئی ہے؟ میرے بیٹے کو ہوش آگیا ہے، مگر وہ سخت تکلیف میں ہے۔"

اس کے بعد شوکت نے کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ دو افراد اس کے باپ کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو وردی پوش فرنگی تھا، دوسرا کوئی ڈاکٹر ٹائپ آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے سفید کوٹ (ایپرن) پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا باکس تھا...... باکس اس نے ایک طرف تپائی پر رکھا اور شوکت کا بہ غور معائنہ کرنے لگا۔

اس کے زخموں کی مرہم پٹی پہلے ہی کردی گئی تھی۔ اس نے ایک انجکشن لگا دیا۔ کچھ دوائیں دیں۔ اسی

وقت باہر سے کسی کے فوجی انداز میں خبرداری دینے کی آواز بلند ہوئی اور ذرا ہی دیر بعد کمرے میں دو رعب داب والے افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو فوجی وردی میں ملبوس لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا تھا اور دوسرا اس کا مہمان پروفیسر ہنری برنارڈ تھا جس کی لاڈلی اور خوبصورت بیٹی کو شوکت نے مارگریٹ نامی منہ زور گھوڑی کی سرکشی سے بچایا تھا۔

”ویل ینگ مین اکسی طبیعت ہے تمہاری؟“ جنرل شانے اس سے پوچھا۔

”میں کافی بہتر ہوں جناب!“ شوکت نے ہولے سے جواب دیا پھر ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ”ک۔۔۔۔کیا میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں۔۔۔۔؟ ام۔۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔۔“

”بے بی اب بالکل ٹھیک ہے، مسٹر شوکی! میں تمہارا بہت مشکور ہوں، تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری بیٹی ریتا کی جان بچائی۔“ اس بار ریتا کے باپ پروفیسر ہنری نے اس سے مخاطب ہو کر مسکرا کے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شوکت کے لیے بڑے ستائشی جذبات ہلکورے لے رہے تھے۔

”ویل! ہم بھی تمہاری اس بہادری کی قدر کرتے ہیں ینگ مین! تم ایک دلیر انسان ہی نہیں بلکہ ہمارے سچے وفادار ملازم بھی ثابت ہوئے۔ تمہیں یہاں آج سے ہر قسم کی مراعات حاصل ہوں گی۔“ جنرل شا بارعب مگر متاثر کن لہجے میں بولا۔

”بہت بہت شکریہ سرکار! ہم غریب لوگ ہیں، بڑی مہربانی ہوتی اگر ہمیں ادھر ہی کسی کوارٹر میں ۔۔۔۔“ بوڑھے کریم بخش کی بات کاٹ دی گئی کیونکہ اسی وقت جنرل شا گونج دار آواز میں بولا تھا۔

”شیور۔۔۔۔شیور۔۔۔۔وائی ناٹ! مسٹر کریم! تم آج ہی سے اپنی فیملی کے ساتھ ڈی سینٹ کوارٹر میں شفٹ ہو سکتے ہو اور حویلی کے ملازم تمہارے ساتھ ہیلپنگ ہینڈ میں ہوں گے۔“

شوکت کے لیے اس اعزاز میں کوئی خاص کشش نہ تھی کہ انہیں یہاں رہنے کے لیے ایک ”ڈی سینٹ“ کوارٹر مل رہا تھا مگر اس کی خوشی کا اصل سبب تو یہ تھا کہ وہ اب یہاں مستقل رہتے ہوئے، ریتا کا دیدار کرتا رہے گا۔ وہ اس کے قریب ہوگا۔ اس سے ملنے رہنے کے مواقع ملیں گے۔۔۔۔لیکن بوڑھے کریم بخش کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عام کوارٹر کے مقابلے میں ڈی سینٹ کوارٹرز کی کیا اہمیت ہوتی تھی۔ یہ فرنگیوں کے مراعات یافتہ اور خصوصی ملازمین کو ملا کرتے تھے۔ جن پر یہ فرنگی آفیسر فخر کرتے تھے کہ یہاں رہتے ہوئے ہم نے اپنے جاں نثار اور وفادار لوگوں کو اکٹھا کر رکھا ہے۔

پروفیسر ہنری غور سے اس کڑیل نوجوان کو تکے جا رہا تھا۔ وہ اپنی دشوار گزار مہم کے لیے اس کا انتخاب کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے میں محو تھا۔

ان سب کے جانے کے بعد شوکت کے دل میں ایک امید سی جاگی تھی کہ ریتا بھی شاید اس کے پاس ”شکریہ“ کہنے آئے۔ اسے یوں تو نہ صلے کی پروا تھی نہ ہی ستائش کی مگر وہ تو ریتا کو ایک نظر بھر کے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس دوران اس کا باپ اس کے بستر کے قریب دھری کرسی پر بیٹھا، بیٹے سے خوشی کے اظہار میں نجانے کیا کیا کہتا رہا تھا مگر شوکت تو کسی اور ہی تصور میں کھویا ہوا تھا۔ وہ بھی سوچتا تھا کہ کیا وہ ریتا سے واقعی محبت کرنے لگا ہے؟ یا پھر یہ محض ایک صنفِ مخالف کے لیے صنفِ نازک کی روایتی سی انسیت ہے؟ جلد ہی اس کے دل نے چیخ کر گواہی دی۔

”نہیں شوکی! یہی محبت ہے، اس میں روایت کا کیا دخل؟ آخر کو حویلی میں اور بھی تو خواتین اور لڑکیاں موجود ہیں؟ پھر آئے روز فرنگیوں کی پارٹیاں، مہمانوں کا آنا جانا۔۔۔۔خواتین اور جوان لڑکیوں سے تو شوکی کی بھی اکثر بات ہو جایا کرتی تھی۔ پر ریتا کے سلسلے میں معاملۂ دل ۔۔۔۔واقعی کچھ اور ہونے لگا تھا۔۔۔۔ وہ پہلے انسیت، پھر چاہت کے مدار سے نکل کر محبت جیسے اٹل جذبے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

☆☆☆

کریم بخش اس قلعہ نما حویلی کے کچھ ملازمین کے ساتھ ایک بڑی سی بگھی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔ سکینہ سے خوشی خوشی سارا حال کہہ سنایا، وہ بھی خوش ہوئی مگر جب اسے اپنے بیٹے شوکت کے بارے میں حادثے کا علم ہوا تو وہ ایک دم تشویش زدہ اور پریشان ہو گئی، تاہم کریم بخش نے اسے بیٹے کی خیریت اور صحت یابی سے متعلق تسلی دے دی کہ وہ اب بالکل بھلا چنگا ہے۔

کریم بخش ادھر اپنی ”شفٹنگ“ میں مصروف تھا ادھر شوکت کے دل کو قرار نہیں مل رہا تھا۔ اسے جنرل شا یا اس کے معزز مہمان پروفیسر کے متاثر ہونے اور ان کے شکریہ کہنے کی قطعی کوئی پروا نہ تھی، وہ تو بے چینی سے

منتظر تھا، رینا کا......!

"کیا وہ محض ایک شکریے کا بول تک کہنے کے لیے بھی نہیں آسکتی؟" وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔ وہ رینا کے لیے کسی احسان تلے یہ نہیں سوچ رہا تھا، اس کی مرضی تھی کہ کسی بہانے ہی سہی وہ آئے تو سہی......تب ہی وہ اپنے بے قرار خیال پر خود ہی ہنس دیا۔ وہ بھی تو اس حادثے میں زخمی ہوئی تھی۔ جب وہ خود بستر سے لگا ہوا تھا تو بھلا وہ بے چاری کیسے اٹھ سکتی یا چل پھر سکتی تھی۔ تب اسے کچھ سکون ملا اور اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ رات کو اسے سوپ اُبلے ہوئے انڈے دیے گئے۔ اسی رات تک وہ کوارٹر میں شفٹ کیا جا چکا تھا اور اب اس کی ماں سکینہ ہی اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔

شوکت کو ایک ہی جگہ اور بستر پر پڑے رہنے سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی طویلے کی راہ لے گا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

اگلے دن صبح سویرے وہ جاگ اٹھا۔ ایک نئے کھلے اور آزاد ماحول میں رات گزارنے کا یہ تجربہ اس کے لیے خاصا خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ محلہ سرداراں والا کی تنگ گلیاں، گھٹے گھٹے اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں والے گھروں سے اسے سخت نفرت تھی۔ یہاں اس ڈی سینٹ کوارٹر کا صحن ہی اس قدر کشادہ تھا کہ میدانی ہواؤں سے پورا گھر تازہ دم سا رہتا تھا۔ اس میں تین بڑے کمرے تھے۔ چھت تھی۔ سب سے بڑھ کر بنیادی ضروریات کی ساری سہولیات میسّر تھیں یہاں۔

سکینہ اور کریم بخش بھی بہت خوش تھے یہاں......

ناشتے کے بعد جب شوکت نے بھی باپ کے ساتھ طویلے جانے کی تیاری باندھی تو دونوں میاں بیوی فکرمند ہو گئے۔

"شوکی بیٹے! یہ تو کدھر چلا......؟" بالآخر باپ نے پوچھا۔

"کام پر جا رہا ہوں......" شوکت نے جواب دیا۔

"پر بیٹا! تیری طبیعت تو......"

"میں اب ٹھیک ہوں ابا!"

"کدھر سے ٹھیک ہے تو میرے لعل!" سکینہ نے ممتا بھری فکرمندی سے کہا۔ "کل تیرے ساتھ اتنا خطرناک حادثہ پیش آیا ہے اور آج تو کام پر جانے کی تیاری پکڑ رہا ہے۔ تجھے کچھ روز آرام کرنا چاہیے بیٹے!"

"اماں امیں ایسے بہت بوریت محسوس کر رہا ہوں، میں کوئی سخت کام نہیں کروں گا......بس یوں سمجھ ذرا چہل قدمی کرنے جا رہا ہوں اور ڈاکٹر نے بھی تو مجھے

بھی مشورہ دیا ہے۔'' شوکت نے مسکرا کر کہا۔

شوکت یوں ماں باپ کو بہلا کے کام پر نکل آیا۔

اس نے بھلا کہاں جانا تھا۔ کوارٹر سے نکلا اور سیدھا طویلے کا رخ کیا جو قریب ہی تھا۔ باقی عام کوارٹر طویلے کے پچھواڑے بنے ہوئے تھے، ڈی سینٹ کوارٹرز چند ہی تھے اور وہ طویلے سے ہٹ کر نسبتاً کشادہ اور کھلی جگہ پر تھے۔ یہاں سے حویلی بھی قریب تھی۔ شوکت کے پہلو کا زخم اگرچہ کافی حد تک بھر گیا تھا مگر پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ابھی گھڑسواری سے منع کر رکھا تھا۔

وہ کچھ سوچتا ہوا طویلے میں داخل ہوا اور کھر کھرا سنبھالے ایک گھوڑے کی کمر پر بے دلی سے پھیرنے لگا۔ اس کا سارا دھیان کھر کھرا پھیرنے کے بجائے پری جمال رینا کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب اسے ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا تھا تو بھلا رینا کو کہاں اتنی جلدی بستر چھوڑنے کا کہا جائے گا؟ وہ خود تو مزدور تھا اور رینا شہزادی شکل...... اسے تو طویل بیڈ ریسٹ کا کہا گیا ہوگا۔

تاہم ایک امید تو تھی کہ ہوسکتا ہے رینا بھی اس کی طرح بیڈ پر پڑے پڑے اکتا جائے اور گھڑسواری کا لباس پہنے طویلے میں چلی آئے...... اور یہی وہ وقت تھا جب دل بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ قبولیت کی اس گھڑی میں وہ خدا سے کچھ اور مانگ لیتا، کیونکہ اگلے ہی لمحے اسے طویلے کے گیٹ پر وہ کھڑی دکھائی دے گئی۔ سروقد، متناسب جسم اور گھڑسواری کے مخصوص ڈارک براؤن کلر کے چست لباس میں ملفوف، سر پر ٹوپی اور اس سے جھانکتے ہوئے اس کے سنہری بال، تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں حسب سابق بید کی اسٹک تھی جس سے وہ بڑے عجیب سے انداز میں ہولے ہولے اپنی دائیں ٹانگ کی پنڈلی پر ضرب لگا رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں ہو۔

گھوڑے کی پشت پر کھر کھرا گھماتا ہوا اس کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔ اس کی دلی مراد بر آئی تھی اور وہ آ گئی تھی۔

ہاتھ رکنے پر گھوڑا ہنہنایا تھا اور اپنی ایال بھری گردن کو گھما کے شوکت کی طرف دیکھا تھا۔ شوکت نے رینا کو دیکھتے ہی مسکرا کر اپنا ایک ہاتھ ہلا دیا۔ جواب میں رینا بھی اپنا ہاتھ ہلا دیا کرتی تھی، مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو لیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی اور شوکت کو یوں لگا جیسے رینا کا ہر اٹھتا ہوا قدم اس کے دل پر پڑ رہا ہو...... رینا کے استقبالیہ انداز میں ہاتھ نہ ہلانے پر وہ اندر سے تھوڑا کھٹکا تھا۔

''ہیلو...... مس رینا! آپ کو صحت یاب دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' وہ جب اس کے بالکل قریب آ کر کھڑی ہوگئی تو شوکت نے اسے ادب سے سلام کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''آئم اوکے...... تم کیسے ہو؟'' رینا کا مترنم لہجہ سپاٹ اور سرد تھا اور اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں ایک خاموش سی چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اندر سے ہولنے لگا، کیا اس سے کوئی غلطی ہوگئی تھی؟ اور تب ہی اسے اپنی ''غلطی'' کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت جب وہ رینا کو نیم بے ہوشی کی حالت میں اس سرکش گھوڑی مارگریٹ سے بچاتا ہوا خود سے لپٹائے بھوسے کے ڈھیر پر جا پڑا تھا تو خود پر قابو نہ پاسکا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر رینا کے ساتھ تھوڑی سی ''گستاخی'' کر ڈالی تھی۔

''تو کیا اسے احساس ہوگیا تھا؟'' اس نے سوچا۔

اسے اپنے باپ کی نصیحت بھی یاد آنے لگی۔

''بیٹا! ان فرنگیوں سے محتاط رہنا، ان کے موڈ بدلنے میں دیر نہیں لگا کرتی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتی ہیں یہ...... شکایت ہوگئی تو سمجھو روزی بھی گئی اور جان بھی......''

وہ تھرا گیا۔ پل کے پل اس نے یہ سب سوچا اور جلدی سے جواب میں قدرے خم ہو کے بولا۔

''تھینک یو مس رینا! میں بالکل ٹھیک ہوں...... بس تھوڑا سا زخم گہرا ہے۔'' اس نے آخر میں جتا بھی دیا کہ اگر ایسی کوئی ''بات'' تھی بھی تو اس پردہ طرح دار میں چھپی رہ جائے۔

شوکت کے جسم پر بھی ہلکے سبز رنگ کی وردی تھی جو اس کے کسرتی جسم پر خوب بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس میں خاصا خوبرو دکھائی دے رہا تھا۔ دراز قد پر فلڈ شرٹ اور ٹائٹ پینٹ، پیروں میں لانگ بوٹ...... اس کی شخصیت کو بھی پُروجیہہ بنائے ہوئے تھے۔

''تمہارا شکریہ! تم نے میری جان بچائی لیکن...... تم نے میری خاطر اپنی جان کیوں اس قدر خطرے میں ڈال دی تھی......؟'' رینا یہ کہتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اسی گھوڑے کی پشت پر پھیرنے لگی، جس پر شوکت کھر کھرا پھیر رہا تھا۔ شوکت کو رینا کا یہ پوچھنا اچھا تو لگا مگر اسے یہ بھی احساس ہوا کہ استفسار کا یہ انداز سرسری اور واجبی سا ہے، جیسے خانہ پُری کی جا رہی ہو۔

''مس! میں آپ کا ملازم ہوں اور مجسٹی کا نمک خوار...... میرے باپ نے مجھے یہی تعلیم دی ہے کہ اپنے

مالکوں سے وفادار رہوں اور وقت پڑنے پر جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں......"

"اچھا.....!" رینا کے گلابی لبوں سے گویا عجب انداز کا اختصاریہ برآمد ہوا۔ اس کے گداز ہونٹوں کا ایک کونا تھوڑا سا یوں کھنچا تھا جس سے ہلکے طنز کا گماں ہوتا تھا۔ اس طرح کونا کھنچنے سے اس کے مرمریں گال میں ایک ڈمپل سا بنا تھا، یہ محسوس کرنے کے باوصف کہ اس میں طنز کا شائبہ تھا، شوکت کو یہ گڑھا پھر بھی بھلا لگا تھا۔ وہ خود کو اس میں گرا ڈالنے کے لیے تیار تھا...... جو شاید اس کا اپنا ہی کھودا ہوا تھا۔

فرنگیوں کی نوکری کرتے ہوئے اور کچھ اپنے باپ سے سیکھے ہوئے ادب وآداب سے شوکت بھی واقف ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ رینا کے ساتھ اسی انداز و تمیز سے باتیں کیا کرتا تھا۔

"لیکن......آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا مگر آپ......" اس نے بات کا رخ گھمانے کی کوشش کی۔

"بہت کرلیا آرام......" رینا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مارگریٹ نظر نہیں آرہی......؟" یہ کہتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"وہ اسطبل نمبر تیرہ میں ہے۔" شوکت نے اس کے چہرے پر اپنی پُرشوق سی نظریں جمائے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"شیور......" شوکت نے کہا اور پھر دونوں رواسٹائل کے اسطبل سے ہٹ کر باکس اسطبل کی طرف آگئے۔ یہاں دو اور ملازم بھی کام میں مصروف تھے۔ یہ دونوں گھوڑوں کی گندگی صاف کرتے تھے اور فیڈر بھی تھے۔ یہ ہندو تھے۔ دونوں ہی پختہ العمر تھے۔

"نندو! مارگریٹ کے اسطبل کا فرش بہت چکنا ہورہا ہے۔" شوکت نے تیرہ نمبر کے اسطبل کے قریب آکر رکتے ہوئے قریب کھڑے ایک فیڈر سے کہا۔

"تم جانتے ہو، یہ گھوڑی صاحب کی کس قدر پسندیدہ ہے۔ پھسل گئی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو صاحب کو اسے گولی مارنے میں کس قدر دکھ ہوگا۔"

"غلطی ہوگئی......ابھی دیکھ لیتا ہوں۔" نندو نامی وہ پختہ العمر فیڈر جلدی سے اس طرف کو بڑھا اور اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔

"آج میں اسی پر سواری کرنا چاہوں گی۔" رینا نے اسطبل باکس کے چوبی بانس پر اپنے دونوں بازو ٹکا کر شوکت سے کہا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ رینا کے اس طرح لچکیلی کمر کا خم نکال کر چوبی بانس کے ساتھ ٹک کر کھڑے ہونے کے قیامت خیز انداز نے شوکت کا دل ایک لمحے کو ڈگمگا کر رکھ دیا تھا تاہم وہ جلدی سے جواباً بولا۔

"مس رینا! کیا آپ اب بھی اس پر سواری کرنا چاہتی ہیں؟"

"ہاں!"

"اس حادثے کے بعد بھی؟" شوکت کے لہجے میں حیرت کے ساتھ تشویش کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے مسٹر شوکی! کیا ایک گھڑسوار کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ایک جانور سے ہار مان لے؟ یہ تمہارا ہی مجھے بتایا ہوا قول ہے۔"

رینا نے اسی طرح کمر کا خم نکالے، دونوں بازو ہنوز بانس پر ٹکائے ہوئے محض اپنی گردن ذرا موڑ کر اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ایسے میں شوکت کو رینا کی آنکھیں چمکتی ہوئی اور ہونٹ تھرکتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ اس کا شارٹ جیکٹ نما کوٹ کمر سے کچھ اور اونچا ہوگیا تھا اور اس کی نیم برہنہ کمر کی دودھیا گوری اور شفاف جلد کچھ اور واضح ہوگئی تھی۔ شوکت نے فوراً کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا......" وہ آگے بھی کہنا چاہتا تھا کہ رینا ایک دم پلٹی اور اس کے بالکل قریب اور سامنے ہو کر مسکت اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔

"مارگریٹ کو باہر نکالو......میں انتظار کررہی ہوں۔" یہ حکم صادر کرکے وہ گیٹ کی طرف چل دی۔ شوکت اسے جاتا تکتا رہ گیا۔ وہ بھی اسے مارگریٹ کی طرح کوئی منہ زور گھوڑی ہی کی صورت نظر آرہی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی شوکت اسطبل کے دیوہیکل چوبی دروازے سے مارگریٹ کی باگیں تھامے برآمد ہوا...... مارگریٹ اس وقت پُرسکون نظر آرہی تھی۔ شوکت اس کی گردن پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ تازہ ہوا میں اس کے ایال لہرا رہے تھے۔ شوکت نے ماہرانہ نظروں سے مارگریٹ کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کو دیکھا۔ ان میں بے چینی نہیں تھی۔ تاہم وہ فکرمند تھا۔ اسی وقت قریب کھڑی رینا نے اس کے کاندھے پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھا۔ شوکت نے اپنے دل کی بے طرح دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس کی شاخِ گل جیسی کمر کے گرد اپنا ایک بازو حمائل کرکے سہارا دیا تو رینا، جو اپنا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا چکی تھی، اچھل کر مارگریٹ کی پشت پر سوار ہوگئی۔ ساتھ ہی اس نے

باگیں مضبوطی سے تھام لیں۔شوکت مارگریٹ کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا اور ساتھ ہی ریتا سے بولا۔

''اس کی گردن اور ایال کو پیار سے سہلایئے، ابھی فوراً ایڑ لگانے کی کوشش مت کیجیے گا۔''

''تم میرے ساتھ، پیچھے بیٹھ جاؤ......'' اچانک ریتا نے نیا حکم صادر کردیا۔شوکت کا دل مزید اتھل پتھل کا شکار ہونے لگا۔تاہم اس نے بھی یہی ضروری سمجھا اور خود بھی اچک کر ریتا کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔مارگریٹ زور سے ہنہنائی اور خاموش ہوگئی۔ریتا تھوڑا آگے کو جھک کر اس کی گردن اور ایال سہلانے لگی، ایسی صورت میں اس کی پشت شوکت کو چھونے لگی۔اس کے حلق میں کانٹے اگنے لگے۔اس نے ریتا سے لگام کو حرکت دینے کی سرگوشی کی اور ریتا نے سیدھی ہوکر ایسا ہی کیا۔مارگریٹ فوراً ہی دلکی چال پر آگئی۔دونوں ایک ساتھ گھڑسواری کرنے لگے۔اس کے بعد ریتا نے مارگریٹ کو ایڑ لگادی۔مارگریٹ زور سے ہنہنائی اور اس نے دوڑنا شروع کردیا۔شوکت ریتا کی پشت سے چپک گیا تھا۔ریتا کا بھی سارا زور عقب میں تھا اور شوکت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آیا وہ مارگریٹ کو سنبھالے یا ریتا کو...... مگر ایسی ''خطرناک'' صورتِ حال میں اسے دونوں کو ہی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔دونوں نے مل کر میدان کا ایک چکر لگایا اور ابھی دوسرا چکر پورا ہونے ہی والا تھا کہ فضا میں گولی چلنے کی آواز ابھری...... ریتا نے فوراً لگامیں کھینچ دیں۔مارگریٹ اضطراری انداز میں ہنہنا کر رک گئی تھی۔

☆☆☆

سرحدی بنجاروں کی بستی میں رہتے ہوئے انہیں آج دوسرا دن تھا اور آج ہی ناگرہ سے وفد کے آنے کا امکان تھا۔

''تارا ہمیں کبھی نہیں بتائے گا کہ وفد آیا ہے یا نہیں''...... شاہ زمان نے کہا۔''اسی لیے میرا خیال ہے مجھ اکیلے کو باہر جاکر معلوم کرلینا چاہیے......''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' احسان جامو بولا۔''وفد آئے گا تو اب کھیا کرجیت ہی انہیں سنبھالے گا۔''

''میرا خیال ہے شاہ زمان کا کہنا غلط نہیں ہے۔'' گروپ لیڈر ملک ریحان نے شاہ زمان کی بات کی تائید میں کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔''جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ حالات غیر یقینی ہیں، ہمیں کھیا کرجیت پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔'' پھر وہ شاہ زمان سے مخاطب ہوکر بولا۔

''تم جاؤ...... اور اگر وفد آبھی گیا ہو تو ان کی سن گن لینے کی کوشش کرنا اور جب تک کسی خطرے کی بومت سونگھ لو وہاں سے مت ہٹنا...... تاہم اگر ایسی بات محسوس نہ کرو تو آکر ہمیں مطلع کردینا۔''

شاہ زمان اسی وقت جھونپڑے سے نکل آیا۔

دور سر بفلک چوٹیوں پر دھوپ سنہری ہونے لگی تھی۔ہواؤں میں ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔شاہ زمان نے کھدر کی موٹی شال اوڑھ رکھی تھی۔تارا نے جس جھونپڑی میں ان کی عارضی رہائش کا بندوبست کر رکھا تھا، وہ نسبتاً الگ تھلگ اور پرے واقع تھی۔یہ بھی ان کے لیے درست نہ تھا، جسے ان پر شک نہ بھی ہوتا، وہ جتلائے تشکیک ہوجاتا۔شاہ زمان نے اس طرف قدم بڑھادیے جدھر کھیا کرجیت کی کٹیا تھی۔اس کے لیے اسے بستی کے وسط سے گزرنا پڑا۔کئی جھونپڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔بچوں کے رونے کی آوازوں میں عورتوں کے بیزارکن انداز میں چلّانے کی بھی آواز ابھرتی تو ماحول کریہہ سا ہونے لگتا تھا۔کچھ لوگ ادھر ادھر الاؤ دہکائے، اس کے گرد بیٹھے پہاڑی جانوروں کے سالم پٹھور بھونتے اور ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔شاہ زمان بظاہر لاابالی انداز میں چلا جارہا تھا۔

کھیا کی کٹیا قریب آتے ہی اس نے یکلخت اپنا راستہ بدل دیا۔راستہ اس نے کٹیا کے باہر بندھے چار گھوڑوں کو دیکھ کر بدلا تھا جن پر مخصوص شاہی زین کسی ہوئی تھیں۔وہ سمجھ گیا کہ مہاراجا چندر گپتا کے بھیجے ہوئے آدمی پہنچ چکے تھے۔شاہ زمان پہلے ہی محتاط تھا۔ایک نظر اور اپنے گردوپیش میں ڈال کر کسی ذی نفس کی غیر موجودی کی تسلی کرڈالی اور کٹیا کے عقبی حصے کی طرف بڑھ چلا۔

یہاں اطراف میں سناٹا طاری تھا۔کسی پہریدار یا محافظ کا بھلا یہاں کیونکر تصور ہوتا۔وہ پھر بھی احتیاط کا دامن تھامے ہوئے آگے بڑھا اور کٹیا کے عقبی حصے کے قریب آکر رک گیا۔لحہ بھر کو گردوپیش کی سن گن لی اور ایک دریچہ نما اور قدرے کشادہ روزن کے پاس سرک آیا۔یہاں ٹاٹ جھول رہا تھا۔اندر سے کسی کے بارعب انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔اس نے وہ ذرا سا سرکا کر اندر جھانکا۔تین سرخ اور ایک نیلی وردی میں ملبوس افراد تنے کھڑے تھے۔سرخ وردی پوش افراد کی پشت سے رائفلیں جھولتی نظر آرہی تھیں، جبکہ نیلی وردی والے کے بائیں پہلو سے تلوار بندھی ہوئی تھی۔وہ خاصا دراز قامت اور رعب داب والی شخصیت نظر آتا تھا۔وہ سامنے مؤدبانہ سے انداز میں کھڑے کھیا کرجیت سے

مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"ہمارے جاں نثار آدمیوں کو ان خطرناک جاسوسوں نے ہلاک کر ڈالا ہے اور یہ جب تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہاں سے انہیں مدد نہ ملی ہو۔"

"سرکار کی جے ہو، ہم تو عرصے سے سرکار اور مہاراجا کی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے آرہے ہیں۔" کھیا کمرجیت جواب میں کہہ رہا تھا۔ "ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے کہ باغیوں کے گروہ کی خفیہ مدد کریں...... آپ کو کوئی شبہ ہے تو وہ دور کر سکتے ہیں۔ میں ابھی سب کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا حکم دیتا ہوں۔"

"وہ تو ہم کریں گے ہی......" نیلی وردی والے نے کڑک دار لہجے میں کہا اور گویا حکم صادر کرتے ہوئے مزید بولا۔

"سب کو ایک جگہ اکٹھے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! ان سے یہ کہہ دو کہ سب اپنی اپنی مڑھیوں (جھونپڑیوں) تک محدود ہو جائیں اور کوئی ہمیں باہر یا ادھر ادھر حرکت کرتا دکھائی نہ دے، ورنہ ہم اسے ہی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر کے لے جائیں گے۔"

"جیسا حکم سرکار......!" کھیا کمرجیت نے کہا اور اسی وقت اس نے بستی میں یہ منادی کرا دی کہ لوگ باگ سب اپنی اپنی کٹیاؤں تک محدود ہو جائیں۔ کوئی باہر نہ نکلے، جب تک کہ حکم نہ ہو......

شاہ زمان بھی اسی وقت الٹے پاؤں دوڑتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا جو بڑی بے چینی سے اسی کی واپسی کے منتظر تھے، کیونکہ اعلان کی بازگشت ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔

"ایک ریاستی سالار کے ہمراہ...فرنگی گن مین وفد کی شکل میں آئے ہوئے ہیں اور انہیں اس بات کی بھنک بھی پڑ چکی ہے کہ ان کے آدمیوں کو ہلاک کرنے میں جن باغی جاسوسوں کی مدد کی گئی ہے وہ انہی کی بستی کا تعلق دار ہے۔" شاہ زمان نے انہیں بتایا۔

"یہ فرنگی بہت عیار ہیں۔" علی ریحان نے پُرغور لہجے میں کہا۔ "سب کو ایک جگہ مجمعے کی صورت اکٹھا کرنے کے بجائے اپنی اپنی کٹیا تک محدود کر دیا گیا ہے۔"

"ان کی اس حکمتِ عملی تلے ہم دھر لیے جائیں گے۔" احسان جامو بولا۔

"تو پھر جو کرنا ہے چند سیکنڈوں میں سوچ کے کر گزرو...... مجھے بھی بچنے کی کوئی خاص امید نہیں نظر آتی ہے۔" شاہ زمان بولا اور پھر تینوں فوراً ہی ایک فیصلے پر متفق ہو گئے۔

اگلے چند ہی سیکنڈوں میں یہ تینوں باہر تھے۔ شام اتر چکی تھی اور سنگلاخ ویرانوں میں رات کے کاجل کے پھیلنے کا گمان ہونے لگا تھا۔ وہ تینوں انہی اندھیاروں کا حصہ بنے ایک طرف کو بڑھنے لگے، ابھی انہوں نے بہ مشکل چند ہی فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ انہیں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔

ایک چٹانی اوٹ سے انہیں ناگرہ ریاست کی سرحدی پٹی کے ساتھ ساتھ بتیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

"ہوں......اس کا مطلب ہے معاملہ صرف وفد بھیجے جانے کا نہیں ہے۔" علی ریحان نے پُرسوچ انداز میں سرگوشی کی اور آگے بولا۔ "انہیں پختہ یقین تھا کہ ان کے شکار اسی بستی میں فروکش ہیں، اسی لیے انہوں نے بستی کے گرد ذرا فاصلے پر پہرا ڈال رکھا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارا بستی چھوڑنے کا یہ بروقت فیصلہ درست تھا۔" احسان جامو بولا۔

"لیکن......ہم اب بھی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔" شاہ زمان نے کہا۔ اس کے لہجے میں فکر کا عنصر غالب تھا۔ "خالی جھونپڑی پاتے ہی ہماری ڈھنڈیا پڑ جائے گی۔"

"لیکن دشمنوں کے اس پہرے کی طویل اور مضبوط زنجیر توڑنا ہمارے لیے آسان نہ ہوگا۔" علی ریحان بولا۔

"یہ توڑنا پڑے گی۔ مقابلے کے سوا اب کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔ میں بارودی تھیلیوں کو دستی بموں کی طرح استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔" شاہ زمان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"میرا خیال ہے ابھی یہ قبل از وقت ہوگا۔ ہمارے پاس سنگینیں ہیں۔ ہم ان سے کام لیتے ہوئے چیرا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گوریلا حملے کا تقاضا بھی یہی ہے۔" علی ریحان بولا۔ دونوں نے تائید میں اپنے سر ہلا دیے۔

وہ تینوں جانباز گوریلا جاسوس دشمنوں کے اس کڑے پہرے کی زنجیر کاٹنے کی غرض سے اس طرف کو جانے والے ایک نسبتاً تنگ اور بل کھاتے نشیبی راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ ملگجا سا اندھیرا ان کے چہار اطراف پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے، جو اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ کوہ شمالیہ کی شہزادیاں غسلِ شب کے لیے تیار تھیں۔ کیونکہ سیاہ گھرے اور گھٹا دار بادل ان عظیم الشان چوٹیوں کو چھوتے محسوس ہو رہے تھے۔

دشمنوں کے اس پٹی دار کڑے پہرے میں کوئی خیمہ

گڑا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا اور وہ سب کے سب سنگے وادر انگنوں کے ساتھ دست بدست چوکس کھڑے تھے۔ تاہم موسم کے تیور دیکھ کر انہیں بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔

''ادھر ہی رک جاؤ...... ہمیں بارش کا انتظار کر لینا چاہیے۔'' علی ریحان، جو سب سے آگے تھا۔ ایک قریبی چٹانی چھجے تلے آ کر رکتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

ٹھیک اسی وقت زور کا کڑاکا ہوا۔ یہی سمجھا گیا کہ آسمانی بجلی نے بارش کا اعلان کیا ہے، مگر یہ گولی چلنے کی آواز تھی جس نے ان تینوں کو بری طرح چونکا دیا تھا۔

''شاید وہ لوگ ہماری جھونپڑی تک پہنچ چکے ہیں اور اسے خالی پا کر فائر کی صورت سگنل دیا ہے۔'' شاہ زمان نے خیال ظاہر کیا لیکن اسی وقت جب فائر ہوا تو قدرے اونچائی پر واقع بنجاروں کے اس عارضی پڑاؤ پر شور مچ گیا۔ اسی وقت مزید تلے اوپر گولیاں چلیں...... لوگوں کے شور کا سوا ہوتا اضافہ بھی عروج اختیار کر گیا۔

''لگتا ہے...... ان لوگوں نے غصے میں آ کر بنجاروں کے مکھیا کو گولی ماردی ہے۔'' زیرک دماغ اور زودفہم شاہ زمان نے سرسراتی سرگوشی میں قیاس آرائی کی۔

اوپر بلوے کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا جیسے ریاستی وفد اور بنجاروں کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ اسی سبب، پہرا بند اور ہتھیار بدست فوجی حرکت میں آ گئے اور بنجاروں کے اس عارضی پڑاؤ کا رخ کرنے لگے۔

یہی وہ وقت تھا جب تاریک آسمان پر بادلوں کی ہیبت ناک گرج ابھری اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔

''لگتا ہے، تقدیر ہمارا پورا پورا ساتھ دے رہی ہے۔ آگے بڑھو دوستو!'' علی ریحان کی پُرجوش آواز ابھری۔ پہرے کی زنجیر کٹ چکی تھی۔ یہ تینوں سنگینیں سنبھالے آگے بڑھنے لگے۔ تعداد میں صرف تین ہونے کے باوجود یہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔ سب سے آگے علی ریحان تھا، درمیان میں احسان جامو اور آخر میں شاہ زمان تھا۔ بارش کے پانی سے اپنے ہتھیاروں کو بیکار ہونے سے بچانے کے لیے انہوں نے موسمی تغیرات کو پہلے ہی سے مدنظر رکھا ہوا تھا اور انہیں کینوس کے خول میں لپیٹ دیا گیا تھا۔

اوپر ''پڑاؤ بستی'' میں ہنگامہ ہونے کے سبب پہرا ٹوٹ چکا تھا۔ یہ لوگ ناگرہ کی سرحدی پٹی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے آگے کی پیش قدمی کے لائحہ عمل پر غور کرنے کے لیے سر جوڑے۔

''شکر ہے کہ ہمارا فیصلہ بروقت اور درست ثابت ہوا۔'' علی ریحان نیچی آواز میں بولا۔

''ٹھیک کہا علی بھائی! وہ پڑاؤ ہمارے گلے کا پھندا بھی بن سکتا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب ان بنجاروں کو اتنی جلدی پروانۂ راہداری مل سکے گا۔'' احسان جامو نے کہا تو شاہ زمان بولا۔

''ان بنجاروں کا معاملہ گمبھیر ہو گیا ہے۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ اس فرنگی فوجی افسر نے مکھیا کرجیت کو گولی مار کے ہلاک کر دیا ہے۔ وہ ہماری خالی جھونپڑی دیکھ کر معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوگا۔ جس کا واضح مطلب ہے کہ ان پہاڑیوں میں ہماری ڈھنڈیا پڑ سکتی ہے اور اب ہمیں اپنی صوابدید پر جلد از جلد یہ پٹی پار کرنا ہوگی۔''

تینوں نے فوراً وہاں سے کوچ کیا۔ تنگ دروں سے گزرتے اور گہری اندھی گھاٹیوں کو جان لیوا رسک سے پار کرتے ہوئے وہ بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ کر تھوڑی دیر کو رکے تھے جہاں سے انہیں روشنی آتی دکھائی دی تھی۔ انہیں سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی کہ وہ ایک مورچا نما سرحدی چوکی کے قریب تھے۔

طوفان بادوباراں کا یہ موسم .... اگرچہ ان کے لیے معاون ثابت ہو سکتا تھا مگر اس کے باعث پتھریلے راستے پھسلواں ہونے لگے تھے۔ انہیں بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے پڑ رہے تھے۔

''اس چکلے پر حملہ کیے بغیر ہم اسے پار نہیں کر سکتے۔'' شاہ زمان نے ہولے سے کہا۔

''حملہ ہمارے لیے موت کا پھندا ثابت ہو سکتا ہے۔'' احسان جامو بولا۔

''گوریلا ایکشن کے ذریعے انہیں موت کی نیند سلانے کی کوشش کرنا ہوگی۔'' شاہ زمان نے اپنی بات کی وضاحت چاہی۔

''معاملہ بگڑ گیا تو ہم بری طرح نرغے میں آ جائیں گے۔'' علی ریحان نے بھی پہلوتہی کرنی چاہی۔

''اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔'' شاہ زمان بولا۔

''تم لوگ اس مورچا نما چوکی کا یہ مقام دیکھ ہی رہے ہو کہ اس کے اطراف میں تاریک... گہری اور سنگلاخ گھاٹیاں ہیں، جو ناگرہ کی چوری چھپے سرحد پار کرنے والوں کے لیے موت کا پیغام لا سکتی ہیں۔''

''ہُم......'' علی ریحان نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے۔

’’اس سے پہلے کہ ان کے باقی ساتھی بھی ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ پہنچیں، ہمیں اپنا کام کر گزرنا چاہیے۔‘‘ شاہ زمان نے اس لائحہ عمل پر گویا آخری کیل ٹھونکتے ہوئے کہا اور پھر وہ اپنا آتشیں اسلحہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

سنگینیں ہنوز ان کے ہاتھوں میں ہی دبی ہوئی تھیں جبکہ آتشیں ہتھیار بھی کچھ اس پوزیشن میں ان کے جسموں کے ساتھ منسلک تھے کہ وہ بوقتِ ضرورت پل کے پل ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتے۔

ایک تنگ سے درّے میں داخل ہونے کے بعد پیچھے سے آتی ہوئی روشنی تھوڑی مزید گہری ہوئی۔ وہ تینوں اب ٹیلے کے کسی نسبتاً قریبی نشیب میں ایک ایسی جگہ محبوس تھے، جہاں آسمانی بجلی کی لمحاتی روشنی میں تنگ پہاڑی رخنے اور اندھی دراڑیں کسی ہولناک عفریت کی طرح انہیں نگلنے کے لیے گھورتی نظر آرہی تھیں۔ قدرے عمودی رخ پر بنے ٹیلے کے مورچے کی روشنی دھواں دھار بارش کے چھینٹوں سے گدلی پڑنے لگی تھی۔ بارش کا طوفانی شور، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک سے اطراف کا سنگلاخ ماحول مزید ہیبت ناکی کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ اس پر سوا یہ ہوا کہ جمع شدہ آبِ استادہ، اس کھڈ میں پانی کی سطح کو رفتہ رفتہ بلند کررہا تھا۔ جو کسی وقت بھی ایک پہاڑی تالاب کی صورت اختیار کرسکتا تھا۔

’’ہمیں پانی کی اس سطح کے بلند ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔‘‘ علی ریحان بولا۔ دھواں دھار پانی کے شور میں اب انہیں تھوڑا اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ ’’پانی کی بلند ہوتی سطح ہمیں ٹیلے کے قریب پہنچادے گی۔‘‘

اس کی تجویز شاہ زمان کو معقول محسوس ہوئی مگر احسان جامو بولا۔ ’’اگر اس سے پہلے ہم کسی اوپر جاتی دراڑ میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔‘‘

’’اگر بارش کے اس تالاب کا پانی بلند ہوکے اس دراڑ کے اندر آگیا تو ہمیں اذیت ناک موت سے کوئی نہیں بچاسکے گا۔‘‘ شاہ زمان نے کہا۔

’’مجھے نہیں لگتا کہ پانی کی سطح ایک چوتھائی سے زیادہ بھی بلند ہوسکتی ہے۔‘‘ احسان جامو نے بجلی کی ابھرتی کڑک اور اس کی روشنی میں ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔

’’کیونکہ ہم جس کھڈ میں موجود ہیں، یہ پیالہ نما گڑھا نہیں ہے۔ اس کی دیواروں میں ان گنت روزن اور چھوٹی موٹی راہ گزاریں بنی ہوئی ہیں۔ جمع شدہ پانی وہاں سے نکلتا رہے گا۔‘‘

ایک بار پھر بجلی زور سے کڑکی۔ علی ریحان اور شاہ زمان نے اس کی اور اپنے ساتھی کی بات کی روشنی میں فوراً اور بہ غور جائزہ لیا تو انہیں احسان جامو کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ اس کھڈ کو بھرنے میں کافی دیر بیت سکتی تھی، دوسرے یہ کہ اس کے اطراف میں ان گنت راستے نالیوں کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ جو نکاسیِ آب کا ایک قدرتی ذریعہ سمجھے جاسکتے تھے۔ لہٰذا پانی کی سطح ایک حد تک ہی بلند ہوسکتی تھی، مگر اتنی زیادہ نہیں کہ یہ لوگ ٹیلے تک پہنچ سکتے۔

چنانچہ تینوں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر ایک ایسی عمودی دراڑ کا رخ کیا جو ٹیلے کے عین نیچے والی پتھریلی دیوار کو چیرتی ہوئی اوپر جارہی تھی۔ یہاں بھی کافی سارا بارش کا پانی جمع ہوچکا تھا۔ وہ تینوں اس میں داخل ہوگئے۔ دراڑ کا حجم فقط اسی قدر تھا کہ اس میں ایک وقت میں ایک ہی نفر سما سکتا تھا۔ ان کی پیش قدمی کی ترتیب وہی رہی تھی۔ یعنی پہلے علی ریحان اندر سمایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کو دراڑ کی سخت مگر پھسلواں دیوار کے ابھرے ہوئے نکیلے پتھروں پر اٹکایا... پھر اپنے جسم کو اوپر کھینچا تاکہ دوسرے ساتھی کے لیے جگہ بن سکے۔ اس کے بعد احسان جامو اندر داخل ہوا اور پھر شاہ زمان......

اب تینوں جری جانباز...... اپنی نہایت کٹھن، صبر آزما اور خطرناک عملی کارروائی سے گزر رہے تھے۔ بارش کی تیز پھوار دراڑ کے اندر بھی پڑ رہی تھی۔ پانی کے سرد اور اتی کی طرح چبھتے چھینٹے ان کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے مگر وہ تینوں اس کی پروا کیے بغیر دراڑ کا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

اس کوشش میں ان کے ہاتھ پاؤں اور جسم بھی تھک کر شل ہونے لگے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کچھ سیکنڈوں کے لیے ٹھہر جاتے اور پھر بڑھنا شروع کردیتے تھے۔

ان کے نیچے اب اندھیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ البتہ بجلی چمکتی تو کھڈ میں بڑھتی ہوئی پانی کی سطح نظر آجاتی تھی جس کا کافی سارا حصہ دراڑ کے اندر بھی جمع تھا۔ گویا ان کے پاس اب صرف ایک ہی راستہ بچا تھا۔ یعنی اوپر اور آگے بڑھتے رہنا۔

دراڑ کی تنگ دامانی اگرچہ ان کے اس عمودی سفر میں معاون و مددگار بھی ثابت ہورہی تھی، کیونکہ وہ خود کو اس کے پتھریلے رخنوں میں پھنسا کر اپنا کٹھن اور عمودی سفر جاری رکھے ہوئے تھے لیکن...... ایک خطرہ ان کے سر پر، بالفاظ دیگر ان کے نیچے پانی کے ایک ایسے تالاب کی صورت منڈلا

رہا تھا جوان میں سے کسی ایک کے گرنے کی صورت میں نکلنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔

سب سے اوپر علی ریحان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دراڑ کا عمودی سرا، جہاں سے مقدور بھر نظر آنے والا برستا آسمان اسے اب قریب نظر آنے لگا تھا' بجلی کی تیز اور چمکتی کڑک میں اسے پگھلے کے ایک حصے کی دیوار بھی نظر آ گئی تھی۔ اسے احسان جامو کی یہ تجویز نہایت کارآمد نظر آنے لگی تھی۔ اس کے متوقع اور دور رس نتائج علی ریحان کو بہت جلد نظر آنے لگے تھے کہ ٹھیک اسی وقت اس کی شورزدہ سماعتوں سے ایک چیخ ٹکرائی۔ اس کے رینگنے کی شکل ہاتھ پاؤں یکلخت وہیں جامد ہو کر رہ گئے اور تب ہی اسے اپنے نیچے سے شاہ زمان کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''علی......! احسان نیچے گر گیا ہے۔''

''اوہ......میرے خدا......!'' علی ریحان دھک سے رہ گیا۔ ''کیا وہ ڈوب جائے گا؟''

''میرا خیال ہے نہیں......'' شاہ زمان نے ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کے لہجے سے محسوس ہوتا تھا کہ اپنی بات کا اسے خود بھی مکمل طور پر یقین نہ تھا۔

''اسے آواز دو......'' علی ریحان نے کسی خیال کے تحت شاہ زمان سے کہا۔

''احسان......!'' علی ریحان کے نیچے ٹانگوں کے قریب موجود شاہ زمان نے پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ دو، تین بار مزید پکارنے پر بھی جواب نہ ملا تو شاہ زمان نے علی ریحان سے کہا۔

''کیا تم خود کو کچھ دیر کے لیے اسی طرح قابو میں رکھ سکتے ہو؟''

''ہاں مگر......!'' ریحان نے اٹکتے لہجے میں کہا مگر شاہ زمان نے اسے جملہ پورا کرنے نہ دیا اور بولا۔

''میں نیچے جا رہا ہوں۔''

''نہیں ......'' علی ریحان نے اسے فوراً منع کیا۔ ''کہیں تم بھی......'' شاہ زمان پُرجوش اور پُرعزم تھا۔ اس نے بات کاٹ دی۔

''میں سنبھلا ہوا ہوں...... نیچے جاتا ہوں۔ تم انتظار کرو......''

شاہ زمان نے نیچے کا سفر شروع کر دیا اور گاہے بہ گاہے احسان جامو کو پکارتا بھی جاتا تھا مگر اس کی طرف سے مکمل خاموشی طاری رہی۔ ماسوائے بارش کے شور کے...... دراڑ کی دیواروں پر ابھرے ہوئے نکیلے پتھروں اور رخنوں میں ہاتھ پاؤں پھنسا کے چڑھنا اگر سخت جاں طلب کام تھا تو اس سے زیادہ جاں گسل اور خطرناک کام نیچے اترنا تھا، جبکہ اس دہری مشقت میں شاہ زمان پہلے ہی تھک کر چور ہو رہا تھا مگر اس نے اپنے ساتھی کی جان بچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے دو ساتھیوں کی ہلاکت سے مغموم تھا جو اس کے گروپ ''کاروانِ مجاہد'' سے بھی تعلق رکھتے تھے، مگر احسان جامو کو بھی وہ اب کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کی اپنی جان کو بھی خطرہ تھا۔ وہ خود بھی کسی وقت پھسل کر گر سکتا تھا یا اگر خدانخواستہ احسان جامو نہ ملتا تو اس میں اب اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ عمودی سفر پر روانہ ہو سکتا، اس کا جسم ہنوز شدید تھکن اور دکھن سے شل ہو چکا تھا۔

بہرطور......وہ بدستور نیچے اترتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں سرد پانی کو چھونے لگے۔ سردی کا احساس بھی بڑھنے لگا تھا مگر اس مشقت طلب کام میں اس کا احساس کم ہی ہو رہا تھا۔

''احسان......احسان......'' اس نے ایک بار پھر ہانپتی کانپتی آواز میں اسے پکارا مگر سوائے پانی کے شور کے کچھ سنائی نہ دیا۔ دراڑ تنگ ہونے کے باعث آکسیجن کی کمی کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ خود اس کی اپنی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔

اتنے قریب پہنچ کر بھی احسان کی طرف سے جواب نہ پا کر شاہ زمان کو تشویش ہونے لگی۔ وہ کچھ اور نیچے پانی میں اترا۔ ٹھیک اسی وقت بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز ابھری اور بجلی کی کڑکڑاہٹ ابھری۔ روشنی کا بڑا سا ہالہ چمکا اور شاہ زمان نے نیچے پانی کی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی...... مگر بے سود، اسے احسان جامو کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شاہ زمان کا دم گھٹنے لگا۔ وہ وہیں رک گیا۔ اس کے دل و دماغ مایوسی کی انتہاؤں کو چھونے لگے تھے کہ ایسے میں ایک گونجیلی آواز ابھری۔

''شاہ زمان......'' یہ علی ریحان تھا، جو اوپر سے اسے آواز دے رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں......'' اس نے بہ مشکل اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن......احسان کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے......''

''خدا کے لیے تم اب اوپر آ جاؤ......'' علی ریحان کی بارش کی جھنکار میں غم سے لوکھڑائی دبی دبی سی آواز ابھری۔

شاہ زمان بالآخر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اپنے

ایک اور جری ساتھی سے محروم ہو چکے ہیں۔ ساتھی کی جان بچانے کا جب تک اس میں ایک جوش اور ولولہ تھا تو تھکن کا احساس بھی نہیں ہوا تھا مگر اب...... دکھ اور مایوسی نے ایک دم ہی یہ احساس جگا دیا تھا اور وہ کچھ ثانیوں کے لیے وہیں چپکا رہا۔ اس کے بعد مشن کی تکمیل کے عزم نے اسے کمدیڑا تو اس نے ایک بار پھر اپنے شکستہ وجود کی رہی سہی طاقت کو سمیٹا اور اوپر کی طرف سرکنے لگا۔

"تم آرہے ہونا......؟" علی ریحان کی آواز دوبارہ آئی۔

شاہ زمان کے اندر جواب دینے کی بھی سکت نہ رہی تھی، پھر بھی اس نے قوت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں......" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا، بارش اور طوفان بادوباراں کے شور میں نجانے اس کی آواز دراڑ کی بلندی پر موجود چپکے کھڑے علی ریحان تک پہنچی تھی یا نہیں۔ اس کا کسی کو احساس نہ ہوسکا۔ تاہم بجلی کی کڑک کے ساتھ ہی ابھرنے والی تیز روشنی میں علی ریحان کو نیچے سے شاہ زمان کی جھلک دکھائی دے گئی تھی۔

شاہ زمان کی رفتار نسبتاً سست تھی، مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور اوپر اٹھتا رہا۔ جب وہ اپنے ساتھی کے قریب پہنچ گیا تو علی ریحان نے اپنا رکا ہوا عمودی سفر دوبارہ شروع کردیا۔

بالآخر کوشش پیہم نے انہیں لب منزل تک پہنچا ہی دیا، جب علی ریحان کا ہاتھ دراڑ کے آخری سرے کے ایک قدرے ابھرے ہوئے اور نکیلے پتھر کو چھو گیا۔ اس نے اسی پر زور لگا کر تھوڑا اور اپنے وجود کو اوپر کھینچا اور پھر دونوں ہاتھوں کو جما کر وہ پکلے کی دیوار کے ساتھ جا لگا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سینے کے بل پتھریلی زمین پر لیٹ کر اپنا ایک ہاتھ نیچے شاہ زمان کی طرف بڑھا دیا جس نے فوراً ہی اسے تھام لیا اور پھر مشترکہ کوشش سے وہ بھی اوپر آچکا تھا۔

پکلے کی یہ دیوار خاصی بلند نظر آتی تھی۔ ان کے اندازے کے مطابق، لگ بھگ کوئی بارہ تیرہ فٹ تھی۔

"کیا احسان جاسو ہم میں نہیں رہا......؟" علی ریحان نے دیوار سے پشت ٹکا کر ڈبڈبائے سے لہجے میں کہا۔

"سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں چلا گیا؟" شاہ زمان بھی دکھی لہجے میں بولا۔

"اوپر سے گرنے والا سیدھا پانی میں گرنا چاہیے تھا۔ احسان ایک سخت کوش آدمی تھا۔ اس نے خود کو بچانے اور ڈمے جانے سے بچنے کی کوشش تو ضرور کی ہوگی۔ وہ اتنی آسانی سے حالات کشی کا شکار ہونے والا بھی نہیں تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا اس کے ساتھ......؟"

"ممکن ہے بلندی سے گرنے کے باعث اس کا سر کسی ابھرواں سنگ سے ٹکرایا ہو اور وہ بے ہوشی کی حالت میں پانی میں گرنے کے بعد بہہ گیا ہو۔" شاہ زمان نے خیال ظاہر کیا۔ علی ریحان اس کی تائید میں محض سر ہلا کر رہ گیا اور پھر بولا۔

"اللہ اس پر اپنا رحم فرمائے دوست! ہم اس وقت دشمن کی ناک کے عین نیچے موجود ہیں۔"

"ہاں! ہمارا یہاں زیادہ دیر تک ٹکے رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا لیکن یہ دیوار......"

"اس طرف بڑھو......" علی ریحان نے پہلے اپنے بائیں طرف ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دائیں جانب دیکھا اور شاہ زمان کو اسی طرف اشارہ کیا۔

آسمان کی تاریک وسعتوں میں طوفانی گھن گرج جاری تھی۔ لمحے بھر کو بجلی چمکتی تو طوفان بادوباراں سے شرابور ماحول میں، اس چٹانی بلندی پر واقع پکلے کی قلعہ بند دیوار سے لگے دونوں کے سائے لرزیدہ سے دکھائی دیتے بڑا پراسرار منظر پیش کررہے تھے۔ بارش کا زور ٹوٹنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔

دونوں دائیں جانب سینے کے بل رینگنے لگے۔ انہیں امید تھی کہ اس پتھریلی دیوار کے کسی جانب کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جو اندر داخلے میں انہیں مدد فراہم کرسکتا ہے۔ جلد ہی ان کی یہ مراد برآئی، مگر ایک قباحت مصیبت بن کر سامنے بھی کھڑی تھی۔

وہ ایک پکلے کا اندر جانے والا راستہ تھا جس پر کوئی دروازہ نہ تھا۔ وہ حصہ کھلا پڑا تھا۔ البتہ وہاں کچھ بھری ہوئی بوریاں رکھی تھیں جن پر گنوں کی نالیں ٹکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ منظر بھی ان دونوں نے چمکتی ہوئی آسمانی بجلی کی روشنی میں دیکھا تھا۔

"جلد بازی مت کرنا علی......!" شاہ زمان نے علی سے سرگوشی میں کہا۔ وہ اس کے چہرے پر موجود جارحانہ جوش کی پرچھائیاں دیکھ چکا تھا۔ "ہم اس وقت دشمن کی شہ رگ کے پاس ہیں اور پوری طرح گھات میں ہیں۔"

علی ریحان اور شاہ زمان، اب دونوں کی حیثیتیں لیڈر کی سی ہی تھیں۔ علی ریحان گروپ لیڈر تھا مگر اب گروپ تتر بتر ہو چکا تھا جبکہ شاہ زمان خود بھی اپنے گروپ "کاروانِ مجاہد" کا لیڈر تھا۔ دونوں ٹاپ مائنڈڈ جنگجو گوریلا تھے۔ اتنے ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد ہی وہ

یہاں تک پہنچے تھے اور شاہ زمان نہیں چاہتا تھا کہ ان کے ساتھیوں کی یہ عظیم قربانیاں ضائع جائیں۔ اسی لیے اس نے علی ریحان کو صبر و احتیاط کی تلقین کی تھی۔

''میں سمجھ رہا ہوں دوست!'' علی ریحان نے خفیف سی مسکراہٹ تلے کہا۔ ''فتح ہمارے نزدیک ہے۔ اس چکلے کو کامیابی سے سر کرنے کا مطلب ہے ہمارا نصف مشن مکمل ہوا کیونکہ اس کے بعد آگے ناگرہ جانے کی اور کوئی رکاوٹ ہماری راہ میں نہیں آئے گی۔''

''اور...... سب سے زیادہ ضروری اور اہم مرحلہ بھی ہمارے لیے یہی ہے۔'' شاہ زمان بھی سرگوشی کرتے ہوئے جوش تلے مسکرایا۔

''سنگین ہاتھ میں پکڑلو...... آتشیں ہتھیار استعمال کرنے کا سوچنا بھی مت......''

شاہ زمان نے کہا اور اسے مذکورہ راستے والی جگہ کے قریب آ کے ٹھہر گیا۔ سنگین اس کے دائیں ہاتھ میں چمکنے لگی تھی۔ علی ریحان نے اسی طرح اس کے سامنے سے رینگتے ہوئے دوسری جانب پوزیشن بنالی۔ شاہ زمان نے اسے مخصوص اشارہ کیا تو علی ریحان نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ شاہ زمان دھڑکتے دل کے ساتھ، بالکل دھیرے دھیرے پتھریلی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہونے لگا اور جیسے ہی اس نے بھری ہوئی بوریوں سے سر ابھار کر دیکھا۔ ایک فرنگی پہرے دار برساتی اوڑھے زمین پر چکلے کی اندرونی دیوار سے پشت لگائے بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ موت اس سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ نہ ہی وہ سوچ سکتا تھا کہ اس طوفانی بارش اور تیز سرد ہواؤں میں کوئی اس چٹانی مورچے کو سر کرنے کی ہمت بھی کر سکتا ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک سچا مسلمان جب اپنے کسی نیک مقصد کو پورا کرنے کا عزم کرتا ہے تو پھر رکاوٹ کی ہر دیوار کو اپنی جان پر کھیل کر بھی عبور کرنے اور اسے مسمار کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتا ہے، یہ کوئی جادوگری نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے ہمتِ مرداں اور مددِ خدا...... والی طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ دونوں مجاہد بھی اس دیوار کو ریت کا ڈھیر ثابت کر چکے تھے۔

شاہ زمان کا مثبت اشارہ پاتے ہی علی ریحان چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ بوریوں پر رینگ گیا اور ایسے ہی وقت میں وہ فرنگی کچھ چونک کر بیٹھے بیٹھے پلٹا تھا۔ لمحہ بھر کو آسمانی بجلی چمکی اور اس نے جیسے ملک الموت کی جھلک دیکھی۔ وہ برق کی طرح اچھلا مگر اس سے زیادہ علی ریحان نے چیتے جیسی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سنگین اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور ساتھ ہی اپنا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر بھی رکھ دیا۔ مبادا اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ مورچا نما اس چوکی کے دیگر گوشوں میں محبوس فرنگیوں کو ہوشیار کردے۔

فرنگی پہرے دار جہنم واصل ہوتے ہی علی کے ہاتھوں میں جھول گیا تو اسی وقت شاہ زمان نے اس کے مردہ وجود کو اٹھا کر چکلے کی گیلی دیوار سے نیچے اندھی کھائی میں لڑھکا دیا۔ بادل گرجا، بجلی چمکی اور بارش میں مزید تیزی آگئی۔ چکلے کا یہ حصہ چند لمحے کے لیے روشن ہوا تو علی کی عقابی نظروں نے ایک مختصر سا راستہ مورچے کی دوسری جانب جاتے دیکھا۔ وہاں سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں اسی طرف کو رینگ گئے۔ سنگینیں ہنوز ان کے ہاتھوں میں چمک رہی تھیں۔

مورچے کے اس طرف ''ڈک'' بنا ہوا تھا۔ اسی کے نیچے ایک میز اور دو کرسیوں پر تین افراد عسکری لبادوں میں نظر آئے۔ ان میں دو ریاستی چوب دار معلوم ہوتے تھے، جنھوں نے سر پر پگڑ بھی باندھے ہوئے تھے جبکہ تیسرا فرنگی فوجی تھا، جو میز والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھونپو والا ریسیور تھا جس کا مائک الگ سے اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ دوسرا میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی گراری دار چرخی گھما کر لائن ملانے کی کوشش میں محو تھا۔

مہاراجا چندر گپتا کی ریاست میں فرنگیوں کی ان کلیدی عہدوں پر شمولیت کی وجوہات سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ مہاراجا کی ریاست ناگرہ میں یہ فرنگی لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کس قدر دخل انداز ہو چکا تھا۔

تینوں شکاران کے سامنے تھے۔ علی ریحان اور شاہ زمان نے ایک بار پھر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کا پیغام پڑھا اور پھر اگلے ہی لمحے یہ دونوں جیسے آسمانی بجلی کی طرح ان پر کڑکے...... علی ریحان نے کرسی پر بیٹھے فرنگی کو اپنی سنگین کا نشانہ بنانا چاہا تھا جو اس کے دائیں پہلو کے پار ہوگئی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ عین اس وقت بدکا تھا، جب اس نے اپنے ایک ساتھی کو کراہ آمیز انداز میں لہراتے ہوئے گرتے دیکھا تھا اور سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی۔ اسے شاہ زمان نے شکار کیا تھا۔

فرنگی کے حلق سے تکلیف کی شدت سے چیخ خارج

ہوگئی اور خدا جانے وہ کرسی سے خود الٹا تھا یا دانستہ اس نے یہ حرکت کی تھی کہ گرتے ہی اس نے اپنے بھاری بھرکم چمڑے کے بوٹ کی ٹو کی ضرب علی ریحان کے چہرے پر بھی رسید کر دی تھی۔ جو زیادہ زوردار تو ثابت نہ ہوئی تھی مگر اس نے ایک لمحہ کے لیے علی ریحان کو گڑبڑا ضرور دیا تھا اور پھر یہی وہ وقت تھا جب تیسرے پہرے دار نے، جس پر شاہ زمان اپنا پہلا شکار گرانے کے بعد حملے کے لیے پر تولے ہوئے تھا...... بجائے دفاع یا جنگ کے اس نے اندر ڈیک کی جانب دوڑ لگا دی۔ شاہ زمان بھی طوفانی بگولے کی طرح خون آلود سنگین لیے دوڑا تھا اور جب تک وہ اس ''فراری'' پہرے دار کے سر تک پہنچتا، اس نے ایک جھولتی ہوئی رسی کھینچ ڈالی۔ ایک زوردار بگل بجا، ساتھ ہی فضا میں ایک پٹاخہ چھوٹنے کی آواز بلند ہوئی۔

اپنا ''کام'' کرتے ہی وہ پلٹا تو شاہ زمان اس کے سینے میں سنگین گھونپ چکا تھا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شاہ زمان پلٹا تو ششدر رہ گیا۔ فضا میں لاتعداد پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔

''اس بدبخت نے خطرے کا سگنل فائر کر دیا ہے، کسی بھی وقت پوری بٹالین کا رخ اس پکھے کی طرف ہو سکتا ہے۔ فوراً منزل کی جانب دوڑو......'' علی ریحان نے چلا کر کہا اور دونوں پکھے کی دوسری سمت میں آ کر ٹاکاسی کے ایک ایسے کھلے راستے سے نکلے جو نشیب میں جا کر ناگرہ ریاست کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں اس پرتیزی کے ساتھ دوڑتے چلے گئے۔ بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا۔

☆☆☆

کسی بھی جانور کے قریب گولی چلانا اس کے سواروں کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، یہ بات شوکت کے باپ کریم بخش نے اسے تربیت کے پہلے دن ہی سمجھا دی تھی، بالخصوص کسی سرکش جانور کے سامنے ......اور مارگریٹ تو تھی ہی منہ زور اور سرکش گھوڑی...... لیکن خلافِ توقع وہ نہ بدکی تھی اور نہ ہی اس نے منہ زوری کا مظاہرہ کیا تھا جبکہ شوکت کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

تب ہی اس کی نظر ایک الٹیمیٹڈ والی جیپ پر پڑی۔ وہ چونک گیا۔ جیپ کے بونٹ کے پاس ایک درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک خوبرو سا انگریز نوجوان اپنے دونوں پاؤں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کا اسٹائل ویسٹرن فلموں کے کاؤبوائز جیسا تھا۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں ہولسٹر جھول رہے تھے۔ ایک میں پستول اور دوسرا خالی نظر آ رہا تھا کیونکہ دوسرے ہولسٹر کا پستول اس کے دائیں ہاتھ میں تھما ہوا تھا اور جس کی نال غیر معمولی طور پر لمبی تھی۔ اس کا انداز جارحانہ تھا اور لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ شوکت کے ساتھ ''ڈوئیل'' لڑنے کے پورے پورے موڈ میں ہو لیکن......وہ اکیلا نہیں تھا...... اس کے ہمراہ ایک طرح دار حسینہ بھی کھڑی تھی، نہایت چست پینٹ شرٹ پہنے، جس میں اس کا فراداکے کیمپس وجود کی تمام تر حشر سامانیاں نمایاں تھیں......سرحدی زبان میں وہ خاصی گل بدن تھی۔ شباب تو جیسے ٹوٹ کر اس پر برس رہا تھا۔ جسم بھرا بھرا تھا اور جسے خالص یورپین اصطلاح میں ''چوبی گرل'' کہا جا سکتا تھا۔ کمر کا حصہ خاص طور پر سبک رو تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گورا چٹا جس میں سرخی بھی ملی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بال بوائے کٹ اور براؤن تھے۔ چست اور فٹ لباس میں اس کا بھرا بھرا جسم دعوتِ نظارہ دے رہا تھا بلکہ ایک ایک انگ چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

''ہے، گائیز...... ! گارشیا...... رابرٹ!'' ریتا اس نوجوان جوڑے کی طرف دیکھ کر شناسا انداز کی مسرت سے چیخی اور اپنے دونوں بازو پھیلائے ان کی طرف لپکی۔ گارشیا سے لپٹ کر دونوں اپسراؤں نے ایک دوسرے کے گال چومے اور پھر آخر میں ریتا، رابرٹ نامی اس کاؤ بوائے نوجوان کے ساتھ بغل گیر ہوئی اور شوکت نے ریتا اور رابرٹ کو ایک دوسرے کے گال پر بوسہ لیتے دیکھا تو اس کی طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ اسے غصہ اس نوجوان پر آ رہا تھا جس نے اپنے لمبی نال والے پستول سے ہوائی فائر کیا تھا۔ وہ اس نوجوان کو سخت تادیب کرنے کے موڈ میں نظر آتا تھا اور اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے گولی نہیں چلانی چاہیے تھی۔ وہ نوجوان اپنے پستول کی دھواں اڑاتی نال کو پھونک مار کر شوکت کی طرف گھورنے لگا۔ اس کے انداز میں رعونت تھی۔

شوکت آگے بڑھا تو ریتا نے پہلے اس کا تعارف کرواتے ہوئے ان سے کہا۔

''یہ ہمارا سائیس ہے، مسٹر شوکت! بہت بہادر اور دلیر...... مجھے اسی نے گھڑسواری سکھائی ہے۔'' ریتا کے منہ سے اپنی تعریف شوکت کو بھلی محسوس ہوئی تھی۔

''اور...... مسٹر شوکی! یہ میرے کزنز ہیں...... سسٹر اینڈ برادر......گارشیا اینڈ رابرٹ......''

تعلق داری قریبی تھی۔ مالکوں کے مہمان بھی اس کے افسروں کا ہی درجہ رکھتے تھے۔

"ہائے...... سو نائس آف یو...... ویری ہینڈسم......"
گارشیا نے شوکت کو دلچسپ اور گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "گلیڈ ٹو میٹ یو...... ہینڈسم......"
شوکت نے بھی اس سے مصافحہ کیا تو اس نے محسوس کیا کہ گارشیا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھوڑا معنی خیز انداز میں دبایا تھا۔ شوکت نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مسکرا کر قریب کھڑے رابرٹ کی طرف بڑھا دیا۔

"نیور ایور...... میں ملازموں اور نوکروں سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا......" رابرٹ نے تلخی اور رعونت کے ساتھ شوکت سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ شوکت کو اس مغرور فرنگی نوجوان کی اس بات پر طیش تو آیا مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنا خالی ہاتھ گرا دیا تاہم اس کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔

"مسٹر رابرٹ! جانور کے آگے دوبارہ فائر کرنے کی غلطی کبھی مت کیجیے گا...... یہ بدکنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگایا کرتے...... اور روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔"

"مائی فٹ......!" رابرٹ نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آخر میں ریتا سے کہا۔

"تم لوگوں نے ان نوکروں کو کس قدر سر پر چڑھا رکھا ہے، یہ ہمیں نصیحتیں کرتے ہیں اور یہ گھوڑے پر اس قدر تمہارے قریب تھا؟...... ڈیم اٹ...... اسے بتاؤ ریتا! میں کون ہوں...... آئم رابرٹ...... آ...... بل فائٹر...... میں وحشی سانڈوں کو نہتا تگنی کا ناچ نچاتا ہوں اور...... یہ ایشیائی گھوڑے میرے سامنے گدھوں سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتے۔ میں تو بیک وقت تین تین گھوڑوں کو قابو کر لیتا ہوں......" اس اکھڑ مزاج فرنگی نوجوان کو شاید ریتا کے منہ سے اس کی تعریف بری لگی تھی۔

"اوہ...... سوری ٹو سے...... مسٹر شوکی! (شوکت)" ریتا نے کہا۔ "رابرٹ کا اصل تعارف یہی ہے کہ یہ ایک ماہر بل فائٹر ہے۔ یہ دونوں آج ہی لندن سے آئے ہیں۔"

"برادر! ہر کوئی اپنے فن میں ماہر ہوتا ہے۔ خود پر اتنا مت اترایا کرو ہر وقت......"

اس کی بہن گارشیا نہایت بیزاری سے اپنے بھائی سے بولی۔ اسے شوکت کے ساتھ اپنے بھائی کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔

"اچھا چھوڑو...... اندر چل کر آرام سے باتیں کرتے ہیں...... آؤ......" ریتا نے ان سے کہا۔ رابرٹ ابھی تک شوکت کو خار زدہ نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ لمبی نال والا پستول ہنوز اس کے ہاتھ میں تھما ہوا تھا، بولا۔

"ٹھہرو...... ابھی ایک تماشا تو ضرور دکھانا چاہوں گا اس غلام کو......" یہ کہتے ہوئے اس نے مارگریٹ کے قدرے قریب جا کر فضا میں ایک اور فائر کر دیا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ مارگریٹ زور سے ہنہنائی اور اپنے پچھلے پیروں پر زور ڈالا اور اگلے پیروں کی کنوتیاں ملائیں...... اور الف ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قریب کھڑے رابرٹ کو ٹکر ماری...... رابرٹ کو معلوم نہ تھا کہ یہ کوئی عام گھوڑی نہیں بلکہ ایک سرکش گھوڑی ہے، جو ابھی سدھانے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ لہٰذا وہ اس کے اگلے سموں کی ٹکر سے سنبھل نہ سکا اور گر پڑا...... مگر اپنی عزت کو بچانے کے لیے وہ حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ دوبارہ اٹھا تب تک مارگریٹ دوڑ لگا چکی تھی۔ رابرٹ اپنا پستول ہولسٹر میں اڑسے اس کی جانب بھاگا مگر وہ مارگریٹ کے پیچھے نہیں بھاگ رہا تھا بلکہ قوس کی شکل میں گھومتے ہوئے میدان کے وسط میں راستہ کاٹ کر دوڑا اور جلد ہی مارگریٹ کو جالیا۔ وہ اب پل کے پل مارگریٹ کی پیٹھ پر نظر آ رہا تھا۔ شوکت کو تسلیم کرنا پڑا کہ رابرٹ بھی کم نہ تھا مگر وہ رابرٹ کی طرح کب اکڑا تھا۔

ریتا، گارشیا اور شوکت جیپ کے قریب کھڑے رابرٹ کو مارگریٹ پر سواری کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور شوکت کی تیز اور بھانپتی ہوئی نظریں بتا رہی تھیں کہ مارگریٹ کو گولی چلنے کا زیادہ غصہ تھا اور اس پر مستزاد وہی شخص اس کی پیٹھ پر زبردستی سوار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مارگریٹ، رابرٹ کو اپنی پیٹھ سے گرانے کے لیے سرکشی کا زیادہ ہی مظاہرہ کرنے لگی۔ اس نے دیکھا خود پر اترانے والا یہ مغرور صفت فرنگی نوجوان جو اس کا ہم عمر بھی تھا، پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ تب ہی ریتا نے تشویش زدہ انداز میں شوکت سے کہا۔

"شوکی! تم جاؤ...... رابرٹ اسے نہیں سنبھال پائے گا۔ مارگریٹ بہت غصے میں لگ رہی ہے۔ وہ کہیں اسے نقصان نہ پہنچا دے......"

"نہیں......" اچانک گارشیا بولی۔ "رابرٹ نے بہت ٹیزنگ (شیخی بگھارنا) کی ہے، اسے بھگتنا چاہیے......" شوکت بھی یہی چاہتا تھا۔

اسی وقت...... مارگریٹ نے ایک ایسی تباہ کن پلٹی کھائی کہ اس کی پیٹھ پر سوار رابرٹ اس کی پشت سے گرتے گرتے بچا اور یہاں تک کہ وہ اس کی گردن سے جھول

گیا اور کوئی وقت جاتا تھا کہ وہ بپھری ہوئی مارگریٹ کے اگلے دونوں سموں کی زد میں آجاتا۔ رینا چیخی اور شوکت سے چمٹ کر بولی۔

''پلیز... پلیز فار مائی سیک... شوکی! رابرٹ کی مدد کرو...''

بس... یہی وہ لمحہ تھا جب شوکت کو رینا کے سیم تن کے لمس ہی نے نہیں، اس کے ملتجیانہ انداز نے کھد یڑ ڈالا۔ مارگریٹ دوڑتی، اچھلتی کودتی، قریب آگئی تھی اور شوکت نے وہیں سے ایک جست بھری... رابرٹ کا جسم تب تک بھربھری مٹی والی زمین سے رگڑنے لگا تھا۔ شوکت مارگریٹ کی پیٹھ پر سوار ہو چکا تھا اور اس کی لگام میں کس کر اسے قابو کرنے کے ساتھ ساتھ مخصوص انداز میں پچکارنے بھی لگا۔

بدمست مارگریٹ کا ابال کم ہوا تو اس کی رفتار بھی آہستہ ہونے لگی اور تب ہی شوکت نے ایک ہاتھ بڑھا کر رابرٹ کو کندھے سے تھام کر نیچے اتار دیا۔ رابرٹ زمین پر گرا اور اپنا لباس جھاڑتا ہوا فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے غصیلے پن سے زیادہ خجالت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ رینا اس کی طرف دوڑی جبکہ گارشیا کی نیم باز سی نگاہیں، سرکش مارگریٹ کی سبک رو پیٹھ پر بڑی شان سے جمے بیٹھے شوکت پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کے گداز لبوں پر بھیدوں بھری مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت حویلی سے کچھ اور لوگ بھی دوڑے چلے آئے، ان میں خداموں کے علاوہ کیمن بھی تھے۔ وہ فکرمندی کے ساتھ رابرٹ کو دیکھ رہے تھے اور اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔

شوکت، مارگریٹ کو میدان کا ایک چکر لگانے کے بعد اس کے اصطبل میں لے گیا۔ وہاں اس نے مارگریٹ کو باندھا، اس کے سفید گورے چہرے پر ''توبڑا'' چڑھایا اور چارے کا کھارا آگے کر کے اس کا منہ اس میں ڈال دیا۔

اصطبل میں دائیں بائیں دس فٹ لمبے اور پانچ فٹ چوڑے چوبی خانے بنے ہوئے تھے۔ ان میں اسٹیبل نمبر درج تھے۔ درمیانی راستہ گلی نما تھا۔ سب خانوں میں اصیل نسل کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ہر سائز کے تھے، لمبے، ٹیڈی، پونی ٹیڈ اور چکبرے۔ سامنے اصطبل کا بڑا سا چوبی گیٹ تھا جس کا ایک در کھلا پڑا تھا۔ وہاں سے دھوپ کی موٹی لکیر اندر پڑ رہی تھی۔ اسی دھوپ میں کسی کا سایہ تھرکا۔ شوکت کی عقابی نگاہیں گیٹ پر چست ہو گئیں اور تب ہی اسے ادراک ہوا کہ وہ سایہ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے کسی عورت کا ہی ہو سکتا تھا۔

''رینا...!''

ایک ہی نام اس کے ذہن میں چمکا تھا۔ مگر جب اس سائے نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور وہ کھنچ کھنچ سا، قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی حرکات وسکنات، چال ڈھال دیکھ کر شوکت کو اپنے دل میں کلک ہونے والے اس آوارہ خیال کی نفی کرنا پڑی کہ وہ رینا نہیں کوئی اور تھی۔ پر کون تھی؟ اگلا خیال کلک ہونے کے بجائے سوالیہ آنکڑے کی طرح اس کے حلق میں جیسے اٹک کر رہ گیا۔

اس نے بھی اسی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اصطبل میں روشنی کا پورا پورا بندوبست تھا مگر کہیں کہیں بلب بجھے ہوئے تھے۔ روشن دان بھی بند تھے، کچھ کھلے ہوئے پھر اچانک ہی دونوں روشنی میں اور ایک دوسرے کے قریب آگئے تو شوکت کے چونکنے تک اس سائے نے گویا حملہ کر دیا۔ وہ اچھل کر اپنی بانہیں پھیلاتا ہوا اس پر آن پڑا۔ اس طرح کہ... وہ کھڑے کھڑے اس کے پیٹ اور سینے سے چپک گیا اور اس کی گردن میں اپنی شاخ گل جیسی بانہیں ڈال کر لپٹ گیا۔

''یو سو بریو...'' یہ کہتے ہی اس نے اپنے ہونٹ شوکت کے ہونٹوں سے لگا دیے۔

شوکت اس ''حملے'' سے بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ ''حملہ'' اگرچہ بے خود کر دینے والا تھا مگر شوکت خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ وہ ان نرم و گداز لبوں کی حلاوت آگیں لمس کو بھی پل کے پل فراموش کر بیٹھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس سائے کو اپنے سے دور دھکیلا تو وہ نیچے گر پڑا۔ مترنم سی چیخ ابھری۔

''اوہ... مس گارشیا! تم...'' وہ اسے پہچان کر چونکا اور آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف سہارے کے لیے بڑھایا۔

''یو فول! جانگلی، وحشی، یو ہرٹ می... ایک عورت کو خود سے اس طرح دھکا دیتے ہیں...؟ اٹس سو ٹیریبل فار می...'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے، برہمی سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو شوکت جھینپ سا گیا اور خجل سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''سوری! میں دراصل گھبرا سا گیا تھا۔ اس لیے کہ پہلے کبھی میں ایسے حالات سے نہیں گزرا تھا۔ ونس اگین اینڈ ایکسٹریملی سوری...'' شوکت کو بھی فرنگیوں کے ساتھ رہتے

ہوئے اس طرح کے ادب و آداب آ گئے تھے۔

گارشیا اس کی سادگی پر اپنا غصہ بھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''یو آر سو سمپل...... بٹ ویری کیوٹ اینڈ سو ہینڈسم...... مجھے تمہاری یہ ادا پسند آئی...... اینی وے......''

اس نے مترنم سی ہنسی کے ساتھ مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا، جسے شوکت نے بھی کسی مصلحت کے ساتھ دوستانہ انداز میں ہی تھام لیا۔

''مجھے اپنے اصطبل کی سیر نہیں کرواؤ گے؟'' وہ ایک ادائے دلبرانہ انداز میں سر جھٹک کر بولی تو شوکت نے بدستور خفیف سی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر طاری رکھتے ہوئے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

وہ اسے اور اندر لے آیا۔ گارشیا ایک ایک چوبی خانوں میں گھس کر گھوڑوں کو پُراشتیاق نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ان کی سبک پیٹھ سہلاتی، انہیں کمر کمراتی......

''مجھے اس گھوڑے پر بٹھاؤ گے......؟'' گارشیا کو ایک سیاہ پیٹھ والا گھوڑا پسند آیا۔ وہ اس کی سبک خرام پیٹھ پر ہاتھ گھماتے ہوئے بولی۔ وہ پونی نسل کا چھوٹے سائز کا گھوڑا تھا۔

''ضرور، کیوں نہیں۔'' شوکت نے کہا اور اس کی سبک کمر کے گرد اپنا ایک بازو حمائل کر دیا۔ گارشیا جیسے اسی کی منتظر تھی، وہ اس بہانے ایک بار پھر گلے کا ''ہار'' بن گئی۔ اس نے پونی کی پیٹھ پر چڑھنے کے دوران خود کو شوکت کے اس قدر قریب کر لیا جیسے وہ گھوڑے پر نہیں شوکت پر سوار ہونا چاہتی ہو۔ اس کے بھرے بھرے گداز جسم کا لمس شوکت کے اندر تھرتھلی سی مچانے کے لیے کافی تھا۔

اس نے گارشیا کو جیسے جلدی سے گھوڑے کی پیٹھ پر پھینک دیا اور دوسرے ہی لمحے گارشیا نے ایک عجیب سی حرکت کر ڈالی۔ وہ آگے کو ذرا جھک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سینے کے بل اس سے چپک کر لیٹ گئی اور تو بہ شکن انگڑائی لینے کے انداز میں اپنے جسم کو خم دیتے ہوئے شوکت کی طرف نیم باز سی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک سسکاری لی اور اسی انداز میں بولی۔

''آہ...... کتنی مضبوط، سخت، لچکیلی اور کشادہ پیٹھ ہے اس کی...... انگ انگ سے اس کے طاقت و جواں خیزی کا چشمہ پھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گارشیا نے اپنی جانب بوکھلائی نظروں سے تکتے ہوئے شوکت کو پُرمعنی انداز میں آنکھ ماری۔

''جج...... جی ہاں!'' شوکت جھجکا۔ اس کے بعد اس نے گارشیا کی مست خیزیوں کو بریک لگانے کی غرض سے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر گارشیا کو نیچے اتار دیا۔

اسی طرح وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

''آر یو میریڈ؟'' (تم شادی شدہ ہو) باہر میدان کی ہری ہری دوب پر چہل قدمی کرتے ہوئے گارشیا نے اس سے سوال کیا۔

''نو......'' شوکت نے جواب دیا۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے موڈ میں تھا، یوں کہ اسے برا بھی نہ لگے۔

''ہیو یو گرل فرینڈ؟''

''نو......'' شوکت نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ ان فرنگیوں کی آزاد خیال معاشرت اور چلن سے بخوبی واقف تھا۔ وہ ایسے سوال بے دھڑک پوچھ لیا کرتے تھے۔

''حیرت ہے...... تم جیسے خوبرو وجیہہ اور ہینڈسم نوجوان بغیر لڑکی کے...... کیسے گزارہ کر لیتے ہیں؟'' گارشیا بولی۔

شوکت اسے کیا جواب دیتا؟ اس کے باپ نے اسے سمجھا رکھا تھا کہ ان فرنگیوں کی زلفوں کے سائے سے بھی دور رہنے کی کوشش کرنا۔ یہ پہلے اس میں پھانستی ہیں اور پھر

زندگی

زندگی بدلنے کے لیے لڑنا پڑتا ہے اور آسان کرنے کے لیے سمجھنا پڑتا ہے۔ وقت آپ کا ہے چاہے تو سونا بنا دو چاہو تو سونے میں گزار دو۔ اگر کچھ کرنا ہے تو بھیڑ سے ہٹ کر چلو۔ بھیڑ ہمت تو دیتی ہے لیکن شناخت چھین لیتی ہے۔ منزل نہ ملے تب تک ہمت نہ ہارو اور نہ ہی ٹھہرو کیونکہ پہاڑ سے نکلنے والی نہروں نے آج تک کسی سے نہیں پوچھا کہ سمندر کتنی دور ہے۔ سب تبدیلی چاہتے ہیں اگر آپ واقعی حقیقی تبدیلی چاہتے ہیں تو اپنے گھروں میں قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ فلمی گانے بند کر دیں۔ نماز کی پابندی کریں اور اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق گزاریں۔ انشاء اللہ آپ کی زندگی میں حقیقی تبدیلی آئے گی اور سکون اور چین نصیب ہوگا۔

(مرسلہ: ڈاکٹر ظفر اسلام۔ جام علی پور)

جکڑ لیتی ہیں۔
شوکت نے فوراً بات کا موضوع بدل ڈالا۔ ”لگتا ہے آپ کو بھی گھڑسواری کا شوق ہے؟“
”تم نے بھلا کیسے اندازہ لگایا؟“ گارشیا نے جیسے اس کی چوری پکڑ لی ہو، شوکت کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔
”آپ نے بڑے شوق سے اصطبل کی سیر جو کی تھی۔“ شوکت نے جلدی سے بات بنائی۔
”ہاہاہا......“ گارشیا نے اپنے حلق سے ایک آزاد منش سا قہقہہ بلند کیا اور بولی کسی دن تمہارے ساتھ گھڑسواری ضرور کروں گی۔ اسی طرح جس طرح تم ابھی تھوڑی دیر پہلے ریتا کو کروار ہے تھے۔
شوکت اس کے منہ سے ریتا کا ذکر سن کر تھوڑا چونکا تھا مگر پھر خود کو مطمئن رکھتے ہوئے جواب میں مسکرادیا۔ ”ضرور......“
”تم ادھر ہی رہتے ہو؟“
”ہاں اڈی سینٹ کوارٹر میں۔“
”اپنے کوارٹر لے چلو مجھے......“
”پھر کبھی سہی۔ ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں، بڑے صاحب آنے والے ہیں...... انہیں ریس کے گھوڑے چن کر دینا ہیں۔“
”اوکے......“
یہ اسی دن شام کا ذکر تھا۔ شوکت لوٹا تو باپ نہیں تھا۔ اس نے غسل وغیرہ کیا اور ذرا آرام کرنے لیٹ گیا۔ ذرا دیر بعد اس کا باپ لوٹا تو اس کا چہرہ اترا اترا اور اداس و پریشان سا تھا۔
”کیا ہوا شوکت کے ابا؟ یہ تم اتنے پریشان کیوں نظر آرہے ہو؟“ سکینہ نے فکرمندی سے پوچھا۔
”صاحب لوگوں کے ہاں ولایت (لندن) سے جو مہمان آئے ہوئے ہیں نا...... وہ کوہ شمالیہ کی کسی لمبی مہم پر جارہے ہیں...... کہہ رہے تھے‘ شوکت بھی ان کے ساتھ جائے گا۔“ کریم بخش نے جواب دیا تو سکینہ نے اپنا کلیجا تھام لیا فوراً بولی۔
”ہائے اللہ! میں ہرگز اپنے بچے کو کسی مہم پر نہیں بھیجوں گی۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ حالات کس قدر خراب ہیں؟“
شوکت بھی وہیں تھا بولا۔ ”ابا! کیسی مہم؟ کچھ پتا تو چلے...... اور میرا ہی کیوں انتخاب کیا ہے؟ میں تو یہیں ٹھیک ہوں۔“
”بیٹا! تم اکیلے نہیں جاؤ گے اور لوگ بھی شامل ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارا بلاوا آنے والا ہے اس سلسلے میں...... تم ایسا کرنا کوئی بہانہ کردینا......“
”تم اس کی فکر نہ کرو ابا! میرے پاس بہت بہانے ہیں۔“ شوکت مسکرایا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ حویلی سے ایک خادم آیا تھا شوکت کو لینے کے لیے۔ وہ اس کے ساتھ ہولیا۔
حویلی میں ایک کمرے میں اسے بٹھادیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ صاحب (لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا) کسی شکاری مہم پر نکلنے والا تھا۔ اسی وقت کمرے میں ایک موٹا اور ٹھگنا سا شخص اندر داخل ہوا۔ شوکت اسے پہچان کر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حویلی کا منتظم اعلیٰ ...... لالہ جواری لال تھا۔ اس نے صرف بڑے صاحب (جنرل مائیکل شا) کا حکم ایک پیغام کی صورت اسے سنا کر چلتا کردیا جس کا لب لباب یہی تھا کہ جنرل مائیکل شا کے دوست پروفیسر ہنری برنارڈ کو اپنی مہم پر نکلنے کے لیے کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ جس کا وہ پہلے ہی انتخاب کرچکے ہیں اور ان کے انتخاب میں سرفہرست شوکت تھا۔
اتنا پیغام سننے کے بعد شوکت نے دل ہی دل میں فوراً ایک بہانہ تراش لیا تھا، وہ کسی بھی صورت میں ریتا سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن جب اسے یہ پتا چلا کہ ریتا بھی ان کے ہمراہ ہوگی اور ہنری کے خاندان کے رشتے دار دونوں بہن بھائی رابرٹ اور گارشیا کے علاوہ کچھ خدام اور دو فوجی بھی ساتھ ہوں گے تو شوکت نے ریتا کی خاطر اس مہم پر جانے کے لیے ہامی بھرلی۔
پروفیسر ہنری نے لندن سے یہاں تک کا سفر اسی مقصد کے لیے کیا تھا کہ وہ کوہ شمالیہ اور اس سے ملحقہ کوہ ہمالیہ کی وادیوں، بستیوں اور پہاڑیوں میں بسنے والے قبیلوں کی علاقائی زبانوں پر تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا پڑاؤ ان کا ریاست ناگرہ تھا۔ وہاں تک روانہ کرنے کا پورا بندوبست مائیکل شا نے کیا تھا۔ جس میں ایک عدد فوکسی کار، ایک جیپ، جس کے پیچھے بڑا سا ٹرالر تھی تھا۔ دو گھوڑے اور اپنے خاندان کے علاوہ کچھ خدام بھی تھے۔ ریتا اور اس کے دونوں مذکورہ کزنز...... شوقیہ طور پر ساتھ ہولیے تھے۔
روانگی کی تیاری قریب آئی تو شوکت کے ماں باپ پریشان ہوگئے۔ شوکت نے ان سے یہی کہا کہ ”حکم حاکم مرگ مفاجات“...... تاہم انہیں تسلی دی کہ یہ مہم محدود عرصے کے لیے ہے اور بہت جلد وہ دیگر لوگوں کے ساتھ بخیریت لوٹ آئے گا۔
شوکت کو ماں باپ کی فکر نہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان

سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ یہاں انہیں کوئی تنگی تکلیف نہیں تھی۔ وہ آرام اور ٹھاٹ سے رہ رہے تھے مگر شوکت تو دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اگر ریتا اس سفر میں نہ ہوتی تو وہ اس مہم پر جانے سے ہی انکار کر دیتا مگر ریتا..... کی وجہ سے وہ ایک بہانہ بھی نہ بنا سکا تھا اور بناتا بھی کیوں.....؟

☆☆☆

یہ ریاست ناگرہ کے مضافاتی علاقے میں ایک خوبصورت پہاڑی وادی کا منظر تھا جس کے دائیں جانب ہردوار کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کوئی دم کو بھادوں مینہ برسنے والی تھی۔ یہ ان کا یہاں پر ابھی پہلا ہی پڑاؤ تھا کہ انہیں ایک ناخوشگوار واقعے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ کوہ شوالیہ کی پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی ان کا ٹریلر جیپ سمیت الٹ کر گہرے کھڈ میں جا گرا تھا۔ شکر تھا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا، کیونکہ ڈرائیور نے خطرہ بھانپتے ہی جیپ سے بروقت چھلانگ لگا دی تھی، البتہ کچھ ضروری سامان سے محرومی انہیں بہرحال سہنا پڑی تھی..... جبکہ دو گھوڑوں کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ فوکسی کار کو یہ ویسے ہی چھوڑ چکے تھے، جو ان سنگلاخ پہاڑی علاقوں میں ان کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ اب بس یہ لوگ پیادہ تھے۔ سامان خداموں نے اٹھا رکھے تھے، جن کی تعداد چھ تھی (ڈرائیور اسم خان بھی ان میں شامل تھا) جن میں دو فوجی، دو ہندو میاں بیوی اور شوکت تھا۔ اس کے ذمے صرف پروفیسر ہنری کے خاندان کے افراد کو سنبھالنے کی ذمے داری تھی اور ”ذمے داری“ میں پروفیسر کی گل رعنا بیٹی ریتا بھی شامل تھی۔ شوکت کو صرف اسی کی پروا تھی جبکہ ان دونوں بہن بھائی گارشیا اور رابرٹ کی خدمت بھی اس کی ذمے داری تھے۔

معیت اصل میں ملازم ہی بے چارے جھیل رہے تھے، جبکہ خاندان کے لوگ اس ایڈونچر سے انجوائے کر رہے تھے۔ خیمہ زنی، کیمپنگ کا سامان تک ان کے پاس موجود تھا۔ شوکت کو تو ویسے ہی ایسی مہمات کا تجربہ تھا، کیونکہ وہ اکثر فرنگی افسروں کے ساتھ ان کی شکاریات کی مہمات میں جاتا رہتا تھا۔ تاہم ریتا، گارشیا اور رابرٹ بھی اسکاؤٹنگ کا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ یوں بھی یہ انگریز لوگ زیادہ ہی ایڈونچر پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ان سب سختیوں اور باتوں کا تجربہ پہلے سے ہی ہوتا ہے۔

ایک پہاڑی دامن میں انہیں شام نے آلیا تھا مگر ابھی تک انہیں کسی پہاڑی بستی یا آبادی کے آثار نہیں ملے تھے۔ موسم کی خرابی نے بھی انہیں آگے بڑھنے سے مانع رکھا تھا۔ لہٰذا وہ وہیں پر ہی خیمہ زن ہو گئے۔

بارش تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن..... آثار بتا رہے تھے کہ کسی وقت بھی آسمان برسنے والا تھا۔

سربفلک پہاڑیوں کے دامن میں ایک مسطح قطعۂ زمین پر یہ لوگ تین بڑے خیمے گاڑ چکے تھے۔ آسمان پر بادل چھا جانے کی وجہ سے سرِشام ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا اسی لیے سالارِ قافلہ پروفیسر ہنری نے رات کے کھانے کی تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ زادِراہ کا بیشتر حصہ جیپ کے ٹرالر سمیت محرومی کے باعث گنوا چکے تھے اور پروفیسر ہنری کو اس سلسلے میں بہت فکر تھی، تاہم شوکت نے ان سے یہ کہہ کر پریشانی دور کر دی تھی کہ اگر خوراک کا مسئلہ ہوا تو انہیں بہ آسانی یہاں چھوٹا موٹا شکار بھی مل سکتا تھا۔ یوں بھی ریاست ناگرہ پہنچ کر صرف یہ مسئلہ ہی نہیں اور بھی بہت سے چھوٹے موٹے مسائل حل کیے جا سکتے تھے۔ ہنری کو اس کی باتوں سے کافی حد تک اطمینان ہوا تھا۔ یوں بھی پروفیسر ہنری اس کی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ اسے اپنا محسن سمجھتا تھا، کیونکہ وہ اس کا احسان آج تک نہیں بھولا تھا جب شوکت نے اس کی پیاری اور لاڈلی بیٹی کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس منہ زور گھوڑی مارگریٹ کے پیروں تلے روندنے سے بچایا تھا۔

شہری آبادی سے کسی حد تک قریب ہونے کی بنا پر یہاں انہیں قریب سے گزرتی ایک ریلوے لائن بھی دکھائی دی تھی۔ اس لیے وہ ادھر ہی فروکش ہو گئے تھے جبکہ ان کی منزل ابھی بہت آگے تھی۔

ہندو جوڑے نے الاؤ روشن کر دیا اور ہلکے پھلکے کھانے کی تیاری میں جت گئے۔ کچھ خشک خوراک کے ڈبے بھی تھے۔ مخصوص مشروب بھی تھے جس سے گارشیا اور رابرٹ زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے، جبکہ پروفیسر ہنری اپنے پائپ پر گزارہ کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی پی لیا کرتا تھا۔

دونوں فوجیوں کو پہرے پر لگا دیا گیا تھا جبکہ شوکت ان دو خیموں کے قریب ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا، جن میں سے ایک میں پروفیسر ہنری اور اس کی بیٹی ریتا موجود تھے جبکہ دوسرے میں وہ دونوں بہن بھائی گارشیا اور رابرٹ تھے مگر اس وقت خاندان کے یہ چاروں افراد بھی اپنے خیموں سے باہر ایک الاؤ کے گرد بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ بعد میں پروفیسر ہنری نے قریب پتھر پر اکیلے بیٹھے شوکت کو بھی قریب ہی بلا لیا تھا، جو بہرحال

رابرٹ کو برا لگا تھا مگر پروفیسر ہنری کی موجودگی میں وہ چپ رہا تھا۔

اس پہاڑی علاقے میں سردی کا احساس ایک خوشگواریت کا تاثر دیتا تھا۔ تاہم انہوں نے موسم کی مناسبت سے گرم اور موٹے کپڑے پہن رکھے تھے۔ الاؤ تاپنے کے دوران ہی نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ اس نے پھلکے بنائے تھے اور آملیٹ انڈے مسالے دار آلو کے ساتھ تلے تھے۔ انگریز لوگ ایسے ”اسپائسی“ کھانے کم ہی کھاتے ہیں، کھانے میں یہی کچھ بچا تھا سو شکر کر کے کھا لیا گیا۔ ابلے ہوئے چاول بھی تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پروفیسر صاحب نے تو اپنے خیمے کی راہ لی کہ انہیں نیند نے آلیا تھا جبکہ رینا، گارشیا اور رابرٹ وہیں الاؤ کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شوکت بھی موقع نکال کر وہیں ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اگرچہ اب تک مسلسل رابرٹ کی طرف سے نفرت خیزی کا نشانہ بنا ہوا تھا تاہم ضبط سے کام لیے خاموش تھا۔ وہ بھی اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر اس سے بے حد نفرت کرنے لگا تھا اور کئی بار جی چاہا تھا کہ اسے آڑے ہاتھوں لے۔ اس پورے قافلے میں رابرٹ ہی ایک ایسا بدطینت آدمی تھا جس کا سلوک شوکت سے ناروا تھا۔ اگرچہ گارشیا نے ہی نہیں بلکہ رینا نے بھی اسے ٹوکا تھا کہ وہ شوکت کے ساتھ ایسا رویہ نہ رکھے مگر رابرٹ کی زبان پر ایک لفظ ہوتا تھا کہ جو نوکر ہے وہ نوکر ہی بن کر رہے، دوست بن کر نہیں۔

الاؤ دہک رہا تھا، یہ تینوں ہنسی ٹھٹھے میں مصروف تھے، شوکت ذرا فاصلے پر بیٹھا تھا۔ ان ”صاحب لوگوں“ کی رکھوالی کا ذمہ نہ ہوتا تو وہ کب کا اٹھ کر چلا جاتا۔ یوں بھی وہ رینا کے دیدار سے اپنا دل بہلائے ہوئے تھا۔ رات سر پر آ گئی۔ آسمان پر بادلوں نے وقفے وقفے سے گرجنا شروع کر دیا تھا تب ہی رینا نے اپنے خیمے کی طرف رخ کیا اور گارشیا اور رابرٹ اپنے خیمے کی طرف چل دیے۔ شوکت نے بھی اپنے خیمے کی راہ لی۔

اسی وقت زور سے بادل گرجے، بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پہاڑیوں میں بارش برسنے سے شراٹے گونج رہے تھے۔ ان کے دائیں جانب ہر دوار کا تاریک جنگل برسات میں بھیگ رہا تھا۔ وہاں گھور اندھیروں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اطراف کی پہاڑیاں برستے پانی کے شور میں تربتر ہو رہی تھیں۔ خیموں میں نیند اتر چکی تھی، سب ہی تھکے ہوئے تھے اور لیٹتے ہی سو گئے تھے۔ تیز و مرطوب ہواؤں کی سیٹیاں سنگلاخ رخنوں میں پھنس کر یوں چلا رہی تھیں جیسے لاتعداد بدروحیں چیخ رہی ہوں...... شوکت دیگر ملازمین کے ساتھ اپنے خیمے میں گہری نیند سویا ہوا تھا...... ان کے خیمے موٹے کپڑے کے بنے ہوئے تھے، وہ بھی بارش کے پانی میں بھیگ رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ الاؤ کب کا سرد پڑ چکا تھا۔ رفتہ رفتہ بارش کا زور بھی ٹوٹنے لگا، یہاں تک کہ وہ بالکل بند ہو گئی۔ برستے طوفان باد و باراں کے تھم جانے کے بعد ماحول میں یکلخت ایک عجیب اور اسرار بھری سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ آسمان ساون بھادوں مینہ برسا کے صاف وشفاف ہو چکا تھا جس کے باعث طباق چاند نے بھی اپنا سنہرا ارتھ اس پہاڑی وادی میں اٹھا لیا تھا۔ خیموں کی دھلی ہوئی موٹی چادریں اس کی طلسماتی روشنی میں چمکنے لگی تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب جانے کس کھٹکے پر شوکت کی آنکھ ایک دم کھل گئی تھی۔ وہ پشت کے بل سینے پر دونوں ہاتھ رکھے اسی طرح پڑا رہا، یوں جیسے اطراف کے اسرار بھرے ماحول نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ اس کی کھلی آنکھیں خیمے کی مخروطی دیوار پر مرتکز ہو گئی تھیں اور تب ہی اسے وہاں کسی کا سایہ متحرک سا نظر آیا۔ اس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ سائے کا حجم بتدریج بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ پورا خیمہ اس دیوہیکل سائے میں آ کر تاریک پڑ گیا اور ٹھیک اسی وقت ایک عجیب سی آواز ابھری تھی۔

وہ خیمے کے اندر اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ دونوں عمر رسیدہ میاں بیوی نندو بابا اور شانتا بھی ایک طرف سوئے پڑے تھے۔ شوکت نے تیز خراٹے کی آواز سن کر یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کوئی دیوہیکل پہاڑی درندے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے خیمے میں کوئی ہتھیار موجود نہ تھا ماسوائے ایک لمبے پھل والی آڑی سی قرولی کے...... وہ اسے ہاتھ میں لیے دبکا بیٹھا خیمے کی اندرونی چادر والی دیواروں کو دیکھتا رہا جو ابھی تک سیاہ اور تاریک پڑی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً وہ دیوہیکل سایہ متحرک ہوا اور خیمے کا ایک حصہ کسی دباؤ کے باعث جھکتا چلا گیا، تب ہی شوکت ایک دم باہر نکل آیا۔

چٹکی ہوئی چاندنی میں اس نے اپنے خیمے کے قریب جو منظر دیکھا، وہ اسے تھرا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے سامنے ایک دیوقامت ”گریزلی“ (Grizzly) کھڑا تھا۔

جاری ہے

غلط فہمی

ثمر عباس

غلط فہمی ہمیشہ دو پیار کرنے والوں کے دلوں میں ہی گھر کرتی ہے۔ چاہے آپس میں تعلق کوئی بھی ہو بس ان کے درمیان فاصلہ پیدا کرکے وقت کے فیصلوں کا تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ وہ بھی علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرچکے تھے لیکن... وقت نے ان کے درمیان ایک ننھے فرشتے کو لاکر سارے فاصلے مٹاڈالے... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

مخالف سمت میں چلنے والے ایک
جوڑے کے ملاپ کا انوکھا انداز

"ایلیٹ! میں اپنے بچے کا نام ہارپو نہیں رکھوں گی۔" شیرون نے مجھے بالکل اسی انداز میں دیکھا جب میں نے علیحدگی کے موقع پر اس سے معاوضے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت اس سے بحث میں جیت گیا تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ اس کی یہ بات مان سکوں گا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جو میں نے کامیڈی ٹونائٹ کی لابی میں واقع اسنیک بار کے قریب رکھی تھی۔ تھیٹر کا دروازہ کھلنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ گوکہ تھیٹر کا ائرکنڈیشنر چل رہا تھا لیکن پرانے ماڈل

کا ہونے کی وجہ سے اس کی کارکردگی واجبی سی تھی۔
شیرون سے میری علیحدگی ہو چکی تھی لیکن ہونے والے بچے پر ہم دونوں کا مساوی دعویٰ تھا تاہم قانون کے مطابق وہ بچے کو اپنے ساتھ رکھنے کی حقدار تھی۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو نقصان میں محسوس کیا۔
''باپ ہونے کی وجہ سے میرا حق زیادہ ہے اس لیے تمہیں میرا تجویز کردہ نام قبول کر لینا چاہیے۔'' میں نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔
شیرون نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''نہیں، یہ ایک احمقانہ نام ہے جس کی وجہ سے بچہ ساری عمر مذاق اور بے عزتی کا نشانہ بنتا رہے گا۔'' پھر وہ اپنے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ''ویسے بھی اگر لڑکی ہوئی تو؟''
''یہی اس نام کی خوبصورتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر لڑکی ہوئی تب بھی تم یہ نام رکھ سکتی ہو۔''
بحث مزید طول پکڑتی لیکن خوش قسمتی سے ہمارا ایک اسٹاف ممبر جوناتھن وہاں آ گیا اور مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی اہم بات کہنے والا ہو۔
''کیا بات ہے جوناتھن؟''
''صوفی کا کہنا ہے کہ میں تنہا سوڈا مشین پر کام کر سکتا ہوں۔''
صوفی اسے آہستہ آہستہ اسنیک بار کے کام سکھا رہی تھی تاکہ وہ اس کی جگہ لے سکے کیونکہ آنے والے موسم خزاں میں اسے پرنسٹن میں کلاسیں اٹینڈ کرنا تھیں۔
''یہ تو بہت اچھی بات ہے جوناتھن۔'' میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔
''کیا تم میرے ساتھ چل کر دیکھنا چاہو گے؟'' جوناتھن نے اسنیک بار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''یقیناً۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ اسنیک بار کی طرف چل دیا جو وہاں سے پندرہ فٹ دور تھا۔
اس نے ایک مشروب بنا کر مجھے دیا اور بولا۔ ''کیسا ہے؟''
اس مشروب کا ذائقہ ڈائٹ کوک جیسا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی تبصرہ کرتا میرے دائیں کندھے کے قریب ایک آواز آئی۔ ''مسٹر فریڈ۔''
یہ انتھونی تھا۔ میرا اصول پروجیکشنسٹ۔ اصول اس لیے کہ صرف وہی ہمارے قدیم پروجیکٹر کو عمدگی سے چلا سکتا تھا۔
''تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر میں کل ایک گھنٹا تاخیر سے آؤں؟''
سچ تو یہ ہے کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا اور انتھونی نے اس سے پہلے کبھی چھٹی نہیں مانگی تھی۔ اسے تھیٹر میں کام کرنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ شروع کے دو مہینے عملاً یہیں رہا۔ اس نے بڑی محنت اور پیار سے اس ناکارہ پروجیکٹر کو کام کے قابل بنایا اور پھر پروجیکشن روم کے لیے اپنی یونیورسٹی کے سات عدد کلاس فیلوز بھرتی کیے۔ لہٰذا اس کا چھٹی مانگنا ایک غیر معمولی بات تھی۔
''تمہیں کس کام کے لیے چھٹی چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔
''مجھے اپنے اسکرین پلے پر کام کرنا ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
''تم ہمیشہ ہی کسی نہ کسی اسکرین پلے پر کام کرتے رہتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں کیا خاص بات ہے؟''
''یہ میرا بڑا پروجیکٹ ہے۔'' انتھونی نے کہا۔ ''مجھے اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ یہ سب سے بہتر ہو۔ میں رات کو جانے سے پہلے کل کے لیے تمام ریلیں ترتیب سے رکھ جاؤں گا۔ صرف ایک گھنٹے کی تو بات ہے۔''
میں جواب دینے ہی والا تھا کہ شیرون کی ہلکی سی کراہ سن کر چونک پڑا۔ میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اس کی زبان پر میرا ہی نام تھا۔ ''ایلیٹ.....''
فلموں میں دیکھا ہے کہ جب کسی عورت کے یہاں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آتا ہے تو تمام سرگرمیاں تیز ہو جاتی ہیں۔ کچھ بے وقوف پانی گرم کرنے لگتے ہیں یا اسپتال کی طرف دیوانہ وار دوڑ لگا دیتے ہیں جبکہ زیادہ تر بچے ٹیکسی میں ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ حقیقی تجربہ اس سے مختلف ہے۔ میں شیرون کو رابرٹ وڈ جانسن یونیورسٹی اسپتال لے گیا۔ شیرون خود بھی ڈاکٹر تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایمرجنسی روم کے بجائے براہِ راست میٹرنٹی ونگ میں لے جایا گیا جو بہت عمدگی سے بنایا گیا تھا۔ نرس جین نے بتایا کہ پورے اسپتال میں یہ سب سے اچھی جگہ ہے۔ وہ شیرون کو اس کے کمرے میں لے گئی۔
فوراً ہی ڈیوٹی پر موجود زچگی کے ماہر ڈاکٹر وائزمین نے شیرون کا معائنہ کر کے بتایا کہ بچے کی پیدائش میں ابھی بارہ گھنٹے باقی ہیں۔ ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مونیکا کو آنا تھا۔ حتمی رائے وہی دے سکتی تھی لیکن اس کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ جب تک ڈاکٹر وائزمین اسے رپورٹ نہ دیتا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
اپنی سابقہ بیوی کو اس حالت میں دیکھنا کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ ڈاکٹر وائزمین نے پہلا کام یہ کیا کہ

شیرون کے ساتھ ایک مانیٹر منسلک کر دیا جس پر پٹھوں کا سکڑاؤ اور اس کی شدت دیکھی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر نے مانیٹر کا رخ شیرون کی طرف سے موڑ کر میری جانب کر دیا تاکہ وہ نہ دیکھ سکے۔ شیرون مجھ سے اس بارے میں پوچھتی رہی۔ تین چار گھنٹوں بعد یہ کھیل اپنی دل کشی کھو بیٹھا اور وہ مجھ سے ممنوعہ اشیا کے لیے اصرار کرنے لگی۔

"یہ لوگ مجھے کھانا نہیں دیں گے کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ شاید آپریشن نہ کرنا پڑ جائے۔" اس نے کہا۔ "تم مجھے ایک ملک شیک لا دو۔"

"تم جانتی ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"تم خود بھی ڈاکٹر ہو۔ کیا تم اس حالت میں اپنی کسی مریضہ کو ملک شیک لینے کی اجازت دو گی؟"

"میں زچگی کی ماہر نہیں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ زچگی میں آٹھ گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ وقت باقی ہے اس لیے میں ملک شیک لے سکتی ہوں۔"

میں نے ملک شیک لانے سے انکار کر دیا اور پھر اسے مانیٹر پر نظر آنے والے سکڑاؤ کے بارے میں بھی نہیں بتایا جس پر وہ مزید ناراض ہو گئی لہٰذا حالات کو معمول پر لانے کے لیے برف کے ٹکڑے لانے پر تیار ہو گیا جنہیں وہ منہ میں رکھ کر چوستی رہے۔ شیرون نے تجویز پیش کی کہ اگر یہ ٹکڑے ملک شیک میں ڈوبے ہوئے ہوں تو بہتر ہوگا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے سوچتی رہے۔

کمرے سے باہر نکل کر میں ایک بڑے ہال میں داخل ہوا جس میں نرسنگ اسٹیشن اور الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے کسی نرس سے برف کے ٹکڑوں کے لیے نہیں کہا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میں خود ہی کپ اور فریزر تلاش کر سکتا ہوں۔ اس طرح کچھ دیر کے لیے شخص شیرون کے بستر کے ساتھ لگے مانیٹر سے نجات مل جائے گی۔ بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ اسپتال میں آئس مشین تلاش کرنا آسان نہیں۔ میں نے قریب ترین ہوٹل تک جانے کے بارے میں سوچا جو ایک میل سے بھی کم فاصلے پر تھا لیکن وہ ایک گرم دن تھا اور شاید میں گرم پانی سے بھرے ہوئے کپ کے ساتھ واپس آتا۔ ایک ایسی عورت کے لیے جو ملک شیک کی آس لگائے بیٹھی تھی، یہ بڑی مایوسی کی بات ہوتی۔

مریضوں کے کمروں کے ساتھ ایک طویل برآمدہ تھا اور اس کے دائیں جانب کئی دروازے تھے جو زیادہ تر مقفل تھے اور ان پر لکھا ہوا تھا، صرف عملے کے لیے...... جبکہ چوتھے دروازے پر لگے ہوئے بورڈ پر جنرل سپلائز لکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے برف نہیں تو کم از کم ایک کپ ہی مل جائے گا لہٰذا میں نے دروازے کی ناب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اندر شیشے کی الماریوں کے درمیان ایک شخص دیوار کی طرف جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس کی پشت کا تین چوتھائی حصہ میری طرف تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے میرے قدموں کی آواز سنی ہوگی۔ اس کے سامنے دیوار کے ساتھ پچیس سال کی ایک عورت آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔ دونوں نے اسپتال کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس عورت کے سنہری بال پیچھے کی طرف مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ کوئی آواز نہیں نکال رہی تھی اور نہ ہی آزادانہ طور پر حرکت کر رہی تھی۔

لیکن اس کے جسم کے درمیانی حصے سے خون اس کے کپڑوں پر بہہ رہا تھا اور مرد کے ہاتھوں میں کوئی چمک دار چیز تھی جو غالباً چاقو یا کوئی تیز دھار چھری تھی اور اس پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ میں مزید کچھ جاننے کے لیے زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔

مجھے یاد نہیں کہ باہر نکلتے وقت میں نے دروازہ بند کیا تھا یا نہیں البتہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ مجھے اس شخص کو غیر مسلح کرنا چاہیے یا کسی اور سے مدد طلب کروں۔ میں نے دوسرے طریقے کا انتخاب کیا۔ میں اپنے آپ کو عملی انسان سمجھتا ہوں لیکن شاید تھوڑا سا بزدل بھی ہوں۔

برآمدے میں کوئی بھی نہیں تھا جس پر مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ ورنہ عام طور پر اسپتال کے برآمدوں میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ میں نرسنگ اسٹیشن کی طرف بڑھا جہاں شیرون کے کمرے کے قریب ہی نرس جین بیٹھی ہوئی تھی۔

"جین!" میں نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "سپلائی والے کمرے میں ایک شخص نیلا لباس پہنے ایک عورت پر چاقو یا کسی اور چیز سے حملہ کر رہا ہے۔"

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "کیا؟"

میں نے اپنی بات دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور کہا۔ "ہمیں سیکیورٹی گارڈز، پولیس یا کسی اور کو بلانا چاہیے۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔"

جین ایک پیشہ ور نرس تھی اور یہ اس کے لیے پہلا ایمرجنسی کیس نہیں تھا۔ اس نے فون اٹھایا اور ڈیسک پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے میٹرنٹی میں سیکیورٹی چاہیے ابھی۔" اس سے پہلے کہ کوئی تفصیل جاننا

چاہتا، اس نے فون بند کر دیا اور کھڑی ہو گئی۔

اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے ایک میل نرس نے بھی یہ گفتگو سن لی اور بولا۔ ''کیا ہوا؟''

''سپلائی روم میں ایک شخص چاقو سمیت موجود ہے۔''

وہ شخص کرسی سے اٹھا اور تیزی سے اس کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے دکھاؤ۔''

میں نے جائے وقوعہ پر دوبارہ جانے کے خیال کو پسند نہیں کیا کیونکہ بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا تھا اور ہم دونوں ابھی تک کسی نام پر متفق نہیں ہوئے تھے۔ اگر میں مارا جاتا تو شاید وہ بچے کا نام فلپ رکھ لیتی لیکن میں پھر بھی چلا گیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسپتال کا عملہ مجھے بزدل سمجھے۔

میل نرس کا نام رینڈی تھا۔ وہ مجھ سے پہلے سپلائی روم میں پہنچ گیا۔ دروازہ نمبر چار مقفل تھا۔ اس نے ناب پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول دیا۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ اس طرح مجرم کی انگلیوں کے نشانات ضائع ہو جائیں گے۔ وہ دہلیز پر کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگا اور اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

''تم نے کیا دیکھا تھا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ اب یہاں کوئی نہیں ہے۔''

واقعی وہاں کا منظر دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک منٹ پہلے اس کمرے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ دونوں افراد وہاں سے جا چکے تھے اور سب چیزیں اپنی جگہ پر ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس دیوار اور فرش کو غور سے دیکھا، وہاں خون کا کوئی دھبا نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس نے یہ جگہ صاف کر دی ہے۔'' میں نے کمزور آواز میں کہا۔

''اونہہ۔'' رینڈی نے منہ بناتے ہوئے کہا جیسے اسے میری کہانی پر یقین نہ آیا ہو لیکن یہ بحث کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ عین اسی وقت اسپتال کے دو مسلح باوردی سیکیورٹی گارڈز وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے لمبے قد اور سیاہ رنگت والے نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا ایمرجنسی ہے؟''

میرے بجائے رینڈی نے جواب دیا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ اس نے یہاں ایک عورت پر چاقو سے حملہ ہوتے دیکھا ہے۔''

چھوٹے قد والے سیکیورٹی گارڈ نے رینڈی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کب؟''

''تقریباً دو منٹ پہلے۔'' رینڈی نے جواب دیا۔

لمبے قد والے نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم نے یہاں کیا دیکھا؟''

میں نے کہا۔ ''ایک پچیس تیس سال کی عمر کے شخص نے اسپتال کے نیلے لباس میں سنہرے گھنگرالے بالوں والی نوجوان عورت کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی قسم کا بلیڈ تھا اور یہاں اس عورت کے کپڑوں سے خون ٹپک رہا تھا۔'' میں نے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں میں نے عورت کے کپڑوں پر خون کا دھبا دیکھا تھا۔

چھوٹے قد والے گارڈ نے کمرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ''اب یہاں کچھ نہیں ہے۔''

''میرا اندازہ ہے کہ اس نے یہاں کی صفائی کر دی۔'' اس بار مجھے یہ جملہ کچھ احمقانہ لگا۔

''اندازہ ......!'' گارڈ نے میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی اور میں نے جل کر کہا۔ ''کیا تم لوگوں کو عمارت کے دروازے بند کر کے اس شخص کو تلاش نہیں کرنا چاہیے؟ یہاں ایک شخص تیز دھار آلہ لیے پھر رہا ہے جس نے شاید اس کمرے میں ایک عورت کو قتل کر دیا۔''

''کیا وہ مر گئی؟'' رینڈی نے پوچھا۔ ''تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو؟''

وہ تینوں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس عورت کی آنکھیں بند تھیں اور مرد نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ یقیناً اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اس نے کچھ نہیں کہا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مر چکی تھی۔''

لمبے قد والے نے پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم یہاں اسپتال میں کیا کر رہے ہو؟''

''میری سابقہ بیوی یہاں داخل ہے۔ اس کے یہاں بچہ ہونے والا ہے۔''

''لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' چھوٹے قد والے نے کہا۔

''کیونکہ میں اپنے بچے کی پیدائش کے موقع پر یہاں موجود رہنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا بچہ؟'' رینڈی نے حیرت سے پوچھا۔

"سابقہ بیوی کے یہاں ہونے والے بچے سے تمہارا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ میرا ہی بچہ ہے۔"

لمبے قد والے سکیورٹی گارڈ نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور وہ تینوں مجھے لے کر برآمدے میں آگئے۔ چھوٹے قد والے نے پوچھا۔ "کیا یہ تمہارا پہلا بچہ ہے؟"

"ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

وہی گارڈ دوبارہ بولا۔ "بعض اوقات جب کسی کے یہاں پہلا بچہ ہونے والا ہوتو وہ تھوڑا سا جذباتی اور گھبرایا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے یہ کئی مرتبہ دیکھا ہے اور یہ ایک فطری بات ہے۔ تمہاری یا کم از کم تمہاری سابقہ بیوی کی زندگی میں تبدیلی آرہی ہے اس لیے تمہاری پریشانی سمجھ میں آتی ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔" میں نے جل کر کہا۔ "میں نے کوئی تماشا نہیں دیکھا۔ پھر کہہ رہا ہوں کہ اس کمرے میں دو افراد تھے جن میں سے ایک بے حس و حرکت تھا اور اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے علاوہ تمہیں کیا بتاؤں۔"

"تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔" چھوٹے قد والے نے کہا۔ "ہم کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے ہیں جس کا حلیہ تمہارے بیان کے مطابق ہو۔"

"کیا یہ کافی ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ تم کچھ نہیں کرو گے؟ شاید وہ عورت مر نہ جائے۔"

چھوٹے قد والے نے کہا۔ "شاید تم نے کچھ دیکھا ہو لیکن تم واضح طور پر نہیں سوچ رہے۔" اس کے لہجے میں سانپ جیسی پھنکار تھی۔ "تم کمرے میں جا کر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھو۔" اس نے لفٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس لمحے میں نے بڑی بے عزتی محسوس کی اور غصے سے کہا۔ "کیا ہوگا اگر میں پولیس کو فون کروں؟"

"تمہیں ایسا کرنے کی آزادی ہے۔" چھوٹے قد والا بولا۔ "لیکن اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو اسپتال سے باہر جا کر فون کرو۔ تم یہاں خلل ڈال رہے ہو۔"

"میں نے کیا خلل ڈالا ہے؟"

"مجھے کچھ کہنے پر مجبور نہ کرو۔" اس نے جواب دیا۔ "بہتر یہی ہے کہ کمرے میں جا کر اپنی بیوی کی خبر گیری کرو۔"

جب میں کمرے میں واپس گیا تو وہاں میرے والدین بھی آچکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی شیروان نے کہا۔

زندگی

☆ بظاہر تو بہار کی طرح شاداب ہے مگر حقیقت میں بڑھاپے کی طرح اداس ہے۔

☆ ہوا کے سرد جھونکے کے مانند ہے جو انسان کو خنکی محسوس کروا کے چلی جاتی ہے۔

☆ پانی کے اس بلبلے کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سطح آب پر نمودار ہوتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا ہے۔

☆ ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح ہے جو ہوا کے جھونکے سے بھی بجھ سکتی ہے۔

رشتہ

ایک صاحب کی اپنی کزن سے شادی ہوئی۔ ایک مہینے بعد بیگم کا تعارف کرواتے ہوئے بولے۔ یہ ہیں میری اہلیہ...... پہلے ان سے میرا بلڈ کا رشتہ تھا اور اب بلڈ پریشر کا ہے۔

پنکھا

آج آدھے گھنٹے میں اتنی بار لائٹ آئی گئی ہے کہ پنکھا خود بھول گیا ہے...... میں سجے پاسے گھومتا ہے یا کھبے پاسے......

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

اکٹھی خوراک

ایک صاحب نے سڑک پر بیٹھے ایک گداگر کو دس روپے دیے اور کہا میں بیمار ہوں، میرے لیے دعا کرو۔

فقیر نے دعا دی۔ پھر بولا۔ "ساٹھ روپے اور دیں۔"

ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

فقیر بولا۔ "ایک دن کی دعا سے شاید افاقہ نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ہفتے کی خوراک اکٹھی ہی لے جائیں۔"

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

"ملک شیک کہاں ہے؟"
"کیا تم آج کے دن ملک شیک لے سکتی ہو؟" میری ماں نے اس سے پوچھا۔
"نہیں!" شیرون سے پہلے میں بول پڑا۔ "ویسے بھی یہاں کہیں ملک شیک نہیں ملا۔"
شیرون نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "برف کے ٹکڑے بھی نہیں ملے؟"
میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اپنی زبان پر قابو رکھو یا میں تم سے دوبارہ شادی کرلوں۔"
"خوابوں میں......" اس نے کہا اور بستر کے ساتھ لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ اس وقت اس کے بائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور اسے برف کے ٹکڑے منہ میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اسی وقت جین دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا اور شیرون کے پاس آکر بولی۔ "ڈاکٹر! تمہیں کچھ چاہیے؟"
"کیا مجھے برف کے ٹکڑوں کا ایک کپ مل سکتا ہے؟"
"یقیناً۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔"
میں اس کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ پہلے نرس سے معلوم کرلوں۔ بلاوجہ ادھر ادھر تاک جھانک کرتا پھرتا رہا۔ خیر یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جرم ہوتے دیکھ لیا۔
"تمہیں یہ خبر کیسے ملی؟" میں نے اپنے والدین سے پوچھا۔
"شیرون نے ہمیں فون کیا تھا۔" میرے والد نے وضاحت کی۔
"تمہیں تو یہ خیال ہی نہ آیا کہ ہمیں فون کرلیتے۔" میری ماں نے شکوہ کیا۔
"سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔" شیرون نے کہا۔ "خوش قسمتی سے تمہارے والدین اسی علاقے میں تھے۔"
"تم یہاں کیا کررہے تھے؟" میں نے پوچھا۔
"دراصل ہمیں ایک الیکٹرک ہیٹر کی ضرورت ہے۔ وہی دیکھنے آئے تھے۔"
اسی وقت جین برف سے بھرا ہوا ایک کپ لے کر آگئی۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر وائزمین بھی تھا۔ جین نے شیرون کو وہ کپ دیا اور واپس چلی گئی۔ ڈاکٹر وائزمین نے شیرون کے قریب جاکر کہا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ایک زیر تربیت ڈاکٹر کو تمہارے معائنے کے لیے کہہ دوں؟ ویسے تو وہ سرجری کے شعبے میں ہے لیکن باری باری اس وارڈ میں بھی ڈیوٹی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے آپریشن سے زیادہ دلچسپی ہے۔"
"یقیناً!" شیرون نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ وہ مجھے آپریشن کی طرف نہ دھکیل دے۔"
وائزمین مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔"
چند منٹوں بعد وہ ایک نوجوان ڈاکٹر کے ساتھ واپس آیا اور شیرون کے بستر کے قریب جاکر بولا۔ "یہ ڈاکٹر اینڈرسن ہے۔"
اس کی عمر پچیس اور تیس برس کے درمیان ہوگی۔ اس نے اسپتال کے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ بالکل نیا تازہ اور دھلا ہوا ہے اور اس کی ایک معقول وجہ تھی کیونکہ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے سپلائی روم میں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے لباس اسی وجہ سے تبدیل کیا کہ اس کی پینٹ شرٹ پر خون کے دھبے دیکھ کر لوگ فکرمند ہوجاتے اور کوئی بھی اس سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کس مریض کا خون ہے۔
اینڈرسن نے بڑی کوشش کی کہ وہ مجھے دیکھ کر کوئی ردعمل ظاہر نہ کرے۔ میرے علاوہ کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر یہی سمجھتا کہ وہ ایک عورت کا معائنہ کرتے ہوئے کچھ گھبرا رہا ہے لیکن میں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ دراصل وہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔
شیرون اسے دیکھ کر مسکرائی تاکہ وہ سکون سے اس کا معائنہ کرسکے۔ وہ خود بھی تربیت کے مرحلے سے گزر چکی تھی اور جانتی تھی کہ زیر تربیت ڈاکٹروں کو مریضوں کو مطمئن کرنے میں کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔
"آجاؤ۔" اس نے کہا پھر اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔
"ایلیٹ! تم ٹھیک تو ہو؟"
ڈاکٹر وائزمین نے ایک مانیٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک نظر اس پر بھی ڈالو۔"
"سب کچھ نارمل ہے۔" اس نے ڈاکٹر سے کہا لیکن وہ پورے وقت مجھے دیکھتا رہا۔ شاید اسے معلوم ہوگیا تھا کہ میں سب جانتا ہوں۔
"تمہارے خیال میں بچے کی پیدائش میں کتنی دیر ہے؟" ڈاکٹر وائزمین نے پوچھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کا امتحان لے رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اتنا ہی احمق ہے کہ مریض، اس کے سابق شوہر اور سسرال والوں کے سامنے پیدائش کا صحیح وقت بتادے۔

"پانچ سے چھ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔" وہ ڈاکٹر وائزمین کے جال میں پھنس گیا۔

"میں بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتا۔" اس کے استاد نے کہا۔ اینڈرسن کا منہ اتر گیا۔ وہ امتحان میں فیل ہو گیا تھا۔

"صرف ایک بات۔" شیرون نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ڈرپ کی سوئی ہل گئی ہے شاید ٹیپ ڈھیلا ہو رہا ہے۔"

"اوہ۔ میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا اور شیرون کے برابر رکھی ہوئی ٹرے میں سے کچھ نکالنے لگا۔

"تم کچھ مت کرو۔" میں چلایا۔ "میں چین کو بلاتا ہوں۔"

میں تیزی سے چلتا ہوا نرسنگ اسٹیشن تک گیا۔ اس وقت ریبڈی وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کے کان کے قریب جا کر کہا۔ "وہ مل گیا۔ وہی جو سپلائی روم میں تھا، اب وہ ہمارے کمرے میں ہے اور میری سابقہ بیوی کو زخمی کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔"

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"آؤ......" میں نے زور دے کر کہا۔ "ہمیں وہاں جانا چاہیے۔"

"کہاں؟" اس نے کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں دوبارہ سیکیورٹی کو بلاؤں؟"

"ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ سیکیورٹی والوں کو فون کرو۔ میں نے اسے ایک عورت کو چاقو مارتے دیکھا اور اب وہ میرے کمرے میں ڈاکٹر اینڈرسن کا روپ دھارے کھڑا ہے۔ ہمیں اسے روکنا ہے۔ انہیں جلدی بلاؤ۔ میں واپس اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

کمرے کا ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ اب صوفی اور جوناتھن بھی آگئے تھے۔ میں نے بستر کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن مما نے مجھے روک دیا۔ پردے کے پیچھے ڈاکٹر شیرون کا معائنہ کر رہے تھے لیکن مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں نے اتنا پردہ ہٹا دیا کہ اندر جا سکوں۔ اینڈرسن ایک طرف کھڑا اپنے استاد کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ میری نظر اس کی جیب پر گئی جس میں ایک روئی کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا اور اس پر خون کا دھبا لگا ہوا تھا۔

"ایلیٹ!" شیرون نے کہا۔ "اگر تم برا نہ مانو تو......"

میں اس کا اشارہ سمجھ کر باہر چلا گیا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ سیکیورٹی گارڈز کو آنے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ صوفی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اسنیک بار پر کون ہے؟"

"کارلا......ویسے بھی آج تھیٹر میں صرف بیس لوگ آئے ہیں۔"

پردہ ہٹا اور دونوں ڈاکٹر باہر آگئے۔ شیرون نے میرے ساتھ صوفی اور جوناتھن کو دیکھا تو بولی۔ "اوہ میرے خدا...... ایلیٹ! تمہیں تو اس وقت تھیٹر میں ہونا چاہیے تھا۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ سیکیورٹی گارڈز کے آنے سے پہلے اینڈرسن کمرے سے جائے۔ میں نے بستر کے قریب جا کر شیرون سے پوچھا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے ڈاکٹر وائزمین کی طرف دیکھا اور بولی۔ "ڈاکٹر! تم کیا کہتے ہو؟"

"تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمام علامات نارمل ہیں۔ البتہ تمہیں چند گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ میں تھوڑی دیر بعد پھر چیک کروں گا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ آپریشن کی ضرورت پیش آئے گی۔" اینڈرسن نے کہا۔

ان دونوں نے دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس وقت میرے ملے جلے جذبات تھے۔ وقتی طور پر یہ اطمینان ضرور ہوا کہ وہ قصائی شیرون سے دور جا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تشویش بھی ہو رہی تھی کہ اگر وہ کمرے سے باہر نکل گیا تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا سیکیورٹی گارڈز کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم دونوں کو یقین ہے کہ ابھی ڈلیوری میں وقت لگے گا؟" میں نے ایک بے چین باپ کا لہجہ اپنانے کی کوشش کی۔ "پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"ایلیٹ!" شیرون نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈاکٹر ہیں۔"

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر۔" ڈاکٹر وائزمین بولا۔ "ہم ان کی پریشانی کو سمجھتے ہیں، خاص طور پر جب پہلے بچے کا معاملہ ہو۔"

جب وہ دونوں جانے لگے تو میں نے اینڈرسن کے قریب ہو کر اس سے کہا۔ "تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟"

ڈاکٹر وائزمین آگے جا چکا تھا۔ اینڈرسن نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"ایک لفظ بھی مت کہنا۔" اس نے شیرون کی

طرف دیکھ کر سر ہلایا اور چلا گیا۔ شیرون بستر پر لیٹی ہوئی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم ڈاکٹر سے کیا بات کر رہے تھے؟"

"ایک سیکنڈ...... !" میں نے کہا اور نرسنگ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ وہاں رینڈی بیٹھا ہوا تھا۔ "سیکیورٹی گارڈز کہاں ہیں؟ وہ جا رہا ہے۔"

رینڈی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس بارے میں سنجیدہ تھے؟"

مجھے ایک بار پھر ناکامی ہوئی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر کمرے میں آ گیا۔ میرے پاس اور بھی طریقے تھے۔ میں بہ آسانی سیڑھیاں اتر کر سیکیورٹی اسٹیشن جا کر وہاں کے انچارج کو بتا سکتا تھا یا براہِ راست پولیس کو فون کر دیتا یا پھر اسپتال کے برآمدوں میں چلا چلا کر قتل کا شور مچاتا لیکن اس سے مریضوں کو تکلیف ہوتی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسپتال کے مردہ خانے میں جا کر دیکھتا کہ وہاں کسی سنہرے گھنگرالے بالوں والی لڑکی کی لاش تو نہیں جس کے پیٹ میں چاقو کا زخم ہو لیکن مجھے شبہ تھا کہ اینڈرسن یہ بے وقوفی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی مجھے مردہ خانے میں داخل نہ ہونے دیتا۔

ایک اور امکان یہ تھا کہ میں واپس اس کمرے میں جاؤں جہاں میری ساتھ بیوی ڈیلیوری کا انتظار کر رہی تھی اور اینڈرسن کے ممکنہ حملے سے بچانے کے لیے اس کے پاس رہوں۔ میں نے میٹرنٹی وارڈ کا ایک چکر لگایا تا کہ اپنے ذہن کو اس الجھن سے آزاد کر سکوں جو اس عورت کا خون دیکھ کر مجھ پر سوار ہو گئی تھی۔ تاہم سب سے پہلے مجھے شیرون کے کمرے کی حفاظت کا بندوبست کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کر سکتا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"مجھے باہر جا کر کچھ چیزوں کو دیکھنا تھا لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"باہر کیا دیکھنے گئے تھے؟" میری ماں نے پوچھا۔

"شیرون تو یہاں ہے۔"

میں نے بستر کے پاس جا کر شیرون کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "میں ڈیلیوری ہونے تک یہیں ٹھہروں گا پھر مجھے تمہارے ڈاکٹر کے خلاف رپورٹ درج کرانے کے لیے قریبی پولیس اسٹیشن جانا ہے۔"

"وہ تو یہاں ابھی آئی ہی نہیں۔"

"میں اس کی نہیں دوسرے ڈاکٹر کی بات کر رہا ہوں۔"

اسی وقت ڈاکٹر وائز مین اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ سکڑاؤ کی رفتار بڑھ گئی ہے۔"

"ہاں۔ ہر پانچ منٹ بعد مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" شیرون نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

وہ بستر کی طرف بڑھا اور اس نے پردہ کھینچ کر برابر کر دیا۔ اسی وقت ڈاکٹر اینڈرسن بھی آ گیا اور جیسے ہی وہ شیرون کے بستر کی طرف بڑھا، میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "رک جاؤ۔ یہ شخص قاتل ہے۔"

سب لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ اینڈرسن بھی حیران تھا پھر اسی نے بولنے میں پہل کی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس کے ساتھ ہی کمرے میں مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ چلا چلا کر سوالات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر وائز مین نے بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن کوئی آواز نہیں آئی۔

شیرون درد سے کراہ رہی تھی۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ "ایک قاتل......کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"میں نے اسے سپلائی روم میں ایک عورت کو پکڑے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو یا ایسی ہی کوئی چیز تھی۔ اس عورت کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن شاید نہیں......رکو۔"

اینڈرسن میری طرف ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جینی کمرے میں داخل ہوئی۔ "میں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میری شفٹ ختم ہو گئی ہے اور یہ......"

اس کے پیچھے وہ نرس تھی جسے اگلے آٹھ گھنٹوں کے لیے جینی سے چارج لینا تھا۔ اس کے گھنگرالے بال تھے اور وہ ...... صاف ستھرا نیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔

"ہائے!" اس نے کہا۔ "میں پامیلا ہوں۔" اس نے اینڈرسن کو عجیب انداز میں دیکھا جسے اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

اینڈرسن میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ میں تمہارے بارے میں غلطی پر تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم پامیلا کو زخمی کر رہے ہو لیکن تم کچھ اور ہی کر رہے تھے اور تم نہیں چاہتے ہو کہ لوگوں کو اس بارے میں پتا چلے۔"

پامیلا مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم مجھے جانتے ہو؟"

”یہی وہ شخص ہے۔“ اینڈرسن نے اسے بتایا۔
پامیلا کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ اس نے ”اوہ......“ کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔
میں نے کمرے میں موجود لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچے کی پیدائش کا وقت قریب آرہا ہے۔ اب ہمیں باہر جا کر انتظار کرنا چاہیے۔ میں بعد میں سب کچھ بتادوں گا۔“
صوفی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”ایلیٹ! تم نے کہا تھا کہ یہ شخص قاتل ہے۔“
”میں غلطی پر تھا۔ پریشان نہ ہو۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“
اسے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا لیکن وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر چلی گئی البتہ میرے والدین وہیں رکے رہے۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بھی باہر چلے جائیں؟“
ڈیڈی نے کہا۔ ”ہاں، جب بچہ دنیا میں آجائے تو جی بھر کر دیکھ لینا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ماں کا بازو پکڑا اور اسے کمرے سے باہر لے گئے۔
میں نے اینڈرسن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میری غلط فہمی دور ہوگئی ہے لیکن خون والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“
ان دونوں نے انگلیاں اپنے ہونٹوں پر رکھ لیں لہٰذا میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تم دونوں سپلائی روم میں وہی کچھ کر رہے تھے جو تم کرنا چاہتے تھے لیکن چاقو یا چھری کی ضرورت کیوں پیش آئی اور وہ خون کیسا تھا؟“
”تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔“ پامیلا بولی۔ ”ورنہ ہماری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔“
”یہ میرا وعدہ ہے۔ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“
”وہ ایک حادثہ تھا۔“ اینڈرسن بولا۔ ”ہم اس کمرے کو اس لیے استعمال کررہے ہیں کہ عام طور پر وہاں کوئی نہیں جاتا۔“
”میں برف تلاش کررہا تھا۔“ میں نے اعتراف کیا۔
پامیلا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”سپلائی روم میں؟“
”یہ بات نہیں۔ بائی داوے تم ٹھیک تو ہو؟ جب میں نے تمہیں دیکھا تو اس وقت تمہارے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔“
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یہاں تک کہ ٹانکوں کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔“
اینڈرسن مجھے ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”تم تو جانتے ہو کہ ایسے موقع پر کیا کچھ ہوجاتا ہے۔ میں ایک جگہ سے پامیلا کا لباس کاٹ رہا تھا۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور قینچی اس کی کھال میں چبھ گئی۔ یقین کرو، وہ ایک چھوٹا سا زخم تھا۔ میں نے اسی وقت پٹی کردی اور اس جگہ کو صاف کردیا اور پامیلا نے وہاں سے جاکر لباس تبدیل کرلیا۔“
”تمہاری آنکھیں بند تھیں۔“ میں نے پامیلا سے کہا۔ ”تم سے بہ مشکل کھڑا ہوا جارہا تھا۔“
اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
”ایلیٹ!“ شیرون نے پردے کے پیچھے سے پکارا۔ مجھے یہ آواز ہمیشہ سے مختلف لگی۔
وائزمین نے چیختے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر اینڈرسن۔“
اینڈرسن تیزی سے اندر آگیا۔ اس کے پیچھے میں بھی تھا۔ شیرون کی حالت دیکھ کر میں تقریباً بے ہوش ہوگیا تھا۔ جب حواس بحال ہوئے تو میرے ہاتھوں میں کمبل میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی جو کسی نے چند سیکنڈ پہلے مجھے تھمادی تھی۔ شیرون بستر پر لیٹی ہوئی مسکرارہی تھی۔ اس وقت وہ مجھے ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگی۔
ہمارے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔
میرے والدین، جوناتھن اور صوفی بھی کمرے میں آگئے۔ پامیلا اپنے کام میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر وائزمین جاچکا تھا لیکن اینڈرسن اب بھی وہاں موجود تھا اور اس کی نظریں پامیلا پر تھیں۔
”ہائے مٹیلڈا!“ میں نے اپنی بیٹی سے کہا۔
میری ماں نے پلکیں جھپکائیں اور بولی۔ ”مٹیلڈا؟“
ڈیڈی بولے۔ ”اس خوب صورت لڑکی کے لیے یہ ایک خوب صورت نام ہے۔“
”ہم اسے ٹلڈا کہیں گے۔“ شیرون نے نحیف آواز میں کہا۔
میں نے تصحیح کی اور بولا۔ ”ٹلی زیادہ مناسب رہے گا۔“
”یہ کوئی روایتی نام نہیں ہے۔“ ڈیڈی نے کہا۔
”ہم بھی روایتی والدین نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔
”بیٹی کے آنے سے بہت کچھ بدل گیا ہے ایلیٹ۔“ ماں نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“
”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اسے ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہے، ہم اسپتال سے فارغ ہوتے ہی طلاق کی درخواست واپس لے لیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں شیرون؟“
اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اثبات میں سر ہلادیا۔ مجھے لگا کہ زندگی میں کوئی پہلا عقل مندی کا کام کیا ہے۔

ٹارگٹ

مرزا امجد بیگ

بعض اوقات انسان کی مفاد پرستی کی عادت اسے ظلم کی انتہا پر بھی لے جاتی ہے۔ اپنی بہتری کی خواہش لیے وہ دوسروں کے لیے گڑھے کھودتا رہتا ہے اور انجانے میں اپنے انجام کو تیزی سے قریب لا رہا ہوتا ہے۔ کچھ یہی حال ان رشتوں کا بھی تھا جو سسرال کے نام پر اسے ملے اور وہ ان کی جانچ کرکے... کبھی اپنی پڑتال پر پردے ڈال کر بھی اپنے عیبوں کو چھپا نہ پائی۔ اپنے پرائے کی عینک لگائے وہ اسی تفریق میں متفرق مسائل کا شکار ہو کر بھی اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرسکی... مگر مجرم کے ماننے یا نہ ماننے سے جرم سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی نشاندہی کے لیے بیگ صاحب جیسے لوگوں کو میدان میں آنا اور انصاف کی زنجیر کو ہلانا پڑتا ہے اور بالآخر ثابت ہو جاتا ہے کہ شاطرانہ چال چلنے کے باوجود مجرم کبھی اپنے ٹارگٹ تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ... قدرت کے قوانین انسان کی سوچ سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں اور جب یہ بات اسے سمجھ میں آئی تب تک وہ بہت سے معصوم لوگوں کا دل دکھا چکی تھی۔

ایک جرم کی ہولناک تباہی سے بچنے والے خاندان کی خوش قسمتی کا ماجرا

کچھ لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ کم گو اور معاشرے سے الگ تھلگ رہنے والے۔ ایسے افراد بہت محتاط زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل اس طور ترتیب دیتے ہیں کہ انہیں شاذ و نادر ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بدقسمتی سے اگر کبھی ان کا مشکلات سے واسطہ پڑ بھی جائے تو وہ اپنی مدد آپ کے تحت تن تنہا اس بحران سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ انتہا درجے کی خودداری کے باعث یہ لوگ دوسروں سے مدد مانگنے کو اچھا نہیں سمجھتے...... اپنی ذات پر بھروسا کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن بعض اوقات انتہائی مجبوری کے عالم میں ایک انسان کو دوسرے انسان کے تعاون کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ اسی کو معاشرت کہا جاتا ہے۔

رشید بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ خاموش طبع، خوددار، اپنے ماحول سے الگ تھلگ رہنے والا اور ایک متوکل انسان...... اسی لیے ایک روز میں رشید احمد کو عدالت میں دیکھ کر چونک اٹھا تھا، میں ایک عدالت سے نکل کر دوسری عدالت کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک اس پر میری نظر پڑ گئی تھی۔

رشید احمد کا تعلق درس و تدریس سے تھا۔ وہ ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس کی رہائش کورنگی کے علاقے میں تھی۔ رشید احمد سے میری دو چار ملاقاتیں تھیں۔ کسی زمانے میں میرا ایک دوست کورنگی میں رہتا تھا۔ میں بھی

کبھار اپنے اس شاعر دوست سے ملنے چلا جاتا تھا تو رشید احمد سے بھی ملاقات ہوجاتی تھی۔ اب گزشتہ کئی سال سے میرا اس طرف جانا نہیں ہوا تھا۔ رشید احمد اپنے محلے میں "ماسٹر جی" کے نام سے مشہور تھا۔

"السلام علیکم ......" میں نے رشید احمد کے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے گردن اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

"ماسٹر جی! آپ کیسے ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

چند لمحات تک وہ متذبذب نگاہ سے مجھے تکتا رہا پھر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بے حد جذباتی لہجے میں گویا ہوا۔

"ارے...... وکیل صاحب...... آپ یہاں......!"

اس کا استفسار بڑا بے ساختہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت نہ ہوئی کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے رشید احمد سے مصافحہ کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماسٹر جی! میں یہاں اس لیے کہ ایک وکیل کو عدالت ہی میں ہونا چاہیے مگر آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟ آپ نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ سب خیریت تو ہے نا......؟"

سچی بات تو یہ ہے کہ رشید احمد کو ایسی خستہ حالت میں دیکھ کر مجھے حیرت بھرا دکھ ہوا تھا۔ ڈاڑھی بے ترتیب بڑھی ہوئی، سر کے بال بکھرے ہوئے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے جیسے وہ کافی عرصے سے سویا نہ ہو اور چہرے پر پریشانی خیمہ زن۔ اس سے قبل میں نے کبھی ماسٹر جی کو اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر میں نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

"ماسٹر جی! مجھے بتائیں، کون سی مصیبت آپ کو عدالت کا راستہ دکھایا ہے؟"

"وکیل صاحب......!" وہ بے چارگی سے بولا۔ "آپ نے ایک سانس میں اتنے سوالات کر دیے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ عارف کی جگہ میں کٹہرے میں کھڑا ہوں اور عدالت کے احاطے میں اس کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔"

رشید احمد کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا عارف اور ایک بیٹی تہمینہ۔ عارف، تہمینہ سے دو سال چھوٹا تھا۔ رشید احمد کے منہ سے "عارف اور کٹہرے" کے الفاظ سن کر میں چونک اٹھا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں دیر نہ لگی کہ عارف کسی قانونی جھمیلے میں پھنس گیا تھا جس کی وجہ سے رشید احمد اس وقت عدالت میں موجود تھا۔

"عارف کو کیا ہوا ہے؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

وہ زخمی لہجے میں بولا۔ "عارف پر چوری کا الزام ہے۔"

میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ عارف چوری چکاری کے معاملات میں ملوث ہوگا۔ رشید احمد نے اپنی اولاد کی مثالی تربیت کی تھی۔ میں عارف سے مل چکا تھا۔ وہ بہت ہی نستعلیق اور تحمل مزاج نوجوان تھا۔

میں نے پوچھا۔ "اس وقت عارف کہاں ہے؟"

"وہ ریمانڈ پر ہے۔" اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "پچھلے پندرہ دن سے وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔ پتا نہیں، کب اس مصیبت سے ہماری جان چھوٹے گی......!"

"آپ نے عارف کے لیے کسی وکیل کا بندوبست کرلیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تک تو میں نے یہ معاملہ اللہ کے سپرد کر رکھا تھا۔" وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا ہے۔ سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا ہے کہ ماسٹر جی، اگر بیٹے کو قانون اور پولیس کے چکروں سے نکالنا ہے تو کوئی وکیل کرنا بہت ضروری ہے۔ میں کسی اچھے وکیل کی تلاش ہی میں سٹی کورٹ آیا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔"

"ماسٹر جی! اللہ پر بھروسا کرنا بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے رشید احمد کی ویران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس عمل کو توکل کہتے ہیں لیکن توکل کا ایک بنیادی اصول ہے۔ توکل کے دعویدار اکثر اس اصول کو فراموش یا نظرانداز کر دیتے ہیں اور بڑے اطمینان سے یہ کہتے پھرتے ہیں...... ہم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے اب آگے جو اللہ کی مرضی۔ وہ جو بھی فیصلہ کرے گا، ہمیں منظور ہوگا۔"

"ہاں، میں نے لوگوں کو اکثر ایسا کہتے سنا ہے۔" رشید احمد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور ایسا کہنے والے اکثر افراد کے خلاف فیصلہ آجاتا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہ اپنی ناکامی کے لیے اللہ کو تو موردِالزام ٹھہرا نہیں سکتے لہٰذا مخالفین ان کی کڑی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ وہ دوسروں کو کوستے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا اور فلاں نے وہ کر دیا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔" وہ

سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ایسا دیکھنے میں آیا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''آپ توکل کا کون سا بنیادی اصول بتا رہے تھے؟''

''پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھنا چاہیے۔ اس کے بعد اپنے اونٹ کی حفاظت کے لیے اللہ پر تکیہ کرنا چاہیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مطلب یہ کہ جو کام آپ کے اختیار میں ہے پہلے اسے پورا کرنا چاہیے اور جو کام آپ کے بس میں نہ ہو، اس کے لیے اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔ اپنی ذمے داری کو نظر انداز کر کے بیٹھ جانا اور یہ امید لگائے رکھنا کہ اللہ سب ٹھیک کر دے گا، میرے خیال میں یہ کوئی مستحسن عمل نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو اپنے فرائض کی تو پروا نہ ہو لیکن اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار ہو۔''

''آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے وکیل صاحب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''مجھے پہلے عارف کے لیے کسی ماہر وکیل کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اللہ سے بہتری کی آس باندھنا چاہیے۔''

''اصول تو یہی ہے ماسٹر جی۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''باقی جو اللہ کی مرضی۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ ہم اس کے اختیار اور طریقہ کار کے لیے کوئی اصول وضع نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔''

''آپ کی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں وکیل صاحب۔'' وہ بڑی عقیدت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے زیادہ قابل وکیل مجھے کہیں نہیں ملے گا۔ میں درخواست کروں گا کہ عارف کا کیس آپ ہی لے لیں۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پر میرے گھر اور دفتر کا نمبر موجود ہے۔ اسے سنبھال کر رکھیں۔ آپ کو مجھ سے رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی۔''

اس نے شکریہ ادا کرنے کے بعد میرا تعارفی کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے کہا۔ ''ایک عدالت میں اس وقت میرا ایک کیس لگا ہوا ہے۔ مجھے وہاں جانا ہوگا۔ آپ ایسا کریں کہ دوپہر کے بعد میرے دفتر میں آ جائیں پھر آپ سے تفصیلی بات ہوگی۔ میرا دفتر ادھر قریب ہی میں ہے۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب مگر......''

اس نے متذبذب انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ''مگر کیا ماسٹر جی؟''

''وہ......وہ آپ نے اپنی فیس کے بارے میں بتایا ہی نہیں......!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''فیس کا معاملہ بھی دفتر میں بیٹھ کر طے کر لیں گے۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے رشید احمد کو گہری نظر سے دیکھا اور استفسار کیا۔

''پولیس عارف کو عدالت میں کب پیش کرے گی؟''

''وہ دو ہفتے سے پولیس کی تحویل میں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''گرفتاری کے بعد پولیس نے ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کیا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد عدالت میں عارف کو پیش کر کے مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ لے لیا کہ ان کی تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ اب دو روز کے بعد اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔''

''دو روز بہت ہیں......'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''آپ میرے دفتر آ جائیں پھر بات کرتے ہیں۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دو روز کے بعد میں پوری تیاری کے ساتھ متعلقہ عدالت میں موجود تھا۔ رشید احمد نے میرے دفتر آ کر مجھے اپنی بپتا سنا دی تھی۔ عارف کی کہانی رشید احمد کی زبانی سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ عارف بے قصور ہے اور اسے چوری کے اس معاملے میں کسی گہری سازش کے تحت ملوث کیا گیا ہے۔ عارف کی عمر لگ بھگ تئیس سال تھی اور وہ خاصا سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو مجسٹریٹ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اس کیس کی پیروی کے لیے ملزم کی طرف سے آپ پیش ہو رہے ہیں؟''

''جی ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے ملزم کی درخواستِ ضمانت کے ساتھ اپنا وکالت نامہ داخل کر دیا ہے۔''

مجسٹریٹ نے بے یقینی سے ملزم عارف کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے الجھن بھری حیرانی مترشح تھی۔ مجھے مجسٹریٹ کی الجھن کو سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ مجسٹریٹ مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور اسے یہ بھی

معلوم تھا کہ میں اپنے مؤکلوں سے خاصی تگڑی فیس وصول کرتا ہوں۔ عارف اور ماسٹر جی کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ میری فیس کا بوجھ اٹھا سکتے اور مجسٹریٹ کی حیرانی کا سبب بھی یہی تھا۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے مجسٹریٹ نے عارف کی درخواستِ ضمانت کو بہ غور پڑھا پھر وکیلِ سرکار سے استفسار کیا۔

''کیا ملزم کا کوئی پرانا پولیس ریکارڈ بھی ہے؟''

میں نے درخواستِ ضمانت میں عارف کی نیک نامی، خوش اطواری اور کردار کی مضبوطی کو تفصیلاً بیان کیا تھا۔ وکیلِ استغاثہ سے مجسٹریٹ کا یہ سوال اسی تفصیل کی روشنی میں تھا۔

''جناب عالی! ملزم نہایت ہی شریف قسم کا چور ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ ''اس کا طریقۂ واردات مختلف نوعیت کا ہے۔ یہ پیشہ ور چوروں کی طرح چھپ کر گھروں میں داخل نہیں ہوتا بلکہ ایک معزز مہمان کے روپ میں یہ اپنے میزبان کے گھر تشریف لے جاتا ہے اور موقع ملتے ہی یہ اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہے......''

''جناب عالی!'' میں نے وکیلِ مخالف کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''مجھے اپنے مؤکل کے لیے استعمال کی جانے والی ''شریف چور'' کی اصطلاح پر سخت اعتراض ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ جب تک کسی ملزم کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا، اسے چور یا مجرم نہیں کہا جا سکتا۔''

''یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عارف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ نوجوان بہت شاطر اور گھنا ہے۔ اس نے ابھی تک پولیس کو اپنے دوسرے کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگر عدالت مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ دے دے تو......''

''وکیل صاحب! میں نے آپ سے ملزم کے سابق ریکارڈ کے حوالے سے سوال کیا ہے؟'' مجسٹریٹ نے قدرے برہمی سے وکیلِ سرکار کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک مزید ریمانڈ کا معاملہ ہے تو عدالت پہلے ہی دو مرتبہ دے چکی ہے۔''

وکیلِ استغاثہ نے کٹ حجتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اگرچہ پولیس کے ریکارڈ میں ملزم کے کسی جرم کا سابق اندراج نہیں ہے لیکن یہ صرف شکل سے معصوم نظر آتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا طریقۂ واردات بڑا نرالا ہے۔ یہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر......''

''آپ تو یہ بات اتنے وثوق کے ساتھ اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے یا تو اس نے آپ کی آنکھوں کے سامنے کئی وارداتیں کی ہوں اور یا پھر اس نے اپنی زبان سے اقبالِ جرم کرلیا ہو۔'' مجسٹریٹ نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس کیس میں ملزم نے اقرارِ جرم کرلیا ہے؟''

''اقبالِ جرم تو نہیں کیا مگر ......!'' وکیلِ استغاثہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

مجسٹریٹ نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا پولیس نے ملزم سے مسروقہ مال برآمد کرلیا ہے؟''

''جناب عالی! میں یہی تو عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ملزم نہایت ہی عیار اور منصوبہ ساز ہے۔'' وکیلِ صفائی نے ملزم کی ضمانت کے خلاف اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مالِ مسروقہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ پاکستانی روپے اور سعودی ریال کی مجموعی رقم ایک لاکھ بیس ہزار روپے بنتی ہے۔ ہم ابھی تک ملزم سے یہ رقم برآمد نہیں کرا سکے۔ ہمیں شک ہے کہ اس نے بڑی کاریگری سے ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت اس تگڑی رقم کو کسی خفیہ جگہ چھپا دیا ہے۔ مذکورہ خفیہ مقام تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ملزم کی زبان کھلوانا ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے استغاثہ معزز عدالت سے ایک ہفتے کے مزید ریمانڈ کی درخواست کرتا ہے۔''

''یور آنر!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست ایک سیدھے سادے معاملے کو سنسنی خیز اور پراسرار بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کے موقف کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ پولیس کے پاس میرے مؤکل کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ملزم عادی مجرم نہیں۔ علاوہ ازیں، اس کیس میں ابھی تک پولیس ملزم کے پاس سے چوری شدہ مال یعنی مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار کی موٹی رقم برآمد نہیں کر سکی۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ ملزم بہت شاطر اور گھنا ہے، اس نے چوری کی بھاری رقم کو کسی خفیہ طریقے سے ٹھکانے لگا دیا، میرے خیال میں یہ محض قیاس آرائی ہے اور اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر وکیلِ استغاثہ کے موقف کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر ہر سیدھے سادے آدمی پر ''شریف چور'' اور ''شاطر گھنا'' کے لیبل چسپاں کر کے اسے جیل میں بند کیا جا سکتا ہے......'' میں

نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! حقیقت یہ ہے کہ میرا مؤکل ایک قانون پسند اور شریف النفس انسان ہے۔ اس کے والد کی ساری زندگی درس و تدریس میں صرف ہوئی ہے اور ملزم بھی ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ یہ کسی اچھی نوکری کی تلاش میں ہے اور سردست ٹیوشن پڑھا رہا ہے۔ یہ اس معاشرے کا ایک مفید فرد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی گہری سازش کے تحت یا پھر کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے مؤکل کو اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔ اگر میرے مؤکل کو ضمانت پر رہا نہ کیا گیا تو اس کی نیک نامی کو شدید دھچکا لگے گا اور یہ اصولاً انصاف کے بھی منافی ہوگا۔"

"آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟" مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

"جنابِ عالی! ابھی تک پولیس کی تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔" وکیل استغاثہ نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ "تفتیش کی تکمیل کے بعد ہی کوئی حتمی بات کی جاسکتی ہے۔"

"پولیس بہ زورِ بازو میرے مؤکل کی زبان سے اقبالِ جرم کروانے کا ارادہ رکھتی ہے اور اسی مقصد کی خاطر اسے مزید ریمانڈ کی ضرورت پیش آرہی ہے۔" میں نے مجسٹریٹ کی جانب دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "قابلِ غور امر یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ روز سے ملزم پولیس کی تحویل میں ہے۔ اتنے عرصے کا ریمانڈ کسی سنگین فوجداری معاملے کی تفتیش کے لیے بھی کافی ہوتا ہے لیکن پولیس کی اب تک کی کارکردگی کا گراف زیرو کے ہندسے سے ذرا سا بھی اوپر نہیں اٹھ سکا لہٰذا میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے مؤکل کو انسانی ہمدردی کی بنا پر ضمانت پر رہا کردیا جائے۔ علاوہ ازیں، پولیس کو اس بات کے لیے پابند کیا جائے کہ وہ ملزم کے گھر والوں کو ہراساں کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا ملزم کا ضمانتی موجود ہے؟"

"یس سر!" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "معزز ضمانتی عدالت کے کمرے کے باہر برآمدے میں موجود ہے۔"

عارف کے لیے میں نے ایک صاحبِ ثروت پیشہ ور ضمانتی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ بہ وقتِ ضرورت ایسے ریڈی میڈ افراد ہمیں میسر ہوتے ہیں جو ہم پر بھروسا کر کے ضمانت دینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ جواب میں ہم بھی انہیں مالی فائدہ پہنچاتے ہیں اور یہ سب آف دی ریکارڈ ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ نے مذکورہ ضمانتی کو اندر بلالیا۔ اس کے بعد ضمانت کے کاغذات چیک کیے اور مطمئن ہونے کے بعد میرے مؤکل کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم جاری کردیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو رشید احمد نے مجھ سے کہا۔ "وکیل صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی مہربانی سے میرے بیٹے کی ضمانت ہوگئی ورنہ پتا نہیں، عارف کو اور کتنے دن پولیس کی تحویل میں گزارنا پڑتے۔"

"شکریہ اس مالک کا ادا کریں جو آپ کا، میرا اور ہم سب کا خالق و رازق ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی محض عارف کی ضمانت ہوئی ہے۔ یہ نہیں سمجھیے گا کہ کیس ختم ہوگیا۔ عارف کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ابھی مجھے بہت زور لگانا پڑے گا۔"

"جی...... میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے آپ کا انداز بہت اچھا لگا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد عارف کو اس بھنور سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

"ان شاء اللہ!" میں نے پُروثوق انداز میں کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "اگلی پیشی کے لیے مجسٹریٹ نے دس دن بعد کی تاریخ دی ہے۔ آپ کل یا پرسوں سہ پہر میں میرے دفتر آجائیں۔ آپ نے اس کیس کے حوالے سے ابتدائی معلومات تو مجھے فراہم کردی ہیں لیکن ابھی بہت سی باتوں کی وضاحت باقی ہے۔ اس سلسلے میں، میں آپ کا تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی، میں کل ہی حاضر ہوجاؤں گا۔" وہ فرماں برداری سے بولا پھر قدرے جھجک کر مستفسر ہوا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں عارف کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں؟"

"آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے ماسٹر جی۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں ابھی آپ سے یہی کہنے والا تھا کہ اکیلے نہیں آیئے گا۔ مجھے عارف سے بھی متعدد سوالات کرنا ہیں۔ اسے بھی ساتھ لے کر آیئے گا۔"

اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں اس سے مصافحہ کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

جس وقت ہمارے درمیان یہ گفتگو ہورہی تھی، اس دوران میں عارف وہاں موجود نہیں تھا۔ ضمانت کی کاغذی کارروائی میں تھوڑا وقت لگتا ہے اور ان لمحات میں عارف

اسی عدالتی کارروائی سے گزر رہا تھا۔ آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ پیش منظر کو سمجھنے کے لیے پس منظر سے شناسائی لازمی ہوتی ہے۔ اس میں سے بہت سی باتیں مجھے اس کیس کی سماعت کے دوران میں پتا چلی تھیں۔ بہرحال، خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ایک بات کی وضاحت کردوں کہ چند باتیں میں نے سردست دانستہ آپ سے چھپائی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر کیا جائے گا تاکہ کہانی کے اندر سسپنس کا پہلو کرونیس بدلتا نظر آئے۔

☆☆☆

پڑھنے اور سننے میں یہی آیا ہے کہ...... اپنا اپنا، غیر غیر۔ یہ ایک محاورہ بھی ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح لیا جاتا ہے کہ اپنا ہر حال میں غیر سے بہتر ہوتا ہے۔ اسی محاورے کو انگریزی میں ”بلڈ از تھکر دین واٹر“ یعنی ”خون پانی سے بہرحال گاڑھا ہوتا ہے“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست کہ اگر اپنا مارے گا تو مار کر چھاؤں میں پھینکے گا...... وغیرہ وغیرہ لیکن عملی زندگی میں بعض ایسے واقعات بھی سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ذہن چکرا کر رہ جاتا ہے اور صدیوں سے مروج محاورے بھی کھوکھلے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ عارف والا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

جیسا کہ آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ ماسٹر رشید احمد کے صاحبزادے عارف پر چوری کا الزام تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ الزام عارف پر اس کی سگی ممانی نے عائد کیا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ کہ اسی ممانی کی بیٹی سے عارف کی منگنی بھی ہوچکی تھی......!

عارف کا ماموں فرید احمد اختر کالونی میں رہتا تھا۔ فرید احمد کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی شمائلہ کو بہن کے گھر میں بیاہے لہٰذا اس نے شمائلہ کا رشتہ اپنے بھانجے عارف سے طے کردیا تھا۔ اس رشتے کے لیے فرید احمد کی بیوی ناہید اختر راضی نہیں تھی تاہم اس نے کھل کر اپنی مخالفت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ عارف کی بدقسمتی کہ یہ رشتہ طے ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد فرید احمد کا انتقال ہوگیا لہٰذا شادی والا معاملہ فی الحال تاخیر کا شکار ہوگیا تھا۔

ناہید اختر اپنے مزاج اور عادات کی بنا پر فرید احمد کے برعکس تھی۔ فرید احمد ایک سادہ طبیعت اور بھلا مانس شخص تھا جبکہ ناہید اختر کو نمود و نمائش کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی شان کو ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ ایک سیدھی اور سادہ سی مثال یہ ہے کہ اس کی رہائش اختر کالونی میں تھی اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اختر کالونی کا یہ حصہ ڈیفنس فیز ون سے متصل تھا۔ اس اتصال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سب کو یہی بتاتی تھی کہ ہم ڈیفنس سوسائٹی میں رہتے ہیں۔

فرید احمد کی تین اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا رضوان غیر شادی شدہ تھا۔ اس سے چھوٹی بیٹی انیلا تھی۔ انیلا کی شادی ہوچکی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ انیلا کا شوہر درزی تھا۔ ان کی رہائش لیاقت آباد میں تھی لیکن ان دنوں وہ لوگ ناہید اختر ہی کے گھر میں قیام پذیر تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ انیلا کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی اور ناہید کا یہ پروگرام تھا کہ بچے کا عقیقہ کرنے کے بعد ہی وہ بیٹی کو رخصت کرے گی۔

انیلا سے چھوٹی بہن شمائلہ تھی۔ شمائلہ کی عارف سے منگنی ہوئی تھی۔ جب تک فرید احمد بہ قید حیات تھا تو وہ اور رضوان مل کر کاروبار کو سنبھالتے تھے لیکن فرید کی وفات کے بعد ساری ذمے داری رضوان کے کاندھوں پر آن پڑی تھی اور وہ بڑی ہمت اور حوصلے سے اس فرض کو نبھا رہا تھا۔ ان لوگوں کی صدر کے علاقے میں کپڑے کی ایک بڑی دکان تھی جو خوب چلتی تھی۔

رشید احمد کے بارے میں، میں آپ کو کہانی کی ابتدا میں مختصراً بتا چکا ہوں۔ رشید کی بیوی کا نام دل شاد بیگم تھا۔ وہ بھی رشید احمد کی طرح سادہ طبیعت کی مالک اور قناعت پسند قسم کی عورت تھی۔ کم آمدنی کے باوجود بھی یہ گھرانا بہت مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہا تھا جبکہ دوسری جانب ناہید اختر کے گھر میں کسی نوعیت کی کوئی معاشی گراوٹ دیکھنے کو نہیں ملتی تھی مگر وہ لوگ اطمینان اور سکون کو ترسے ہوئے تھے۔ اگر خوشی کا تعلق مالی آسودگی سے ہوتا تو پھر کوئی بھی صاحب ثروت آپ کو بے سکون دکھائی نہ دیتا جبکہ انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بے سکونی کا مرض سب سے زیادہ دولت مند افراد کو لاحق ہوتا ہے۔

انیلا ڈیلیوری کی وجہ سے اپنی ماں کے گھر میں رکی ہوئی تھی۔ ناہید اختر کا ارادہ تھا کہ چلہ مکمل ہونے کے بعد ہی وہ بیٹی کو رخصت کرے گی۔ انیلا کے شوہر اعجاز حسین کا ٹیلرنگ کا کام کچھ خاص نہیں چلتا تھا۔ اسی سبب ناہید نے بیٹی کی ڈیلیوری اپنے گھر میں رکھ کر کرائی تھی اور اب عقیقے کا پروگرام تھا۔

عقیقے میں رشید احمد کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ فرید

احمد کے انتقال کے بعد ناہید اختر کے اکھڑے اکھڑے ہوئے رویے کو اگرچہ رشید احمد نے بہت اچھی طرح محسوس کر لیا تھا لیکن وہ اپنے منہ سے کوئی بات نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ رشید احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عقیقے کی تقریب میں شریک ہوا۔ خوشی کے ان لمحات میں رشید احمد یا اس کی فیملی کے کسی بھی فرد کو ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ تقریب ان کی زندگی میں کون سا بھونچال لانے والی ہے......!

وہ لوگ نصف شب کو گھر پہنچے اور لمبی تان کر سو گئے۔

اگلے روز ایک مصیبت نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ پتا چلا کہ ناہید اختر کے گھر میں چوری ہوگئی ہے۔ صورت حال جاننے کے لیے رشید احمد، عارف کو اپنے ساتھ لے کر فوراً اختر کالونی پہنچ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ناہید سے پوچھا۔

''بہن! یہ سب کیسے ہوا؟''

ناہید نے شک زدہ نظر سے رشید احمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ کب ہوا، کیسے ہوا اور کس نے کیا، سب پتا چل جائے گا۔ آپ اپنی بیٹی اور بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے؟''

''میں اور عارف افراتفری میں گھر سے نکلے ہیں۔'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''اگر آپ ضروری سمجھتی ہیں تو میں تہمینہ اور دل شاد بیگم کو بھی بلا لیتا ہوں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔

''آپ مجھے چوری کے بارے میں تو کچھ بتائیں؟''

''میرے گھر سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے چوری ہوئے ہیں۔'' ناہید اختر نے دونوں باپ بیٹے کو باری باری گھورتے ہوئے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''باقی باتیں اس وقت ہوں گی جب تہمینہ اور دل شاد بھی یہاں آجائیں گی۔''

''ایک لاکھ بیس ہزار روپے!'' ماسٹر جی نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ''یہ تو خاصی بڑی رقم ہے۔ آپ نے اتنے پیسے اپنے گھر میں کیوں رکھے ہوئے تھے؟''

''یہ میری ذاتی رقم تھی اور یہ گھر بھی میرا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

''بہن! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' رشید احمد جلدی سے بولا۔ ''میں تو حفاظت کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔''

آج کل ایک لاکھ بیس ہزار کو تگڑی رقم نہیں کہا جا سکتا لیکن چالیس، پینتالیس سال پہلے یہ رقم بہت معنی رکھتی تھی۔

''بھائی صاحب! آپ ہماری حفاظت کے خیال کو تو اپنے

ذہن سے نکال ہی دیں۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں سب جانتی ہوں، کون ہمارا ہمدرد ہے اور کون ......!" اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر سرسری لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"آپ اپنی بیگم اور بیٹی کو بھی بلالیں پھر بات کرتے ہیں۔"

یہ بات ناہید پہلے زور دے کر کہہ چکی تھی۔ رشید احمد کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"بہن! مجھے ایسا کیوں محسوس ہورہا ہے کہ آپ ہمیں شک کی نظر سے دیکھ رہی ہیں؟"

وہ ہاتھ کو ایک مخصوص انداز میں ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ "بھائی! جس کا نقصان ہوتا ہے اسے تو سب پر شک ہوتا ہے۔"

رشید احمد کو احساس ہوا کہ معاملہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ اس نے فوری طور پر عارف کو گھر بھیج دیا تاکہ وہ تہمینہ اور دل شاد بیگم کو اپنے ساتھ لے آئے پھر وہ ناہید اختر سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"بہن! مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کا نقصان ہوا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ کو ہم لوگوں پر کیوں شبہ ہورہا ہے؟"

"بھائی صاحب! سچی بات سب کو کڑوی لگتی ہے۔" وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔ "لیکن مجھے اس امر کی کوئی پروا نہیں کہ آپ کو اچھا لگتا ہے یا برا...... میں تو یہی کہوں گی کہ مجھے آپ لوگوں پر شک ہے۔"

ناہید کے واشگاف الفاظ نے ماسٹر جی کو اندر سے زمیں بوس کردیا۔ وہ ناہید کی جانب سے اس قسم کے سلوک کی توقع نہیں کررہا تھا۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس شک کا کوئی سبب تو ہوگا بہن......؟"

"حساب میں یہی آیا ہے۔" ناہید نے جواب دیا۔

"کس کے حساب میں؟" رشید احمد حیرت بھری نظر سے اسے تکنے لگا۔

"ہم نے ایک سیانے سے حساب لگوایا ہے۔" ناہید گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اور اس سیانے نے آپ لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

"ناہید بہن! یہ آپ کس قسم کی باتیں کررہی ہیں۔" رشید احمد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں یا میرے بیوی بچوں کا اس چوری سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کس نوعیت کا سیانا ہے جس نے آپ کو ہم لوگوں کے خلاف کردیا ہے۔"

"وہ بہت پہنچا ہوا بندہ ہے اور مجھے اس کے حساب پر پورا یقین ہے۔ میں پہلے بھی دو چار معاملات میں حساب لگوا کر اسے آزما چکی ہوں۔ اس سیانے کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے اور جہاں تک قسم کھانے کی بات ہے تو......" ناہید نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کے گھر کے باقی افراد کو اسی مقصد کی خاطر تو بلایا ہے......!"

"اوہ ......!" رشید احمد ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا۔

ناہید اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ موجودہ صورت حال نے ماسٹر جی کو گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ وہ ناہید کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات لے کر گھر سے نکلا تھا اور یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکل آیا تھا۔ ناہید کسی نام نہاد سیانے کے ایما پر ان لوگوں کو چور گردان رہی تھی اور اب انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے قسم اٹھانا تھی۔

ان لمحات میں ماسٹر جی کو اپنی کم مائیگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ وہ اتنی ذلت اور بے عزتی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ناہید نے یہ بڑی گری ہوئی حرکت کی تھی۔ جب تک فرید احمد زندہ تھا، اس گھر میں ان لوگوں کی آؤ بھگت ہوتی تھی مگر فرید کے دنیا سے پردہ کرتے ہی اس گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ خاص طور پر ماسٹر جی کو تو یہاں کا ماحول اب بہت زہریلا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بے اعتمادی کی فضا میں اسے عارف اور شائلہ کے رشتے کی نیا بھی کسی کنارے لگتی دکھائی نہیں دے رہی تھی......!

تھوڑی دیر کے بعد عارف کے ہمراہ دل شاد بیگم اور تہمینہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ اس گھر میں کیا ہونے جارہا ہے کیونکہ "قسم کھانے" کا معاملہ ناہید اختر اور رشید احمد کے بیچ ڈسکس ہوا تھا۔

جب ناہید کے مطلوبہ تمام افراد وہاں جمع ہوگئے تو وہ ایک قرآن پاک اٹھا لائی اور مطالبہ کیا کہ وہ لوگ باری باری یہ قرآن اپنے سر پر رکھ کر قسم کھائیں کہ انہوں نے ناہید کے گھر سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے نہیں چرائے۔

"ممانی جان! یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟"

عارف نے برہمی سے کہا۔ ''کیا آپ مجھے اور میرے گھر والوں کو چور سمجھتی ہیں؟''

''آپ لوگ میرے سمجھنے اور نہ سمجھنے کے چکر میں نہ پڑیں۔'' ناہید کھردرے لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ سچے ہیں تو پھر آپ کو قرآن اٹھانے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔''

دل شاد بیگم نے کہا۔ ''ناہید بہن! تمہارا نقصان ہوا ہمیں اس بات کا دکھ ہے مگر تمہارا یہ انداز ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ کل رات اس گھر میں ہمارے علاوہ اور لوگ بھی موجود تھے۔ کیا تم نے ان سب کے سروں پر قرآن رکھا ہے؟''

''جو حساب میں آئے گا، میں اسی سے قسم اٹھواؤں گی نا!'' ناہید ہاتھ نچا کر بولی۔ ''باقی سب کا اس معاملے سے کیا لینا دینا۔''

''میں قرآن نہیں اٹھاؤں گا۔'' عارف نے ضدی لہجے میں کہا۔

ناہید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے، تمہارے دل میں کوئی چور چھپا بیٹھا ہے!''

رشید احمد صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ناہید بہن جو کہہ رہی ہے، ہمیں اس پر عمل کرنا ہوگا۔''

''ابو! یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے۔'' تہمینہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''ہمیں گھر بلا کر بے عزت کیا جارہا ہے۔''

''یہ...... میرا حکم ہے......!'' رشید احمد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

اس کے بعد عارف، تہمینہ اور دل شاد بیگم کی طرف سے ایک بھی اعتراضی لفظ سننے کو نہیں ملا۔ ان سب نے باری باری قرآن اٹھا کر ناہید کی خواہش کی تکمیل کر دی اور ''بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے'' کے مصداق وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر آگئے۔

دل شاد بیگم، عارف اور تہمینہ اس ذلت پر راستے بھر پیچ و تاب کھاتے رہے تھے مگر رشید احمد گم صم خاموش بیٹھا رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی ان میں گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔

''ناہید نے یہ کس قسم کا ڈراما کیا ہے؟'' دل شاد بیگم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

تہمینہ شاکی لہجے میں بولی۔ ''ابو! آپ کو ممانی جان کی بات نہیں ماننا چاہیے تھی!''

''میں نے ایسی ذلت کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' عارف برہمی سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ممانی جان سے مجھے ایسی بیچ حرکت کی توقع نہیں تھی۔ انہیں ایک لمحے کے لیے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میں اس گھر کا داماد بننے والا ہوں......!''

''بیچ لوگوں سے اعلیٰ وارفع حرکات کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔'' دل شاد بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فرید بھائی زندہ تھے تو ناہید کی کبھی جرأت نہیں ہوتی تھی، کوئی گھٹیا بات کرنے کی۔ بیوہ ہوتے ہی اس کے تو پر نکل آئے ہیں۔ میں نے بھائی صاحب کی ضد پر عارف کا شائلہ سے رشتہ طے کر دیا تھا لیکن ناہید کے حالیہ رویے کے بعد تو یہ بیل مجھے منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی......!''

''بیل منڈھے نہ چڑھے یا سارے چمن کو آگ لگ جائے لیکن ایک بات طے ہے کہ میں ممانی جان کی اکڑفوں نکالنے کے لیے ہر قیمت پر شائلہ سے شادی کروں گا۔'' عارف نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اس سے زیادہ موثر اور کوئی طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔''

''تم سب لوگ جذباتی انداز میں سوچ رہے ہو۔'' رشید احمد نے وہاں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔ ''انتظار کرو...... کچھ ہی عرصے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یہ آپ کی خوش فہمی ہے ماسٹر جی!'' دل شاد بیگم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم چاہے جتنا بھی انتظار کرلیں، اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہونے والا۔ میں تو آج کے بعد اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھوں گی۔''

''اگر تم ناہید کے گھر میں قدم نہیں رکھو گی تو اپنے لیے بہو کیسے بیاہ کر لاؤ گی؟'' رشید احمد نے معتدل انداز میں کہا۔

''دنیا میں ایک شائلہ ہی نہیں رہ گئی میری بہو بننے کے لیے۔'' دل شاد بیگم نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''میرے بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔''

''میری تو خیر ہے۔ ناہید یا فرید سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔'' رشید احمد گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن فرید تمہارا سگا بھائی تھا۔ اس حوالے سے شائلہ تمہاری بھتیجی لگتی ہے۔ یہ رشتہ فرید کی خواہش پر جوڑا گیا تھا۔ اگر تم اسے توڑو گی تو مرے ہوئے بھائی کی روح کو اذیت پہنچاؤ گی۔''

''جس بھائی نے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔'' دل شاد بیگم ایک مغموم سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''باقی جہاں تک اس رشتے کو توڑنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں بھابی ناہید نے پہل کردی

ہے۔ میں تو اس کے شروع کیے ہوئے عمل کو آگے بڑھانے کی بات کر رہی ہوں۔ آج اس گھر میں ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد رشتے داری کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔"

"اللہ ناہید کو نیک ہدایت دے۔" رشید احمد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوگی۔"

"اونہہ...... نادم ہوگی وہ!" دل شاد بیگم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کہیں آپ یہ توقع تو نہیں کر رہے کہ شدید ندامت کے بعد وہ ہم سب سے معافی مانگنے کے لیے یہاں چلی آئے گی؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے۔" رشید احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اللہ سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھنا چاہیے۔ اللہ ناہید کو بھی سیدھی راہ دکھا سکتا ہے۔"

"اللہ کی ہدایت صرف انہی لوگوں تک پہنچتی ہے جن کے اندر قبولیت کے جراثیم ہوتے ہیں۔" دل شاد بیگم نے کہا۔ "ناہید کی نیت میں کھوٹ شامل ہو چکی ہے۔ ایسے افراد نہ تو اپنے کیے پر شرمندہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی آنکھیں راہِ راست کو پہچاننے کے لیے آمادہ ہوتی ہیں۔ آپ چاہے ناہید کے سدھرنے کا انتظار کریں لیکن میری طرف سے تو ہر دروازہ بند ہی سمجھ لیں۔"

میاں بیوی کی تکرار کے دوران میں عارف گھر سے باہر نکل گیا تھا اور تہمینہ بھی کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ رشید احمد نے سمجھانے والے انداز میں دل شاد بیگم سے کہا۔

"تم بڑے شوق سے ناہید پر اپنے دل کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دو لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کسی عمل سے عارف کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچنا چاہیے!"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" دل شاد بیگم نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

"شاید تم نے عارف کے الفاظ پر غور نہیں کیا جو یہ سوال کر رہی ہو......!"

وہ الجھن زدہ انداز میں مستفسر ہوئی۔ "کون سے الفاظ؟"

"عارف نے تھوڑی دیر پہلے بڑے عزم سے کہا تھا...... بیل منڈھے نہ چڑھے یا سارے چمن کو آگ لگ جائے لیکن ایک بات طے ہے کہ میں ممانی جان کی اکڑفوں نکالنے کے لیے ہر قیمت پر شائلہ سے شادی کروں گا۔ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اس سے زیادہ موثر اور کوئی طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" رشید احمد نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ "اگر تم اپنے بیٹے کے لیے سنجیدہ ہو تو اس کے آخری الفاظ پر غور کرو۔ وہ شائلہ سے شادی کے لیے" کچھ بھی کرنے" کی دھمکی دے کر گیا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں، عارف نے یہ سب جذبات کی رو میں کہہ دیا ہے۔" دل شاد بیگم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا غصہ اترے گا تو نارمل ہو جائے گا۔"

"میں بھی تو اتنی دیر میں تمہیں یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" رشید احمد گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس وقت تم بھی جذبات میں ترکِ تعلقات کے بڑے بڑے دعوے کر رہی ہو۔ جب تنہائی میں بیٹھ کر تحمل سے سوچو گی تو تم بھی نارمل ہو جاؤ گی۔"

آئندہ دو روز خیریت سے گزر گئے۔ تیسرے دن ناہید، رضوان کے ساتھ رشید احمد کے گھر پہنچ گئی۔ اس وقت عارف وہاں موجود نہیں تھا۔ رشید احمد یہی سمجھا کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو کر ان لوگوں سے معذرت کرنے آئی ہے لیکن جب گفتگو کا آغاز ہوا تو یہ کوئی اور ہی معاملہ نکلا۔

"رشید بھائی! آپ کو دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی۔" ناہید نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "ورنہ یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

"کون سا مسئلہ؟" دل شاد بیگم نے خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ایک لاکھ بیس ہزار والا مسئلہ۔" ناہید نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

دل شاد بیگم طنزیہ انداز میں بولی۔ "مطلب ہماری بےعزتی کرنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے جو تم یہاں تک چلی آئی ہو......؟"

"یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے جو میں صبر کر کے بیٹھ جاؤں۔" ناہید نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔ "میں تو ایک ایک پائی وصول کر کے رہوں گی۔"

"تم تو یہ بات ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم نے اپنی آنکھوں سے ہمیں وہ رقم چراتے ہوئے دیکھا ہے!" دل شاد بیگم نے نفرت بھرے انداز میں ناہید کو گھورا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" ناہید نے معنی خیز انداز میں کہا۔

رشید احمد پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ناہید بہن! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے کب ہمیں رقم چراتے ہوئے دیکھا تھا؟ اور بالفرضِ محال، اگر دیکھا بھی تھا تو اسی وقت روکا کیوں نہیں؟''

''بھائی صاحب! میں یہاں بحث مباحثہ کرنے نہیں آئی۔'' وہ بے مروتی سے بولی۔ ''مجھے کچھ ایسی شہادتیں ملی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ چوری آپ کے بیٹے عارف نے کی ہے اور پھر حساب میں بھی ایسی ہی بات آرہی ہے......''

''بھاڑ میں گیا تمہارا حساب۔'' ناہید کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دل شاد بیگم پھٹ پڑی۔ ''تمہاری مت ماری گئی ہے جو اپنے ہونے والے داماد پر چوری کا الزام لگا رہی ہو۔''

''بھاڑ میں جائے یہ ہونے والا داماد!'' ناہید نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ ''دل شاد بیگم! تم اپنا منہ دھو رکھو۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنی بیٹی کو ایک چور سے نہیں بیاہ سکتی۔''

''آپ سن رہے ہیں، یہ عورت کیا اول فول بکے جا رہی ہے؟'' دل شاد بیگم نے رشید احمد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ عورت تمہاری بھابی ہے دل شاد بیگم!'' رشید احمد نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور اس وقت یہ ہمارے گھر میں بیٹھی ہے، ہماری مہمان ہے۔ تم خوش خلقی کے دامن کو تھام کر رکھو۔''

''اخلاقیات تو ناہید پر آکر ہی اختتام پذیر ہوتی ہیں۔'' دل شاد بیگم نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر میں اس کے شایانِ شان بات نہیں کر رہی تو پھر یہ مذاکرات آپ ہی کرلیں۔ میں ایسے ناخوش گوار ماحول میں نہیں بیٹھ سکتی۔''

بات کے اختتام پر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پاؤں پٹختے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ اس دوران میں رضوان بھی وہاں موجود تھا لیکن اس نے ابھی تک اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔

رشید احمد نے ناہید کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔ ''ہاں بہن! مجھے بتاؤ، وہ کون سی دو باتیں ہیں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جن میں سے ہمیں ایک ماننا ہوگی؟''

''نمبر ایک......'' ناہید نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ میرے ایک لاکھ بیس ہزار روپے واپس کردیں تو یہ معاملہ رفع دفع ہوجائے گا اور نمبر دو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے رشید احمد کو دیکھا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اگر آپ کا رقم واپس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو پھر آپ لوگوں کو ایک امتحان سے گزرنا ہوگا تاکہ میں ثابت کرسکوں کہ چوری تم لوگوں ہی نے کی ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کو میرے ساتھ آئندہ جمعرات کی سہ پہر تین ہٹی جانا ہوگا۔''

''تین ہٹی......'' رشید احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہاں کیا ہے؟''

''تین ہٹی کے علاقے میں ایک بہت پہنچے ہوئے اللہ والے کا آستانہ ہے۔'' ناہید وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اسی سیانے نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ میری رقم آپ لوگوں میں سے کسی نے چرائی ہے اور اسے یقین ہے کہ یہ کام عارف نے کیا ہے۔''

''دیکھو ناہید بہن!'' رشید احمد نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ ہم میں سے کسی نے تمہاری رقم نہیں چرائی لہٰذا رقم کی واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ اگر تم نے حساب لگانے والے کی لغویات پر یقین کرلیا ہے تو پھر ہمیں اس فتنہ پرور شخص کے پاس کیوں لے کر جانا چاہتی ہو؟''

''وہاں پر آپ لوگوں کو ایک امتحان سے گزارا جائے گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''جس کے نتیجے میں یہ ثابت ہوجائے گا کہ تم میں سے کس نے میری رقم چرائی ہے۔''

''تم کس قسم کے امتحان کی بات کر رہی ہو؟'' رشید احمد کی الجھن میں پریشانی کا عنصر لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''اس اللہ والے نے کہا ہے کہ جمعرات کی سہ پہر میں تم لوگوں کو اس کے آستانے پر لے آؤں۔'' ناہید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''وہ آپ لوگوں کے سامنے اپنے آستانے کی بنی ہوئی ایک روٹی رکھے گا۔ آپ میں سے ہر کوئی اس روٹی میں سے ایک نوالہ توڑ کر کھائے گا۔ اس بندے کا دعویٰ ہے کہ جس نے رقم چرائی ہے، وہ نوالہ نگلتے ہی خون کی الٹی کردے گا۔ اس تجربے سے ثابت ہوجائے گا کہ میری رقم کو چرانے والا چور کون ہے۔''

رشید احمد نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت ہی خطرناک تجربہ ہے!''

''خطرناک اور خوفناک کے بارے میں غور و فکر کرنا آپ کا کام ہے ماسٹر جی۔'' ناہید اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''دو دن کے بعد جمعرات ہے۔ میں آپ

لوگوں کو لینے آؤں گی۔ آپ سب تیار رہنا۔''

''اور...... اگر...... ہم اس تجربے کے لیے...... راضی نہ ہوں تو......؟'' رشید احمد نے شکستہ لہجے میں استفسار کیا۔

''تو پھر مجھے تیسرا اور آخری راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' وہ سفاکی سے بولی۔ ''اور اس کام کے لیے مجھے تمہارے دروازے تک آنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''تیسرا راستہ......'' رشید احمد بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ کون سا راستہ ہے ناہید؟''

''پولیس......!'' وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔

''کک...... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رشید احمد چکرا کر رہ گیا۔

''مجھے ہر صورت میں اپنی رقم واپس چاہیے۔'' وہ دروازے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکل سکا تو بہ حالت مجبوری مجھے اپنی انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑے گا۔ میں پولیس اسٹیشن جا کر عارف کے خلاف ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی چوری کی رپورٹ لکھوادوں گی۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میرے پاس ایسے شواہد ہیں کہ عارف کو چور ثابت کرنے کے لیے پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔''

اپنی اس سنسنی خیز دھمکی سے ماسٹر جی کو سپردِ عتاب کرنے کے بعد ناہید وہاں سے رخصت ہوگئی۔

تھوڑی دیر کے بعد عارف بھی گھر آ گیا پھر یہ چاروں سر جوڑ کر موجودہ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ رشید احمد نے ناہید سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں ان سب کو بھی بتادیا۔

''مجھے یقین ہے کہ ناہید بکواس کر رہی ہے۔'' دل شاد بیگم نے کہا ''جب ہم میں سے کسی نے اس کی رقم نہیں چرائی تو پھر اس کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت کس طرح ہوسکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، وہ دھونس دھمکی سے ہمیں دھمکانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''سب سے زیادہ خطرہ عارف کے لیے ہے۔'' رشید احمد نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''ناہید نے اپنی ساری توپوں کا رخ اس کی جانب کر رکھا ہے۔''

''عارف! سن لیا تم نے، ماسٹر جی کیا کہہ رہے ہیں!'' دل شاد بیگم نے بیٹے سے پوچھا۔ ''کیا اب بھی تم اس فریبی عورت کی دامادی میں آنے کے لیے بے قرار ہو؟''

''تم لوگ ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے صورتِ حال کی سنگینی پر غور کرو تو جب ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکل سکتا ہے۔'' رشید احمد نے منت ریز لہجے میں کہا۔

''ابو! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' عارف نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں اور میرا رب جانتا ہے کہ میں نے کوئی چوری نہیں کی، لہٰذا مجھے یقین ہے کہ میرے اس فرضی جرم کا کسی کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہوسکتا۔ ناہید ممانی پولیس اسٹیشن جائے یا کورٹ کچہری، مجھے کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔''

''اور وہ جو ناہید نے تین ہٹی والے کسی آستانے کی بات ہے......؟'' رشید احمد نے سوالیہ نظر سے باری باری سب کو دیکھا۔

''ابو! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' تہمینہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں وہ روٹی نہیں کھاؤں گی جس سے خون کی الٹی ہوتی ہے۔''

''تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تہمینہ!'' عارف نے بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی تین ہٹی والے آستانے پر نہیں جائے گا۔ ہم اللہ کے ماننے والے ہیں۔ اس کے آخری نبی ﷺ اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید پر ہمارا پختہ ایمان ہے۔ آستانوں پر کیے جانے والے اس نوعیت کے مکروہ تجربات کا حصہ بننا ہمارے دین کے منافی ہے۔ اگر جمعرات کو ممانی اس مقصد سے یہاں آئے تو اس کے لیے دروازہ کھولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ باہر کھڑے کھڑے ہی اس پر واضح کردیں کہ اسے ہمارے خلاف جو بھی کرنا ہے، بہ صد شوق کرے۔ ہم کھرے اور سچے ہیں لہٰذا ہمیں اس کی کسی کارروائی کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

''شاباش میرے بچے! تم نے تو میرا کلیجا ٹھنڈا کردیا ہے۔'' دل شاد بیگم نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ کی نا تم نے مردوں والی بات۔ لعنت بھیجو ایسے نامراد لوگوں پر۔ سمجھ لو کہ آج سے ناہید اور اس کے گھر سے ہمارا ہر تعلق واسطہ ختم۔ میں کسی بہت اچھی جگہ پر دیکھ بھال کر تمہاری شادی کراؤں گی۔ ناہید نے اپنی اصلیت دکھادی ہے۔ شائلہ نے بھی ناہید کا دودھ پیا ہے۔ وہ اپنی ماں سے دس ہاتھ آگے ہی ہوگی۔''

''اللہ نے ہمیں بہت بڑی پریشانی سے بچالیا ہے۔'' رشید احمد نے کہا۔ ''واقعی، تم ٹھیک کہتی ہو دل شاد بیگم۔ عارف کو اب شائلہ کا خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے۔'' پھر اس نے عارف کی جانب دیکھتے ہوئے

استفسار کیا۔

"بیٹا! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ابو! سچی بات یہ ہے کہ اس وقت جو بھی گند پھیلی ہوئی ہے اس کی ذمے دار صرف ناہید ممانی ہی نظر آتی ہیں۔" عارف نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس گھر کے کسی اور فرد نے ابھی تک اپنی زبان سے ہمارے خلاف ایک لفظ نہیں نکالا لہٰذا سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہاں، آگے چل کر اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شائستہ بھی اس تیم کا حصہ تھی تو میں آپ لوگوں کی خواہش اور آپ کے حکم سے ایک انچ بھی ادھر ادھر حرکت نہیں کروں گا۔"

عارف نے بہت ہی معقول اور سمجھ داری کی بات کی تھی۔ رشید احمد اور دل شاد بیگم ستائشی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

وہ چاروں آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ آئندہ جمعرات کو ناہید اختر ان کے دروازے پر پہنچ گئی تا کہ انہیں ایک تجربے سے گزارنے کے لیے بابا کے آستانے پر لے جائے لیکن انہوں نے ناہید کے منصوبے پر اوس ڈال دی اور اسے دروازے پر ہی سے ٹرخا دیا گیا۔

ناہید پاؤں پٹخ کر واپس چلی گئی۔

دو دن امن و سکون سے گزر گئے لیکن تیسرے روز شام کے وقت ایک ایس آئی دو کانسٹیبلو کے ساتھ ان کے دروازے پر پہنچ گیا پھر وہ کوئی سرچ وارنٹ دکھائے بغیر ہی رشید احمد کے گھر میں گھس گئے۔ افرادِ خانہ پولیس کی ہنگامی آمد پر حیران و پریشان تھے تاہم ان میں سے کسی ایک کو بھی اس امر میں شک و شبہ نہیں تھا کہ یہ کارروائی ناہید اختر کے ایما پر ہو رہی تھی۔ آخری ملاقات میں ناہید نے بڑے واشگاف الفاظ میں انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر سیدھی انگلی سے گھی نہ نکل سکا تو وہ عارف کے خلاف تھانے میں ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی چوری کی رپورٹ درج کروا دے گی۔

چند منٹ کے اندر سب انسپکٹر نے اپنے ساتھی دونوں کانسٹیبلو کے ساتھ مل کر پورے گھر کا سامان اوپر تلے کر ڈالا۔ رشید احمد نے اس بے ہودگی پر احتجاج کرنے کی کوشش کی تو اسے دھکے مارے گئے۔ عارف اپنے باپ کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر لب کشا ہوا تو سب انسپکٹر نے طمانچے مار مار کر اس کا چہرہ سرخ کر دیا پھر اسے گریبان سے کھینچتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"حرام زادے...... رقم کہاں چھپائی ہے؟"

سب انسپکٹر کے اس جملے نے ان کے تمام تر اندازوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ ناہید نے عارف کے خلاف پولیس کو سرگرم کر دیا تھا۔

"میں نہیں جانتا، آپ کس رقم کا ذکر کر رہے ہیں؟" عارف نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔

"تمہارے پاس وقت ہے۔" سب انسپکٹر نے عارف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔ "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ سچ اگل دو۔ اگر میں تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے گیا تو وہاں پہنچ کر تمہارا حشر نشر کر دوں گا۔ تم کسی کو بتانے کے قابل بھی نہیں رہو گے کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" عارف منت ریز لہجے میں...... بولا...... "مجھے کسی رقم کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں......"

"مجھے پتا چلا ہے کہ چند روز پہلے تم اپنی فیملی کے ساتھ ناہید اختر کے گھر دعوت اڑانے گئے تھے۔" سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم سب کی آنکھ بچا کر ناہید اختر کے بیڈ روم میں گھسے اور وہاں ان کی الماری میں رکھے ایک لاکھ بیس ہزار روپے چپکے سے اڑا لیے۔ تمہاری اس ہوشیاری کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔"

"میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے ممانی جان کے گھر سے کوئی رقم نہیں چرائی۔" عارف نے برہمی سے کہا۔

رشید احمد نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "سر! آپ نے ہمارے گھر کے سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ آپ اس وقت ہمارے گھر میں موجود ہیں۔ آپ خوب اچھی طرح تلاشی لے لیں۔ اگر میرے بیٹے نے آپ کی مطلوبہ رقم کہیں چھپا رکھی ہوگی تو آپ اسے برآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

رشید احمد کی مدلل تجویز میں وزن تھا۔ ایس آئی کے حکم پر دونوں کانسٹیبلو نے گھر کا کونا کونا چھان مارا اور کھدرا کھدرا جھانک ڈالا لیکن وہ کسی تگڑی رقم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

"سر جی!" ایک سپاہی نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "لگتا ہے، اس بدمعاش نے رقم کو گھر سے باہر کہیں ٹھکانے لگایا ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" ایس آئی عارف کو گھورتے ہوئے بولا۔ "اسے ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔ چند روز حوالات میں گزارے گا تو اس کی عقل ٹھکانے

آجائے گی۔"

سب انسپکٹر کے اشارے پر کانسٹیبلو نے عارف کو حراست میں لے لیا۔ سب انسپکٹر نے دیگر افرادِ خانہ کی جانب دیکھتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔

"تم لوگوں میں سے اگر کسی بھی شخص کو رقم کے بارے میں کچھ پتا ہے تو مجھے بتادو۔ یہ سیدھا سیدھا چوری کا کیس ہے۔ ناہید اختر نے عارف کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے۔"

حقیقت یہی تھی کہ وہ لوگ کسی رقم کی چوری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اگر واقعتاً ناہید اختر کے گھر میں کوئی چوری بھی ہوئی تھی تو اس میں عارف کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ناہید بیٹھے بٹھائے اچانک دشمنی پر کیوں اتر آئی تھی!

پولیس والے جب عارف کو گرفتار کرکے گھر سے باہر نکلے تو وہاں آس پاس کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ رشید احمد اور اس کے گھر والوں کی محلے میں بڑی عزت تھی۔ عارف کی گرفتاری نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ عارف نے کوئی جرم کیا ہوگا......!

☆☆☆

پولیس کے روزنامچے کے مطابق، تھانے میں چوری کی رپورٹ اٹھارہ مئی کو درج کرائی گئی تھی۔ اس سے اگلے روز یعنی انیس مئی کی شام عارف کو اس کے گھر سے گرفتار کرلیا گیا تھا جبکہ ناہید اختر کے گھر میں انیلا کے بیٹے کے عقیقے کی تقریب بارہ مئی کو منعقد کی گئی تھی۔

ابتدائی چند پیشیوں میں کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ اس دوران میں ضابطے کی کارروائیاں چلتی رہیں۔ ایسی کارروائیوں میں آپ کی دلچسپی کے لیے کچھ نہیں ہے لہٰذا میں ان کے ذکر کو گول کرکے آگے بڑھتا ہوں۔

اس کیس کے ملزم اور میرے موکل کو میں نے ضمانت پر رہا کروالیا تھا لیکن ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا تھا۔ جب کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا تو مجسٹریٹ نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ جس پر ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے ناہید اختر سب سے پہلے گواہی کے لیے پیش ہوئی۔ ناہید پچپن سے متجاوز تھی لیکن اس نے تیس کی نظر آنے کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ ناہید نے نارنجی رنگ کی ریشمی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے بال شانوں پر کٹے ہوئے تھے اور پاؤں میں پانچ انچ ہیل والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ بنیادی طور پر ناہید اختر کا قد قدرے کم تھا۔ مذکورہ سینڈل نے اس کی پستہ قامتی کو چھپالیا تھا۔ جب وہ عدالت میں داخل ہوئی تو وہاں موجود ہر شخص اس کی جانب متوجہ ہوگیا تھا۔

ناہید نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے آگے بڑھا۔ وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ کر وکیلِ استغاثہ نے ملزم کی سمت انگلی اٹھا کر پہلا سوال کیا۔

"میڈم! کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟"

"جی ہاں۔" ناہید نے نفرت آمیز نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل عارف کی جانب دیکھا اور کہا۔ "بہت اچھی طرح جانتی ہوں لیکن......"

وہ بولتے بولتے رکی تو وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "میڈم! لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ......" وہ ایک معاندانہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "یہ میرے مرحوم شوہر کا بھانجا ہے مگر اس سے رشتے داری کا اظہار کرتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے۔ اس بدبخت نے میرے اعتماد کا خون کیا ہے۔"

"میڈم! استغاثہ کے مطابق، وقوعہ یعنی بارہ مئی کی رات آپ کے گھر سے ایک بھاری رقم مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار روپے چوری ہو گئے تھے۔" وکیلِ استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کو یقین ہے کہ مذکورہ رقم ملزم نے چرائی ہے۔"

"جی بالکل۔ مجھے پکا یقین ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

وکیلِ استغاثہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔ "اس یقین کا کوئی سبب؟"

"جی ہاں۔" ناہید نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس نامراد کے جرم کا پکا ثبوت ہے میرے پاس۔"

وکیل استغاثہ نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا اور مزید دو چار سرسری سوالات کے بعد جرح ختم کردی۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا پھر اس کیس کی مدعی ناہید اختر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"میڈم! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کے گھر سے ایک بھاری رقم چوری ہوگئی......"

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ''ہمدردی جتانے کا شکریہ۔''
''میڈم! اگر میں غلطی نہیں کررہا تو آپ کے دعوے کے مطابق، آپ کے گھر سے مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار روپے چوری ہوئے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''آپ بالکل غلطی نہیں کررہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میری اتنی ہی رقم گئی ہے اور چور بھی آپ کے سامنے کھڑا ہے......'' اس نے ملزم کی جانب اشارہ کیا اور ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''اور آپ...... اسی چور کی وکالت کررہے ہیں!''
ناہید کے آخری جملے میں طنز کی وافر مقدار موجود تھی۔ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! چور اور شاہد کی بحث بعد میں کریں گے۔ آپ اس بات کی فکر میں اپنی جان ہلکان نہ کریں کہ میں کس کی وکالت کررہا ہوں اور کس کو رگیدنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے صرف اتنا بتادیں کہ مذکورہ رقم کی حیثیت کیا تھی؟''
''حیثیت......!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں کہ آپ پوچھنا کیا چاہ رہے ہیں؟''
''میرا مطلب ہے کہ یہ رقم کس کرنسی کی شکل میں تھی۔'' میں نے پوچھا۔
''اوہ اچھا......'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس میں دس ہزار روپے پاکستانی کرنسی میں تھے اور باقی کے سعودی ریال تھے جن کی پاکستانی کرنسی میں قیمت ایک لاکھ دس ہزار روپے بنتی ہے۔ اس طرح کل ملاکر پاکستانی کرنسی کے مطابق، یہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی رقم ہوجاتی تھی۔''
''سمجھ گیا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ ''کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ گھر میں اتنی زیادہ غیرملکی کرنسی رکھنے کی کیا وجہ تھی؟''
''آپ کے سوال کا جواب دینے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ پُراعتماد انداز میں بولی۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ اس واقعے کے دو ماہ بعد میرا عمرہ کرنے کا ارادہ تھا۔ ایک نیک مقصد کے لیے تو دس ہزار ہی کافی تھے۔ سعودی ریال میں اپنے ساتھ لے کر سعودی عرب جانا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے سونا خرید کر لاسکوں۔ اس رقم میں کچھ پیسے میرے اپنے تھے اور کچھ میرے جاننے والوں کے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سعودی عرب والا گولڈ بہت معیاری ہوتا ہے اگرچہ وہاں پاکستان کی مارکیٹ کی بہ نسبت سونا قدرے مہنگا ملتا ہے مگر......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''مگر اب تو یہ سب خواب وخیال ہوگیا ہے۔ نہ رہا بانس، نہ بجے گی بانسری......''
''میڈم! آپ نے یہ رقم کہاں رکھی ہوئی تھی؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔
''اپنے پرس میں۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے سوال کیا۔ ''اور آپ کا رقم والا پرس گھر کے کس حصے میں رکھا تھا؟''
''میرے بیڈروم کی الماری کے اندر۔'' اس نے بتایا۔
''میڈم! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے علاوہ یہ بات اور کس کس کے علم میں تھی کہ رقم سے بھرا ہوا پرس آپ کے بیڈروم کی الماری میں رکھا ہوا ہے؟''
''مجھے اور میری اولادوں کو۔''
''یعنی آپ کے علاوہ رضوان، انیلا اور شمائلہ کو اس رقم کی الماری میں موجودگی کا علم تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔
''اور اپنے داماد اعجاز حسین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔
''اعجاز حسین کو اس رقم کی خبر نہیں تھی۔''
''آپ نے مذکورہ رقم والا پرس جس الماری میں رکھ چھوڑا تھا کیا وہ لاک تھی؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں......!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''الماری بند تھی مگر اس میں تالا نہیں لگا ہوا تھا۔''
''گویا چور کوئی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو الماری میں رقم کی موجودگی سے واقف تھا۔'' میں نے اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ایسا شخص یہ بات بھی بہ خوبی جانتا تھا کہ مذکورہ الماری کو لاک نہیں کیا گیا......؟''
''جی۔ اصولی طور پر تو آپ کی منطق درست نظر آتی ہے۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔
''لیکن میرا موکل اور اس کیس کا ملزم تو چور کی منطق کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔'' میں نے ناہید اختر کو گھیرنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ملزم کو یہ پتا تھا کہ آپ نے اپنی الماری میں رقم سے بھرا ہوا پرس رکھا ہوا ہے، نہ ہی وہ

یہ جانتا تھا کہ آپ نے مذکورہ الماری کو لاک نہیں کیا ہوا...... پھر میرا موکل کس طرح موردِ الزام ٹھہرتا ہے؟"

"دیکھیں...... بات یہ ہے کہ...... یہ بدبخت کچھ جانتا تھا...... یا کچھ نہیں جانتا تھا...... مگر میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ...... چوری اسی نے کی ہے......" وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

"ارے ہاں...... آپ کے وثوق سے ایک بات یاد آئی......" میں نے گھسائی منجھائی کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ کے پاس ملزم کے جرم کا پکا ثبوت موجود ہے۔ آپ نے ایسا کہا تھا نا......؟"

"بالکل...... میں نے ایسا کہا تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"کیا آپ مجھے اس پکے ثبوت کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے، معزز عدالت اس ٹھوس ثبوت کی حقیقت جاننا چاہتی ہے۔"

"اس امر کے دو گواہ موجود ہیں کہ چور عارف کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔" وہ خاصے اعتماد کے ساتھ بولی۔ "نمبر ایک، اعجاز حسین۔ نمبر دو، انیلا۔"

"میڈم! عدالت آپ سے وضاحت کا تقاضا کرتی ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "پلیز......؟"

"اس رات میرے گھر میں انیلا کے بیٹے فرقان کے عقیقے کی تقریب چل رہی تھی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور ہم سب لوگ گھر کی چھت پر موجود تھے۔ موسم گرما کے سبب میں نے کھانے کا انتظام اپنے گھر کی چھت پر کررکھا تھا تاکہ کھلی فضا کا لطف اٹھایا جاسکے۔ موسم کو خوشگوار بنانے کے لیے میں نے چھت پر تین چار پیڈسٹل فین بھی رکھوادیے تھے......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے ایک لمحے کو تھمی پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تقریب اپنے عروج پر تھی کہ اعجاز حسین کو کسی کام سے گھر کے نچلے حصے میں جانا پڑا اور اسی وقت اعجاز حسین نے چوروں کے انداز میں ملزم کو میرے بیڈ روم کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اعجاز حسین نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انیلا کو نیچے جانے کا اتفاق ہوا تو اس نے ملزم کو میرے بیڈ روم کے اندر سے باہر نکلتے دیکھا۔ انیلا پر نگاہ پڑی تو یہ گھبرا گیا اور انیلا کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بول اٹھا...... میں واش روم میں گیا تھا...... اس کم بخت کو میرا ہی واش روم استعمال کرنے کا خیال کیوں آیا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ بدنیت چوری کی غرض سے میرے کمرے میں گھسا تھا۔"

"اگرچند لمحات کے لیے یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ چوری میرے موکل ہی نے کی ہوگی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کو یہ خبر کیسے ہوئی کہ آپ کے بیڈ روم کی الماری میں ایک پرس کے اندر ایک لاکھ بیس ہزار مالیت کے کرنسی نوٹ موجود ہیں اور مذکورہ الماری لاک بھی نہیں ہے؟"

میرے اس سوال پر وہ گڑبڑا کر رہ گئی پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ اللہ شکر خورے کو ضرور شکر دیتا ہے......!"

"یہ مثال سمجھ میں نہیں آئی میڈم۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ...... اس مردود نے نوٹوں کی خوشبو سونگھ لی ہوگی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "میں نے سنا ہے، چوروں کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے......"

"چوروں کی نہیں، جانوروں کی۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "خاص طور پر کتے اور بلی کی......"

"یہ منحوس بھی کسی جانور سے کم تو نہیں!" وہ معاندانہ نظر سے ملزم کو تکتے ہوئے بولی۔

"آپ کی بیٹی انیلا اور اس کے شوہر اعجاز حسین نے وقوعہ کی رات کیا دیکھا اور کیا نہیں دیکھا، یہ میں انہی سے پوچھ لوں گا۔" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ صرف یہ بتائیں کہ وقوعہ کی رات آپ کے گھر میں کل کتنے افراد موجود تھے؟"

کیس کی باقاعدہ سماعت کافی تاخیر سے شروع ہوئی تھی۔ مجھے ہوم ورک کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔ اس دوران میں، میں نے عارف اور رشید احمد کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر اور اپنے عمل کے پرندے اڑا کر مفید اور کارآمد معلومات حاصل کرلی تھیں جو اس کیس کو فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے میری بھرپور مدد کرسکتی تھیں۔

ناہید اختر نے انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ "میں، رضوان، انیلا، شائلہ، اعجاز حسین، سدرہ، فرقان، رشید احمد، دل شاد بیگم، تہمینہ اور یہ چور......" اس نے عارف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بات مکمل کردی۔ "کل گیارہ افراد۔"

"لیکن میرا حساب بتاتا ہے کہ اس رات آپ کے

گھر میں کُل بارہ افراد موجود تھے!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔
"تو پھر آپ اپنے حساب کے مطابق، بارہویں بندے کا نام بتادیں؟" وہ حقارت بھرے انداز میں بولی۔
میں نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"شاکر علی عرف کنڈا ماسٹر......"
"اوہ...... آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "شاکر علی الیکٹرک کا کام کرتا ہے۔ وہ ہمارا محلے دار ہے۔ مجھے گھر کی چھت پر پیڈسٹل فین وغیرہ کے لیے تار اور سوئچ کی سیٹنگ کرانا تھی اس لیے میں نے شاکر کو بلالیا تھا۔ وہ اپنا کام کر کے تھوڑی ہی دیر میں واپس چلا گیا تھا۔"
"کیا آپ نے شاکر سے کوئی فنکارانہ کام بھی کروایا تھا؟" میں نے پوچھا۔
وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھی نہیں......!"
"شاکر علی "کنڈا ماسٹر" کے نام سے مشہور ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں آپ نے اس کی خدمات سے استفادہ کیا تھا یا نہیں؟"
"بالکل نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔ "ہم بجلی چور نہیں ہیں۔ شاکر نے چھت پر پنکھوں کے لیے جو تار وغیرہ کا بندوبست کیا تھا اُس کا کنکشن ہمارے میٹر ہی سے لیا گیا تھا۔"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔
وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ میں نے اس کی تعریف کی ہے یا اس پر طنز کیا ہے۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"چوری کے اگلے روز یعنی تیرہ مئی کو آپ نے رشید احمد، دل شاد بیگم، تہمینہ اور عارف سے قرآن اٹھوایا تھا کیونکہ آپ کو شک تھا کہ آپ کی رقم انہی میں سے کسی نے چرائی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے ایسا کیا تھا۔"
"اور ایسا آپ نے اس لیے کیا تھا کہ کسی سیانے نے حساب لگا کر آپ کو بتایا تھا کہ آپ کی رقم چرانے میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہے...... ہیں نا؟"
"جی بالکل...... میں نے ایک پہنچے ہوئے اللہ کے بندے سے حساب لگوایا تھا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میری رقم گئی تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا نا۔"
"ضرور۔ آپ کو کچھ نہ کچھ لازمی کرنا چاہیے تھا۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "لیکن اس سلسلے میں آپ نے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے تھے!"
"کون سے تقاضے؟" وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔
"سندس کی عمر تین سال ہے اور فرقان نے تو ابھی اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے لہٰذا یہ بات تو طے ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی آپ کی رقم نہیں چرا سکتا تھا۔" میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اگر ان دونوں کو وہاں موجود افراد کی فہرست سے خارج کر دیا جائے تو باقی دس افراد بچیں گے۔ اصولی طور پر تو ان سب سے قسم اٹھوائی جانا چاہیے تھی لیکن آپ نے انیلا، شائلہ، رضوان، اعجاز حسین اور کنڈا ماسٹر کو خاص رعایت دی اور ...... باقی ایک ہی خاندان کے چار افراد کے سروں پر قرآن رکھ دیا گیا۔ یہ سراسر ناانصافی نہیں ہے؟"
"ہرگز نہیں۔" وہ پوری ڈھٹائی سے بولی۔ "شائلہ، انیلا اور رضوان میری اولادیں ہیں اور میں اعجاز حسین کی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ ان میں سے کوئی چوری نہیں کر سکتا۔"
"یعنی آ جا کر تان ماسٹر جی کی فیملی پر ہی ٹوٹتی ہے......؟"
"جی بالکل۔ حساب میں یہی آیا تھا۔" اس نے کہا۔
"جب آپ نے ان لوگوں سے قرآن اٹھوالیا تھا تو پھر یہ معاملہ گویا آپ نے قرآن کے سپرد کر دیا تھا۔" میں نے ناہید اختر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد مزید کسی حیل و حجت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ اب جو بھی فیصلہ کرنا تھا وہ قرآن مجید نے کرنا تھا مگر چند روز کے بعد آپ نئی اسکیم کے ساتھ ماسٹر جی کے گھر پہنچ گئیں...... وہ روٹی کے نوالے اور خون کی الٹی والی اسکیم......؟"
"یہ میری اسکیم نہیں تھی۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "تین ہٹی والے بابا نے یہ مشورہ دیا تھا۔"
"یعنی وہی سیانا جس نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ چوری ماسٹر جی کی فیملی میں سے کسی نے کی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اسے شک تھا کہ یہ تمام کام اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل عارف کا ہے؟"
"جی...... میں اسی سیانے کی بات کر رہی ہوں۔"
"میڈم! کیا آپ مجھے اس سیانے کا نام بتانا پسند کریں گی؟" میں نے پوچھا۔

"میں ان کا نام نہیں جانتی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "وہ شاہ جی کے نام سے مشہور ہیں۔"

"آپ ان شاہ جی کو کب سے جانتی ہیں؟" میں نے اپنے سوالات میں تیزی بھرتے ہوئے کہا۔

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "اس کم عرصے میں شاہ جی سے آپ کی کتنی ملاقاتیں ہو چکی ہیں؟"

"آں......ایک......بھی نہیں......" وہ گڑبڑا گئی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ "جب آپ کی کبھی شاہ جی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو پھر کیا آپ نے ان سے خواب میں حساب لگوایا تھا؟"

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ......" وہ خاصی نروس ہو گئی تھی۔ "انیلا حساب لگوانے کے لیے شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی......"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

مجسٹریٹ نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر نکلے تو ماسٹر رشید احمد بہت خوش تھا۔ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

"وکیل صاحب! آپ کی جرح کا انداز مجھے بہت اچھا لگا ہے۔"

"آپ نے تو کمال کر دیا جناب!" عارف کی آواز سے بھی طمانیت جھلکتی تھی۔

"یہ تو ابھی ابتدا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "آگے آگے دیکھتے جاؤ، کون کون سے کمال، جمال اور وصال ہوتے ہیں۔"

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے چند سوالات اس کیس کے تفتیشی افسر سے کر لیے۔ کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

تفتیشی افسر سے میں نے جائے وقوعہ اور ملزم کے فنگر پرنٹس کے حوالے سے سوالات کیے تھے لیکن وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا کیونکہ جب پولیس کو اس معاملے میں گھسیٹا گیا تو وقوعہ کو گزرے کافی دن ہو گئے تھے۔

اس کے بعد انیلا کے شوہر اعجاز حسین کی گواہی ہوئی۔

وکیل استغاثہ گھما پھرا کر اس سے سوالات کرتا رہا کیونکہ استغاثہ کے ریکارڈ کے مطابق اعجاز حسین نے وقوعہ کے روز ملزم عارف کو چوروں کے انداز میں ناہید اختر کے بیڈ روم میں جاتے دیکھا تھا۔ میرے نزدیک اعجاز حسین یا اس کی گواہی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی کیونکہ یہ بات مجھے اپنے موکل کی زبانی معلوم ہو چکی تھی کہ وہ وقوعہ کی رات واقعتاً اپنی ممانی جان کے بیڈ روم میں گیا تھا اور اس آمد و جامد کا مقصد وہاں سے رقم چرانا نہیں بلکہ واش روم استعمال کرنا تھا۔ ان لمحات میں گھر کا کامن واش روم کسی کے استعمال میں تھا لہٰذا وہ اپنی حاجت رفع کرنے کے لیے ممانی جان کے بیڈ روم میں جا گھسا تھا۔

ایک دو سرسری سوالات کے بعد میں نے اعجاز حسین کو فارغ کر دیا۔ اس کے بعد اعجاز حسین کی بیوی انیلا گواہی دینے کے لیے وٹنس باکس میں پہنچ گئی۔ وکیل استغاثہ نے جرح مکمل کی تو میں انیلا والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

"آپ کو میری جانب سے بہت بہت مبارک ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بیٹے کو جنم دے کر اپنی فیملی کو مکمل کر لیا ہے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی......"

اس نے مختصراً جواب دیا۔ "جی، خیر مبارک!"

"فرقان کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"اللہ اسے سدا سلامت رکھے۔" میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"جی......آپ کا شکریہ۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"انیلا جی! اس کیس میں آپ کی گواہی بہت اہمیت کی حامل ہے۔" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ استغاثہ کے مطابق، آپ نے ملزم کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے دیکھا تھا؟"

انیلا کی عمر کا اندازہ میں نے اٹھائیس اور تیس کے بیچ لگایا۔ وہ ناہید اختر کی بڑی بیٹی تھی تاہم وہ رضوان سے کم و بیش دو سال چھوٹی تھی۔ انیلا درمیانے قد کی مالک ایک فربہ اندام اور گوری چٹی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت پائی جاتی تھی۔ وہ میرے سوال کے چکر میں آ گئی۔

"جی بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"انیلا جی!" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اس بات کا کب انکشاف ہوا کہ آپ کی والدہ کے گھر سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے چوری ہو گئے ہیں؟"

"میں ان دنوں فرقان کی ڈیلیوری کے باعث امی کے گھر میں رکی ہوئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "وہ میرے بیٹے کے عقیقے کی تقریب تھی۔ ہم اس فنکشن سے لگ بھگ آدھی رات کو فارغ ہوئے تھے۔ تھکاوٹ اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ ہم لوگ جلدی سو گئے۔ اگلے روز صبح جب امی نے اپنے پرس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ رقم غائب ہے۔"

"اوہ...... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات کو رقم کی چوری کسی کے علم میں نہیں آئی تھی؟" میں نے اپنے مخصوص انداز میں قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"جی...... میرا یہی مطلب ہے۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"حالانکہ یہ سنسنی خیز انکشاف رات ہی کو ہو جانا چاہیے تھا جب سارے مہمان گھر میں موجود تھے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "لگتا ہے، آپ نے اس معاملے میں خاصی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے!"

"میں نے کون سی غفلت کی ہے؟" وہ بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا کام جاری رکھا اور کہا۔ "اگر آپ نے غفلت نہ کی ہوتی تو رقم کو بازیاب کرنا نہایت ہی آسان تھا۔ اسی لمحے تمام گھر والوں اور تمام مہمانوں کی تلاشی لے لی جاتی۔ جو بھی چور ہوتا اس کے پاس سے رقم برآمد ہو جاتی۔"

"پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

وکیل صفائی فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ "جناب عالی! میرے فاضل دوست اپنی بے سروپا باتوں سے استغاثہ کی معزز گواہ کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس عمل سے روکا جائے۔"

"یور آنر! میں بالکل درست سمت میں جرح کر رہا ہوں۔" میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "اگر وکیل سرکار تھوڑا تحمل سے کام لیں تو میں معزز عدالت کے سامنے ابھی یہ ثابت کر دوں گا کہ میرے ان سوالات کا سر بھی ہے اور پاؤں بھی۔"

میں نے یہ بات ایسے ٹھوس انداز میں کہی تھی کہ مجسٹریٹ نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

"بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں شیر ہو گیا۔ "انیلا جی!" میں نے تیز نظر سے استغاثہ کی گواہ کو گھورتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ "معزز عدالت یہ جاننے کے لیے بے تاب ہے کہ آپ نے وقوعہ کے روز مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیوں کیا؟ اگر آپ اس چوری کے بارے میں رات ہی کو زبان کھول دیتیں تو چور اس تگڑی رقم کو گھر سے باہر نہیں لے کر جا سکتا تھا۔"

"مجھے تو خود اگلی صبح پتا چلا تھا کہ امی کے پرس سے رقم چوری ہو گئی ہے۔" وہ قدرے روہانسی ہو گئی۔ "میں رات کو اس چوری کا اعلان کیسے کر سکتی تھی......؟"

"انیلا جی! آپ بڑی عجیب بات کر رہی ہیں!" میں نے اسے گھورا۔

"کیوں...... اس میں ایسا کیا عجیب ہے؟" وہ حیرت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"عجیب یہ ہے کہ......" میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ کے دعوے کے مطابق، وقوعہ کی رات آپ نے ملزم کو اپنی امی کے بیڈ روم سے نکلتے دیکھا تھا۔ ان لمحات میں وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے سوال کے جواب میں بھری عدالت میں بتایا ہے کہ آپ نے ملزم کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے دیکھا تھا۔ اس تناظر میں تو آپ چوری کی واردات کی عینی شاہد یعنی آئی وٹنس ہو جاتی ہیں اور...... اب آپ فرما رہی ہیں کہ آپ کو بھی اگلی صبح ہی پتا چلا تھا کہ گھر میں چوری ہو چکی ہے۔ آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟"

"میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کو بھی امی کے پرس سے رقم چراتے نہیں دیکھا۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

میں اسے زچ ہی کرنا چاہتا تھا سو، میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور کاٹ دار آواز میں پوچھا۔

"تو پھر آپ نے وقوعہ کی رات کیا دیکھا تھا؟"

"میں نے عارف کو امی کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا...... بس!" وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بس......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بس...... وہ خاصا گھبرایا ہوا بھی تھا۔" وہ بولی۔

"اس کے چہرے پر کس نوعیت کی گھبراہٹ تھی؟"

"وہ پسینے سے شرابور تھا۔" اس نے بتایا۔

"ملزم کے چہرے پر پسینا دیکھ کر آپ نے فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "وہ آپ کا ہونے والا بہنوئی تھا۔ آپ کا فرض بنتا

تھا کہ اس کی گھبراہٹ کا سبب جاننے کی کوشش کرتیں۔''

''اس وقت میرے ذہن میں ایسی بات نہیں آئی تھی۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ انسانی ذہن بعض اوقات ایسی کوتاہی کر جاتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں اور مجھے بتائیں کہ کیا آپ کی امی کا کمرا ائرکنڈیشنڈ ہے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''امی کے گھر کے کسی بھی حصے میں کوئی ائرکنڈیشنر نہیں لگا ہوا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ہم لوگ عقیقے کی تقریب کا انتظام چھت پر کیوں کرتے.....!''

''یہ آپ نے پتے کی بات بتائی ہے۔'' میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ میرے تبصرے پر کچھ نہیں بولی۔

''انیلا جی! وقوعہ مئی کے مہینے میں ہوا تھا۔'' میں نے استغاثہ کی گواہ کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس رات تو بڑی شدید گرمی بھی تھی۔ ایسے موسم میں اگر کسی کو دس پندرہ منٹ کسی نان ائرکنڈیشنڈ واش روم میں بیٹھنا پڑ جائے تو آپ کے خیال میں اسے پسینا نہیں آئے گا؟''

''کوئی ایسا ویسا پسینا.....'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''میں تو سمجھتی ہوں وہ بندہ پسینے میں نہا ہی جائے گا لیکن.....آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟''

''وہ اس لیے کہ جب آپ نے ملزم کو اپنی امی کے بیڈروم سے پسینے میں شرابور نکلتے دیکھا تو وہ اپنی انتہائی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ کی امی کے واش روم میں دس پندرہ منٹ گزار کر آیا تھا اسی سبب وہ آپ کو گھبرایا ہوا بھی دکھائی دیا اور پسینے میں شرابور بھی نظر آیا۔ گھر کا کامن واش روم اس وقت کسی اور کے زیرِ استعمال تھا لہٰذا ملزم کو مجبوراً آپ کی امی کے بیڈروم کا رخ کرنا پڑا تھا۔''

''جی.....ایسا ہو سکتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''ایسا تو ہو سکتا ہے اور ویسا بھی ہو سکتا ہے انیلا جی۔'' میں نے بھی سادے سے لہجے میں کہا۔

''کیسا؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''جیسا آپ کی امی نے کیا ہے.....!''

''میری امی نے کیا کیا ہے؟'' اس کی حیرت میں پریشانی بھی شامل ہو گئی۔

''ناہید اختر نے سارا ملبا آپ پر ڈال دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں.....؟''

''آپ کو وہ تین ہٹی والے شاہ جی یاد ہیں نا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جنہوں نے حساب.... لگا کر بتایا تھا کہ چوری رشید احمد کی فیملی میں سے کسی نے کی ہے اور ان کا شک ملزم کی جانب تھا؟''

''جی..... مجھے یاد ہے۔'' وہ جلدی سے سر کو اثبات میں ہلاتے بولی۔

''آپ کی امی نے ان شاہ جی سے اعلانِ لاتعلقی کر دیا ہے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''کک..... کیا مطلب ہے آپ کا.....؟'' وہ گھبرا گئی۔

''آپ کی امی فرماتی ہیں کہ وہ نہ تو شاہ جی کو جانتی ہیں اور نہ ہی کبھی ان سے ملی ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی امی نے معزز عدالت کے سامنے بتایا ہے کہ چوری کا حساب لگوانے کے لیے آپ شاہ جی کے پاس گئی تھیں؟''

''امی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔'' انیلا نے کہا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ان شاہ جی کو اچھی طرح جانتی ہیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ بولی۔ ''اچھی طرح تو نہیں۔ بس، جانتی ہوں۔''

''اس جان کاری کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔''

''کم ہی بتا دیں.....؟''

''یہی کوئی پانچ چھ ماہ۔'' اس نے بتایا۔

''ان پانچ چھ ماہ میں آپ شاہ جی سے کتنی بار ملی ہیں؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''صرف دو بار۔'' اس نے جواب دیا۔

''پہلی بار شاہ جی سے آپ کی ملاقات کب اور کس سلسلے میں ہوئی؟''

''جب امی کے گھر میں چوری ہوئی تو میں حساب لگوانے شاہ جی کے پاس گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''شاہ جی نے بتایا تھا کہ چوری مہمانوں میں سے کسی نے کی ہے اور ان کا زور ملزم پر تھا لیکن جب ان لوگوں نے چوری کا اقرار نہیں کیا اور جھوٹی قسم اٹھالی تو مجھے دوبارہ شاہ جی کے پاس جانا پڑا تھا۔ تب انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں کورنگی والی فیملی کو ان کے آستانے پر لے جاؤں تو وہ اپنے آستانے پر بنی ہوئی روٹی کا ایک ایک نوالہ کھلا کر ثابت کر دیں گے کہ

چور کون ہے۔ جس نے امی کی رقم چرائی ہوگی وہ نوالہ حلق سے اترتے ہی خون کی الٹی کردے گا۔"
"اور آپ سمجھتی ہیں کہ شاہ جی نے چور پکڑنے کا جو طریقہ بتایا اس میں صداقت ہے؟" میں نے اس کی اندھی رائے کو عدالت کے ریکارڈ پر لانے کی کوشش کی۔ "اگر شاہ جی کی اسکیم پر عمل کیا جاتا تو چور واقعی خون کی الٹی کر دیتا؟"
"جی بالکل...... اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔
"تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ شاہ جی خون کی الٹی والے اس عمل میں اللہ کے کلام کا سہارا لیتے ہیں؟"
"جی وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں......!" وہ جاہلانہ انداز میں بولی۔
"لیکن آپ لوگ تو اللہ کے کلام پر یقین ہی نہیں رکھتے؟" میں نے زہریلے لہجے میں کاری وار کیا۔
"کیا مطلب ہے آپ کا۔" وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔ "یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟"
میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اس پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ لوگوں کو اللہ کے کلام پر یقین ہوتا تو ماسٹر جی اور ان کی فیملی سے قرآن اٹھوانے کے بعد آپ چپ ہو کر بیٹھ جاتے اور کلام پاک کے فیصلے کا انتظار کرتے لیکن آپ لوگوں نے کیا کیا......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
"چند روز کے بعد آپ کی امی جان خون والی الٹی اسکیم کے ساتھ ماسٹر جی کے پاس پہنچ گئیں لیکن جب ان لوگوں نے ایسے کسی مکروہ تجربے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تو تب آپ کی والدہ نے انتقاماً میرے مؤکل کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرادی۔"
"امی کا بھاری نقصان ہوا ہے۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "وہ اپنے مال کی بازیابی کے لیے چارہ جوئی تو کریں گی نا......!"
"چارہ جوئی کرنے سے کس نے روکا ہے؟" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "یہ ساری وضاحت کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ اس نوعیت کے معاملات میں اللہ کے کلام کو کبھی بیچ میں نہیں لانا چاہیے اور...... اگر یہ ناگزیر ہو جائے...... اس کے سوا مسئلے کا اور کوئی حل نظر نہ آ رہا ہو تو پھر اللہ کے کلام کی تاثیر کو دل و جان سے مانتے ہوئے اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے مگر آپ کو تو حساب لگانے والے شاہ جی پر بھروسا ہے۔ اس کی بات ماننے کو آپ زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔"
میری بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولی۔ بس خجالت بھری نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
"انیلا جی! آپ نے بتایا ہے حساب لگانے والے شاہ جی سے آپ کی صرف دو ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ان دو ملاقاتوں میں آپ اور آپ کے گھر والے شاہ جی کے کشف و کرامات پر ایمان لے آئے ہیں۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ یہ حساب کتاب والے شاہ جی کس کے حساب میں آئے تھے...... میرا مطلب ہے، آپ کو شاہ جی کے بارے میں کب اور کس نے بتایا تھا۔ یہ نابغہ روزگار کس کی دریافت ہے؟"
"شاہ جی کے بارے میں مجھے شاکر علی سے پتا چلا تھا۔" اس نے جواب دیا۔
☆☆☆
"شاکر علی...... اچھا وہ کنڈا ماسٹر؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
"جی جی...... میں شاکر بھائی ہی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "شاکر بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔ لوگوں نے ایسے ہی ان کے نام کے ساتھ "کنڈا ماسٹر" لگا کر انہیں بدنام کر رکھا ہے۔"
"تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ شاکر علی بجلی چور نہیں ہے؟" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ محکمہ بجلی کے تاروں پر کنڈا نہیں ڈالتا......؟"
"میں مانتی ہوں کہ شاکر بھائی یہ کام کرتے ہیں لیکن اس حوالے سے ان کا مقصد نیک ہوتا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ صرف مجبور اور لاچار لوگوں کے ہی کام آتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ ہمارے محلے میں ایک بوڑھی بیوہ خاتون رہتی ہیں۔ ان کا استعمال ایک پنکھا اور ایک ٹیوب لائٹ سے زیادہ نہیں ہے لیکن الیکٹرک کمپنی والے ان کا بل ہمارے بل کے برابر بھیجتے ہیں جو کہ سراسر زیادتی ہے۔ اگر شاکر بھائی نے ان بوڑھی خاتون کو کنڈا لگا دیا تو اس میں کیا برائی ہے؟"
انیلا کی باتوں سے یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دل میں شاکر علی کے لیے گہری ہمدردی رکھتی تھی اسی لیے وہ اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''اگر آپ کے بیان کردہ نیکی و برائی کے فلسفے کو درست مان لیا جائے تو پھر رابن ہڈ، سلطانہ ڈاکو اور ملنگی بھی نہایت ہی نیک سیرت انسان تھے۔ یہ تینوں اور انہی کے قبیل کے دیگر معروف کردار بھی امیروں کو لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کرتے تھے......''

''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ''وکیل صفائی غیر متعلق اور فروعی باتوں کو زیرِ بحث لا کر عدالت کا وقت برباد کررہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات کو زیرِ سماعت کیس تک محدود رکھتے ہوئے اپنی جرح کو آگے بڑھائیں۔'' مجسٹریٹ نے میری جانب دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''یس سر......!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا اور استغاثہ کی گواہ انیلا کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''انیلا جی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ صرف دو مرتبہ تین ہٹی والے پہنچے ہوئے شاہ جی سے ملی ہیں۔ اس سے پہلے آپ اس سیانے کو جانتی تک نہیں تھیں اور شاہ جی سے رجوع کرنے کا مشورہ آپ کو شاکر علی کنڈا ماسٹر نے دیا تھا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر استفسار کیا۔

''میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا؟''

''نہیں۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''شاہ جی سے ملاقات کرنے آپ اکیلی گئی تھیں؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''نن......نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ کا شوہر اعجاز حسین آپ کے ساتھ گیا تھا؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔ ''جی نہیں۔''

''پھر......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آپ کس کے ساتھ دو مرتبہ شاہ جی سے ملاقات کرنے گئی تھیں؟''

''شاکر بھائی کے ساتھ۔'' اس نے بڑے اعتماد سے بتایا۔

''آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شاکر علی اور اس کے مشوروں پر بہت بھروسا کرتی ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جی بالکل......'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''شاکر بھائی اس قابل ہیں کہ ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ میرے اس عمل پر آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟''

''کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے انیلا کے سوال کے جواب میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا پھر روئے سخن مجسٹریٹ کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یور آنر! یہ کیس دلچسپ مرحلے میں داخل ہوچکا ہے۔ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عارف کے خلاف استغاثہ کی جانب سے ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا جاسکا جس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہو کہ چوری اسی نے کی ہے۔ علاوہ ازیں پولیس کی دو ہفتے کی کڑی تفتیش کے باوجود بھی مالِ مسروقہ یعنی ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی رقم ملزم کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی اور نہ ہی کہیں اور سے بازیاب کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے مؤکل کو ایک گہری سازش کے تحت چوری کے اس مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ استغاثہ اور اس کیس کی مدعی ناہید اختر کے پاس میرے مؤکل کو ملزم گرداننے کے لیے صرف ایک پوائنٹ ہے اور وہ پوائنٹ ہے، شاہ جی......شاہ جی جو کوئی بہت ہی پہنچا ہوا اور سیانا بندہ ہے۔ اس کے حساب کتاب میں آیا ہے کہ مدعی کے گھر میں میرے مؤکل نے چوری کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اتنے اہم شخص کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ نیز اس فہرست میں اس صلاح کار کا نام بھی شامل نہیں جس کے مشورے پر انیلا تین ہٹی والے آستانے پر گئی تھی لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ آئندہ پیشی پر ان دونوں افراد کو عدالت میں حاضر ہونے کے احکامات صادر کرے تاکہ......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے تیکھی نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور ڈرامائی انداز میں اپنی بات مکمل کردی۔

''......تاکہ میں بھی اپنے بعض مقدمات کے سلسلے میں شاہ جی کی روحانی قوتوں سے فیض یاب ہوسکوں اور ...... میں نے کنڈا ماسٹر سے بھی چند مفید مشورے لینا ہیں......دیٹس آل یور آنر۔''

مجسٹریٹ نے متعلقہ عدالتی عملے اور تفتیشی افسر کو ہدایات جاری کیں کہ اگلی پیشی پر شاہ جی اور شاکر علی کو بہ طور گواہِ استغاثہ عدالت میں پیش کیا جائے۔ اس کے بعد عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں پہنچا ہوا سیانا شاہ جی کھڑا تھا۔ شاہ جی کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے بیچ لگایا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا شلوار کرتا زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔ مرغن غذاؤں نے اس کے بدن خصوصاً گردن کے عقبی حصے پر چربی کی تہیں چڑھا رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھاری مونچھیں اور ہلکی سی ڈاڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے سر کے بال کندھوں تک بڑھا رکھے تھے جن میں کوئی چمک دار تیل بھی ڈالا ہوا تھا بلکہ تیل کی مقدار کے پیش نظر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے سر کے بالوں کو تیل میں ڈال رکھا تھا۔ شاہ جی کی آنکھوں میں ایک مخصوص نوعیت کی سرخی دکھائی دیتی تھی جو عموماً رت جگے کے باعث پیدا ہو جاتی ہے یا پھر ...... چرس کا نشہ کرنے کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے!

اپنی باری پر میں شاہ جی والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا اور نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ”شاہ جی! آپ کیسے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اللہ کا کرم ہے۔“ اس نے کراری آواز میں جواب دیا۔

”شاہ جی! اس وقت میری شدید خواہش ہے کہ آپ کی دست بوسی کروں۔“ میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن عدالت اجازت نہیں دیتی کہ میں اپنی تمنا پوری کر سکوں لہٰذا میری معذرت قبول فرمایئے۔“

اس نے چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو... کہ کہیں میں اسے بانس پر تو نہیں چڑھا رہا۔

”وکیل صاحب! آپ کبھی میرے آستانے پر تشریف لائیں۔“ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”آپ کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔“

”زہے نصیب...... میں بہت جلد حاضری دوں گا۔“ میں نے احترام میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے کمالات کے بارے میں سن کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ کشف و کرامات آپ کی جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ آپ حساب کتاب کے ماہر ہیں۔ آپ اپنی باطنی آنکھ سے سیکڑوں اور ہزاروں میل دور کے مناظر کو بھی واضح طور پر دیکھ لیتے ہیں۔“

وہ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی رعونت سے بولا۔ ”بس جناب، مخلوقِ خدا کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“

”اس وقت عدالت میں بھی خلقِ خدا موجود ہے جنہیں آپ کے علم کے استعمال کی ضرورت ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ کو میری درخواست پر یہاں بلایا گیا ہے۔ امید ہے، آپ ضرور ہم سب کی مشکل آسان فرمائیں گے......!“

”ضرور...... ضرور...... کیوں نہیں۔“ وہ فراخ دلی سے بولا۔

اس نے میرے پھیلائے ہوئے ہم رنگِ زمیں جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے غیر محسوس انداز میں جال کو دھیرے دھیرے کھینچنا شروع کر دیا۔

”شاہ جی! کچھ عرصے پہلے آپ کی ایک عقیدت مند خاتون انیلا نے آپ کے آستانے پر آ کر کچھ حساب لگوایا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انیلا کے گھر سے ایک موٹی رقم چوری ہو گئی تھی اور آپ نے اپنے علم کے زور پر حساب لگا کر چور کی نشاندہی کر دی تھی۔ آپ کا بتایا ہوا اور اس کیس کا ملزم عارف اس وقت آپ کی نظر کے سامنے اکیوزڈ باکس میں کھڑا ہے۔“ بات کے اختتام پر میں نے اپنے مؤکل کی سمت اشارہ بھی کر دیا۔

شاہ جی نے ناپسندیدہ نگاہ سے عارف کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”وکیل صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے یہ حساب لگایا تھا۔“

”حضرت! میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کے حساب لگانے کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟“ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے...... کوئی مراقبہ یا پھر استخارہ......؟“

”میں کئی ایک علوم کا ماہر ہوں۔“ وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ”جیسا کہ علم جفر، علم رمل، مراقبہ، استخارہ، علم ارواح وغیرہ وغیرہ......“

”ماشا اللہ!“ میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ”اللہ کرے زورِ علم اور زیادہ لیکن قبلہ...... اس وقت معزز عدالت صرف اس علم کے بارے میں جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے جس کی مدد سے آپ نے مسز انیلا کے گھر میں ہونے والی رقم کی چوری کا حساب لگایا تھا......!“

”اس حساب کا تعلق علم قیافہ سے ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”نیز اس سلسلے میں علم جفر سے بھی میں نے مدد لی تھی۔“

”بہت خوب......“ میں نے اوزار گھسائی منجھائی اٹھا لیے اور اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ”کیا علم قیافہ اور علم جفر سے استفادہ کرنے کے لیے کوئی وقت مخصوص

ہوتا ہے یا یہ حساب کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے؟"

"وقت کے محتاج اناڑی عامل ہوتے ہیں۔" وہ متکبرانہ انداز میں بولا۔ "ماہرفن کسی بھی وقت اور کہیں بھی اپنے علم کو استعمال کر کے سو فیصد نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔"

"اور ماشاءاللہ! آپ ماہرفن ہیں!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "اس میں کیا شک ہے۔"

علم جفر، علم رمل، عمل قیافہ اور اسی نوعیت کے جتنے بھی علم صدیوں سے رائج ہیں، میں ان کی حقیقت اور اہمیت پر یقین رکھتا ہوں لیکن میں نے اس دوران میں اس دو ٹکے کے سیانے کے بارے میں اچھی خاصی ریسرچ کر لی تھی اور میں یہ بات جانتا تھا کہ شاہ جی کے پلے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک ڈھونگی عامل تھا جو سادہ لوح لوگوں کو الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتا تھا۔ یہ سطور درج کرنے کا میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر میں جرح کے دوران میں شاہ جی کی شان میں کوئی چھوٹی بڑی گستاخی کردوں تو ان علوم کے سچے اور کھرے ماہرین کو برا نہیں منانا چاہیے۔ انسان نما حیوانوں اور معاشرتی ناسوروں کو بے نقاب کرنا عین عبادت ہے..... اس عبادت میں سستی کرنا ٹھیک نہیں!

"حضرت! آپ نے جس بھی علم کی مدد سے انیلا صاحبہ کو یہ بتایا تھا کہ ان کے گھر میں چوری کورنگی سے آنے والی فیملی نے کی ہے، خصوصاً آپ کا اشارہ اس کیس کے ملزم عارف کی جانب تھا۔" میں نے جرح کو خطرناک موڑ کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ "معزز عدالت آپ کے اس علم کا عملی مظاہرہ دیکھنے کی مشتاق ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں....." وہ بدکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں..... سمجھاتا ہوں۔" میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے تاش کی گڈی برآمد کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس گڈی میں سے کوئی بھی تین پتے نکال رہا ہوں۔ آپ اپنے علم کے زور پر حساب لگا کر بتائیں گے کہ میں نے باون پتوں میں سے کون سے تین پتے نکالے ہیں؟"

میں نے جس تفریحی کھیل کا آغاز کیا تھا اسے حاضرین عدالت کے علاوہ مجسٹریٹ بھی گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہ مجھ پر لگی ہوئی تھی اور وہ سب شاہ جی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ صورت حال ڈرامائی رنگ اختیار کر گئی تھی۔

شاہ جی یکایک پریشانی میں گھر گیا تھا۔ میرے پینترے نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ بے چین فراری نظر سے کبھی مجھے اور کبھی مجسٹریٹ کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن اب میں اسے کسی بھی قسم کا سیف فنج دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے کسی ماہر کھلاڑی کے انداز میں تاش کی گڈی کو پھینٹا پھر اس میں سے تین پتے نکال کر باقی گڈی شاہ جی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "قبلہ! آپ ان پتوں پر اپنے تمام علوم کی بارش فرمادیں، پاتال میں جھانکنے والی اپنی باطنی آنکھ کو زحمت دیں اور مجھے بتائیں کہ میں نے کون سے تین پتے نکالے ہیں؟"

چند لمحات کے لیے وہ گڑبڑایا لیکن بندہ کائیاں تھا چنانچہ فوراً ہی سنبھل گیا اور شاطرانہ انداز میں بولا۔ "میں سارا حساب نوری علم سے لگاتا ہوں اور یہ تاش شیطانی کھیل ہے۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ دین میں پتے کھیلنے اور پانسہ پھینکنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ہم حلال چیزوں کی بات کرتے ہیں۔" میں نے تاش کی گڈی کو واپس اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے جو کوٹ پتلون پہن رکھا ہے اس میں کل آٹھ جیبیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جیب میں میرا بٹوا..... اوہ، ایک بات تو میں پوچھنا ہی بھول گیا....." میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"شاہ جی! آپ لیدر کو کہیں حرام تو نہیں سمجھتے؟ کیا دین میں چمڑے کی بنی ہوئی چیزوں کا نام لینے کی ممانعت تو نہیں ہے؟"

"نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

اس روز میں اس پہنچے ہوئے فراڈی شخص کو بری طرح ذلیل کرنے کا بندوبست کر کے عدالت پہنچا تھا۔ میں نے رشید احمد کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ تہمینہ اور دل شاد بیگم کو بھی ساتھ لے کر آئے۔ عارف تو آل ریڈی اکیوزڈ باکس میں موجود تھا۔ دوسری جانب سے ناہید اختر، رضوان اور انیلا عدالت آئے تھے۔ شائکہ گھر پر رکی ہوئی تھی۔ بہ قول کسے، اس وقت عدالت کا کمرا کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔

"شکر ہے....." میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے شاہ جی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ ان آٹھ جیبوں میں سے کسی ایک میں، میں نے اپنا چمڑے کا بٹوا رکھا ہوا ہے۔ آپ معزز عدالت

کے رو برو حساب لگا کر بتائیں کہ میرا بٹوا کون سی جیب میں ہے؟"

وہ میرے جال میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ ان لمحات میں وہ "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" جیسی کیفیت کا شکار نظر آتا تھا۔ ایک لمحہ متذبذب رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"آپ کا بٹوا پتلون کی عقبی جیب میں ہے۔"

"حساب لگا کر بتا رہے ہیں یا محض تکا لگا رہے ہیں؟" میں نے اسے گہری نظر سے گھورا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں نے باقاعدہ حساب لگایا ہے۔"

"آپ کا حساب غلط ہو گیا شاہ جی۔" میں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے ایک پھولا ہوا بٹوا برآمد کرتے ہوئے کہا پھر مذکورہ بٹوا اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے حساب کے مطابق، اس بٹوے کے اندر کتنی رقم ہوگی۔ آپ رقم کے بارے میں حساب لگانے کے بڑے ماہر ہیں.....!"

اس نے چند لمحات تک میرے ہاتھ میں موجود پھولے ہوئے بٹوے کو گھورا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں یہ حساب تو نہیں لگا سکتا کہ اس بٹوے کے اندر کل کتنی رقم ہے لیکن میں بڑے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔"

"میں آپ کے وثوق کا عملی مظاہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا بٹوا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کے اندر موجود نوٹوں کو گن کر معزز عدالت سے حساب میں ماہر ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں....."

ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے بٹوا لے لیا لیکن جیسے ہی اس نے بٹوا کھولا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ کیا..... آپ کے بٹوے میں تو..... مختلف قسم کے کارڈز..... اور تہ شدہ کاغذات..... بھرے ہوئے ہیں..... یہاں تو ایک روپیا بھی موجود نہیں....."

"جس طرح زنگ لوہے کو اور دیمک لکڑی کو کھا جاتے ہیں بالکل اسی طرح دروغ گوئی انسان کے اعتبار کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا بٹوا لیتے ہوئے کہا پھر اپنی میز کے پاس پہنچ کر قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "اس میز پر تین فائلیں رکھی ہوئی ہیں اور تینوں کا رنگ ایک دوسرے سے جدا ہے۔ آج عدالت میں میرے تین کیس لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر کیس کی ایک فائل ہے۔ آپ اپنے تمام علوم کے گھوڑے دوڑا کر حساب لگائیں اور معزز عدالت کو بتائیں کہ ان میں سے زیر سماعت کیس کی فائل کون سی ہے؟"

میں نے اسے چکر دینے کے لیے ایک غیر متعلق فائل کو کھول رکھا تھا۔ میری اب تک کی جرح نے اسے خاصا بدحواس کر دیا تھا۔ وہ آسانی سے میرے چکر میں آ گیا اور اضطراری انداز میں کھلی ہوئی فائل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ فائل..... جو نیلے رنگ کی ہے..... اور کھلی ہوئی ہے....."

"ایک دم بکواس....." میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا پھر "آپ" سے "تم" کے میدان میں چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ "تم جھوٹے ہو..... تمہارا حساب جھوٹا ہے..... اور یہ بات عدالت کے سامنے عملاً ثابت ہو چکی ہے۔" پھر میں نے کھلی ہوئی نیلی فائل کو اٹھا کر مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! یہ قتل کے ایک مقدمے کی فائل ہے۔ آپ میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہ شخص جھوٹا، عیار، مکار اور دھوکے باز ہے۔ اس کی دروغ گوئی نے ایک بے گناہ نوجوان کو کئی ماہ سے عدالت کے بکھیڑوں میں الجھا رکھا ہے۔"

پھر میں دوبارہ شاہ حساب داں کی جانب متوجہ ہو گیا اور کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم ملزم کو کب سے جانتے ہو؟"

وہ اپنے ماتھے پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے آج پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے۔ اس سے پہلے میں نے صرف اس کا نام سنا تھا۔"

"کس سے..... تم نے کس سے ملزم کا نام سنا تھا؟" میرے لہجے میں درشتی در آئی۔

"انیلا سے..... اور شاکر سے....." وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا کبھی ملزم نے تمہارے کھیتوں کو نذر آتش کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نن..... نہیں..... کبھی نہیں....." وہ ہکلایا۔

''اس نے کبھی تمہارے جھوٹ اور فراڈ کے ٹھکانے یعنی تمہارے آستانے پر کوئی بم مارنے کی کوشش کی؟'' میں نے زہریلے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں جی...... ایسا کبھی نہیں ہوا......'' وہ مریل سی آواز میں بولا۔

''پھر کیوں ...... تم نے کیوں اسے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی؟'' میرے لہجے کی خطرناکی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔'' ملزم سے تمہاری ایسی کون سی دشمنی تھی جو تم نے حساب کا ڈھونگ رچا کر اسے اس دلدل میں دھکیلا......؟''

قبل اس کے کہ کاذب حساب داں میرے سوال کا جواب دیتا، انیلا ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر اس کے قدم دروازے کی سمت اٹھنے لگے۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے آواز دے کر اسے مخاطب کرلیا۔

''انیلا جی! آپ کہاں جارہی ہیں؟''

''واش روم......'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔'' میں کافی دیر سے ضرورت محسوس کررہی تھی۔''

بات ختم کرتے ہی وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔ میں نے تیز آواز میں کہا۔''رک جائیں۔ جہاں اتنا برداشت کیا ہے، تھوڑا اور برداشت کرلیں۔ اپنے حساب داں شاہ جی کا جواب سن لیں، پھر چلی جائیے گا۔''

''میں نہیں رک سکتی...... مجھ سے اور برداشت نہیں ہورہا......'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیلِ استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔'' میرے فاضل دوست سراسر زیادتی کررہے ہیں۔ استغاثہ کی معزز گواہ کو حوائجِ ضروریہ سے روکنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے۔''

''بیگ صاحب! آپ گواہ انیلا کو واش روم جانے سے کیوں روکنا چاہتے ہیں؟'' مجسٹریٹ نے مجھ سے استفسار کیا۔''کیا اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔''

''یس سر! میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔'' میرے خیال میں کذاب حساب داں کا جواب انیلا کے لیے کوئی پریشانی کھڑی کرسکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، عدالتی کارروائی کو چند منٹ کے لیے موقوف کیا جاتا ہے۔'' مجسٹریٹ نے فیصلہ کن انداز میں

کہا۔ ”کسی خاتون کو واش روم جانے سے روکنا مناسب نہیں ہوگا۔ جب مسز انیلا واپس آجائے گی تو عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے گا۔“

مجسٹریٹ نے خاصی معقول بات کی تھی لیکن میرے ذہن میں چونکہ خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی لہٰذا میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا۔

”اوکے سر۔ میں معزز عدالت کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میری ایک درخواست ہے۔“

”کیسی درخواست؟“ مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں، عدالت سے متعلق کسی ذمے دار شخص کو نگرانی کی غرض سے انیلا کے ساتھ روانہ کیا جائے۔“

”ٹھیک ہے!“ مجسٹریٹ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر ایک لیڈی سرچ کو انیلا کے ساتھ واش روم تک جانے اور اسے واپس عدالت کے کمرے کے اندر لانے کی ہدایت کردی۔

اس صورتِ حال نے عدالت میں موجود ہر شخص کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ شاہ جی کی حالت دیدنی تھی۔ میری جرح نے اسے ایک ایسے موڑ پر لاکر کھڑا کیا تھا کہ جہاں بولنے میں تباہی اور چپ رہنے میں بربادی تھی۔

انیلا واپس آئی تو اس کی حالت خاصی غیر ہورہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ آئی تھی اور وہ نروس دکھائی دیتی تھی۔ مجسٹریٹ نے بھی اس کی کیفیت کو نوٹ کرلیا تھا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ عدالتی کارروائی شروع کی تو میں ڈھونگی شاہ جی کی جانب بڑھ گیا پھر اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا۔

”معزز عدالت کو بتاؤ کہ ملزم سے تمہاری کیا دشمنی تھی۔ تم نے اپنے حساب کی آڑ میں اسے پھنسانے کی کیوں کوشش کی؟“

جب کسی شکار کو یہ یقین ہوجائے کہ شکاری نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے اور اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا تو وہ سپر ڈالنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاہ جی کی بھی تھی۔ وہ میرے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔

”میں سچ بولنا چاہتا ہوں......!“

”میں تمہارے اس فیصلے کو قدر کی نگاہ سے دیکھوں گا۔“ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”سچ بول کر تم اپنے لیے آسانیاں پیدا کرسکتے ہو۔“

”ملزم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔“

”گویا......تم نے کسی کی ہدایت پر ملزم کو پھنسانے کے لیے اپنے حساب کا ڈھونگ رچایا تھا؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اس کام کے لیے تمہیں کتنی رقم دی گئی تھی؟“

”جی ...... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے جھوٹ بولنے کے لیے ایک ہزار روپے دیے گئے تھے۔“

”اوہ ...... یہ تو اچھی خاصی رقم ہے۔“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”اس مشن کا ماسٹر مائنڈ کون ہے......تم نے کس کے ایما پر اتنا بڑا جھوٹ بولا؟“

”شاکر علی ......“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کیا تم یہ بات شاکر علی کے سامنے بھی کہہ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جب میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو آپ جہاں کہیں گے، میں سچ ہی بولوں گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”آپ شاکر کو میرے سامنے لائیں، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔“

مجسٹریٹ نے انکوائری آفیسر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ پیشی پر شاہ جی اور شاکر علی کا نام گواہوں کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ کیا آج شاکر علی کو بھی گواہی کے لیے پیش کیا جارہا ہے؟“

”سوری سر!“ تفتیشی افسر نے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا۔ ”شاکر علی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیجا ہے۔ اسے آئندہ پیشی پر پیش کردیا جائے گا۔“

”جنابِ عالی!“ میں نے روئے سخن مجسٹریٹ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت معزز گواہ استغاثہ انیلا صاحبہ عدالت میں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شاکر علی کے غیاب میں انیلا صاحبہ اس معاملے پر روشنی ڈال سکتی ہیں کیونکہ انیلا صاحبہ نے اپنے شاکر بھائی کے مشورے پر ہی شاہ جی سے حساب لگوایا تھا اور یہ دو مرتبہ شاکر کے ساتھ ہی تین ہٹی والے آستانے پر گئی تھیں۔ یہ تمام حقائق عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔“

مجسٹریٹ نے انیلا کو وٹنس باکس میں بلالیا اور میں

اس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''م...... میں ٹھیک ہوں......'' وہ بدحواسی سے بولی۔

''آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں ہے۔''

''اب میں آپ کو یقین دلانے کے لیے کیا کرسکتی ہوں۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔

''وہی......'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''جو آپ کے پہنچے ہوئے شاہ جی نے کیا ہے۔''

''کیا......؟!'' وہ چونک کر مجھے تکنے لگی۔

''شاہ جی نے سچ بول کر اپنے جرم کی سنگینی میں خاصی رعایت حاصل کرلی ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ ڈھٹائی سے دروغ گوئی پر ڈٹا رہتا تو میں اس پہنچے ہوئے بندے کو ایسی جگہ پہنچا دیتا جہاں سے واپسی میں اسے کئی سال لگ جاتے......'' میں سانس ہموار کرنے کو تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''میں سمجھی نہیں......!''

''معزز عدالت آپ کے منہ سے سچ سننا چاہتی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا آپ بتائیں کہ شاکر علی نے شاہ جی کو جھوٹ بولنے کے لیے ایک ہزار روپے کیوں دیے تھے؟ میرے مؤکل سے شاکر کی کیا دشمنی تھی؟ اس نے عارف کو چوری کے مقدمے میں کیوں پھنسایا؟''

''م...... میں اس...... بارے میں کچھ نہیں جانتی......'' وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ ''آپ...... یہ سارے سوال...... شاکر سے کریں......''

اس کے لہجے کی شکستگی اور ناتوانی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے لیکن کسی خاص سبب کی بنا پر زبان نہیں کھول رہی۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آئندہ پیشی پر میں یہ سوال شاکر علی کنڈا ماسٹر سے کرلوں گا اور پھر آپ کا جو بھی ہو اس کی ذمے دار آپ ہی ہوں گی......!''

''کیوں...... میرا کیا ہونے والا ہے......'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

میری دھمکی کارگر رہی تھی۔ میں نے اسے مزید خوفزدہ کرنے کی غرض سے کہا۔ ''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ سردست میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ نے بھی شاہ جی کی طرح عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ سکتی تھیں خیر...... ہر انسان اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اگر آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہائش اختیار کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں کون ہوتا ہوں آپ کی خواہش کی راہ میں رکاوٹ بننے والا......!''

میری نفسیاتی ٹریٹ منٹ نے بڑے مثبت نتائج دیے۔ انیلا کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ پھٹ پڑی اور بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''اگر شاہ جی نے اپنی زبان کھول دی ہے تو میں بھی سچ بولوں گی اور سچ بولتے ہوئے مجھے کسی قسم کا ڈر خوف نہیں ہے کیونکہ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ میری اور شاکر بھائی کی منصوبہ بندی میں خلوص شامل تھا۔ ہماری نیت صاف تھی۔ ہم نے جو بھی کیا وہ حالات اور وقت کا تقاضا تھا۔ مجھے اپنے اس عمل پر کوئی ندامت نہیں ہے۔''

''انیلا جی! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس سارے پروگرام میں آپ کی نیک نیتی کیسے ظاہر ہوتی ہے؟'' میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''شاہ جی کو ایک ہزار روپے رشوت دے کر ان کی زبان سے جھوٹ بلوانا اور ایک بے گناہ انسان کو ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی چوری کے الزام میں پھنسانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی؟''

''ابو بہت سیدھے انسان تھے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''وہ ہر قسم کا نقصان اٹھا کر رشتوں کو نبھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ میری شادی بھی انہوں نے اپنے رشتے داروں میں کی اور میں آج تک آرام و آسائش کو ترس رہی ہوں۔ اعجاز حسین کی اتنی آمدنی نہیں ہے کہ ہم ایک خوش حال زندگی بسر کرسکیں۔ اوپر سے ابو نے شمائلہ کا رشتہ پھوپی کے بیٹے عارف سے طے کردیا جو بے روزگار ہے۔ اس کے پاس کوئی مستقبل نہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری طرح شمائلہ بھی زندگی بھر کسمپرسی کی حالت میں رہے اس لیے میں نے شاکر بھائی کی مدد سے یہ چال چلی تھی تاکہ عارف پر چوری کا الزام لگے اور یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔''

''ٹھیک ہے، تم نے اپنی چھوٹی بہن کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے یہ رشتہ تڑوانے کی کوشش کی۔'' میں

نے تلخی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی بھاری رقم الھدل تھا؟''

''جی...... بالکل تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کون؟''

''شاکر بھائی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''شاکر بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ''میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ شائلہ کو پسند کرتے ہیں اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شائلہ شاکر بھائی کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔''

''انیلا جی! تمہارے اور شاہ جی کے بیان کی روشنی میں میرا مؤکل تو صد فیصد بے گناہ ثابت ہو گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ابھی تک چوری شدہ رقم کی ہسٹری مکمل نہیں ہو سکی۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ وہ تگڑی رقم کہاں گئی؟''

''وہ رقم میں نے امی کے پاس سے نکال کر شاکر بھائی کے حوالے کی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر شاکر بھائی وہاں سے چلے گئے تھے۔''

''تمہارے اور شاکر کے علاوہ اس منصوبے میں اور کون کون شامل تھا؟'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''شاہ جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں تمہارے گھر کے افراد کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''کیا ناہید اختر، رضوان، شائلہ اور اعجاز حسین میں سے کسی کو تمہارے عزائم کی خبر تھی؟''

''جی نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔''

انیلا کے واشگاف بیان پر ناہید اختر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر انیلا کا منہ نوچ لے۔ میں نے ناہید اختر کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے انیلا سے کہا۔

''تم نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی سوچا کہ تمہاری ماں نے وہ رقم عمرہ کرنے کے لیے جمع کر رکھی تھی؟''

''امی جھوٹ بولتی ہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''انہوں نے سب کو یہی بتا رکھا ہے کہ وہ عمرے پر جانے والی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ رضوان کے ساتھ ملائیشیا اور تھائی لینڈ کی سیر کرنے جانے والی تھیں۔ اس رقم کی امی سے زیادہ میں ضرورت مند تھی۔ میرے اور شاکر بھائی کے بیچ طے ہوا تھا کہ ہم اس رقم کو آپس میں بانٹ لیں گے۔ وہ ساٹھ ہزار سے اپنی شادی کا انتظام کر لیں گے اور میں اعجاز حسین کو ٹیلرنگ شاپ کھلوا دوں گی تاکہ وہ اپنا کام کر سکے۔ اعجاز کسی دوسرے کے پاس کمیشن پر سلائی کا کام کرتا ہے۔ آمدنی اتنی کم ہے کہ گزارہ نہیں ہوتا۔ میں نے جو بھی کیا، اس میں میری نیک نیتی شامل تھی لیکن میرے نصیب میں کامیابی نہیں تھی اس لیے وقت سے پہلے ہی میرا منصوبہ فیل ہو گیا۔''

''تم نے جو کچھ بھی کیا وہ بہرحال قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں اور شاکر علی کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ کم یا زیادہ...... اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔''

اس نے گردن جھکا دی۔ اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

''یور آنر!'' میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ حالات و واقعات اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں میرا مؤکل بے گناہ ثابت ہو گیا ہے۔ اس معصوم کو ٹارگٹ بنا کر جو گھناؤنا کھیل کھیلا گیا اس کا پول کھل چکا ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم عارف کو اس کیس سے باعزت بری کیا جائے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی۔''

جج نے فیصلے کے لیے دو روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آئندہ پیشی پر مجسٹریٹ نے عارف کی باعزت بریت کے احکام صادر کر دیے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شاکر علی کو شاملِ تفتیش کر کے اس کے پاس سے ایک لاکھ دس ہزار کی رقم برآمد کر لی گئی تھی۔ اس دوران میں وہ دس ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے...... جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، ایک روز وہ خود اس گڑھے میں گرتا ہے۔ شاکر اور انیلا نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے عارف کو ٹارگٹ بنایا تھا لیکن میری کوشش اور مالک کے کرم نے اسے بچا لیا۔ عارف پر یہ مثال صادق آتی تھی...... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے!

(تحریر: حسام بٹ)

بدلہ

شاہ زین رضوان

اکثر بے خبری میں انسان اپنے ہی دشمنوں کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور اپنا دوست سمجھ لیتا ہے۔۔ اور دشمن اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مکاری پر خوش ہوتا ہے مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوسکتا۔۔۔ ایک لمحہ آگہی کا جب اس کی معصومیت کو اپنے گھیرے میں لیتا ہے تو بہت ساری سرگوشیاں اسے حقیقت سے آگاہ کردیتی ہیں اور بس یہ وہی لمحہ ہوتا ہے جب ناحق بہنے والا خون اپنے مجرم کی نشاندہی کردیتا ہے۔ اسے بھی جب حقیقت کا ادراک ہوا تو پل کے پل میں اس نے بدلے کی ٹھان لی۔

آستین کے سانپوں کے درمیان ادھورے مشن کی تکمیل کا ماجرا

ریمنڈ، انٹرنیشنل ہوٹل میں ہونے والا ایلوس پریسلے کا شو دیکھ کر باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے منیجر ٹام پارکر کی نظر اس پر پڑ گئی جو بیرونی لابی میں پریسلے کی ریکارڈ البمز، تصویریں، پوسٹر اور دیگر یادگاری اشیا بیچ رہا تھا جنہیں لینے کے لیے پرستاروں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ٹام نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور واپس آنے کا اشارہ کیا۔

”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا تم ایلوس سے نہیں ملو گے؟“

"اس وقت نہیں ٹام۔ مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اس وقت کون سی میٹنگ ہے؟" ٹام نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت مایوس ہوگا اگر تم نے اس سے ملنے اور یہ بتانے کے لیے کچھ وقت نہیں دیا کہ آج کا شو بہت شاندار تھا۔"

"تم میری طرف سے اسے بتا دینا۔"

ٹام اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "تم جانتے ہو کہ وہ لوگوں کے منہ سے براہِ راست سننا پسند کرتا ہے۔ ویسے وہ کون ہے جس سے ملنے کے لیے تم اتنی جلدی کر رہے ہو؟"

ریمنڈ میز پر جھکا اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے وہ نام بتا دیا۔ ٹام کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بولا۔ "تب تو تمہیں بالکل بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ایلوس اور میری جانب سے بھی اسے نیک خواہشات کا پیغام پہنچا دینا۔"

ریمنڈ کا دفتر ایک غیر معروف سڑک پر واقع تھا جہاں بیشتر دکانیں اور دفاتر خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس کی بیرونی کھڑکی پر تاریک شیشہ لگا ہوا تھا اور باہر سے یہ نظر نہیں آتا تھا کہ اندر کوئی سرگرمی ہو رہی ہے۔ البتہ دروازے پر اس کے نام کی تختی ضرور لگی ہوئی تھی۔ وہ صرف ان لوگوں کے لیے کام کرتا تھا جو کسی کی معرفت اس کے پاس آتے یا وہ انہیں پہلے سے جانتا تھا۔ انہی لوگوں میں ایک نام نک سائمن کا تھا جسے وہ کیا بلکہ لاس ویگاس کا ہر شخص اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایلامو کے نام سے ایک بہت بڑے جوئے خانے کا مالک تھا جو اس نے انڈر ورلڈ کی کمائی سے بنایا تھا اور جہاں بڑے پیمانے پر جوئے کے ساتھ ساتھ تفریح کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے تھے۔

اس کی سیکریٹری نے آٹھ بجے کے قریب فون کر کے ریمنڈ کو بتایا کہ مسٹر سائمن اس سے ملنے کے لیے دفتر آ رہے ہیں۔ اس لیے وہ وقتِ مقررہ پر وہاں موجود رہے۔ اس نے تنبیہی انداز میں کہا کہ مسٹر سائمن انتظار کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس نے ریمنڈ کی جانب سے تصدیق ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریمنڈ نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔ عین اسی وقت وہاں ایک کیڈی لاک آن کر رکی جس کے ڈرائیور کو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ جہاں لیوڈون براجمان تھا جس کی شہرت لائن کے نام سے تھی۔ ریمنڈ اسے اچھی طرح جانتا تھا اور جن دنوں وہ ویگاس پولیس میں سراغ رساں تھا تو اس کا واسطہ کئی بار اس سے پڑا تھا۔ وہ ویگاس کا نامی گرامی غنڈا تھا۔ اس کے اثر رسوخ کا یہ عالم تھا کہ کئی بار پکڑے جانے کے باوجود وہ جیل سے رہا ہو جاتا کیونکہ کوئی بھی اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

سائمن گاڑی سے باہر آیا اور اسے دیکھ کر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے دفتر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگراہٹ تھی۔ اسی لیے ڈون اس کے بالکل قریب ہو کر چل رہا تھا تاکہ اسے گرنے سے بچا لے۔ سائمن نے ریمنڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنی ہے اور ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔"

ریمنڈ کا دفتر کسی لیونگ روم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں ایک کاؤچ، دو آرام دہ کرسیاں، کافی کی میز، ایک آفس ٹیبل جس پر چار عدد فون رکھے ہوئے تھے اور نصف درجن فائل کیبنٹ دیواروں پر نصب تھے۔ سائمن اور ریمنڈ آمنے سامنے آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ لائن دروازے کے ساتھ ہی کھڑا رہا۔ اس کی اسپورٹس جیکٹ کا ابھار بتا رہا تھا کہ وہ پوری طرح مسلح ہے۔

"میرے نزدیک فوری کارروائی کی بڑی اہمیت ہے اور میرے اندازے کے مطابق تم اس کے اہل ہو۔" سائمن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک بہت ہی خطرناک کام ہے لیکن اس کی کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ لوگ تمہاری ایمان داری اور فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔"

"لگتا ہے کہ تم نے مجھے فون کرنے سے پہلے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا ہے۔" ریمنڈ نے کہا۔

"بالکل۔ میں ہر کام میں احتیاط اور چھان بین کا قائل ہوں۔ تم نے ویگاس پولیس میں رہ کر قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کیں اور بطور سراغ رساں مجرموں کو پکڑ کر انہیں سزا بھی دلوائی۔ ایک بار فائرنگ کے تبادلے میں تمہارا ایک کان متاثر ہوا اور تمہارا دیرینہ ساتھی مارٹن ریان تمہیں بچاتے ہوئے مارا گیا۔ اس کی موت کا تمہیں اتنا صدمہ ہوا کہ تم نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور کچھ عرصہ شراب سے اپنا غم غلط کرتے رہے پھر پرائیویٹ سراغ رسانی شروع کر دی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مسٹر ریمنڈ؟"

"ہاں۔ سوائے اس کے کہ میں ابھی تک اس کتیا کے بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں جس نے مارٹن پر گولی چلائی تھی اور یہ

کہ مارٹی کی بیٹی جوائس اب میری پارٹنر ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں اپنے لیے نہیں آیا بلکہ یہ معاملہ ایک بڑی طاقت کا ہے۔ کیا تم نے ایلی مارکس کا نام سنا ہے؟"

"اسے کون نہیں جانتا۔ اسے شکاگو میں ہونے والے جرائم کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ایلاموکا اصل مالک وہی ہے اور تم اس کے فرنٹ مین ہو۔ اس کے علاوہ ویگاس میں اس کی تنظیم کے ذمے دار بھی تم ہی ہو۔"

سائمن مسکراتے ہوئے بولا۔ "بہت عمدہ۔ اب کام کی بات کرتے ہیں۔ یہ مسٹر مارکس کے لیے ایک فیور ہوگا اور کامیاب ہونے کی صورت میں تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔"

"اور اگر کامیابی نہ ہوئی تو؟"

"تو تمہیں ماردیا جائے گا اور ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اس کام کے لیے کسی اور کو تلاش کرو۔"

"تب بھی تمہیں ماردیا جائے گا۔"

لیوڈون کا ہاتھ بے اختیار اس جگہ پر گیا جو ابھری ہوئی تھی۔ سائمن نے اسے ایک نظر دیکھا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی اور اسی وقت تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔"

"مسٹر مارکس مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟ مجھے اس کی تفصیل بتاؤ۔"

"یہ ہوئی نا عقل کی بات۔" اس نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بلی اینڈ دی بلونڈ سے واقف ہو؟ یہ دونوں گلوکار ہمارے کیسینو میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ میں نے انہیں چند مرتبہ سنا ہے لیکن ان دونوں کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"کچھ نہیں...... بہت کچھ مسٹر ریمنڈ۔"

☆☆☆

"تم سن رہی ہو۔" ریمنڈ نے جوائس کو بتایا۔ "دا بلونڈ دراصل ایلی مارکس کی پوتی روزالی مارکس ہے اور وہ شوبزنس کی دنیا میں جولی جیمسن کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ تین یا چار سال کی تھی جب اس کے والدین وفات پاگئے تھے اور اس کی پرورش مارکس نے ہی کی۔"

"اوہ میرے خدا! اسے کسی نامعلوم فرد یا افراد نے اغوا کرلیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بدمعاشوں کے سرغنہ کی پوتی ہے۔"

"اور انہوں نے دس لاکھ ڈالرز تاوان کی ادائیگی کا مطالبہ کیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ اگر بہتر گھنٹوں کے اندر یہ رقم ادا نہیں کی تو لڑکی کو ماردیا جائے گا۔"

جوائس جب دفتر آئی تو اس نے ریمنڈ کو کاؤچ پر سوتے ہوئے پایا۔ وہ خودرات ویرینگ اسٹارڈسٹ میں جوا کھیلتی رہی تھی اور وہاں سے اٹھارہ سو ڈالرز جیت کر اٹھی تھی۔ اب وہ دفتر کے کچن میں بیٹھے کافی اور سینڈوچ سے ناشتا کررہے تھے۔

ریمنڈ نے کہا۔ "سائمن کو بالکل بھی اندازہ نہیں کہ ان لوگوں کو لڑکی کی اصلیت کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ یہ بات بہت خفیہ رکھی گئی تھی اور بہت کم لوگوں کو حقیقت کا علم تھا۔ وہ لڑکی یہی چاہتی تھی کہ خاص طور پر ویگاس میں کسی کو سائمن یا مارکس سے تعلق کے بارے میں معلوم نہ ہو لیکن اس کے باوجود کسی کو یہ پتا چل گیا۔"

"ہم اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتے ہیں؟"

"تم کیا سمجھتی ہو اگر ہم ان لوگوں کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو مارکس مقررہ وقت ختم ہونے سے پہلے ہی روزالی کو بچانے کے لیے نکل پڑے گا؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر ہم اس کا کام نہ کرسکے تو ہمیں زمین کے نیچے چھ فٹ سے زیادہ جانا پڑے گا؟"

"ہم نہیں صرف میں۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہتر میں سے نو گھنٹے گزر چکے ہیں، ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔"

☆☆☆

"تم ہمیں بتارہے ہو کہ اس کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔ میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔" بلی اینڈ دی بلونڈ کے بلی نے کہا۔ وہ یہ خبر سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ "کیا تم مجھ سے کوئی خطرناک مذاق تو نہیں کررہے مسٹر ریمنڈ؟"

"یہ سچ ہے۔" جوائس نے کہا۔ "کیا تم نے مس مارکس کی گمشدگی کے بعد اس کے بارے میں کوئی خبر سنی؟"

"تمہارا مطلب جولی سے ہے...... جولی جیمسن۔ میں اسے اسی نام سے جانتا تھا۔"

وہ ایلاموکے میزنائن فلور پر واقع سائمن کے جدید کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بلی کی غالباً نیند پوری

نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیوڈون اسے ہوٹل کی سولھویں منزل پر واقع دو بیڈ روم کے سوئٹ سے اٹھا کر لایا تھا جسے وہ اور جولی ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ لیو نے اسے لباس تبدیل کرنے کے لیے پانچ منٹ دیے اور خود اسے لے کر کانفرنس روم تک آیا۔ وہ آخری شو ختم کر کے بہ مشکل تین گھنٹے ہی سو سکا تھا۔

''ہاں۔ اس کا نام جولی جیمسن تھا اور میں پہلے بلی ولیمز کے نام سے انفرادی طور پر گایا کرتا تھا۔ پھر ہم نے اپنا گروپ بنالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گئے۔ میری ماں نے اپنے پسندیدہ جوگی کے نام پر ولیم بی رومالو رکھا اور اس طرح میں اپنا خاندانی پیشہ اختیار کرنے کے بجائے شو بزنس میں آ گیا۔ ماں نے میری حوصلہ افزائی کی اور فیصلہ کیا کہ مجھے رقص بھی سیکھنا چاہیے۔ وہ اپنے پسندیدہ اسٹارز فریڈ ایسٹیئر زاور جین کیلی کی طرح مجھے بھی رقاص اور گلوکار دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے مجھے اپنے خرچ پر ڈانس اسکول میں داخل کروادیا۔''

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' جوائس نے کہا۔ ''کیا تم نے گمشدگی کے بعد اس کے بارے میں کچھ سنا؟''

''ذرا صبر کرو۔ میں اسی جانب آرہا ہوں۔ ایک شو کے دوران میری اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میری پرفارمنس کی تعریف کی اور میرے ساتھ مل کر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا چہرہ اور جسم اتنا خوب صورت ہے کہ نہ جانے کتنے لوگ اس پر مرتے ہوں گے۔ پھر ہم نے بلی اینڈ دی بلونڈ کے نام سے جوڑی بنائی۔ آہستہ آہستہ ہماری مقبولیت بڑھتی گئی اور ہمارا ذکر اخباروں میں ہونے لگا پھر ہمیں ایلاموسے ایک بڑی رقم کی پیشکش ہوئی جسے انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے اس کی وجہ معلوم ہوگئی کہ وہ مسٹر مارکس کی پوتی ہے۔''

''تمہارے اور اس کے درمیان کوئی لڑکے لڑکی والا معاملہ تو نہیں ہے؟''

''ابھی تک تو ایسی بات نہیں مسٹر ریمنڈ۔ ویسے بھی جولی ایک شخص سے ملتی رہتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں کا تعلق کتنا پرانا ہے؟''

''وہ کون ہے؟''

''اس نے ایک دفعہ حادثاتی طور پر اس کا نام لے دیا تھا۔ شاید وہ جونی یا جیری تھا۔ وہ کوئی پروڈکشن منگر ہے۔''

''تمہیں جولی کا پتا معلوم ہے؟''

''وہ مغربی پٹی کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ میں خود کبھی وہاں نہیں گیا۔ پرسنل ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والی لڑکی تمہیں اس بارے میں بتاسکتی ہے۔'' وہ اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ ان دونوں نے بھاگ کر شادی کر لی اور اب کہیں ہنی مون منا رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کسی اور بھورے بالوں والی کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اگلی بار سرخ بالوں والی مل جائے۔'' اس نے ایک بار جوائس کو دیکھا اور بولا۔ ''تمہارے بال قدرتی سرخ ہیں۔ میں اس پر بھی تیار ہوسکتا ہوں۔ اگر تم میرے پیکیج کا حصہ بن جاؤ۔''

لیوڈون کانفرنس روم کے باہر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ''مسٹر سائمن تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ انہیں اپنے ہمراہ سائمن کے دفتر میں لے گیا۔

''تمہارے پاس میرے لیے کوئی خبر ہے؟'' وہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ''میری ابھی ابھی مسٹر مارکس سے بات ہوئی ہے۔ وہ کسی ایسی خبر کا منتظر ہے جس میں کسی پیش رفت کی جھلک نظر آئے۔''

ریمنڈ نے کہا۔ ''فی الحال کوئی خاص پیش رفت نہیں۔''

''مسٹر مارکس کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے میں یہ اطلاع انہیں نہیں دوں گا۔ بلی ولیمز کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ وہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جس سے یہ شبہ ہو کہ وہ بھی اس اغوا میں ملوث ہوسکتا ہے۔''

''نہیں۔'' ریمنڈ نے کہا اور پھر اسے بلی کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنادی۔

سائمن نے انٹرکام پر سیکریٹری سے کہا کہ وہ پرسنل ڈیپارٹمنٹ سے اس کی بات کروائے۔ رابطہ کرنے پر اس نے ان سے جولی کے گھر کا پتا معلوم کیا اور ایک کاغذ پر لکھ کر ریمنڈ کو پکڑا دیا۔ ''تم نے مجھے اتنا تو بتادیا کہ پہلی بات کیا معلوم ہوئی۔ اب یہ بوائے فرینڈ کی کہانی سامنے آ گئی ہے۔ گو کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی نیا مرد آ گیا ہے لیکن یہ جونی والی بات میرے لیے ایک خبر ہے۔ تم اس معاملے سے کس طرح نمٹو گے یا میں لائن کو یہ ذمے داری سونپ دوں؟''

''مسٹر ڈون کی شہرت کو دیکھتے ہوئے اسے اس معاملے میں شامل کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔'' ریمنڈ نے کہا۔ ''جوائس میرے ساتھ رہے گی۔ اسے شہر کے تمام جوئے

خالوں اور علاقوں سے واقفیت ہے۔"

"عمدہ سوچ ہے مسٹر ریمنڈ۔ کیا تم اس سے متفق نہیں ہو لائن؟"

لائن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور تم یہ بھی نہیں چاہو گے کہ مسٹر مارکس کو مایوس کرو۔ کیا تمہیں یہ بات یاد ہے؟"

"میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں۔"

جولی کا اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی، گھنٹی بجائی۔ چند مرتبہ جولی کا نام لے کر اسے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک پرکشش عورت اسے دیکھ کر رک گئی اور بولی۔ "تمہاری قسمت خراب ہے مسٹر۔ جولی کو یہاں سے گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی۔"

"کتنا وقت گزر گیا؟"

"چار دن پہلے میں اس کے ساتھ آخری بار صبح کی سیر کے لیے گئی تھی۔ جب میں اسے لینے آئی تو وہ موجود نہیں تھی۔ تب میں نے اس کے بارے میں پریشان ہونا شروع کر دیا اور میں پولیس کو فون کرنے ہی والی تھی۔" پھر وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم جولی کے دوست ہو یا کچھ اور؟"

"میں جولی کا کزن ہوں اور چھٹیاں منانے نیویارک سے آیا ہوں۔ میرا ارادہ اسے اچانک حیران کرنے کا تھا۔ شاید وہ بھی چھٹیوں پر چلی گئی ہے اس نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ جس کے بارے میں اس نے مجھے لکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نام جرنی ہے اور وہ کوئی گلوکار ہے۔"

"بہت خوب۔ وہ آئے دن دوست بدلتی رہتی ہے۔ اس کا نیا دوست فریڈی ہے۔ فریڈی ناش۔ وہ ایک کار ڈیلر ہے۔"

ریمنڈ دفتر پہنچا تو جوائس وہاں پہلے سے موجود کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریمنڈ نے فریج سے مشروب کی بوتل نکالی اور انتظار کرنے لگا کہ کب اس کی گفتگو ختم ہوتی ہے۔ جوائس نے ریسیور رکھ کر پوچھا۔ "کچھ معلوم ہوا؟"

"پڑوس میں رہنے والی ایک عورت نے بتایا ہے کہ اس نے جولی کو چار دن سے نہیں دیکھا۔ وہ اچانک ہی غائب ہو گئی۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس کا موجودہ

بھکاری

ایک بھکاری بینک کے دروازے سے اندر داخل ہونا چاہتا تھا گارڈ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"بینک میں بھیک مانگنا منع ہے۔"

بھکاری۔ "بے وقوف آدمی آگے سے ہٹ جاؤ میں یہاں بھیک مانگنے نہیں آیا بلکہ اپنے اکاؤنٹ میں دس ہزار روپے جمع کروانے آیا ہوں۔"

ٹرک کا نمبر

دو بیوقوف عجائب گھر دیکھنے گئے۔ انہوں نے ایک انسانی ڈھانچا دیکھا جس پر 1580 لکھا ہوا تھا۔

ایک بیوقوف اپنے ساتھی سے بولا۔ "لگتا ہے کہ یہ کسی ٹرک کے نیچے آ کر مرا تھا۔"

دوسرا بیوقوف ہنس کر بولا۔ "ظاہر ہے تبھی تو ٹرک کا نمبر لکھا ہوا ہے۔"

سالگرہ

ایک بھکاری نے ایک کوٹھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے پر ایک عورت آئی تو بھکاری نے اس سے کہا۔

"کیا آپ کے ہاں ایسے شخص کے لیے جس نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا کیک مل سکے گا۔"

عورت نے کہا۔ "کیک کیوں..... روٹی سے کام نہیں چلے گا؟"

بھکاری۔ "بیگم صاحبہ! آج میری سالگرہ ہے۔"

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

خوش خبری

"ممی! آپ کو معلوم ہے اس سالگرہ پر میں آپ کو کیا تحفہ دے رہی ہوں؟"

"نہیں بیٹی! مجھے تو معلوم نہیں۔ کیا دے رہی ہو؟"

"اچھا سا ایک ٹی سیٹ۔"

"لیکن ایک بہت اچھا ٹی سیٹ تو ہمارے گھر میں بھی موجود ہے نا؟"

"اب نہیں ہے مما جی۔ وہ مجھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ ابھی ابھی جو زوردار آواز آپ نے سنی تھی۔ وہ اسی کے گرنے کی تھی۔"

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی)

دوست فریڈی ناش ہے جو تقریبات کے لیے گاڑیوں کا انتظام کرتا ہے۔"

"فریڈی ایک ہفتے پہلے تک وہاں جز وقتی کام کررہا تھا۔اس نے اپنا معاوضہ وصول کیا اور چلا گیا۔ایسی ہی ایک کہانی میں نے پہلے بھی سنی تھی۔جس جگہ وہ پہلے کام کرتا تھا وہاں بھی اس کی یہی حرکتیں تھیں۔"

"ہم ایک بار پھر بند گلی میں آگئے ہیں۔" ریمنڈ نے کہا۔"کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ مختلف لوگ ایک ہی جانب اشارہ کررہے ہیں کہ جولی اپنے کسی دوست کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔کوئی یہ نہیں کہہ رہا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔"

"ممکن ہے کہ ناش نے ہی اسے اغوا کیا ہو؟"

"وہ ایسا کیوں کرے گا جبکہ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ جولی کا مارکس سے خونی رشتہ ہے اور وہ اس کے خاص بندے تک سائمن کی زیرِ نگرانی رہ رہی ہے۔"

"ممکن ہے کہ قربت کے لمحات میں جولی کی زبان سے یہ بات نکل گئی ہو۔"

"زیادہ امکان یہ ہے کہ کسی نے ان لوگوں کو معاوضہ دے کر یہ کام کروایا ہے اور اس کے بعد تمہیں روزالی کی تلاش پر لگا دیا۔"

"تمہارے خیال میں وہ کون ہوسکتا ہے؟"

"مجھے سائمن پر شبہ ہے۔اگر روزالی مردہ حالت میں ملتی ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔اس نے تمہیں اس کی تلاش پر لگا دیا کیونکہ تمہیں ایک کامیاب سراغ رساں سمجھا جاتا ہے لیکن تم نے نہ صرف اسے بلکہ ایلی مارکس کو بھی مایوس کیا۔"

"فرض کرلیتے ہیں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں کیونکہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور بہتر گھنٹے کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔"

"ایک بار پھر بلی ولیمز سے شروع کرتے ہیں۔کوشش کرو کہ وہ اپنے بجائے جولی کے بارے میں باتیں کرے۔میں نے پہلی ملاقات میں یہ تاثر لیا ہے کہ جب تم نے اسے جولی اور مارکس کے بارے میں بتایا تو وہ بالکل حیران نہیں ہوا۔"

☆☆☆

ریمنڈ نے لاس ویگاس میں پولیس کے ان سراغ رسانوں میں ایک سے بلی ولیمز کے گھر کا پتا اور فون نمبر معلوم کیا جو اب بھی اس سے رابطے میں تھے اور کسی معاوضے کے بغیر اس کی مدد کرتے تھے۔چھٹی گھنٹی پر آپریٹر نے بتایا کہ مسٹر ولیمز ایلا موکنچنے والے ہیں جہاں وہ اپنے نئے شو کے بارے میں بات کریں گے۔جب وہ دونوں ریزورٹ میں پہنچے تو وہ انہیں لاؤنج یا اپنے سوئٹ میں نظر نہیں آیا البتہ لائن کا فون آگیا۔اس نے کہا۔"مسٹر سائمن تمہاری گرل فرینڈ اور تم سے ابھی اور اسی وقت اپنے دفتر میں ملنا چاہتے ہیں۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو لائن۔" ریمنڈ نے غصے سے کہا۔"وہ میری پارٹنر ہے۔مسئلہ کیا ہے؟"

"غیر ضروری سوالوں میں وقت ضائع نہ کرو۔تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مسئلہ کیا ہے۔" یہ کہہ کر لائن نے سلسلہ منقطع کردیا۔

وہ دونوں سائمن کے ایگزیکٹو سوئٹ میں داخل ہوئے تو وہاں ایلی مارکس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ریمنڈ نے اسے فوراً پہچان لیا کیونکہ وہ پولیس کی ملازمت کے دوران اس کی کچھ تصویریں دیکھ چکا تھا۔اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔وہ ایک کونے میں چمڑے کے قیمتی صوفے پر بیٹھا مشروب کے گھونٹ لے رہا تھا۔اس کے برابر ہی میں سائمن ایک آرام دہ کرسی پر مؤدبانہ انداز میں موجود تھا۔

"مسٹر مارکس کو ہیلو کہو۔" سائمن نے کہا۔"یہ تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔"

مارکس کچھ خوش نظر نہیں آرہا تھا۔ریمنڈ نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔مارکس نے کہا۔"میں نہیں سمجھتا کہ تم نے اب تک روزالی کو تلاش کرلیا ہوگا۔ورنہ میں یہاں نہ آتا۔تم دونوں بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ کیا ہورہا ہے۔تم کہاں تک پہنچے؟"

اس کی مضحکہ خیز شخصیت دیکھ کر ریمنڈ کو یقین نہیں آیا کہ یہ شخص جرائم کی دنیا کا بادشاہ ہوسکتا ہے۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، مارکس کی آواز گونجی۔"مجھے جواب چاہیے۔ابھی اور اسی وقت۔"

ریمنڈ کچھ ہچکچایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ جوائس اس کی طرف سے جواب دینے والی ہے تو اس نے اسے روک دیا اور بولا۔"جو تم سنو گے، وہ تمہیں پسند نہیں آئے گا مسٹر مارکس۔"

"کیا تم ذہن پڑھنا بھی جانتے ہو؟ جو کہنا ہے، کہہ ڈالو۔میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں روزالی کا پتا لگانے میں ابھی تک کامیاب نہ ہوسکا۔ہمارے پاس بہ مشکل ایک دن اور رہ گیا ہے۔مجھے شک ہے کہ تمہاری خواہش کے مطابق نتیجہ نہیں دے سکوں گا۔"

"اس کی مراد ہم سے ہے۔" جوائس بولی۔ "ہم اکٹھے کام کرتے ہیں۔"

"تم چپ رہو جوائس۔" ریمنڈ نے اسے منع کیا۔

"ہرگز نہیں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پر سارا الزام آئے۔"

"بہت ہو چکا۔" مارکس بولا۔ "کس نے الزام کی بات کی خاتون؟ کیا میں نے کچھ کہا؟"

"نہیں لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام کس طرح ہوسکتا ہے۔ میں بھی تمہیں کہانیاں سنا سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے لوگوں سے سن رکھا ہے ریمنڈ کہ تم پہلے پولیس کی ملازمت اور اب پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر بھی ایماندار اور اپنے کام سے مخلص ہو۔ جس کا ثبوت تم نے اس وقت بھی سچ بول کر دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے کہو۔" ریمنڈ نے کہا۔ "میں سن رہا ہوں۔"

"اب بہتر گھنٹے کی مدت ختم ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ آج صبح مجھے شکاگو سے اغوا کرنے والے کا فون موصول ہوا۔ اس نے کہا کہ کل صبح سورج نکلنے پر یہ مدت ختم ہوجائے گی اور بتایا کہ روزالی کے بدلے ایک ملین ڈالرز کب اور کہاں دیے جائیں گے۔ میں نے فوراً ایک پرائیویٹ جیٹ طیارہ چارٹر کیا اور یہاں چلا آیا۔ اب مجھے تم دونوں کی ضرورت ہے تاکہ میری پوتی کو بحفاظت واپس لاسکو۔"

"ہماری ضرورت...... وہ کیسے مسٹر مارکس؟"

"غور سے سنو نک، انہیں بتاؤ۔"

سائمن نے جو منصوبہ بتایا، وہ بہت ہی سادہ تھا۔ وہ مقررہ وقت اور مقام پر اغوا کنندہ سے ملتے۔ ان کے عقب میں سائمن اپنی سیاہ لیموزین میں ہوتا جو اس کے ذاتی استعمال میں رہتی تھی اور وہ اسے اغوا کنندہ کی گاڑی سے کافی فاصلے پر کھڑی کرتا۔ مارکس کو اس کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا جاتا تاکہ وہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔ لین دین کا کام ریمنڈ اور جوائس کرتے۔ جب ریمنڈ کو اطمینان ہوجاتا کہ روزالی بالکل محفوظ ہے تو وہ رقم دینے سے پہلے اسے جوائس کے ساتھ لیموزین کی جانب روانہ کردیتا اور اس کے بحفاظت کار تک پہنچنے کے بعد رقم کا بیگ اغوا کنندہ کے حوالے کرکے خود بھی واپس آجاتا۔

"بالکل سادہ۔ ایک دو تین کی طرح۔" سائمن نے کہا۔ "تم نے فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں دیکھا ہوگا جیسے ایک کیک کا ٹکڑا۔"

ریمنڈ اس سے متفق نہیں تھا اور اس نے اپنے خدشات کا اظہار کردیا۔

"آخر کیوں؟ تم مجھے کوئی ایک مثال بتاؤ۔" سائمن نے کہا۔

"یہ فطرت کا قانون ہے مسٹر سائمن۔ جس کام کی ابتدا غلط ہو، اس کا انجام بھی غلط ہوتا ہے۔ میں نے بھی ٹیلی ویژن اور فلموں میں یہی دیکھا ہے۔"

مارکس بولا۔ "اس کی بات میں وزن ہے نک۔ اسے باقی بات بھی بتاؤ۔"

"ہم بالکل سیدھا کام کررہے ہیں۔ اس میں کوئی رسّی یا پھندا نہیں لگا ہوا ہے اور نہ ہی روزالی کے لیے کوئی خطرہ ہے۔ وہ ہماری اکلوتی متاع ہے اور یہ رقم مرغیوں کی خوراک جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم اسے بہت کم وقت میں دوبارہ حاصل کرلیں گے۔"

"لیکن اگر انہوں نے کوئی دھوکا دیا تو کیا ہوگا؟ اگر روزالی ہمیں خستہ حالت میں ملی یا......"

"خدا نہ کرے۔" مارکس اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"یا وہ مسلح ہو اور پیچھے ہٹتے ہوئے ہم دونوں پر فائر کھول دے پھر رقم کے بیگ سمیت کار میں بیٹھ کر فرار ہوجائے۔"

"وہ زیادہ دور نہیں جاسکے گا۔" سائمن نے کہا۔ "لائن گاڑی کی عقبی سیٹ پر مسٹر مارکس کے ساتھ ان کی حفاظت کے لیے مسلح بیٹھا ہوگا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ کارروائی کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہوگے؟"

"یہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔" ڈون نے کہا۔ "اس نے ایک دفعہ مجھ پر ریپ کا کیس ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"

"تمہاری قسمت اچھی تھی جو بچ گئے اور دوبارہ مجھ سے واسطہ نہیں پڑا۔" ریمنڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم لوگ کس بحث میں الجھ گئے۔ تمہیں صرف آنے والی صبح پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمیں مسٹر مارکس کی حفاظت اور روزالی کو محفوظ طریقے سے گھر لانا ہے۔"

"نک! تمہیں میرا کتنا خیال ہے؟" مارکس نے کہا۔ "تم ہمیشہ میری بھلائی کے لیے سوچتے ہو۔"

"یہ میرے فرائض میں شامل ہے کہ اپنے لوگوں کے معاملات دیکھوں۔"

"یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری وفاداری کو تسلیم نہیں کروں گا یا تمہیں اس کا انعام نہیں ملے گا۔"

"مجھ پر تمہارا اعتماد ہی سب سے بڑا انعام ہے۔"

ریمنڈ بولا۔ "مداخلت کی معذرت چاہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اب مجھے اور جوائس کو چلے جانا چاہیے تاکہ ہم بھرپور نیند لینے کے بعد صبح تازہ دم ہو کر اپنے مشن پر جاسکیں۔"

"مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹا پہلے یہاں پہنچ جانا۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔" سائمن نے کہا۔

اگلے روز صبح سائمن کی لیموزین مقررہ مقام پر سورج نکلنے سے آدھ گھنٹا پہلے پہنچ گئی۔ اس وقت دور پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے عقب سے سورج کی نارنجی شعاعیں نمودار ہو رہی تھیں اور جنگلی پرندوں کی آوازیں فضا میں نغمہ بکھیر رہی تھیں۔ اس مقام کی نشاندہی کے لیے کیکٹس کی جھاڑیوں پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ یہ جگہ مرکزی شاہراہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک دو رویہ پرانی سڑک پر واقع تھی اور دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ لاس ویگاس کے جرائم پیشہ گروہ اس جگہ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ سائمن کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی ایک براؤن اور سفید رنگ کی اسٹیشن ویگن آتی ہوئی دکھائی دی اور ان سے پچاس گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس نے تین مرتبہ ہارن دیا۔ سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے پھر ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے مزید تین دفعہ ہارن بجایا۔ اس دوران گاڑی کا انجن چلتا رہا۔

"نک! پُرسکون ہو جاؤ۔" مارکس نے کہا۔ "وہ یہاں آگئے ہیں۔ یہ زیادہ اہم ہے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ہونٹوں کو اس طرح حرکت دینے لگا جیسے زیرلب کوئی دعا پڑھ رہا ہو۔ پھر اس نے ریمنڈ اور جوائس کو اس گاڑی کی جانب روانہ کر دیا۔ وہ سب لیموزین کے ساتھ کھڑے انتظار کرتے رہے۔ تبھی ایک شخص کرسلر کی پچھلی سیٹ سے باہر آیا اور بولا۔ "مال لے آئے؟"

ریمنڈ نے بیگ اوپر کر کے دکھایا تو وہ بولا۔ "یہ مجھے دے دو۔"

"نہیں۔" ریمنڈ بولا۔ "پہلے تم لڑکی دکھاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ صحیح سلامت ہے یا نہیں۔ جب وہ آدھا راستہ طے کر کے میرے پاس آجائے گی تو میں یہ رقم تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس شخص نے ایک ہاتھ بڑھا کر گاڑی میں سے لڑکی کو باہر آنے میں مدد دی جسے دیکھتے ہی ریمنڈ نے پہچان لیا۔

"تم ٹھیک تو ہو مس مارکس؟" ریمنڈ نے پوچھا۔

اس لڑکی کے بند ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تمہیں کسی قسم کی تکلیف یا درد تو محسوس نہیں ہو رہا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا تو ریمنڈ نے جوائس کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھنے لگی۔ ریمنڈ نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ احمق کوئی بھی غلط حرکت کرسکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ ایسی صورت میں کیا کرنا ہے؟"

"ایک قدم پیچھے رہ کر تمہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کروں گی یا اس کے علاوہ کوئی پلان بی بھی ہے؟"

"تم تیزی سے زمین پر لیٹ کر فائرنگ سے بچنے کی کوشش کرو گی اور میں اپنے ریوالور سے انہیں جواب دوں گا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ وہ میرے ٹخنے سے بندھا ہوا ہے۔"

"ہمیں مسلح ہونے کے لیے نہیں کہا گیا تھا۔" جوائس نے کہا۔

"ہمیں مرنے کے لیے بھی نہیں کہا گیا تھا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا۔ ورنہ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میری کمر سے کولٹ کوبرا بندھا ہوا ہے۔" وہ احمق کسی ڈانسر کے انداز میں چلتا ہوا آیا۔ اس نے معقول لباس پہن رکھا تھا اور حلیے سے اپنے گروپ کا سرغنہ لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو رعب دار بنانے کے لیے کلارک گیبل جیسی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔

ریمنڈ کا خیال تھا کہ وہ جولی کا بوائے فرینڈ فریڈی ناش ہے لیکن اس وقت ان کے درمیان ایسا کوئی تعلق نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے مضبوطی سے جولی کی کلائی پکڑ رکھی تھی اور وہ اسے حقارت آمیز انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"بیگ کھولو تاکہ میں ایک نظر دیکھ سکوں۔" اس احمق نے کہا۔

"پورے دس لاکھ ہیں۔ تم اپنے اطمینان کے لیے انہیں گن سکتے ہو۔" ریمنڈ نے بیگ کھول کر رقم دکھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر مارکس عزت دار شخص ہیں۔ انہوں نے مجھے پوری رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مجھے ان کے کہے ہوئے پر اعتماد ہے۔ تم ان کی پوتی کو لے جاسکتے ہو۔"

جوائس نے جولی کی کمر کے گرد بازو ڈالا اور اسے

لے کر تیزی سے لیموزین کی جانب چل دی۔ مارکس پہلے ہی کار سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ہلایا اور ایک منٹ بعد وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔ وہ بے تحاشا اس کا ماتھا چوم رہا تھا۔ وہ احمق تیزی سے اسٹیشن ویگن تک پہنچا اور کود کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی اور اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے ریت اڑاتا ہوا چلا گیا۔

جب ریمنڈ لیموزین کے پاس پہنچا تو مارکس نے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں نے میرے لیے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے اور میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"تم اسے یاد رکھنے کے لیے زیادہ دیر نہیں رہو گے اور نہ ہی اس سے کسی کو کوئی فرق پڑے گا۔" سائمن نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے تم تینوں ہی ایک ساتھ اس دنیا سے جاؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ اور لائن لیموزین سے باہر آ گئے۔ انہوں نے اپنے ریوالور کا رخ مارکس اور دوسرے افراد کی جانب کر لیا تھا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو نک؟"

"تمہیں کیا لگ رہا ہے ایلی؟ میں اسی دن کے لیے دعائیں کر رہا تھا اور مجھے صرف صحیح وقت اور موقع کا انتظار تھا۔ روزالی کے اغوا سے یہ موقع مل گیا اور آج ہم یہاں موجود ہیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تمہاری لاش دریافت ہو گی تو میں بہت بڑے پیمانے پر تمہاری تجہیز و تکفین کا اہتمام کروں گا جو اس سے پہلے ویگاس میں کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔"

"میں نے سنا تھا کہ تم میرے بارے میں غلط باتیں کر رہے ہو لیکن مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ مجھے اتنے سالوں سے تم پر بھروسا ہے اور میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ بیٹے جیسا سلوک کیا......"

"لیکن میں کبھی تمہارا وارث نہیں بن سکا جو کہ میں چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے ویگاس تک محدود کر رکھا ہے جبکہ میں شکاگو کا کنٹرول چاہتا ہوں تاکہ تمہارے بعد میں پورے آپریشن کی نگرانی کر سکوں۔"

"تم جاننا چاہتے ہو کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ میں بتاتا ہوں کیونکہ یہ عہدہ تمہاری شخصیت اور خواہشات کے مقابلے میں بہت بڑا تھا۔ لہٰذا میں نے تمہیں ویگاس بھیج دیا اور تمہیں ایلاموو دے دیا۔ یہ کوئی سزا نہیں تھی بلکہ تمہارا ٹیسٹ تھا کہ تم ثابت کر سکو کہ میں غلط ہوں۔"

اللہ کے نام پر

ایک فقیر ایک پھل والے کے پاس گیا اور کہا کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ پھل والے نے فقیر کو گھور کے دیکھا اور پھر ایک گلا سڑا آم اٹھا کر فقیر کی جھولی میں ڈال دیا۔ فقیر کچھ دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر پھل والے کو بیس روپے نکال کر دیے اور کہا بیس روپے کے آم دو۔ دکاندار نے دو بہترین آم اٹھائے اور لفافے میں ڈال کر فقیر کو دے دیے۔ فقیر نے ایک ہاتھ میں گلا سڑا آم اور دوسرے ہاتھ میں بہترین آموں والا لفافہ لیا اور آسمان کی طرف نگاہ کر کے کہنے لگا...... دیکھ اللہ انسان کی سوچ۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنی پسندیدہ چیز اللہ کے رستے میں قربان نہ کرے۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

"اور تم غلط تھے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"نہیں۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ میں بالکل صحیح تھا۔"

"بہرحال تمہیں مارنے کا اعزاز میرے حصے میں آئے گا جبکہ لائن بقیہ لوگوں کو دیکھے گا۔ ٹھیک ہے لائن! میں گنتی شروع کرتا ہوں۔"

"وہ ابھی دو تک ہی پہنچا تھا کہ لائن نے فائر کر کے اسے گرا دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔"

"اس غدار کی یہی سزا ہونی چاہیے۔" مارکس نے کہا۔ "شکریہ لائن۔"

لائن نے جواب میں سر خم کیا پھر اپنی گن کا رخ ریمنڈ اور جوائس کی طرف کر لیا جنہوں نے بدحواسی میں اپنے ہتھیار نکال لیے تھے اور اسے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔

"تم دونوں گولی چلانے سے پہلے ہی مار دیے جاؤ گے۔" لائن نے کہا۔ "مسٹر مارکس! تم کیا چاہتے ہو...... میں ان کے ساتھ کیا کروں؟"

"ابھی کچھ نہیں لائن۔ تم اپنی گن ہٹالو۔ تم دونوں سے بھی میں یہی کہوں گا۔ آج کافی شوٹنگ ہو چکی ہے۔" پھر

وہ روزالی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم تو ٹھیک ہو میری شہزادی؟“

”بالکل ٹھیک۔ سب کچھ ایسے ہی ہوا جیسا تم چاہتے تھے؟“

”ہاں۔“

”میرا کام کیسا رہا؟“

”میں اس سے بہتر کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ تم نے اپنا کردار بڑی خوبی سے نبھایا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔ تم لوگ کیا باتیں کررہے ہو؟“ ریمنڈ بولا۔

مارکس اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ نک کے دل میں کیا خواہش مچل رہی ہے۔ اس نے لوگوں سے کہنا شروع کردیا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اس لیے میری جگہ اس جیسے کسی شخص کو لایا جائے جس کے پاس تنظیم کو چلانے کے لیے نئے اور تازہ خیالات ہوں تاکہ گروہ کے ہر رکن کی آمدنی میں خاطرخواہ اضافہ ہوسکے۔ وہ اس معاملے میں اس حد تک بے پروا ہوگیا کہ ان لوگوں کے سامنے بھی برملا اس بات کا اظہار کرنے لگا جو میرے وفادار تھے۔ ان میں لائن بھی تھا۔ یہ سب لوگ اس کے بارے میں مجھے پوری طرح باخبر رکھے ہوئے تھے.... بالآخر میں نے اس کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس طرح کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔

”بہت سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں روزالی کے جھوٹے اغوا کا خیال آیا۔ اسی طرح میں نک کو گھیر سکتا تھا لیکن اس کے لیے روزالی کو رضامند کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے اسے فون کرکے پوری صورتِ حال بتائی اور کہا کہ کیا وہ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے۔ اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا کہ وہ ہرحال میں میرا ساتھ دے گی۔“

روزالی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا.... اور اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”میں ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گی۔“

مارکس نے کہا۔ ”نک کو اس ڈرامے میں اس وقت شامل کیا گیا جب میں نے اس سے کہا کہ وہ روزالی کی بازیابی کے لیے تم سے رابطہ کرے۔ اس کے علاوہ اس نے لائن سے یہ بھی کہا کہ اگر میں تاوان کی ادائیگی کے لیے وگاس آیا تو یہ اس کے لیے اچھا موقع ہوگا کہ میں واپس نہ جاسکوں اور وہ میری جگہ لے سکے۔ اس وقت تک میں دوسرے لوگوں کو تیار کرچکا تھا کہ وہ تمہیں بھٹکاتے رہیں اور تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے۔“

”بوائے فرینڈ فریڈی ناش کے بارے میں کیا کہو گے؟ کیا وہی اغوا کنندہ کا رول پلے کررہا تھا؟“

”ہاں۔ روزالی کا کہنا ہے کہ اس نے پہلی بار کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ اب وہ کیا کرے گا اور وہ دس لاکھ ڈالرز کہاں استعمال کرے گا جو میں نے شادی سے پہلے ہی اسے تحفے میں دے دیے۔“

”اسٹیشن ویگن کا ڈرائیور کون تھا؟“

”بلی ولیمز۔ میں نے اس کے سامنے دو راستے رکھے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ ناش کو دی جانے والی رقم میں حصے دار بن جائے یا مرکزی ہال میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ اس نے مرکزی ہال کا انتخاب کیا۔“

”مجھے اس سے یہی توقع تھی۔“ روزالی نے کہا۔

مارکس بولا۔ ”اگر تمہارے سوالات ختم ہوگئے ہوں مسٹر ریمنڈ تو لائن ہمیں واپس ایلامو لے جائے گا۔ اس سے پہلے کہ کوئی لیموزین کی غیر موجودگی پر توجہ دے۔“

”میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے مسٹر مارکس۔ کیا تم واقعی یہ توقع رکھتے ہو کہ میں اور جوائس اس معاملے میں خاموش رہیں گے۔ ہم دونوں نے لائن کو قتل کرتے دیکھا ہے۔ اسے اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔“

جوائس بولی۔ ”چپ ہوجاؤ ریمنڈ۔ تم بہت زیادہ بولتے ہو۔“

لائن غرایا۔ اس نے اپنی گن نکالی اور ریمنڈ کو نشانے پر لے لیا۔

”ابھی نہیں لائن۔“ مارکس نے کہا۔ ”اپنی قبر کھودنے سے پہلے اچھی طرح غور کرلو مسٹر ریمنڈ۔ تم لائن کو گرفتار اور اس پر قتل کا الزام عائد کرنا چاہتے ہو۔ تم نے روزالی اور مجھ پر بھی انگلی اٹھائی ہے۔ ہم دونوں ذاتی دفاع کا حق استعمال کرسکتے ہیں۔ البتہ لائن پر مقدمہ چلے گا اور تم دونوں بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں کہ تم میرے اس سوال کا کیا جواب دیتے ہو۔“

جوائس کو سب نے نظرانداز کردیا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کولٹ کوبرا نکالا اور لائن کے سینے میں چار گولیاں اتار دیں جس کی آنکھوں میں زمین پر گرنے سے پہلے حیرت اتر آئی تھی۔ وہ اپنے باپ کے قاتل کو پہچان گئی تھی۔

دل کشا بائی کی لال حویلی لکھنؤ کی گنجان آبادی میں بالکل نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ اس لال حویلی کے بارے میں طرح طرح کی روایات مشہور تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دل کشا نے اپنی نوعمری میں ہی بھرا میلا چھوڑ کر اپنی جمع پونجی سے یہ لال حویلی خریدی جبکہ یہ بات زیادہ مشہور تھی کہ لکھنؤ کے ایک دل پھینک نواب نے دل کشا کو بازارِ حسن سے نکال کر یہ حویلی تحفے میں دی لیکن نواب صاحب دل کشا کو اپنانے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

لال حویلی سے متعلق مختلف اندازے اپنی جگہ لیکن دل کشا کا اپنا دامن ہر قسم کی تہمت سے بالکل پاک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج بھی دل کشا کی لال حویلی شرفاء کی ادبی محفلوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ لکھنؤ کی دم توڑتی ادبی تہذیب کم از کم لال حویلی میں ضرور دکھائی دیتی تھی۔ ہر مہینے لال حویلی میں مشاعرے کی محفل برپا ہوتی تھی جس میں لکھنؤ کے کہنہ مشق اور

عشق کی منازل طے کرنے والے دو عاشقوں کی دلگداز روداد

منزل ملے نہ ملے مگر کبھی کبھی ادھورے سفر میں بھی زندگی مکمل ہو جاتی ہے اور پھر انہی رستوں پر قدرت دوسرے مسافر کو لے آتی ہے تاکہ مطلوبہ منزل کا ہدف پورا ہو سکے۔ کچھ ایسا ہی کھیل مقدر نے یہاں بھی کھیلا جب اس کے عشقِ ناتمام کی تمام آزمائشیں پوری ہو گئیں اور اگلے مسافر نے سفر مکمل کر کے منزلِ مقصود پالی تو قدرت کی مصلحت سمجھ میں آگئی۔

عشقِ ناتمام

ظفر اقبال ظفر
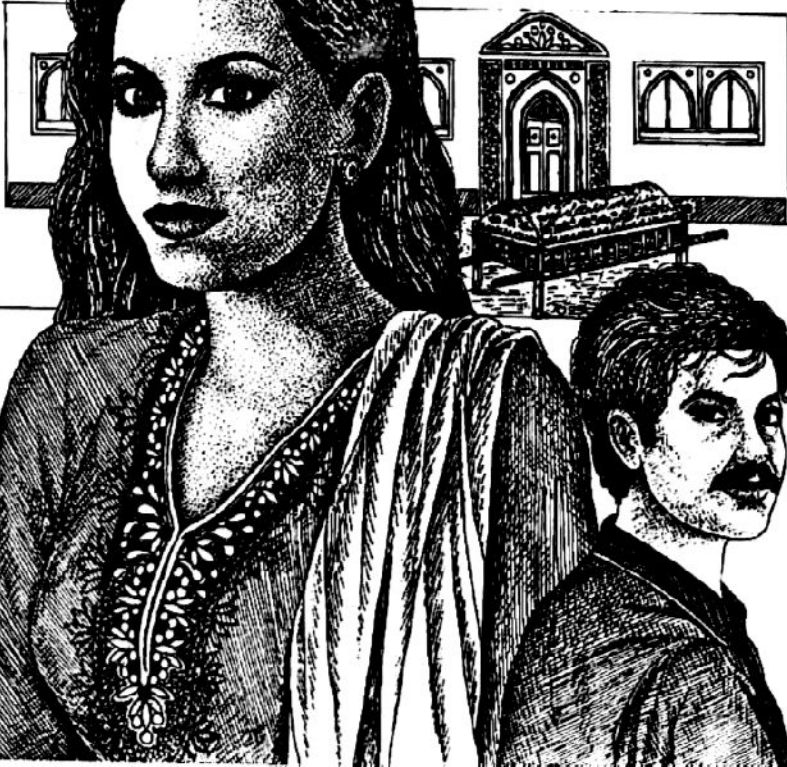
نئے شاعروں کے علاوہ سامعین شرفا بھی اچھی بھلی تعداد میں باقاعدگی سے آتے اور دل کشا کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے تھے۔

دل کشا کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پُرکشش اور جاذب نظر نقوش کے ساتھ ساتھ نسوانی حسن سے بھرپور دل کشا اپنے انداز واطوار اور شائستہ گفتگو سے لکھنؤ کے طلسماتی حسن کی چلتی پھرتی تصویر اپنی عمر سے آدھی نظر آتی۔ شہر کے بعض نوابین اور دل جلے شعرا صرف اور صرف دل کشا کی قربت میں کچھ وقت گزارنے کی خاطر لال حویلی میں آیا کرتے تھے۔

دل کشا کے رویے میں سردمہری نہیں تھی تاہم رکھ رکھاؤ اور بے حجابی ... میں بھی دل کشا کا محتاط تکلف کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ ہنس کر لوگوں سے بات ضرور کرتی تھی لیکن اس کی ہنسی میں بے تکلفی اور وارفتگی کی دعوت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے دل کشا کی محفل اور قربت میں گھنٹوں بیٹھنے والے شرفا محتاط ہی رہا کرتے تھے پھر ایک دن اس حویلی میں ہو بہو دل کشا کی شکل و شخصیت کو دیکھ کر شور ہوا۔

وہ نوجوان آج تیسری بار اس محفل میں شریک ہوا تھا۔ اکیس یا بائیس سال کا گورا چٹا، تیکھے ناک نقشے والا نوعمر لڑکا، خاموش طبع، اجنبی اور نامانوس، شاعر تو وہ تھا نہیں کہ اسے اظہار کا موقع دیا جاتا بس چپ چاپ سامعین میں بیٹھا اپنی بولتی آنکھوں سے دل کشا کے سراپا کا طواف کرتا رہتا تھا اور ساتھ ہی اس کا عکس بھی تلاش کرتا رہتا تھا۔ جسے اچانک اس نے پہلی بار ہی محفل میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا لیکن وہ پھر نظر نہ آئی۔ اس نوعمر لڑکے کی اجنبیت پہلی بار تو کئی لوگوں کو کھٹکی لیکن جب آج تیسری بار بھی وہ محفل میں خاموشی کے ساتھ شریک ہوا تو دوسرے حضرات نے اس پر توجہ دینی چھوڑ دی لیکن آج بھی ایسا ہو رہا تھا کہ دل کشا کو سرتاپا اپنے وجود میں اس لڑکے کی نگاہیں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

مشاعرے میں سب سے زیادہ داد حاصل کرنے والے شاعر کی غزل کو محفل کے اختتام پر دل کشا ترنم کے ساتھ پیش کیا کرتی تھی اور یہ لمحہ قیامت کا ہوتا تھا۔ دل کشا کا پُرسوز اور دل گداز ترنم اور گائیکی کا انداز حاضرین کو یوں مسحور کر دیتا کہ سماعتوں میں نقرئی گھنٹیوں کی مدھر آواز اور سینوں میں بے ترتیب سانسوں کا ہیجان برپا ہونے لگتا تھا۔

اس نوجوان کا معمول سب سے مختلف اور کسی قدر حیرت انگیز تھا۔ دل کشا جونہی غزل سرا ہوتی وہ ایک سنسناتی ہوئی بھرپور نظر دل کشا کے سراپا پر ڈالتا اور خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ شاید آج بھی ایسا ہی ہوتا لیکن دل کشا نے غزل چھیڑنے سے پہلے معمول سے ہٹ کر حاضرین کو ایک پُراسرار حیرت میں ڈال دیا۔

"اجنبی لڑکے! محفل کے اختتام تک آپ تشریف رکھیے گا، ہم تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

دل کشا نے اس مختصر اعلان کے بعد اپنا ترنم بکھیرنا شروع کر دیا۔

آج حاضرین کی کیفیت جدا تھی۔ سب کے دلوں میں اجنبی نوجوان کھٹک رہا تھا۔ عام حالات میں حاضرین کی توجہ ایک پل کے لیے بھی دل کشا کے ترنم سے نہیں ہٹتی تھی لیکن آج حاضرین عدم دلچسپی کا شکار ہو رہے تھے۔ دبی دبی سرگوشیاں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں سوالوں کا تحیر، دلوں میں اجنبی نوجوان سے متعلق رقابت کی آنچ ...... اور پھر اس کے ساتھ ہی دل کشا نے غزل مکمل کر ڈالی۔

محفل اختتام کو پہنچی۔ حاضرین ایک ایک کر کے اجنبی لڑکے کو رشک وحسد سے دیکھتے اور گھورتے روانہ ہو گئے۔

اب لال حویلی میں دل کشا تھی اور وہ اجنبی نوجوان۔

☆☆☆

فیض آباد لکھنؤ کے رکاب گنج میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے پھیل گئی کہ نواب صباحت علی خان اور رئیسہ بیگم میں علیحدگی ہو گئی ہے۔ ہر طرف کوچہ و بازار میں چہ میگوئیاں تھیں کہ جتنی عجلت میں نواب صباحت علی خان اور رئیسہ بیگم کی شادی ہوئی اتنی ہی جلد یہ ناتا ٹوٹ گیا۔

نواب صباحت علی خان ابھی عمر کے بائیسویں سال میں تھے کہ انہیں ان کی خالہ زاد رئیسہ بانو کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا اور یوں رئیسہ بانو بہت ہی کم عمری میں رئیسہ بیگم بن کر نواب صباحت علی خان کے ہاں آ گئیں۔ فیض آباد کے نوابوں کی روایت سے ہٹ کر یہ پہلی شادی تھی جو اتنی کم عمری اور عجلت میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے انداز میں کی گئی تھی۔ بعض لوگوں کو دبے دبے انداز میں کہتے سنا گیا کہ نواب صباحت علی خان کو شاعری کا روگ لگ گیا تھا۔ شاعری میں تشنہ تخلص فرمانے لگے تھے۔ ان کا اکثر آنا جانا شاعروں کی محفل میں تو تھا ہی اب سنا تھا کہ مشتری بائی کے کوٹھے پر بھی جانے آنے لگے ہیں۔

خاندان والوں نے کسی اندیشے کے پیش نظر انہیں رئیسہ بیگم کی زلفوں سے باندھ ڈالا۔ نواب صباحت علی خان تشنہ اور رئیسہ بیگم کا ازدواجی سمجھوتا ہوئے ایک سوا سال ہی ہوا تھا کہ خدا نے انہیں بیٹے کی دولت سے بھی نواز دیا۔ اس مضبوط رشتے

کے باوجود اور بیٹے کی ولادت کے تین سال بعد نواب صباحت علی خان اور رئیسہ بیگم میں علیحدگی ہو گئی۔

خاندان میں دونوں طرف سے بھونچال آ گیا۔ رئیسہ بیگم کم عمری میں طلاق کا ٹیکا ماتھے پر سجائے اور اپنے تین سالہ بیٹے کو سینے سے لگا کر دوسرے پورشن میں چلی گئیں اور نواب صاحب نے خاندان والوں کی طعن و تشنیع اور لعنت ملامت سے یکدم بے نیاز ہو کر چپ سادھ لی اور گوشہ نشین ہو گئے۔

تین ماہ کی قلیل مدت میں نواب صباحت علی خان تشنہ اپنی تنہائی اور گوشہ نشینی کے سبب نجانے کس موذی مرض میں مبتلا ہوئے کہ عمر کے چھبیسویں سال میں دنیا چھوڑ گئے۔ ان کی بس ایک ہی وصیت تھی کہ انہیں دفنانے سے پہلے ان کا جنازہ چند ثانیے کے لیے مشتری بائی کے کوٹھے تک ضرور لے جایا جائے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ رکاب گنج کی ایک نیم تاریک سی گلی میں ایک سال خوردہ اور خستہ حال مکان کے سامنے نواب صباحت علی تشنہ کی میت کچھ دیر کے لیے رکھی گئی اس دوران میں گلی میں کھلنے والی کوٹھے کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا۔ لوگوں نے چند سسکیوں کی آواز سنی اور کھڑکی بند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی نواب صباحت علی تشنہ کا جنازہ اٹھا لیا گیا۔

☆☆☆

لال حویلی کے دیوان خانے سے اتر کر جانے والوں کے قدموں کی چاپ معدوم ہوئی تو دل کشا نے نوجوان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

''آپ متواتر ہماری محفل میں آنے لگے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سخن فہمی کا ذوق آپ کو لال حویلی میں کھینچ کر لاتا ہے؟''

''جی نہیں، ہمیں شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''تو پھر، آپ کے یہاں آنے کا مقصد؟'' اب دل کشا کے سوال میں حیرت بھی شامل تھی۔

''ہمیں شاعروں کی صحبت نہیں بلکہ ایک انجانی سی کشش لال حویلی میں کھینچ کر لاتی ہے۔'' نوجوان نے بلاخوف و تردد سادگی سے اپنے دل کی سچائی اگل دی۔ دل کشا نے نوجوان کی سادگی اور جرأت کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

''اچھا! تو آپ ہماری قربت کے لیے یہاں آتے ہیں، مگر کیوں؟''

''ہم نے فیض آباد کے گلی کوچوں سے لے کر بازار و گلزار تک آپ کے حسن اور شائستگی کے چرچے سنے ہیں، سوچا ذرا ہم بھی تو دیکھیں وہ کون ہے جس کی بازگشت پورے لکھنؤ میں سنائی دیتی ہے۔''

نوجوان نے متانت کے ساتھ اپنی کتاب دل کا ایک اور ورق الٹ دیا۔ دل کشا نے نوجوان کے چہرے پر وارفتگی کے رنگ بکھرتے دیکھے اور ذرا توقف کے بعد بات آگے بڑھائی۔

''ہمارا نام تو آپ نے لکھنؤ کے کوچہ و بازار میں سن لیا، کیا آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گے؟''

''ہمیں نواب فراست علی خان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔''

جواب پا کر دل کشا کی نظریں نوجوان کے سراپا کا طواف کر کے اس کے چہرے کے نقوش میں بھٹکنے لگیں۔

''آپ ہمیں اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟''

نوجوان کے استفسار سے بے نیاز دل کشا کی نگاہیں نواب فراست علی کی صورت میں شناسائی کی الجھی ہوئی ڈور کا سرا تلاش کر رہی تھیں پھر دل کشا نے اپنے لبوں پر گہری مسکراہٹ سجا کر سوال کیا۔

''فراست علی! آپ کا شغل کیا ہے؟ روایتی نواب زادوں کی طرح پر آسائش فراغت یا کچھ اور؟''

''ہم بی۔ اے کر چکے ہیں، کچھ اور ضروری تعلیم کے بعد کلکٹر بننا چاہتے ہیں کیونکہ کلکٹر بننا ہمارا خواب ہے۔''

فراست علی کے جواب سے ارادے کی پختگی جھلک رہی تھی۔ ''اور آپ کا ہماری لال حویلی میں آنا جانا کب تک رہے گا؟'' دل کشا نے سوال کیا۔

''جب تک ہم آپ کے تعلق کو کوئی نام نہ دے دیں۔''

''کیا مطلب؟'' دل کشا فراست علی کے جواب پر چونک اٹھی۔ دل کشا کا دل سینے میں لرز اٹھا تھا۔

''ہم آپ سے رشتہ جوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کی محبت میں پناہ لینا چاہتے ہیں دل کشا۔''

فراست علی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

لال حویلی کے دیوان خانے میں دل کشا کی ہنسی کھنکھنائی اور فراست علی کے سینے میں جلترنگ بج اٹھے۔

''آپ نے تو ہم سے رشتہ جوڑنے کا فیصلہ یوں سنا ڈالا جیسے یہ سب کچھ آسان ہو۔''

''ہم شاعر تو نہیں کہ محبت کا اظہار کرنے کے لیے دل آویز لفظوں کا سہارا لے سکیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ سچا ہو تو مشکلات آسان ہو جایا کرتی ہیں۔''

''ہم آپ کے جذبۂ محبت کی قدر کرتے ہیں لیکن پہلے آپ اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنا کلکٹر بننے کا خواب تو پورا

کرلیں۔"
دل کشا نے اپنے لہجے کی نمی سے فراست علی کے اندر کی آنچ کو سرد کرنا چاہا۔ "تعلیم تو آپ سے تعلق داری کے بعد بھی مکمل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی کلکٹر بننے کا خواب پورا کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ہم اس خواب کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں جو خواب ہمیں لال حویلی کے زندانِ عشق کا اسیر کیے جا رہا ہے۔"
فراست علی نے بمشکل تمام اپنا آخری جملہ مکمل کیا۔ اب اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی تھی۔ شاید اندر سے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو چکا تھا اور یوں لگتا تھا کہ دل کشا نے اگر اسے چھوا تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔
"نواب فراست علی! آپ جانتے ہیں لال حویلی میں رہنے والی دل کشا کی شہرت کا تعارف حسن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔"
"ہمیں معلوم ہے، لکھنؤ کے کوچہ و بازار آپ کو دل کشا بائی کے نام سے جانتے ہیں۔"
"تو پھر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود آپ......؟" دل کشا کا یہ سوال تیکھا بھی تھا اور مشکل بھی۔
"شاید آپ کو اس دل کی تشنگی کا اندازہ نہیں...... یہ تو جس کے حصے میں آ جائے وہی جانتا ہے۔"
"لیکن عمروں کا فرق جانتے ہی ہیں آپ؟"
دل کشا نے ماہ و سال کے تفاوت کا سہارا لیا۔ جانے وہ فراست علی کی باتوں سے کیا مطلب اخذ کر رہی تھی۔
"عمروں کا فرق ہم اور آپ تو سمجھتے ہیں لیکن کیا کیجیے یہ دل اس فرق کو نہیں مانتا۔ ہماری عمر بائیس سال ہے۔"
فراست علی کا جواب سن کر دل کشا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اب دل کشا کے لیے جواب کی مشکل آ پڑی تھی۔ ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش تھا۔
"ٹھیک ہے نواب فراست علی! آپ کے جذبۂ عشق سے سچائی کی خوشبو آ رہی ہے۔ ہم دل سے آپ کی محبت کے معترف ہو گئے ہیں۔ لال حویلی کے در و دیوار آپ کی برات کے لیے چشم براہ ہوں گے۔"
دل کشا کی گھنی پلکوں کے سائبان حجابانہ انداز میں گرے تو فراست علی کی روح میں مسرت اور خوشی کا موسم گل ایک نئی زندگی اور تازگی کی نوید لے کر آ گیا۔
"لیکن ہماری رضامندی مشروط ہے۔"
دل کشا کی مترنم آواز نے فراست علی کی سانسوں میں آزمائش کی ایک نئی گرہ لگا دی۔
"کیسی شرط؟" فراست علی خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے تڑپ اٹھا۔
"جب تک آپ کلکٹر بننے کا خواب تعبیر نہیں کر لیتے ہم اپنی لال حویلی میں آپ کے لیے سراپا انتظار رہیں گے۔"
دل کشا نے پلکیں اٹھائیں تو جھیل جیسی گہری آنکھوں میں لہجے کی لنگر انداز کشتیوں پر انتظار کے بادبان پھڑ پھڑا اٹھے۔
فراست علی نے بادبانوں کی پھڑپھڑاہٹ اپنے کانوں سے سنی اور محبت کی گٹھڑی میں متاعِ اعتماد سمیٹتے ہوئے یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔
"دل کشا! ہم آپ کی شرط ضرور پوری کریں گے۔ کلکٹر بننے کے خواب کی تعبیر پا کر ایک دن ضرور لوٹیں گے۔ آپ اپنے عہد پر قائم رہیے گا۔"
پھر فراست علی نے چاروں طرف گھوم کر لال حویلی کے در و دیوار کو دیکھا جیسے در و دیوار کو گواہی کا پندار سونپا جا رہا ہو۔ نواب فراست علی نے ایک بھرپور الوداعی نظر ڈالی پھر خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دیوان خانے سے اترنے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔
دل کشا بائیس برس کے نواب فراست علی خان کو جاتے دیکھ کر خود بھی بیس سال پیچھے ماضی کے تنگ و تاریک رستوں سے گزر کر رکاب گنج کے اس خستہ و تاریک کوٹھے تک پہنچ گئی جہاں ایک مشتری بائی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول کر کسی کی راہ دیکھا کرتی تھی۔

☆☆☆

نواب صباحت علی خان نوخیز جوان تھے۔ لکھنؤ کی ادب پرور فضاؤں نے انہیں شاعری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ انتہا درجے کے حساس طبیعت تھے۔ اپنے احساسات اور جذبات کو لفظوں کی پوشاک پہنانے کا فن اچھی طرح سیکھ چکے تھے۔ نواب صباحت علی خان سے صباحت تشنہ بننے میں عمر رائگاں نہیں گئی تھی۔
نواب صباحت تشنہ نے آج اپنی غزل سنائی تو مشتری بائی نے خلافِ معمول داد نہیں دی، بس یک ٹک وہ نواب صباحت کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔
"کیا ہوا مشتری بائی؟ آج آپ کے اس سکوت کا ہم کیا مطلب لیں؟" نواب صباحت نے الجھتے ہوئے پوچھا۔
"نواب صباحت علی خان! اب آپ ہمارے کوٹھے پر آنا جانا چھوڑ دیجیے۔" مشتری بائی نے ٹھہرے سکون سے جواب دیا۔
"آخر کیوں؟"

"نواب صاحب! ہم طوائفوں کے کوٹھوں پر لکھنؤ کے شرفاء اپنی اولاد کو تہذیب و شائستگی کے آداب سکھانے کے لیے تو بھیج سکتے ہیں لیکن......"

"لیکن کیا؟" نواب صباحت علی کی بے چینی بڑھ گئی۔

"لیکن شرفاء کسی آداب سکھانے والی طوائف کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کرتے۔"

"ہم ان شرفاء سے مختلف ہیں مشتری بائی، ہم ہر قیمت پر......"

"لیکن آپ کی تو شادی ہو گئی ہے۔ رئیسہ بیگم نے آپ کا گھر آباد کر دیا ہے۔" مشتری بائی نے تڑپ کر جواب دیا۔

"ہم اپنی کشتیاں جلا کر آئے ہیں مشتری بائی۔ ہم نے اپنے آباد گھر کو رئیسہ بیگم کے وجود سے خالی کر دیا ہے۔ اپنے دل کی طرح۔"

"کیا مطلب؟" مشتری بائی کی آنکھوں میں حیرت کی طغیانی آ گئی۔

"ہم نے رئیسہ بیگم کو طلاق دے دی ہے اور اپنا بچہ بھی ان کی آغوش میں ڈال دیا ہے۔"

مشتری بائی کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں لہرائیں اور دل میں ایک کسک نے سر پٹخنا شروع کر دیا۔

"نواب صاحب! کاش آپ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ملے ہوتے تو آپ کو ایک قیامت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔"

"قیامت! کیسی قیامت؟" نواب صباحت علی کی بے چینی ان کے ذہن و دل میں ایڑیاں رگڑنے لگی۔

"آپ نے رئیسہ بیگم اور اپنے لخت جگر کو جس کی خاطر چھوڑ دیا، میں کچھ دن پہلے ہی خاموشی سے اس کے ہاتھ پیلے کر کے اس کوٹھے سے رخصت کر چکی ہوں۔"

"کیا...... مشتری بائی کیا کہا آپ نے؟" دنیا جہان کا کرب نواب صباحت علی کی سماعت سے گزر کر دل میں جمع ہو گیا تھا۔

"ہم نے جو کچھ کہا ہے، درست کہا ہے نواب صباحت!" مشتری بائی کے ضبط نے آخری ہچکی لی اور آنسو ہمت کی دیواروں میں شگاف ڈال کر باہر آ نکلے۔

نواب صباحت علی نے چند ثانیے مشتری بائی اور کوٹھے کی خاموش دیواروں کو گھورا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے نیچے اترنے والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس زمانے میں عورت کے لیے دوسری شادی کا تصور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی رئیسہ بیگم کے لیے نوعمری میں علیحدگی کا زخم سوہان روح بن چکا تھا۔ وہ اپنے ماضی کو ایک بھیانک خواب کی طرح بھلا دینا چاہتی تھیں۔ اب رئیسہ بیگم کی کل کائنات ان کا بیٹا تھا۔ رئیسہ نے فراست علی کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ فراست علی خود بھی حد درجہ ذہین، سنجیدہ مزاج اور کم گو واقع ہوا تھا۔

وہ خوبصورتی اور مردانہ وجاہت میں بالکل نواب صباحت علی پر گیا تھا۔ اس کی تعلیم کا سفر بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نجانے کیوں رئیسہ بیگم نے صباحت علی خان کی ایک خواہش کو اپنے دل میں جگہ دی تھی اور یہ خواہش صباحت علی خان کی امانت کے طور پر رئیسہ بیگم کے دل میں پروان چڑھ رہی تھی۔

فراست علی کی پیدائش پر نواب صباحت علی خان نے واجبی طور پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور بے ساختہ ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا تھا۔

"رئیسہ بیگم! ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا پڑھ لکھ کر کلکٹر بنے۔"

پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ کچھ ہی عرصہ بعد نواب صباحت علی اور رئیسہ بیگم میں علیحدگی ہو گئی۔

رئیسہ بیگم نے دکھوں کی گود میں صباحت علی کے اس جملے کی پرورش کی تھی۔ اب رئیسہ بیگم کو اپنے خواب کی تعبیر ملنے ہی والی تھی۔

☆☆☆

دل کشا کو فراست علی سے کیا ہوا عہد بھولا نہیں تھا۔ چار سال بعد بھی فراست علی کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کی بازگشت دل کشا کو لال حویلی میں سنائی دیتی تھی۔

ان چار برسوں میں فراست علی کبھی بھولے سے بھی لال حویلی کی طرف نہیں آئے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا کوئی رابطہ بحال رکھا تھا۔ اس کے باوجود دل کشا کو یقین تھا کہ فراست علی اپنے عشق کی خودسری سے مجبور ہو کر ایک دن لال حویلی میں ضرور آئیں گے۔

مٹھی میں دبی ریت کی طرح سے تین برس روز و شب کی گردش میں بکھر گئے۔ ان چار برسوں میں بہت کچھ بدل گیا اور بہت کچھ بگڑ گیا۔

دل کشا بیمار رہنے لگی۔ ادبی محفلوں کی رونقیں دم توڑ گئیں۔ شاعروں اور سخن فہم حضرات کی آمد کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گئی۔ لے دے کر لال حویلی میں بیماری کے سبب گری پڑی دل کشا تھی یا حویلی کی پرانی خادمہ شکورن۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا ملنے والا آ جاتا تو کچھ دیر کے لیے لال حویلی کے آباد ہونے کا احساس جاگ اٹھتا تھا، ورنہ دن رات خاموشی اور سناٹے میں ڈوبی

لال حویلی بھوت بنگلا دکھائی دینے لگی تھی۔
فراست علی نے مقابلے کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ اب انٹرویو کے مرحلے سے کامیاب ہوکر نتیجے کا انتظار تھا۔ کلکٹر بننے کا خیال محض اس وجہ سے فراست علی کو سرشار کیے جارہا تھا کہ کلکٹر بن کر اپنے خواب کو پالینے کی شرط پوری ہوجائے گی اور لال حویلی کے درودیوار محبت بھرے انداز سے فراست علی کا استقبال کریں گے۔
اب نواب فراست علی کے کلکٹر بننے کی خبر رکاب گنج فیض آباد سے ہوتی ہوئی پورے لکھنؤ کے قریہ بازار تک پھیل گئی۔
رئیسہ بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کے رخسار پر خوشی کے آنسو پھیل رہے تھے۔ رئیسہ بیگم نے فراست علی کی تعلیم وتربیت کا حق ادا کردیا تھا۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کیں اور تصور میں کچھ فاصلے پر کھڑے نواب صباحت علی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”دیکھ لیجیے نواب صباحت! ہم نے فراست علی کی پرورش اپنی گود میں کی اور آپ کی خواہش کو ہم نے اپنے دل کی آغوش میں پروان چڑھایا۔“
اور پھر اچانک گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ رئیسہ بیگم کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔
”نہیں نہیں، ہم نے شاید غلط سنا ہے۔“
”آپ نے ٹھیک سنا ہے امی جان! ہم نے اپنی زندگی کا ساتھی چار برس پہلے چن لیا تھا اور اس نے ہم سے شادی کرنے کے لیے کلکٹر بننے کی شرط عائد کی تھی۔“
”تو کیا فراست! آپ نے ہمارے خواب کو تعبیر نہیں کیا، اپنی محبت کو حاصل کرنے کی شرط کی تکمیل کی ہے؟“
رئیسہ بیگم کا وجود کانچ کے برتن کی طرح کرچی کرچی ہورہا تھا۔
”فراست! کاش آپ ہمیں چار سال پہلے ہی اپنے فیصلے کی سولی پر لٹکا دیتے۔“ رئیسہ بیگم کے چہرے پر شدید کرب کے باعث تناؤ سا آگیا تھا۔ ”آخر وہ ذات شریف کون ہے جسے حاصل کرنے کے لیے آپ چار سال تک پہاڑ جیسی راتیں آنکھوں میں کاٹ کر پڑھتے رہے۔“
رئیسہ بیگم کی آنکھوں سے حسرت کا ناسور رسنے لگا تھا، زندگی بہہ رہی تھی۔ ”امی جان! ہم سہرا باندھ کر لال حویلی جائیں گے دل کشا کی بیٹی کو اپنانے کے لیے۔“
”فراست......“
رئیسہ بیگم کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر رئیسہ بیگم دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام کر اپنے قدموں میں گرتی چلی گئیں۔

☆☆☆

رئیسہ بیگم کی تدفین کے بعد کئی دنوں تک فراست علی اپنی سوگوار حویلی میں کھویا کھویا سا ڈھن اور بجھا بجھا سا دل تھامے درودیوار سے نظریں چراتا رہا۔ آنکھوں کے چشمے خشک ہوئے تو اس کے عشق بلاخیز نے سرابھارلیا۔
جونہی لکھنؤ کی شام رکاب گنج میں گہری ہوئی، فراست علی کے قدم لال حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔
تیسری دستک پر حویلی کا دروازہ کھلا۔ فراست علی نے ڈیوڑھی عبور کرکے بالاخانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ دیوان خانے میں پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا۔ پوری حویلی کا سناٹا دیوان خانے کے درودیوار پر کچھ زیادہ ہی ناچتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔
دل کشا کی خواب گاہ سے پرانی خادمہ شکورن باہر آئی۔
”نواب صاحب! ادھر آیئے، بیگم صاحبہ اندر ہیں۔“
فراست علی شکورن کے پیچھے چلتے ہوئے اندر خواب گاہ میں داخل ہوگئے۔ بستر پر دل کشا کا مٹھی بھر وجود ایک ڈھانچے کی طرح سمٹا ہوا پڑا تھا۔
”شکورن! ہماری طرف سے پھولوں کے ہار نواب فراست علی کے گلے میں ڈالو“ دل کشا کی نقاہت بھری آواز ابھری۔
فراست بت بنا یک ٹک دل کشا کو دیکھے جارہا تھا۔ شکورن نے کھونٹی پر سلیقے سے لٹکے تازہ پھولوں کے ہار فراست علی کے گلے میں ڈال دیے۔
فراست علی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دل کشا کی جانب بڑھا اور قریب پہنچتے ہی دل کشا کا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔
”تین برسوں میں، صرف چار برسوں میں یہ کیا ہوگیا ہے؟“
فراست علی کے آنسو جیسے حلق میں اترنے لگے تھے۔
شکورن سر جھکائے خواب گاہ سے نکل گئی۔
”مبارک ہو آپ کو فراست علی! آپ نے کلکٹر بن کر ہماری شرط پوری کردی۔“ دل کشا کے بے رنگ چہرے پر پھیکی مسکراہٹ کا کرب سلگ اٹھا۔
”لیکن دل کشا! ہمیں یوں لگتا ہے، جیسے ہم آپ کی شرط پوری کرکے بھی ہار گئے ہیں۔ ہم کیوں ہار گئے؟ ہم تو.... اپنے خواب کو جیتنا چاہتے تھے۔“
فراست علی کی آواز اب آنسوؤں میں بھیگ چکی تھی۔
”فراست علی! یہ اچھا ہوا کہ ہمیں جگر کے سرطان نے اس حال کو پہنچا دیا۔ اگر ہم اس حال کو نہ بھی پہنچتے تو آپ سے شادی ہرگز نہیں کرسکتے تھے۔“
”کیا...... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ......شادی اور آپ

سے...... ہم تو آپ کے عکس کے دیوانے ہوئے تھے...... پہلی بار اس محفل میں ہم نے ہو بہو آپ کا عکس دیکھا تھا۔"

"کیا......؟" اس بار دل کشا کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ "اوہ ...... تو قدرت کو بھی وہی منظور تھا جو ہم نے سوچا تھا۔"

"کیا مطلب...... آپ نے کیا سوچا تھا اور قدرت کو کیا منظور تھا......؟" فراست علی کی آنکھوں میں اس بار نمایاں طور پر الجھن نظر آ رہی تھی۔ "ہم تو سمجھے تھے شاید آپ ہمارے دل کا حال جان چکی ہیں۔"

"حال تو ہم تمہارے والد محترم صباحت تشنہ کا بھی جان چکے تھے اور اسی لیے ہم ان سے دور بھی ہو گئے تھے کہ ہم ان کے قابل نہ تھے اور اسی لیے ہم نے آپ سے بھی اسی لیے عہد کیا تھا تا کہ آپ اپنا خواب پانے کی جستجو میں کلکٹر بن کر ہمارے صباحت تشنہ کی خواہش پوری کر سکیں۔"

"آپ کے صباحت تشنہ؟ دل کشا! آپ ہمارے والد نواب صباحت علی تشنہ کو کیسے جانتی ہیں؟" دل کشا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ فراست علی کے دل و دماغ میں سوالات کی آندھیاں چل رہی تھیں۔

"فراست علی! سنیے، ہم نے آج تک اپنے عشق ناتمام کا دکھ کسی اور کو نہیں سنایا لیکن یہ دکھ آپ کو سنانا ضروری ہے۔"

فراست علی کی آنکھوں سے زندگی بہہ رہی تھی اور چہرہ سراپا سوال بنا ہوا تھا۔ "سنیے فراست علی! ہم نے اور نواب صباحت علی نے ایک دوسرے سے عشق کیا تھا لیکن تقدیر کا ستم یہ تھا کہ ہم نے مشتری بائی کی گود میں ایک کوٹھے پر پرورش پائی تھی اور صباحت علی نواب زادے تھے۔ پھر وہی ہوا جو لکھنؤ کی تہذیب میں ہوتا آیا ہے۔ نواب صباحت علی کے خاندان والوں نے ان کی شادی رئیسہ بیگم سے کر ڈالی کہ کہیں کوٹھے پر بیٹھنے والی دل کشا ان کی بہو نہ بن جائے......"

دل کشا کی آنسوؤں میں رندھی آواز دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگی۔ شاید سانسوں کی ڈوری الجھنے لگی تھی۔

"اس کے بعد کیا ہوا دل کشا! خدا کے لیے کہیے۔" فراست کا دل سینے کے اطراف میں سر پٹک رہا تھا۔

"پھر...... مشتری بائی نے ایک دن خاموشی سے ایک دولت مند رئیس کے ساتھ ہماری شادی کر کے اس کوٹھے سے رخصت کر دیا۔ خدا نے نواب صباحت علی کو ایک بیٹا دے کر عمر بھر کی تنہائی دے دی اور ادھر ہمیں بھی خدا نے ایک بیٹی عطا کر کے زندگی بھر کے لیے لال حویلی کے زندان میں قید تنہائی دے دی۔"

دل کشا کی سانسیں اب اکھڑنے لگی تھیں۔

"خدا کے لیے بولتی رہیے دل کشا۔ عشقِ ناتمام کی حکایت پوری کیجیے ورنہ ہم مر جائیں گے۔"

"ہم اپنا عہد نبھانا چاہتے ہیں فراست علی۔ ہم اپنے عشق ناتمام کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔" اسی دوران کمرے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

فراست علی نے پلٹ کر دیکھا تو ہو بہو دل کشا کی تصویر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ فراست علی کی آنکھوں میں ایک دم سے جیسے دیے روشن ہو گئے...... فراست علی نے لڑکی کے سراپا پر نظر ڈالنے کے بعد پُرتجسس نگاہوں سے دل کشا کو دیکھا۔ "ہم نے انہی کا تو انتظار کیا ہے دل کشا بیگم...... فقط ایک نظر دیکھنے کے بعد۔"

"دیکھ لیجیے فراست علی! ہماری بیٹی دل ربا ہو بہو ہماری تصویر ہے۔ ہم نے اپنی بیٹی کو لکھنؤ کے بڑے تعلیمی ادارے سے تعلیم دلائی ہے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ لال حویلی میں نہیں رکھا تا کہ ہماری شہرت کا سایہ اس کے لیے رسوائی کا داغ نہ بن جائے۔ بس کبھی کبھی ہم سے ملنے آتی جاتی رہی ہے۔"

فراست علی کی آنکھوں میں زندگی پگھل کر بہہ جانے کے لیے بے تاب تھی۔ دھیرے سے کہا۔

"فقط ایک نظر دیکھ لینے کے بعد یہ تصور کبھی ہماری یادوں سے اوجھل نہ ہو سکا۔"

دل ربا نے قریب آ کر دل کشا کا نحیف اور کمزور ہاتھ تھام لیا تھا۔ خواب گاہ میں گہرا سکوت تھا۔ "فراست علی! دل کشا تو صباحت علی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں۔ آپ دل ربا کو اپنا لیجیے کہ اس نے نہ تو کوٹھے پر پرورش پائی ہے اور نہ ہی ہم نے اسے جاہل رکھا۔ ہم نے اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے۔ شاید اس ملاپ سے ہمارا عشقِ ناتمام مکمل ہو جائے۔"

دل کشا نے دل ربا کا ہاتھ فراست علی کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اور ہاں سنیے! نواب صباحت علی کی وصیت کے مطابق ان کا جنازہ مشتری بائی کے کوٹھے پر ٹھہرایا گیا تھا۔ ہماری وصیت بھی سن لیجیے۔ ہمارا جنازہ نواب صباحت علی تشنہ کی حویلی کے دروازے پر ضرور ٹھہرایا جائے۔"

لکھنؤ کی ایک اداس شام تھی۔ لال حویلی سے دل کشا کی میت اٹھائی گئی۔ رکاب گنج کے کوچہ و بازار سے ہوتی ہوئی دل کشا کی میت کو نواب صباحت علی مرحوم کی حویلی کے سامنے ذرا دیر ٹھہرایا گیا۔

ایک عشقِ ناتمام گہری ہوتی ہوئی شام میں مکمل ہو گیا تھا۔

محفلِ شعر و سخن

❁ محمد نصیر شہیر اسامہ سیال...... سکھر

بہت جدا ہے اوروں سے میرے درد کی کیفیت
زخم کا کوئی نشان نہیں درد کی کوئی انتہا نہیں

❁ ماہین فاطمہ ...... حجرہ شاہ مقیم

دشتِ احساس کی حدت بھی قیامت ہے ندیم
کچھ ضروری تو نہیں پاؤں میں چھالے رکھنا

❁ داؤد اشفاق ...... حجرہ شاہ مقیم

مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آئے ہیں اکثر دعاؤں میں

❁ ملائکہ حریم ...... حجرہ شاہ مقیم

بکھر گئی ہے نگاہوں کی روشنی ورنہ
نظر نہ آئے وہ، اتنا تو فاصلہ بھی نہیں

❁ عبدالجبار رومی انصاری ...... قصور سٹی

اک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

❁ وزیر محمد خان ...... بفل ہزارہ

زباں خاموش ہوجائے تو چہرہ بات کرتا ہے
محبت کے مراحل میں عجب موسم گزرتا ہے

❁ شائلہ سلمان ...... کورنگی، کراچی

احساس نہ اخلاق محبت نہ تعلق
اس دور کے انسان ہیں پتھر کے مجسمے

❁ ریاض بٹ ...... حسن ابدال

تُو نے الفاظ کی تاثیر کو پرکھا ہی نہیں
نرم لہجے سے تو پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

❁ انعم کمال ...... حیدرآباد

اے دوست میرے ظرفِ محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تبسم بنی ہوئی

❁ ادریس احمد خان ...... ناظم آباد کراچی

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

❁ میمونہ اصغر ...... گلستانِ جوہر، کراچی

بدن میں سانس لیتی ہے
کہیں پوشیدہ رہتی ہے
محبت مر نہیں سکتی
کہیں خوابیدہ رہتی ہے

❁ زرین آفریدی...... حیدرآباد

تو بھی نہ مل سکا ہمیں، عمر بھی رائگاں گئی
تجھ سے تو خیر عشق تھا، خود سے بڑے گلے رہے

❁ اوشا راٹھی ...... مٹھی، سندھ
ہم محبتوں کے فقیر ہیں صاحب
عشق کے دارالامان میں رہتے ہیں

❁ شبانہ حسن...... لاہور کینٹ
دھڑکن کو اس کی یاد سے تحریک مل رہی ہے
چاہت اگر سزا ہے تو پھر ٹھیک مل رہی ہے

❁ محمد شہباز اکرم نوئی ...... پاکپتن شریف
یہ جو عین، یہ جو شین، یہ جو قاف کرتا ہے
یہ لاحق جس کو ہو جائے اسے برباد کرتا ہے

❁ محمد آذین رضوان...... کورنگی، کراچی
ہم اپنی وضع کے بندے ہیں ہم اپنی طرز کے انساں ہیں
جو زیست مرا سرمایہ تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے
ہم ہار کے بھی کب ہارے ہیں تو جیت کے بھی کب جیتا ہے
کچھ مان ترا بھی رکھنا تھا یوں جیت کے بازی ہاری ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی...... خانیوال
میرا وجود بھی کسی صحرا سے کم نہ تھا
اس کی سپردگی میں بھی وحشت بلا کی تھی

❁ فضا شاہ ...... ماڈل ٹاؤن
منایا نہ گیا مجھ سے اس بار ......
اس کی ناراضگی میں آباد کوئی اور تھا

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... فورٹ عباس
گھٹا کا فیض ہے ارضِ وطن میں جاری و ساری
بہار رنگ و بو ہے دامنِ فطرت کی گل کاری

❁ شیزا کاشان ...... کراچی
گھر کی ویرانی تو میرا ساتھ دینے سے رہی
میں کھلونے لے بھی آؤں گا اگر بازار سے
خواہشِ تعمیر اندیشوں کی زد میں آ گئی
بے گھری کی رسم چل نکلی درودیوار سے

❁ زہیر احمد...... کراچی
میں پانی اور آگ سے اک مٹی کی خاطر لڑتا تھا
اور یہ دونوں عالم کھیل تماشا دیکھنے والے تھے

❁ خفیق حسین ...... نیو کراچی
پہلے دنیا میرے قاتل سے ملائے گی تجھے
پھر مجھے تیرے بہانے سے بلائے جائے گی

❁ جاوید اختر رانا...... پاکپتن شریف
یہ سلوٹیں نہیں ہیں جبیں کی اٹھان پر
لمحے نقوش چھوڑ گئے ہیں چٹان پر

❁ اشفاق شاہین...... لاہور
ہجر کی مسافت میں خواب تک نہیں آتے
بارشوں کے موسم میں دھوپ کم نکلتی ہے

❁ محمد زریان سلطان...... اردو بازار کراچی
ہم پیار محبت والے ہیں اور امن بھی ہم کو پیارا ہے
یہ نیزے کیوں لہراتے ہو یہ جنگ ہے کیوں تلواروں کی
حالات تھے الجھے الجھے سے تحریر عجب تھی چہروں پر
کردار تھے ایک ہی جیسے سب ہم سنتے کیا بنجاروں کی

❁ طارق کلیرا...... تحصیل نور پور تھل
اپنے دروازے پہ دستک دوں گا تیرے نام کی
خود سے ملنے کا یہی اک راستہ رہ جائے گا

❁ محمد صفدر معاویہ...... خانیوال
یہ کیا کہ انجمنِ ذات ہی میں روشن ہو
کبھی تو شمع ہواؤں کے روبرو کی جائے

❁ ناہید یوسف...... اسلام آباد
ہر اک قدم پہ بجھے ہیں سحر کے اندیشے
یہ تیرگی کا سفر ختم ہو تو سو لیں گے

❁ اسد خان...... مانسہرہ
آئینے سے یونہی تیری آنکھ گر لگ جائے گی
دیکھنا پھر تجھ کو تیری ہی نظر لگ جائے گی
آج بھی آئے گا تو یا پھر وہی کل کی طرح
پاؤں میں مہندی ترے اے فتنہ گر لگ جائے گی

❁ لیتی وکیل ...... کوئٹہ
بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزشِ غم سے
مگر منہ سے نہ اف ہم غمگساروں میں نکالیں گے

❁ عظیم احمد...... جھنگ سٹی
چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا
کہ پہنچی اڑ کے نہ مجھ تک گلِ چمن کی بو
ہوا ہے صورتِ دیوانہ گل گریباں چاک
چمن میں لائی صبا کس کے پیرہن کی بو

❁ صبا سحر...... کراچی
کہاں پرواز کی طاقت نہیں ہیں بال و پر ثابت
قفس میں کیا تمنائے رہائی سوچ کر کیجیے

❁ زوہیب احمد ملک......کراچی
ہنستا ہے تیرے سامنے اس طرح میرا زخم
جس طرح آشنا سے کوئی آشنا ہنسے

❁ نوشتہ گلزار......بھکر
برا ہو محتسب کا ایک دن میں کردیے ویراں
وہ جو آباد تھے اس شہر میں میخانے برسوں سے

❁ امتیاز احمد......چالیہ
دے کے اس شوخ ستمگار کو ہم اپنا دل
جی میں پچھتائے ہیں اپنے کہ یہ کیا کر بیٹھے

❁ نعیم احمد...... بہاولپور
نہ لیتا مول سودا کوئی بازارِ محبت کا
مگر کچھ جان اپنی بیچ کر لیتے تو ہم لیتے

❁ سائرہ نواب......پشاور
گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہ غربت میں
ہم آوازِ جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں

❁ نادیہ ریاض ......پشاور
زنداں میں کیا پڑے ہو کہے ہے مجھے جنوں
تم چند روز سیرِ بیاباں تو کرو

❁ صبا حمید......ٹنڈوالہ یار
رات بھر گرچہ جلی شمع تو کیا خاک جلی
عاشق سوختہ جاں آٹھ پہر جلتے ہیں

❁ جنید احمد ملک......گلستانِ جوہر کراچی
امڈ آتا ہے دل جس وقت کب رو کے سے رکتا ہے
مجھے رہنے دو یارو میرے آنسو پونچھتے کیوں ہو

❁ مہتاب احمد ......حیدرآباد
کوئی حسرت اے فلک اپنی نکلنے کی نہیں
ساتھ ہی زیرِ زمیں ارماں سارے جائیں گے

❁ منیر شگفتہ......وہاڑی
تم ہار بیٹھے زندگی ہر اک خوشی کو جیت کر
دھوئے تمہارے کیا ہوئے غم کی ہوئیں جو بارشیں

❁ سلیم قادر......میانوال رانجھا
اک نئی کہانی سوچیں ہم اور بھولیں گزری باتوں کو
کیوں پچھلا غم دہرائیں ہم جو قصہ تھا کچھ راتوں کا

❁ شاہد علی......فیصل آباد
آغاز میں کرتی ہوں سفر دیکھ کے جس کو
وہ شام کا تارا مجھے بھٹکائے بہت ہے

❁ ثمینہ ثاقب......ملتان
رسمِ وفا ہم نے ہی نبھائی اور ہم ہی بدنام ہوئے
حسن و عشق کی اس دنیا میں ہم ایسے دیوانے تھے

❁ عاصمہ سعید......سرگودھا
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

❁ عاطف علی......میرپور خاص
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

❁ وسیم خان......چنیوٹ
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

❁ اسامہ جنید......کراچی
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

❁ اسلم احمد......سکھر
جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

❁ اسما فیصل......ٹوبہ ٹیک سنگھ
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

❁ سعدیہ ریحان ......اٹک
تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پہ عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2017

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

سایہ

محمد الیاس

بچپن کی کچھ یادیں جوان ہونے تک بھی ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوتا ہے ان کا نقش اور تاثر بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی چھاؤں تلے بیٹھا زندگی کی کچھ گرہیں کھولنے میں مصروف تھا کہ اچانک جیون کی تپتی دھوپ نے اس پر انکشاف کیا کہ اس کی تلاش اور جستجو لاحاصل سعی کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔

فطرت سے دور ہونے والوں کی تباہی کا منظرنامہ

میں اپنے سے کم وبیش آٹھ دس برس عمر میں بڑی شادی شدہ بال بچوں والی عورت کی مربیانہ شفقت کو آج تک صحیح تناظر میں سمجھ کیوں نہیں پایا۔ وادی میں صنفِ نازک کی غالب اکثریت کے چہرے اسی طرح دلکش ہوتے ہیں۔ منزہ کا رنگ روپ غیر معمولی پُرکشش ہی سہی لیکن یکتائے عصر بھی نہیں تھا۔ پھر اس کا خیال آنے پر انجانی سی خلش کیوں محسوس ہوتی تھی۔ وہ میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھالیا کرتی تھی۔ اپنے سر سے اوپر تک اچھالتی اور ہنستے ہوئے دوبارہ تھام کر سینے سے لگالیتی۔ میرے گالوں پر بوسہ دیتی۔ مجھے پھول سے تشبیہ دیا کرتی۔ اس نے میرا نام ہی ''پھول'' رکھ

دیا تھا۔ جب میں اسکول جانے لگا اور میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا، تب بھی اسی نام سے پکاری گئی۔

اماں بڑے شوق سے مجھے اسکول کے لیے تیار کیا کرتیں۔ گھر سے باہر تک مجھے چھوڑنے آتیں۔ ڈیڑھ دو فرلانگ کی ڈھلان اترنے تک اماں مجھے دیکھتی رہتیں۔ اس خوبصورت وادی میں ندی کے پار دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ پچاس ساٹھ گز اوپر کی طرف چلنا پڑتا جہاں چشمہ پھوٹتا تھا اور قریب ہی منزہ کا میکا بھی تھا۔ وہ مجھے آتے ہوئے بلندی پر کھڑی یوں دیکھا کرتی، جیسے میرا انتظار کر رہی ہو۔ میری اماں کو ہاتھ ہلا کر جانے کا اشارہ کر دیتی۔ وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کی اترائی میں سطح ہموار پر اسکول تھا، جہاں میں جایا کرتا تھا۔

واپسی پر وہ میری منتظر ہوا کرتی۔ خاطر داری کے لیے کچھ نہ کچھ رکھ چھوڑتی۔ کبھی ہوتا تو کبھی مکئی کی میٹھی روٹی یا موسم کے مطابق دستیاب مقامی پھل۔ اماں نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ گھر جلد پہنچوں اور ڈھنگ سے کھانا کھاؤں لیکن منزہ کی دل جوئی کی خاطر منہ جھٹال لیا کرتا۔ البتہ پانی ضرور پیتا۔ براہِ راست چشمے کا پھوٹتا پانی اوک سے پینے کا مزہ آ جاتا۔

ایک مرتبہ اونچائی سے پھسل جانے پر میری ہتھیلیاں چھل گئی تھیں۔ ان دنوں میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ منزہ ... دردمندی سے میرے ہاتھوں کو یوں دیکھتی رہی، گویا اس کے دل پر چوٹ لگی ہو۔ نم آنکھوں سے مجھے دیکھے گئی۔ وہ گھر سے برتن لانے کو اٹھی لیکن میں نے اسے روک لیا اور کہا کہ اپنے ہاتھوں کی اوک سے پانی پلا دو۔ میں آج تک اپنی اس خواہش کی توجیہہ نہیں کر پایا۔ اس نے بسم اللہ کا ورد شروع کر دیا اور خوشی خوشی اوک سے پانی پلانے لگی۔ وہ منظر آج بھی پوری جزئیات سے آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ شفاف پانی میں گلابی ریشمی ہاتھوں اور مخروطی انگلیوں کے ڈوبنے ابھرنے اور میرے لبوں سے مس ہونے کا دلفریب منظر۔ اس کے بار بار جھکنے سے ایک اور اسرار کھل گیا کہ وہ بھرپور جوان ہو چکی ہے۔ وہ بسم اللہ پڑھتی گئی اور میں پانی پی پی کر اپھر گیا۔ جی پھر بھی نہ بھرا۔

دور پار کا رشتے دار اور برادری کا خوش اخلاق فرد ہونے کے ناتے صابر حسین مجھے کبھی برا نہ لگا۔ ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں سب سے خوش حال گھرانا ہمارا ہی تھا۔ یتیم یسیر صابر اپنی بیوہ بہن اور اس کی اولاد کے ہمراہ ہمارے گھر کے پچھواڑے ذاتی زمین میں بنے کچے پکے دیہاتی طرز کے مکان میں مقیم تھا۔ زمین اتنی بھی نہ تھی کہ چھ افراد پر مشتمل کنبے کی کفالت آسانی سے کر پاتا اور پھر اس پر دھن سوار تھی کہ بیرون ملک سے ڈھیروں دولت کما کر لائے اور بہت عالی شان کوٹھی بنائے۔ مجھے کیا اعتراض ہوتا، خواہ وہ کتنا ہی امیر کبیر ہو جاتا، اگر اس کی منگنی منزہ سے نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے اس بھلے مانس سے بلاوجہ ہی پُرخاش ہو گئی۔ وہ مسقط چلا گیا اور میں بدستور محنت سے پڑھائی کرتا رہا۔

نویں جماعت میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے دس لڑکوں کا انتخاب کیا اور اساتذہ کو ٹاسک دیا کہ انہیں ابھی سے بورڈ کے امتحانات کی تیاری اس عزم سے کروائی جائے کہ کبھی نہیں تو چند ایک ہی اعلیٰ پوزیشن حاصل کر لیں۔ ان لڑکوں کو اسپیشل گروپ کا نام دیا گیا۔ میں یوں بھی اس گروپ میں نمایاں طالب علم تھا اور شروع سے ہی ہر سالانہ امتحان میں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتا آ رہا تھا۔ ہمارے زیادہ تر اساتذہ بڑے محنتی تھے، خصوصاً سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھانے والے۔ سائنس ٹیچر ماسٹر شریف صاحب نے گروپ کے لڑکوں کو اچھی غذا کی افادیت پر بڑا موثر لیکچر دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہم اپنے اپنے گھر سے، جس حد تک ممکن ہو سکے، اچھے سے اچھا کھانا لایا کریں اور تفریح کے پیریڈ میں خوب سیر ہو کے کھا لیں تاکہ چھٹی کے بعد مزید دو گھنٹے تسلی سے پڑھائی کی جا سکے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر ہو سکے تو آملیٹ اور دیسی گھی کا پراٹھا لایا کریں۔

ہمارے اردو کے استاد ملک فضل حق خاصے نالائق تھے اور ماسوائے میرے، باقی قریباً تمام لڑکوں کی اس مضمون میں استعداد غیر تسلی بخش تھی۔ ماسٹر صاحب اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے طلبا پر بے جا سختی کیا کرتے۔ اگر کوئی طالب علم ان سے کسی لفظ کا مطلب پوچھ لیتا اور وہ نہ جانتے ہوتے تو سیخ پا ہو جاتے۔ پٹائی کرنے کے ساتھ ساتھ بولتے جاتے۔ ”الو کے پٹھے، گدھے! کلاس روم میں دھیان سے سبق سنا کرو۔ کتنی بار پہلے بھی اس لفظ کا مطلب سمجھایا ہے۔“ تاہم جاننے کی صورت میں فوراً ہی بڑے شفیق اور مہربان استاد کا روپ دھار لیتے۔ شفقت آمیز لب و لہجے میں سمجھاتے اور آخر میں کہتے۔ ”شاباش! جو نہ آتا ہو، وہ ضرور پوچھا کرو۔“

ہمارے پچھواڑے صابر حسین نے عجیب نمونے کا گھر تعمیر کرایا۔ ایک بڑے سے کمرے کے اوپر کمرا اور اس پر کشادہ برساتی کا ڈھانچا دیکھ کر یوں گمان گزرتا جیسے کسی ریلوے جنکشن کا تین منزلہ سگنل روم ہو، جس کی کھڑکی سے ریلوے اہلکار سر نکالے ریل گاڑی کو سرخ یا سبز جھنڈی دکھایا کرتا ہے۔ اس کی چھٹی کم تھی۔ دنوں میں اسٹرکچر کھڑا کیا گیا تھا

اور راتوں رات اندر باہر سے پلاستر کروا کر مجوبہ تیار کرا دیا۔ ہمارے گھر کی عقبی دیوار سے فاصلہ بھی کم تھا اور برساتی پر مشتمل تیسری منزل خاصی اونچی نکل گئی تھی۔ سفیدی ہوتے ہی اگلے روز منزہ کو دلہن بنا کر لے آیا۔ زبان زدِ عام تھا کہ اس کو منزہ سے مثالی محبت تھی۔ اعلان کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے لیے ہر آسائش مہیا کرے گا۔ سننے میں آیا کہ بڑے خوبصورت گہنے، قیمتی لباس اور ایسے ایسے تحفے لایا ہے، جو آس پاس کی بستیوں کی کسی نوبیاہتا کو شاید ہی نصیب ہوئے ہوں۔

میں دل برداشتہ سا ہوا شادی کی تقریب میں شرکت نہ کرنے کے بہانے تراشتا رہا لیکن والدین کو برادری کے رسم ورواج کی پاسداری عزیز تھی، لہٰذا ان کی سرزنش سے بچنے کی خاطر دعوتِ ولیمہ میں چلا گیا۔ سوچ رکھا تھا کہ جلد ہی اٹھ آؤں گا لیکن صابر نے اتنی محبت دی کہ میں حیران رہ گیا۔ آگے بڑھ کر خندہ پیشانی سے گلے لگایا اور بولا۔

”تم واقعی پھول ہو۔ میں بھی آئندہ تمہیں اسی نام سے پکارا کروں گا اور ہاں! میں رشتے میں تمہارا ماموں ہوں...... دل قریب ہوں تو دور کا رشتہ بھی نزدیک ہوجاتا ہے۔“

اس لیے مجھے خیال آیا کہ اس شخص سے پرخاش رکھنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ شاید یہی میرا نصیب ہو، جو آج تک برابر ملتا آیا ہے۔ پیار بھرے بوسے اور گداز بدن کا لمس اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس پر قدغن نہ لگے۔ ہمارے علاقے کی یہ روایت قابلِ تحسین ہے کہ بزرگ خواتین و حضرات اپنے عزیزوں کو اپنی خصوصی شفقت اور محبت سے کبھی محروم نہیں کرتے۔

مجوبہ عمارت کی سیڑھیاں کچھ زیادہ ہی عجیب طرز کی بنائی گئیں۔ بغلی دیوار سے لپٹی ہوئی پینتالیس درجے کا زاویہ بناتی اوپر کی منزل تک پہنچیں اور برساتی تک جانے کے لیے عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ اسی زاویے سے اوپر چلی گئیں۔ ہوا اور روشنی کے لیے ہر دیوار میں جابجا کھڑکیاں رکھ دیں۔ میں اپنے کمرے میں پڑھائی کرتے ہوئے کھڑکی سے گاہے بگاہے اس مجوبہ پر نگاہ ڈال لیا کرتا۔ رات کو دیر تک پڑھتے ہوئے سناٹے میں دبی دبی ہنسی کی آواز اور چوڑیوں کی کھنک سنائی دے جانے پر ذہن منتشر ہوجاتا۔ گیارہ بجے میری اماں نیم گرم دودھ کا پیالہ لیے آجاتیں اور اپنی نگرانی میں پلوا کر بتی بجھا دیا کرتیں۔ حکم ہوتا کہ سوجاؤں۔

باطنی خوشی کی صوتی علامت کھنکھناتی ہنسی نقرئی گھنٹیوں کی سی اور کانچ کی جھنکار سن کر نیند کافور ہوجایا کرتی۔ ایسے موقع پر ماسٹر شریف صاحب کی بتائی ہوئی نیند لانے کی ترکیب پر عمل کیا کرتا۔ تصور میں دو تین میل پنجے ندی کے کھلے پاٹ کی ترائی میں ہری بھری گھاس چرتی سیکڑوں بھیڑوں کے ریوڑ کو یکسوئی سے دیکھنے لگتا۔ یوں لمحۂ موجود کے حقائق سے غافل ہوتے ہی نیند کا غلبہ ہوجاتا۔

چھٹی ختم ہونے پر جس روز صابر حسین صبح صبح گھر سے روانہ ہوا، اس کے سسرالی اور دیگر رشتے دار بھی رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ گزشتہ روز فرداً فرداً ہر گھر میں الوداعی ملاقات کرنے آیا تو ہمارے ہاں خصوصی طور پر مجھے بلوایا اور بڑی گرم جوشی سے ملا تھا۔ ابھی میں نے اسکول جانے کی تیاری کرتے ہوئے دو تین بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔ اس کو آہوں اور سسکیوں میں الوداع کیا گیا۔ دونوں بھانجے سامان اٹھائے لاری پر سوار کرانے سڑک تک ہمراہ گئے، جب کہ بیوی اپنے والدین کے ساتھ میکے چلی گئی۔

میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ اس روز فضل حق صاحب کو زچ کرنے پر کیوں تل گیا۔ وہ غلطیاں پہلے بھی کیا کرتے تھے۔ کئی بار میں نے موقع مناسب جانتے ہوئے بڑے سلیقے سے ان کی اصلاح بھی کر دی لیکن وہ شاید ایک بُرا دن تھا۔ اس کی ابتدا ہی آنسوؤں اور آہوں سے ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب ”جاں بر ہونے“ کا معنی یکسر الٹ رہے تھے۔ ”زندہ بچ رہنے“ کے بجائے ”مر جانے“ کے معنوں میں تین بار بڑے وثوق سے جملہ دہرایا تو مجھ سے مزید صبر نہ ہوسکا۔ صحیح معنی بتانے پر قدرے جزبز ہوئے لیکن سنبھل گئے اور خفت مٹانے کی غرض سے اوور ایکٹنگ کرتے ہوئے بولے۔

”ہاں ہاں! میں بھی کس خیال میں کھو گیا تھا۔“ مجھے شاباش دی۔ ابھی نصف پیریڈ ہی گزرا تھا کہ ایک عام سا محاورہ ”سنی ان سنی کرنا“ کو دو مرتبہ ”سنی ان سنی ایک کرنا“ بول دیا۔ میں نے پھر توجہ دلائی۔ وہ نتھنے پھلا کر کہنے لگے۔

”ایک ہی بات ہے، دونوں ٹھیک ہیں......زیادہ سر پر سوار ہونے کی کوشش نہ کرو، پی ایچ ڈی صاحب!“

پیریڈ ختم ہونے سے چند منٹ پہلے ایک لڑکے نے ”گرسنہ چشم“ کے معنی پوچھ لیے۔ شپٹا سے گئے۔ فوری خیال یہی آیا کہ وہی آزمودہ نسخہ آزمائیں گے۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کے ساتھ لعنت ملامت۔

”الو کے پٹھے، گدھے! کلاس روم میں دماغ حاضر رکھا کرو۔ کئی بار بتا چکا ہوں......“ لیکن شاید دو مرتبہ خفیف ہونے پر کمزور پڑ چکے تھے اس لیے نیا فارمولا بروئے کار لائے اور بڑے اعتماد سے بولے۔

”بھیڑیے کی آنکھوں والے کو گرسنہ چشم بھی کہتے ہیں۔“

وہ گرگ کو "گرسنہ" سے خلط ملط کر رہے تھے۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ غضب ناک ہو گئے۔ فوراً باہر نکلے اور دو تین منٹ بعد ہی ہاتھ میں تقریباً تین فٹ لمبی، ڈیڑھ دو انچ چوڑی موٹی سی کھردری چوبی پھٹی اٹھالائے اور بڑے سرد لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اب مرد کا بچہ بنتا اور چیخنا چلانا نہیں۔ ہاتھ سامنے کرو۔ میں آج تمہاری پی ایچ ڈی نکالوں......"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں سامنے کر دیں۔ ماسٹر صاحب پوری طاقت سے اور دیوانہ وار مشینی انداز میں دونوں جانب باری باری وار کرنے لگے۔ ابھی چند ضربات ہی لگی تھیں کہ اچانک ہیڈ ماسٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ لڑکے کھڑے ہو گئے اور ماسٹر صاحب نے ہاتھ روک لیا۔ دونوں اساتذہ میں باہم نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ سینئر نے نظروں ہی نظروں میں جونیئر کو کیا پیغام دیا کہ وہ خاموشی سے چل دیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرے زخمی ہاتھوں کو غور سے دیکھا اور دو لڑکوں سے کہا کہ مجھے سائنس لیبارٹری لے جائیں اور دوا لگوائیں۔ ساتھ ہی مجھے چھٹی کرنے کا حکم دیا۔

لیب اسسٹنٹ، اسلم نے زخم اچھی طرح صاف کر کے دوائی لگائی اور دونوں ہاتھوں پر سفید پٹی لپیٹ دی۔ ماسٹر شریف صاحب نے ایک جار میں دو تین دواؤں کا مکسچر بنا کر مجھے پلایا اور بولے۔ "یہ دل کو طاقت دینے والی دوائی ہے اور درد بھی کم ہوگا......جاؤ، شاباش! آرام کرو۔"

واپسی پر میرے دل میں عجیب لایعنی سی خواہش بیدار ہوئی کہ منزہ مجھے اس حالت میں دیکھ لے۔ میں چشمے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا چونکہ اسکول میں ابھی چھٹی کا وقت نہیں ہوا لہٰذا وہ شاید اس طرف نگاہ نہ ڈالے لیکن ابھی چند منٹ ہی انتظار کیا ہوگا کہ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ پٹیوں میں لپٹے میرے ہاتھ دیکھ کر ٹھٹکی اور لپک کر کلائیوں سے تھام لیا۔ مضطرب ہو کر پوچھنے لگی اور آبدیدہ ہو گئی۔ میری بپتا سن کر ظالم استاد کو بددعائیں دیتے ہوئے رونے لگی۔ میں مبہوت سا اس کو دیکھے گیا۔ زرق برق لباس اور طلائی زیورات پہنے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ گوری کلائیوں میں سجی رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں ذرا سی حرکت ہونے پر بجنے لگتیں۔ اس کے ہاتھوں پر رچا حنا کا رنگ اتنا گہرا تھا، گویا تھوڑی دیر پہلے ہی مہندی چھڑائی ہو۔ دو تین مہینوں میں ہی اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے اور وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ میں دیکھتا اور حیران ہو کر سوچتا رہا کہ پرستان کی پریاں آخر اس عورت سے زیادہ اور کیا خوبصورت ہوتی ہوں گی۔

میرے دل میں بڑی منہ زور امنگ بیدار ہوئی کہ ان حنائی ہاتھوں سے پانی پیوں۔ وہ مجھے اپنے میکے سے لے جانے کی ضد کرنے لگی تاکہ گرم دودھ میں دیسی گھی اور انڈا اسپھینٹ کر پلائے لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے رتی بھر پیاس نہیں تھی۔ اس کے باوجود پیاسا ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پانی پلانے کی التجا کی۔ غالباً اس کو بھی اڑھائی برس قبل کا وہ اوک سے پانی پلانے والا دل آرا منظر یاد آ گیا تھا۔ بسم اللہ کا کلمہ پڑھتے ہوئے بیٹھ گئی اور مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

تاریخ کے استاد چودھری رحمت الٰہی صاحب، نصاب سے ہٹ کر بھی بڑے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ سمندر کا سارا پانی پی جانے والے یونانی دیوتا کا قصہ انہوں نے ہی سنایا تھا۔ سورج کی کرنوں نے شفاف پانی کو چاندی چاندی کر رکھا تھا اور اس میں ڈوبتے ابھرتے حنائی ہاتھ سے رنگ بکھرتے رہے۔ چوڑیوں کی جھنکار میں بسم اللہ کا ورد جاری رہا۔ سحر طاری ہو گیا مگر دیومالائی تشنگی عود کر نہ آئی۔ اوک خالی ہو جانے پر بھی میں اپنے منہ سے چھونے والے اس کے ہاتھ کے کنارے کو ہر بار ہونٹوں سے تادیر مس کیے رکھنے کی خفی خفی سی سعی میں یوں محو ہو گیا کہ وہ میری تشنگی کی اصل نوعیت کو بھانپ گئی۔ زیر لب مسکرائی اور اوک میں لیے پانی سے میرا چہرہ تر کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ہی جھینپ گئے اور ہنس پڑے، گو کہ دل کا چور دبکا رہا۔

فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ منزہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میں ہاسٹل میں مقیم تھا۔ جب بھی چھٹی پر گھر آتا، حسب روایت بڑی بوڑھیاں ملنے آ جاتیں۔ ہاتھوں میں لے کر منہ سر چومتیں اور ڈھیروں دعائیں دیتیں۔ مرد حضرات بھی اسی خلوص سے ملتے۔ تاہم منزہ کا رویہ منفرد ہوا کرتا۔ اس عورت کی روح میں واقعی کوئی دادی اماں براجمان تھی یا بلا کی اداکارہ۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بہ آواز بلند کہتی۔

"ہمارا پھول آیا ہے، کہاں گیا؟" میں جھینپتے ہوئے سامنے آ جاتا چونکہ مجھے سب سے زیادہ اسی کا... انتظار ہوتا۔ مسکرا کر سلام کرتا۔ وہ بلاتکلف دادی اماں کا روپ دھار لیتی۔ میں خود کو پوری رضا سے اس کے حوالے کر دیتا۔ بڑی توانا خواہش بیدار ہوتی کہ میں بھی جواباً اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کروں لیکن نہاں خانے میں کہیں اچانک کھٹکا ہو جانے سے دبکا بیٹھا چور لرز کر رہ جاتا۔

میڈیکل کالج میں مجھے میرٹ پر داخلہ ملا۔ اس عرصے میں صابر حسین تین بار ہی چھٹی پر گھر آسکا۔ اس کی رہائشی عمارت میں توسیع ہوتی رہی۔ سامانِ آرائش اور آسائش جمع ہوتا رہا۔ اولاد میں مزید اضافہ ہوا اور بچوں کی تعداد تین ہو گئی۔ صابر نے پھر وہی عزم دہرایا کہ وہ منزہ کی زندگی میں شاندار انقلاب لانا چاہتا ہے۔ کار، کوٹھی، اور وہ سب کچھ، جس کی تمنا کی جاسکتی ہے۔ میں سیکنڈ ایئر میں تھا جب اس نے بتایا کہ وہ تین سال کے لیے لیبیا جارہا ہے اور بہت سی دولت کما کر لائے گا۔

ہاؤس جاب شروع کرنے سے پہلے چند روزہ فرصت ملنے پر گھر پہنچتے ہی اماں نے بڑی افسوس ناک خبر سنائی۔ کہنے لگیں: ”منزہ کے لیے دعا کرو۔ بڑی سخت پکڑ ہوگئی ہے۔ اس پر سایہ ہے۔ تمہارے پرچے ہونے والے تھے اس لیے کچھ نہ بتایا۔ کئی مہینوں سے علاج ہو رہا ہے۔ ہفتے دس دن میں ایک بار دورہ ضرور پڑتا ہے۔ بڑا ظالم جن چمٹ گیا ہے جو کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑ رہا......“

ہوش ربا تفصیلات سن کر میرا دل نادیدہ گرفت میں آ گیا۔ کوئی عامل بابا، پیر حکیم محمد کفیل جھاڑ پھونک کر رہا ہے۔ ہر ایک بار چلہ کھینچنے کا بڑا بھاری نذرانہ وصول کرتا ہے۔ پانچ اقسام کے اناج، پانچ خشک میوہ جات اور پانچ ہی کلو روغن...... یعنی گھی یا تیل۔ بار بار خبردار کرتا ہے کہ کوئی بھی چیز مصنوعی نہ ہو۔ یعنی اصلی ہونی چاہیے۔ ورنہ عمل الٹا پڑ سکتا ہے۔ اناج مثلاً گندم، چاول، مکئی، باجرہ، جوار، تل وغیرہ۔ اور میوہ جات میں بادام، کشمش، اخروٹ، مونگ پھلی، چلغوزے، پستہ اور کاجو۔ جو بھی توفیق ہو۔ تمام کا ہم وزن ہونا شرط ہے، مقدار کی قید نہیں، کوئی جس قدر دے سکے۔ بقول پیر حکیم، منزہ پر ایک بڑا ہی ضدی جن عاشق ہوگیا ہے۔ وہ گزشتہ سردیوں میں گھر کی سب سے اوپر والی چھت پر تن تنہا لیٹی، دھوپ تاپ رہی تھی کہ بدن کو پوری طرح ڈھانپنے کا خیال نہ رہا۔ غلام موسیٰ نام کا یہودی جن، کوہ قاف کی طرف جارہا تھا کہ اس عورت کے حسن کا نظارا پڑنے سے چندھیا گیا اور عین اوپر آ گرا۔ وہ اور آج کا دن، پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ منزہ کی آنکھیں سرخ اور چہرہ انگارہ ہونے سے شکل ڈراؤنی ہوجاتی ہے۔ جسم میں بے پناہ طاقت آجانے سے کئی کئی عورتیں مل کر بھی قابو نہیں کرسکتیں۔ اپنے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے مردانہ آواز میں بے تکان بولتی ہے، لیکن مہمل جملے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔

اماں سے معلوم ہوا کہ پیر حکیم نے گزشتہ روز جو چلہ کھینچا

تصحیح

دل کے آپریشن کے بعد خاتون کی حالت تشویشناک تھی۔ ان کے شوہر بیڈ کے قریب پریشان کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا، آپ فکرمند نہ ہوں یہ جلدی ٹھیک ہوجائیں گی کیونکہ ان کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔

”کچھ ایسی کم بھی نہیں ہے۔“ شوہر نے کہا۔

”پورے پینتالیس سال کی ہیں۔“

خاتون کے ہونٹ ذرا ہلے اور سرگوشی سنائی دی...... چالیس سال۔

شاپنگ

بیوی نے اٹھلاتے ہوئے شوہر سے کہا۔ ہفتے کو شاپنگ پر چلیں گے۔ اتوار کو امی کے گھر۔ سوموار کو پارلر، منگل کو ڈنر کرنے جائیں گے، بدھ کو موی دیکھنے جمعرات کو پکنک پر جائیں گے...... ٹھیک ہے نا۔

شوہر نے تجویز پیش کی...... اور جمعے کو مسجد چلیں گے۔

بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ وہ کیوں؟

بھیک مانگنے۔ شوہر نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

قابلِ غور

☆ جب دل کا پیالہ غموں سے بھر جاتا ہے تو یہ غم آنسو بن کر آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں۔

☆ مشکلات سے گھبرانے والے لوگ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

☆ بزدل لوگوں کی انا نہیں ہوتی۔

☆ جب تک دل و زبان میں تضاد ہو دعائیں اثر نہیں کرتیں۔

☆ رکاوٹیں عبور کرنا منزل پانے کی نشانی ہے۔

☆ ایک مرتبہ ہار کر بیٹھ جانے والا عمر بھر ہارتا رہتا ہے۔

☆ ہم کسی کو وہی کچھ دیتے ہیں جو ہمارے پاس ہو، چاہے وہ محبت ہو یا نفرت۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

ہے، معمول کے نذرانے کے ساتھ کالا بکرا بھی لیا ہے۔ اپنے حالیہ چلّے کے بارے میں بتایا کہ اس خطرناک عمل میں جان بھی جاسکتی تھی۔ آج منزہ سکون میں ہے۔ عامل بابا نے چیلنج کردیا ہے کہ اب بھی اگر غلام موسیٰ جن حرکت سے باز نہ آیا تو اس کی خیر نہیں۔ سختی کرنا پڑے گی لیکن گھر والے پریشان نہ ہوں۔ منزہ کی چیخ و پکار سن کر گھبرائیں نہیں۔ سمجھ لیں کہ جن کو سزا مل رہی ہے۔

اپنے لوگوں کی سادہ لوحی اور جہالت پر دلی دکھ ہوا۔ شعبۂ طب میں ان خرافات پر ماہرین کے تفصیلی اور مدلل لیکچر سن رکھے تھے۔ اس کے علاوہ آئے روز اخبارات میں خبریں شائع ہوتیں، جن کے مطابق نام نہاد عامل، متاثرہ خواتین کے جن نکالنے کی آڑ میں ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالتے اور بعض شرمناک حرکت بھی کر گزرتے۔ افسوس کہ لوگ نصیحت نہیں پکڑتے۔ ہر بار فریب میں آجاتے ہیں۔

دوپہر کو کھانے کے بعد چند منٹ کا وقفہ گزرا تھا کہ عقب میں ہڑبونگ مچنے سے میں چونک اٹھا۔ اماں کفِ افسوس ملتے ہوئے بولیں۔ ”پھر دورہ پڑ گیا۔ بے چاری کو نظر کھا گئی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے رل گئے ہیں......“ میں اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکا تھا لیکن اماں کو کچھ بتانے کے بجائے مصمم ارادے سے نکلا اور پچھواڑے چلا آیا۔ اہلِ خانہ سخت غم زدہ اور سہمے ہوئے نظر آئے۔

منزہ کے والدین اور بڑا بھائی بھی موجود تھا۔ وہ خود مجوبہ عمارت کے نچلے کمرے میں تھی۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں برآمد ہوئیں کہ کچھ پلے نہ پڑا۔ دروازے کے باہر فرش پر دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس پیڑھی پر بیٹھا عامل بابا کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی چنگیری میں سرخ گول مرچیں اور کچھ دردرکی جڑی بوٹیوں کا آمیزہ رکھا تھا۔ بابا کے الٹے ہاتھ پر موٹا لمبا ڈنڈا پڑا تھا۔ اس پیر حکیم کے چہرے مہرے سے کمینگی اور عجیب طرح کی وحشت ٹپک رہی تھی۔ ذہن میں فوری خیال آیا کہ اتنا بوڑھا شخص ایک لحاظ سے نیوٹرل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ناگفتنی کے ارتکاب کا خدشہ عموماً ٹل جایا کرتا ہے لیکن بعید نہیں کہ جسمانی تشدد کرنے پر آئے تو حد سے ہی گزر جائے۔

میرے گاؤں کے لوگ وقت سے پہلے ہی مجھے ”ڈاکٹر صاحب“ کہنے لگ گئے تھے۔ میری آمد پر سب نے والہانہ استقبال کیا تھا اور خواتین پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ تاہم مردوں نے حوصلہ پکڑا۔ منزہ کا بھائی یعقوب، فوج سے نائیک یا حوالدار کے رینک سے ریٹائر ہوا تھا۔ میں نے اس کو الگ کر کے سمجھایا کہ منزہ بیمار ہے اور اس کو فوری طور پر شہر لے جانا ہوگا، ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس، جو میرے مہربان استاد بھی ہیں۔ وہ شاید پہلے ہی گومگو کی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی آئی۔ فوراً باپ کے قریب جا کر کھسر پھسر کرنے لگا۔

عامل بابا نے یک دم گرج دار آواز میں منتر کے مہمل الفاظ دہرائے اور دہاڑ کر بولا۔ ”اوئے یہودی! آج تیرا مقابلہ مسلمان عامل سے ہے۔ تیری خیر نہیں۔ سیدھی طرح چلا جا، نہیں تو پچھتائے گا۔ تیری نسلیں یاد کریں گی۔“ اس نے ڈنڈے سے فرش بجایا اور چنگیری میں پڑا نسخہ کوئلوں پر الٹ دیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور جھپاک سے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بھیڑ لیا۔ وہ بستر پر لیٹی، آنکھیں پھاڑے بڑبڑاتے ہوئے چھت کو گھور رہی تھی۔ تشنج طاری ہونے سے جسم اکڑا ہوا تھا۔ میں نے چادر پھیلا کر اس کا بدن ڈھانپ دیا اور پسینے میں تر چہرے پر بڑی نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ پسینا پونچھا اور پیشانی کو سہلاتے ہوئے اگلے مرحلے پر پھٹی پھٹی سی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ اس کے بدن میں ہلکی لرزش ہونے لگی اور ہونٹ باہم پیوست ہوگئے۔

مجھے صحیح اندازہ نہ ہوسکا کہ کتنے منٹ کے دورانیے میں منزہ کے جسم کی اینٹھن کم ہونا شروع ہوئی اور اس نے اپنا چہرہ سہلاتے ہوئے میرے ہاتھ کی پشت پر اپنی دونوں ہتھیلیاں رکھ دیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے غنودگی آنے سے وہ پُرسکون ہوگئی ہے۔ تادیر جھکے رہنے سے مجھے اپنی کمر میں کھچاؤ محسوس ہوا تو الٹے ہاتھ سے باری باری سہارا دے کر اس کے دونوں ہاتھوں کو پہلو میں رکھا اور اپنا سیدھا ہاتھ آزاد کرالیا۔

باہر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر عامل بابا جلال میں آگیا اور بولا۔ ”میرا شکریہ ادا کرو۔ ورنہ جن نے تمہاری گردن مروڑ دینی تھی۔“ میں نے تحمل سے کہا۔

”ٹھیک ہے باواجی! بہت شکریہ۔ ویسے میں نے جن کو کوہ قاف ائرلائن کی فلائٹ سے روانہ کردیا ہے۔ وہ جلد ہی پہنچ جائے گا۔ اس عورت کو معاف کردیں۔ یہ میڈیکلی فٹ نہیں......“

مرچوں کی دھونی سے وہاں کھڑا ہونا محال ہوگیا۔ بابا نے ڈنڈے سے فرش بجایا اور دبنگ لب و لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”تمہاری میڈیکل یہاں نہیں چلے گی اور چھپیاں میں حضرت پیر سے شاہ غازی، دمڑیاں والی سرکار کا راج ہے۔ وہاں کوئی جن نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتا۔“ میں نے حکمت سے کام لیا۔ چونکہ اپنے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے خوف

آ رہا تھا۔ عامل بابا سے الجھنے کے بجائے یعقوب سے کہا۔

”اس وقت مریضہ کو آرام کرنے دیں اور یہاں شور شرابا نہیں ہونا چاہیے۔“ ذرا توقف سے بابا کی طرف اشارہ کر کے مزید کہا۔ ”اگر جن واپس آ گیا تو آپ بزرگ ہی علاج کریں گے۔ ہمارے بس کی بات نہیں۔“

☆☆☆

میرے محترم استاد، معروف سائیکاٹرسٹ، پروفیسر ڈاکٹر حسنین بخاری بڑی شفقت سے پیش آئے اور پوری توجہ دی۔ بیس پچیس منٹ کے لیے مجھے باہر بھیج دیا اور مریضہ سے تنہائی میں بات کرتے رہے۔ معائنہ ختم ہونے پر میں اس کو گاڑی میں بھائی کے پاس چھوڑ کر واپس آیا تو بخاری صاحب نے کہا۔ ”اس عورت کے خاوند سے کہو، اگر بیوی عزیز ہے تو فوراً آ جائے۔ جب وہ دو تین ماہ بال بچوں میں گزار لے تو میاں بیوی کو ایک ساتھ میرے پاس لے آنا۔“

ڈاکٹر صاحب نے ٹانک اور سکون آور دوا۔۔ کا نسخہ لکھ دیا۔

صابر حسین سے گھر والوں کا بذریعہ خط رابطہ ہوا کرتا تھا یا پھر کمپنی کے پاکستانی اکاؤنٹنٹ کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں نے پی سی او سے کال ملا کر خود بات کی اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کا حوالہ دے کر فوراً گھر آ جانے کی تاکید کر دی۔ وہ فکرمند ہو گیا اور بولا۔ ”میرے کنٹریکٹ کے تین سال پورے ہو گئے ہیں۔ آئندہ کے کنٹریکٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بیوی اور بچوں کے لیے ہی پردیس کاٹ رہا ہوں۔ چند روز میں معاملات سمیٹ کر نکل آؤں گا۔“

چھٹے روز صابر حسین گھر پہنچ گیا۔ اس عرصے میں منزہ کے ہاں دن بھر کے میں میرے تین چکر لگتے رہے۔ اپنی نگرانی میں اس کو ادویات کی خوراک دیا کرتا۔ وہ بھی خاوند کے آنے تک کسی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اس کے گھر لوٹ آنے پر بڑی تیزی سے روبہ صحت ہوئی۔ میری چھٹی ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہمارے گھر آ گئی۔ قریب قریب اسی انداز سے ملی جیسے کبھی ملا کرتی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہی منزہ ہے، جسے میں جانتا ہوں اور وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کی بھلائی کے علاوہ میری اور کوئی ترجیح نہیں۔ شاید اسی حوالے سے مجھے اس کا خاوند بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ اتنے میں وہ خود بھی آ پہنچا اور صحن پار کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

”سنا ہے ہمارا پھول صبح جا رہا ہے۔ جانے پھر کب ملاقات ہو۔ ہم اداس ہو جائیں گے......“

میں نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا اور اس نے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ کہنے لگا۔

”ڈاکٹر صاحب! مجھے کاروبار کا کوئی مشورہ دیتے جاؤ۔ اب میں گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا۔“ میں نے کہا۔

”بہت اچھا خیال ہے۔ ہماری ویلی کی سڑک چوڑی کی جا رہی ہے۔ تین چار میل اوپر جھیل کے قریب گیسٹ ہاؤس بنا لیں۔ سیزن میں سرکاری ریسٹ ہاؤس کی بکنگ کے لیے لوگ وزیروں کی سفارشیں کرواتے ہیں۔ اب تو سارا سال ہی ٹورسٹ آنے لگے ہیں۔ یہی موقع ہے، جس نے پہل کی، فائدے میں رہے گا......“ وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بولا۔

”واہ واہ! کیا بات ہے ڈاکٹر پھول صاحب! کمال کر دیا۔ اتنی رقم ہے میرے پاس۔ بڑا اچھا گیسٹ ہاؤس بن جائے گا۔ کیا زبردست مشورہ دیا ہے۔ دونوں بھانجے جوان ہو گئے ہیں۔ ہم سارے ہی کام سے لگ جائیں گے۔“

منزہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں تینوں بچے آ گئے تو گفتگو میں خلل پڑنے لگا۔ میں نے اٹھ کر دیوار پر لگا کیلنڈر دیکھا اور صابر حسین سے کہا کہ ستمبر کی چھ سات کو میری دو چھٹیاں ہیں۔ آپ میاں بیوی سات تاریخ کو میرے پاس آ جانا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے اپائنٹمنٹ لے رکھوں گا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”بالکل ٹھیک۔ ہم حاضر ہو جائیں گے۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے اور ہر خوشی دے......“ میاں بیوی رخصت ہوتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ ہی مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ میری حیرت کی انتہا ہو گئی جب دیکھا کہ تینوں بچے بھی میری ٹانگوں سے لپٹ رہے ہیں۔ سوچتا ہی رہ گیا کہ ان بچوں کے دلوں میں کون سا جذبہ موجزن ہوا ہے۔

ڈاکٹر... حسنین بخاری سے سات ستمبر کو شام پانچ بجے کی اپائنٹمنٹ لے رکھی تھی۔ انہوں نے اسی طرح توجہ دی اور منزہ سے دس پندرہ منٹ علیحدگی میں بھی بات کی۔ اس کو باہر بھیج کر ہمیں دوبارہ بلا لیا اور ہر طرح سے تسلی دی کہ مریضہ بالکل نارمل ہے۔ صابر حسین لجاجت آمیز لہجے میں بول پڑا۔

”سر! میری بیوی کی اصل بیماری کیا تھی؟“ ڈاکٹر صاحب بڑی بے ساختگی سے بول گئے۔

”شرافت!“ میں تو حیران ہوا ہی تھا، صابر حسین بھی بھونچکا سا دکھا گیا۔ ہمیں پریشان دیکھ کر سر بخاری ہنس دیے اور بولے۔

”بھئی! سیدھی سی بات ہے، شوہر کی لمبی جدائی میں باکردار عورت ہی.... اپنے جذبات کی حفاظت کرتی ہے......“

قسط نمبر: 8

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے ۔کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی' اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی نفی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا...... ''میرے بچے! انکار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔'' یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی چنانچہ نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے آہنگٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نکار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو نی گس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ''ونی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئی...... ''مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔'' اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بگاہے مڈبھیڑ ہوتی رہی۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹیلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پابلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پابلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پابلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پابلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائی اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔ پھر سرخ ہنڈائی اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو پابلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیہ با کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک بارورخ لاؤ اور ایما ایبل پام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔ جب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک کارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چھ ماہ سے

اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورتِ حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور بوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایئرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ جب حفیظ کپور نے علی کو سلمٰی خاتون کے بارے میں بتایا تو وہ یک ٹک انہیں دیکھنے لگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بڑے کپور صاحب کے الفاظ میری سماعت کے لیے کسی ایٹمی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ میں ان سنسنی خیز لمحات میں اضطرار اور اضطراب کی آخری منازل سے گزر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک طوفان برپا تھا جو مجھے کچھ سوچنے اور کچھ سمجھنے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ چشم زدن میں سیکڑوں استفسارات برساتی کھمبیوں کے مانند دماغ کے مختلف گوشوں سے نکل کر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ ایسی کیفیت میں انسان یقین اور بے یقینی کے بیچ سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ حفیظ کپور کے آخری جملے کی گونج مجھے اپنے پورے وجود میں محسوس رہی تھی۔ انہوں نے نہایت ہی مشفق اور مہربان لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔

''اوپر عظیم کے کمرے میں سلمٰی صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

حفیظ کپور کی زبان سے اپنی ماں کا نام سن کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ میں نے ابھی تک یہاں کسی شخص کو اپنی والدہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ عظیم اور حفیظ کپور یا دیگر افراد کو صرف یہی معلوم تھا کہ میں کسی سلمٰی نامی عورت کی تلاش میں امریکا سے کراچی آیا ہوں پھر حفیظ کپور نے یہ کیوں کہا۔ ''آپ کو میں آپ کی والدہ صاحبہ سے ملوانے لے جا رہا ہوں؟''

اس جملے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ سلمٰی صاحبہ کو میری والدہ کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر کیسے......؟

اس ''کیسے'' نے مجھے کشمکش و پیچ میں ڈال دیا تھا۔ میں زیادہ دیر تک حیرتوں کے پہاڑ تلے دبا نہیں رہا۔ میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور میں نے الجھنوں کے ماؤنٹ ایوریسٹ کو اپنے سر سے اتار پھینکا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں پے در پے رونما ہونے والے اہم واقعات ایک کے بعد ایک میرے ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ یادداشت کی البم میری راہ نما بن گئی۔ گزشتہ رات عظیم سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو میں جب اس نے مجھے بتایا کہ میں جس عورت کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آیا ہوں، اس کا نام سلمٰی ہے تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا تھا اور سیل فون میرے ہاتھ سے پھسل کر بیڈ پر جا گرا تھا۔ ان جذباتی لمحات میں بے ساختہ میں نے عظیم سے استفسار کیا تھا۔

''تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟''

یہ ایک غیر ارادی اور بے اختیار سوال تھا جو عظیم کے انکشاف کے ردِعمل میں میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد عظیم سے ہونے والی بات چیت سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے اس اضطراری سوال کے الفاظ اس کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر پائے تھے ورنہ وہ مجھ سے میری والدہ کے حوالے سے ضرور پوچھ تاچھ کرتا۔ اس وقت میں نے یہی سوچ کر اطمینان کر لیا تھا کہ عظیم کا اس معاملے کو نہ کریدنا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ نہیں سمجھ سکا کہ سلمٰی دراصل میری ماں ہے......!

لیکن یہ میری خوش فہمی تھی کہ بیڈ پر پڑے ہوئے سیل فون سے ابھرنے والے میرے سوال کو عظیم سن نہیں پایا تھا۔ یقیناً وہ جان چکا تھا کہ میں جس سلمٰی نامی عورت کی تلاش میں یہاں آیا ہوں، وہ میری ماں ہے اور یہ راز عظیم نے ہی اپنے پاپا کو بتایا ہوگا۔ اس کے بعد حفیظ کپور نے مجھے سرپرائز دینے کے لیے یہ اہتمام کیا تھا۔ پورا دن مجھ پر یہی ظاہر کیا جاتا رہا کہ عظیم میری ماں...... مطلب یہ کہ سلمٰی صاحبہ کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ درحقیقت عظیم میری ماں کو یہاں لانے کی مہم پر گیا ہوا تھا اور وہ کامیاب لوٹا تھا۔ میرے ذہن میں حفیظ کپور کے وہ الفاظ بھی روشن ہو گئے جب کپور صاحب نے سیل فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''سیدھے اوپر......!''

ان لمحات میں اور بعد ازاں کپور صاحب اور اکبر کے بیچ ہونے والی گفتگو سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ

سیدھے اوپر" کے الفاظ کپور صاحب نے اپنے پوتے علیم کے لیے استعمال کیے تھے جس نے چھت کے اوپر مختلف پرندے پال رکھے تھے لیکن میرا یہ ماخوذ نتیجہ کسی بھول سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ یقیناً یہ وہی لمحات تھے جب عظیم میری والدہ کو لے کر اس گھر میں پہنچا تھا۔ یقیناً حفیظ نے ٹیلی فون پر عظیم ہی سے بات کی تھی اور اسے "سیدھا اوپر" جانے کو کہا تھا۔

یہ تمام تر خیالات پلک جھپکتے میں میرے ذہن سے گزرے اور یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ حفیظ کپور نے اتنے اعتماد کے ساتھ مجھ سے وہ ڈیل کیوں کی تھی۔ انہوں نے کسی بیوپاری کے انداز میں مجھ سے یہ سودا کیا تھا کہ......

"آپ دعا کرو کہ اللہ میری آزمائش کو ختم کر کے مجھے دوبارہ سرسبز و شاداب بنا دے۔ اس کے بدلے میں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آج کی تاریخ میں آپ کو ایک ایسی ہستی سے ملواؤں گا جس کی تلاش میں آپ امریکا سے یہاں آئے ہو۔"

حفیظ کپور نے مجھے سرپرائز دینے کے لیے بھرپور منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ میرے ساتھ بڑا کلاس کا ڈراما کیا جا رہا تھا اور اب اس ڈرامے کا کلائمکس آ گیا تھا۔ میں یک ٹک کپور صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"آپ رک کیوں گئے۔ آئیں میرے ساتھ......"

اسی لمحے عظیم اٹھ کر ہماری جانب بڑھا۔ "پاپا! آپ بیٹھیں۔" اس نے حفیظ کپور سے کہا۔ "میں اسد کو لے کر اوپر جاتا ہوں۔"

عظیم کی طرف سے اکھڑے اکھڑے اور بگڑے رہنے والے حفیظ کپور نے اس موقع پر عظیم کی پیشکش کے جواب میں کوئی اعتراض نہیں اٹھایا اور بڑے رسان سے بولے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم دونوں اوپر جاؤ۔"

"آؤ برو۔" عظیم نے میرے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "آپ کی مراد پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

میں گردن جھکا کر چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

عالی شان ریلنگ والے صاف شفاف زینے پر عظیم کے پہلو میں چلتے ہوئے میں نے قدرے شاکی لہجے میں کہا۔

"آج دوپہر سے اب تک آپ لوگوں نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔ مجھے بڑے کپور صاحب سے کوئی گلہ نہیں لیکن تم تو میرے دوست ہو۔ تم نے مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا؟"

"تھی کوئی مصلحت......!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیسی مصلحت؟"

"جب وقت آئے گا تو بتا دوں گا۔" وہ لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ "پھر تمہیں پتا چلے گا کہ آج دوپہر سے نہیں بلکہ گزشتہ روز نصف شب سے لے کر اب تک میں نے تم سے بہت ساری باتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے ضدی لہجے میں پوچھا۔

"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا مگر پہلے تم اپنی والدہ سے ملاقات کر لو۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں انہیں جلدی واپس چھوڑنے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ یہاں لایا ہوں۔"

"اوہ...... تو کیا تم انہیں واپس بھی چھوڑنے جاؤ گے؟"

"ہاں...... یہ ان کی خواہش ہے۔" اس نے کہا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......" میں نے الجھن زدہ لہجے میں خود کلامی کی۔

"سب سمجھ میں آ جائے گا برو۔" عظیم نے پُرمعنی انداز میں کہا۔

ہم بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ گھر کا یہ حصہ بھی نیٹ کلین اور اعلیٰ طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔ میری معلومات کے مطابق، بالائی منزل پر عظیم اپنی فیملی کے ساتھ آباد تھا۔ اس کی بیوی مہر النسا دو بیٹیوں کے ساتھ ان دنوں امریکا یاترا پر گئی ہوئی تھی۔ ایک بیٹی اور بیٹا عظیم کے پاس تھے اور یہ دونوں بچے اس وقت زیریں منزل پر اپنی دادی پھوپھیوں کے ساتھ تھے۔ پھوپھیوں کے بچوں کے ساتھ ان کی خوب جمتی تھی۔ علی، اس کی بیوی اور بڑے کپور صاحب زیریں منزل پر قیام پذیر تھے۔ عظیم کی والدہ سعیدہ خاتون کے ساتھ جوڑوں کے مسائل تھے اور دونوں گھٹنے تو بالکل کام نہیں کرتے تھے لہٰذا وہ نچلی منزل کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

عظیم نے ایک کمرے کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسد! تمہاری والدہ اس کمرے کے اندر موجود ہیں۔ تم ان سے ملاقات کرو۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔"

بات کے اختتام پر وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں نیچے ڈائننگ میں پاپا کے پاس جا رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تمہارا کھانا اوپر ہی بھیج دوں گا۔ آج تم ڈنر اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ کرو گے......"

میں نے عظیم سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ایسی بات

نہیں کہ میرے پاس سوالات کا ذخیرہ ختم ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں سوالات جمناسٹک میں مصروف تھے لیکن عظیم کے موڈ سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سرِدست وہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا لہٰذا میں نے اس سعی میں وقت برباد نہیں کیا اور اس دروازے کی سمت بڑھ گیا جس کے پیچھے وہ عظیم ہستی موجود تھی جس نے مجھے جنم دیا تھا لیکن ماں کی آغوش کی نرمی اور گرمی میرے نصیب میں نہیں تھی۔ کاتبِ تقدیر نے ماں بیٹے کے بیچ طویل جدائی رقم کردی تھی۔ میں کم وبیش ایک سال کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ اتنی کم عمر کے بچے کو کسی چیز کا شعور نہیں ہوتا۔ مجھے بھی کچھ یاد نہیں تھا۔ میں نے برسوں پہلے اپنی زندگی کا ابتدائی ایک سال ماں کے ساتھ گزارا تھا۔ اس ایک سال کا ایک لمحہ بھی میری یادداشت کے کسی کونے کھدرے میں محفوظ نہیں تھا۔ میں اپنی ماں کی شکل سے آشنا نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔

اس یقین کا ایک خاص سبب تھا۔ بروکلین (نیویارک) میں مرزا عامر بیگ سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں انہی کے ایما پر امریکا سے پاکستان آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلے انیس سالوں میں انکل علی سلطان گاہے بہ گاہے میری تصویریں انہیں بھیجتے رہتے تھے۔ بیگ صاحب مذکورہ تصاویر کو ان ایڈریس پر پوسٹ کردیا کرتے تھے جہاں سے ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ انہیں رقم بھیجی جاتی تھی۔ اگرچہ رقم بھیجنے والوں کے نام اور پتے وقت گزرنے کے ساتھ بدلتے رہتے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ تمام کی تمام نہ بھی سہی تو اتنی تصاویر ضرور میری ماں کے پاس پہنچ گئی تھیں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتیں۔ علاوہ ازیں، قدرت نے ماں کے اندر ایک خاص نوعیت کا انٹینا نصب کیا ہوتا ہے۔ اس عظیم ہستی کو اپنے جگر گوشوں کی جان پہچان کے لیے کسی حیلے وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماتا کی فریکوئنسی ایک خودکار نظام کے تحت اپنی اولاد کو شناخت کرلیتی ہے۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دس دیں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔

کمرے کا اندرونی ماحول خنک بستہ تھا۔ کمرے کا اے سی بڑی عمدگی سے کام کررہا تھا۔ میں نے گویا بہشتِ ارضی میں قدم رکھ دیا تھا۔ کہا جاتا ہے، جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔ میری جنت، میری ماں اس وقت میری نگاہ کے سامنے تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھیں۔ چند لمحات تک ہم دونوں بت بنے، ساکت کھڑے ایک دوسرے کو تکتے چلے گئے۔ اس ”دیکھن دکھن“ میں بڑا والہانہ پن تھا۔ جذبات کی شدت نے دونوں کی زبانوں پر قفل ڈال دیے تھے۔ ہمارے پاس کہنے کے لیے اتنا زیادہ تھا کہ الفاظ کے بوجھ سے ہماری سوچ کی کمر جھک گئی تھی۔ ہم یک بہ یک ازلی ابدی گونگے بن گئے تھے۔ ٹھنڈے ٹھار جنت نظیر بیڈروم میں پن ڈراپ خاموشی کا راج تھا۔ صرف ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ وقت گویا ایک مقام پر ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ ہمارے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا مگر زمیں ہمارے پاؤں پڑ گئی تھی اور ہمارے پاؤں جنبش ناآشنا ہوگئے تھے۔

معلوم نہیں، ہم کتنی دیر تک خاموش نظروں سے ایک دوسرے کے چہرے کا طواف کرتے رہے۔ ماں کی آنکھوں سے شناسائی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ بے شک انہوں نے اپنے لختِ جگر کو پہچان لیا تھا۔ میری نگاہ بھی ہر ہر زاویے سے یقین کامل کی کیفیت سے گزر چکی تھی۔ ہم دونوں نے احساسات کے اڑن کھٹولے پر سوار ہوکر انیس برس کا فاصلہ انیس سیکنڈ میں طے کرلیا تھا۔

قبل اس کے کہ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا، ماں کے ہونٹوں میں خفیف سی جنبش ہوئی پھر وہ دونوں بازو وا کرکے اضطراری انداز میں آگے بڑھیں۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

”میرے بچے......!“

ماں کی پکار پر میں بھلا کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ میرے قدموں میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں کمان سے نکلے ہوئے تیروں کے مانند ایک دوسرے کے سینے میں پیوست ہوچکے تھے۔

یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا جب میں بہ قائمی ہوش و حواس شعوری حالت میں ماتا کی نرماہٹ اور گرماہٹ سے آشنا ہورہا تھا۔ میں ان لمحات کے کیف کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ایک روح پرور خوشبو سانسوں کے راستے میرے اندر اتر رہی تھی اور میرے تن بدن کو سرشار کررہی تھی۔ میں انبساط کی آخری منازل سے گزر رہا تھا۔ کائنات کی ہر شے ہمارے ملن کی خوشی میں احتراماً ساکت ہوگئی تھی۔ گویا وقت تھم گیا تھا۔

معانقہ ختم ہوا تو ماں نے بے دریغ میرا چہرہ چوما۔ میں نے ان کے ہاتھوں پر بوسے دیے۔ میں پہلی بار اس نوعیت کی محبت سے آشنا ہو رہا تھا۔ اس پیار میں بڑی لذت اور چاشنی تھی۔ میں اس اپنایت اور خلوص کے ذائقے سے ابھی تک ناواقف تھا۔ ان لمحات میں، میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ مجھے اپنے بخت پر بے پناہ فخر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

جب ہم جذبات کے منہ زور طوفان سے باہر نکلے تو قوت گویائی بحال ہوئی۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے نہایت ہی احترام سے استفسار کیا۔

"ماں! آپ کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہوں میرے لعل!" وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "تم کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک نہیں ہوں......"

"تمہیں کیا ہوا ہے میرے لعل؟" وہ تڑپ کر بولیں۔

"ہوا تو کچھ نہیں۔" میں نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔

"پھر تم نے کیوں کہا کہ ٹھیک نہیں ہو؟"

"بس...... ویسے ہی۔" میں نے کہا۔

"نہیں...... مجھے بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔ "تم اچانک پاکستان کیوں آئے ہو؟ کیا تمہارے کیئر ٹیکر کو اس بات کی خبر ہے کہ تم اس وقت پاکستان میں ہو؟ اس نے تمہیں آنے کی اجازت کیوں دی......؟"

انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔ میرے پاس ان کے ہر سوال کا جواب موجود تھا لیکن مجھے اس بات پر تشویش محسوس ہو رہی تھی کہ وہ پاکستان میں میری آمد پر اس قدر پریشان کیوں ہو رہی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھیں مگر اس خوشی کے پیچھے وہ مجھے بے انتہا فکرمند بھی دکھائی دے رہی تھیں اور یہ بات ان کے سوالات سے بھی ہویدا تھی کہ وہ پاکستان میں میری اچانک آمد پر بوکھلا کر رہ گئی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کسی مشکل میں تھیں۔ ماں کی مشکل کے بارے میں سوچ کر میں بے چین ہو گیا۔

"میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس سے پہلے آپ میری ایک بات کا جواب دیں......"

"کون سی بات؟" انہوں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"آپ نے ایک طویل عرصے تک مجھے اپنی محبت سے محروم کیوں رکھا؟" میں نے کسی معصوم بچے کے انداز میں پوچھا۔ "اور آپ نے ملاقات کے لیے مجھے اپنے گھر کیوں نہیں بلایا...... آپ عظیم کے ساتھ یہاں کیوں چلی آئیں؟"

"تم نے بہت ہی نازک اور خطرناک سوالات کیے ہیں میرے لعل۔" وہ دکھی لہجے میں بولیں۔ "ان کے جواب ایک دو جملوں میں نہیں دیے جا سکتے۔ اس کے لیے تمہیں میری زندگی کی مکمل داستان سننا ہوگی۔ تب جا کر تمہاری تسلی ہوگی۔"

"میں اپنی آخری سانس تک آپ کی بپتا سننے کو تیار ہوں۔" میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ "آپ کو اندازہ نہیں کہ میں اپنے والدین سے ملنے کے لیے کتنا تڑپا ہوں، ان کی صورت دیکھنے کے لیے کتنا ترسا ہوں۔ میں نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کا وقت آپ لوگوں کی یاد میں کس اذیت سے گزارا ہے، اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں......!"

"مجھے بہ خوبی اندازہ ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔

"جب آپ کو ہر بات کا اندازہ ہے تو پھر ایک طویل عرصے تک مجھے خود سے دور کیوں رکھا؟" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "یہ تو چند دن پہلے اتفاق سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے باپ کو کسی دشمن نے قتل کر ڈالا تھا اور آپ نے ایک سال کی عمر میں مجھے کسی فیملی کے ساتھ امریکا روانہ کر دیا تھا۔ پھر آپ میری پرورش اور نگہداشت کے لیے میرے کیئر ٹیکر کو ہر ماہ ایک مخصوص رقم بھیجتی رہتی تھیں......"

"یہ ساری باتیں تمہیں اسی کیئر ٹیکر نے بتائی ہیں؟" انہوں نے چونک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "میرا مطلب ہے، بیگ صاحب نے......؟"

"جی بالکل!" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"بیگ صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولیں۔ "مجھے ان سے ایسی کوتاہی کی امید نہیں تھی۔"

میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ ماں بیگ صاحب کے اس عمل کو کسی کوتاہی سے تعبیر کر رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں کوتاہی والی کون سی بات ہے؟ یہی سوال میں نے ماں سے کیا۔

"اگر بیگ صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتا دیا تو اس میں ان کی کیا غلطی ہے؟"

"میں نے جاوید واسطی نامی ایک شخص کے توسط سے تمہیں امریکا بھجوایا تھا۔" انہوں نے بتایا۔ "جاوید واسطی

دلچسپ و دلگداز تحریروں سے سجا اکتوبر 2017ء کا دل فریب شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط وار ناول
سیما رضا ردا کا نئی ناول ہم کو عبث بدنام کیا اختتامی مراحل میں
اسما قادری کی ایک نہایت شاندار تحریر...... بد صورت
هما بیگ، نیلم احمد بشیر اور صبیحہ شاہ کی خصوصی تحریریں
نگہت سیما کا خوب صورت انداز بیاں...... پُرلطف ناولٹ صیدِ ضیافت کی صورت
دینی معلومات پر مبنی پُرعقیدت مضامین
ماضی کی اداکارہ حیبا کی
ہونہار فنکارہ صاحبزادی مدیحہ رضوی
سے دل پذیر ملاقات
سحر ساجد کی اچھوتی تحریر...... عنان گیر مکمل ناول کی صورت
اس کے علاوہ
عقیلہ حق، ثمر کاظمی، سحرش فاطمہ، طیبہ عنصر مغل،
ہاجرہ ریحان و دیگر ماہر افسانہ نگاروں کی خوب صورت کاوشیں
اس کے ساتھ ساتھ مسحور کُن شاعری، خوش ذائقہ تراکیب، متاثر کن تراشے اور بہت کچھ صرف آپ جیسے پُرذوق پڑھنے والوں کے لیے

کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ انہوں نے تمہیں مرزا عامر بیگ کے حوالے کیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو بڑی سختی سے یہ تاکید کردی تھی کہ جب تک میں گرین سگنل نہ دوں، انہوں نے تمہیں پاکستان نہیں بھیجنا۔ بیگ صاحب کی کوتاہی یہ ہے کہ مجھے کانوں کان خبر نہیں اور تم چپ چاپ امریکا سے پاکستان آگئے ہو......!"

"بیگ صاحب کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"کیوں ......ایسی کیا آفت ٹوٹ پڑی تھی؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئیں۔

میں نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں انہیں بتایا کہ جب مسلسل چھ ماہ تک ان کی طرف سے رقم موصول نہیں ہوئی تو بیگ صاحب پریشان ہوگئے۔ انہیں شک ہوا کہ آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہیں ورنہ گزشتہ انیس سال میں ایک بار بھی آپ کی طرف سے ایسی غیر ذمے داری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ بیگ صاحب کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ رابطہ کرکے آپ کی خیریت دریافت کرتے۔ بالآخر بیگ صاحب اور انکل سلطان نے مل کر یہی فیصلہ کیا کہ اس صورتِ حال میں مجھے فوراً پاکستان یعنی آپ کے پاس چلے جانا چاہیے۔ وہ ایسا فیصلہ کرنے کے لیے مجبور ہوگئے تھے۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے......؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔

"کیا؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"میں تو ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ بیگ صاحب کو ایک مخصوص رقم بھجوا رہی ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ "میرے پاس تو رقوم بھیجنے کی رسیدیں بھی ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بیگ صاحب کو پچھلے چھ ماہ سے رقم نہ ملی ہو......؟"

"بیگ صاحب جھوٹ کیوں بولیں گے!" میں نے کہا۔

"میں بیگ صاحب کو جھوٹا نہیں کہہ رہی ہوں۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "لگتا ہے، میرا کوئی ملازم گڑبڑ کررہا ہے۔ رقم اپنی جیب میں ڈال کر مجھے نقلی رسیدیں تھمارہا ہے۔"

"کوئی نقلی رسیدیں کیسے بنا سکتا ہے؟" میں نے ایک نکتہ اٹھایا۔ "اور وہ بھی کسی انٹرنیشنل منی ٹرانسفر کمپنی کی......!"

"میرے لعل! اس ملک میں ہر قسم کے ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولیں۔ "یہاں کسی نقلی رسید سے لے کر امریکا، کینیڈا کے ویزے کے حصول تک سب کچھ ممکن ہوجاتا ہے۔ خیر......" لمحاتی توقف کرکے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"میں ان تمام بندوں کی خبر لیتی ہوں جن کے توسط سے پچھلے چھ ماہ میں، میں نے عامر بیگ کو رقوم بھیجی ہیں۔ جب چور پکڑا جائے گا تو پھر میں اس بدمعاش کو جیل میں بند کراؤں گی۔ پھر اس کمینے کو پتا چلے گا کہ بے ایمانی کیسے کرتے ہیں!"

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آپ بے ایمانی کرنے والے شخص کو کسی قسم کی کوئی سزا نہیں دلوائیں گی۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"مگر کیوں؟" ان کی حیرت دوچند ہوگئی۔

"اس لیے کہ میں اس بے ایمان شخص کا احسان مند ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"احسان مند......تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"اگر وہ شخص بے ایمانی نہ کرتا تو آج میں آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں اس شخص کا بے حد شکر گزار ہوں جس کی غلطی نے مجھے میری ماں سے ملوادیا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس بے ایمان شخص کو معاف کردیں۔"

وہ بڑی گہری نظر سے مجھے گھورنے لگیں۔ جب چند لمحات تک وہ کچھ نہیں بولیں اور جذب کے عالم میں مجھے تکتی رہیں تو میں نے متذبذب لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں......؟"

"بالکل اپنے باپ حیدر علی کی کاپی ہو تم۔" انہوں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "دل بڑا، دماغ کا بڑا، عالی ظرف، درگزر اور معاف کردینے والا......"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔

"آجائیں۔"

دروازہ کھلا اور ملازمائیں کھانے کی دو ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئیں۔ کمرے میں ماں کے قریب ہی ایک شاندار میز پر خورونوش کا اچھا خاصا سامان پہلے سے موجود تھا۔ یہ وہ افطاری تھی جو میری ماں کے لیے بیڈ روم میں بھجوائی گئی تھی اور اب ڈنر کے لوازمات لائے جارہے تھے۔ مجھے ذرا سی بھی بھوک نہیں تھی۔ ایک تو حفیظ کھوکھر

صاحب نے ضد کر کے مجھے تین بندروں کی خوراک کھلادی تھی اور اس برماں سے ہونے والی ملاقات کی خوشی نے میرے قلب وجگر کو مسرت وشادمانی سے نہال کررکھا تھا۔ کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر میں نے ملازماؤں کے کام میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا اور خاموشی سے ان کی کارروائی کو دیکھتا رہا۔ جب وہ کھانا چننے کے بعد بیڈروم سے رخصت ہو گئیں تو میں نے کہا۔

''آج میں اپنی ماں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔''

''اگرچہ مجھے ذرا سی بھی طلب نہیں۔'' ماں نے کہا۔ ''لیکن میں اپنے بیٹے کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔ اس کے ہاتھ سے کھاؤں گی اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔''

کھانے کے دوران میں، میں نے ایک بار پھر ماں سے سوال کیا۔ ''آپ نے ملاقات کے لیے مجھے اپنے گھر کیوں نہیں بلایا؟ آپ عظیم کے ساتھ یہاں کیوں چلی آئیں؟''

''میں جہاں رہتی ہوں، تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے میرے بچے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔

ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ''کیوں؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کے گھر میں ایسی کیا بات ہے کہ میرا وہاں جانا مناسب نہیں؟ ماں کے گھر جانے کے لیے ایک بیٹے کے راستے میں ایسی کون سی رکاوٹ ہو سکتی ہے؟''

''رکاوٹ کوئی نہیں۔'' وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ''حالات کی بعض ایسی مجبوریاں ہیں کہ تمہارا وہاں جانا اور میرے ساتھ رہنا فی الحال ٹھیک نہیں۔''

''میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں ماں......!'' میں نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے بھی تو بتائیں کہ حالات کی ایسی کون سی مجبوریاں ہیں؟''

''میرے لعل! میری مجبوریاں آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔'' وہ قدرے بے بسی سے بولیں۔ ''میری زندگی بڑی عجیب وغریب ہے۔ میں نے اب تک اگر تمہیں خود سے دور رکھا ہوا ہے تو اس میں کئی مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور انہی مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکتی۔ میں فوری طور پر کوئی رسک نہیں لے سکتی۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں!'' میں ہونقوں کی نظر سے انہیں دیکھنے لگا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ آپ کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کی داستان سننا ہوگی......تو سنائیں اپنی داستان۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''تمہارے باپ حیدر علی کی بعض لوگوں سے دشمنی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگیں۔ ''وہ لوگ اس دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے تمہارے باپ کی جان لے لی۔ جب تمہارے باپ کا قتل ہوا، تم میرے پیٹ میں تھے۔ حیدر علی کی موت کے چھ ماہ بعد تم اس دنیا میں آئے تھے۔ میں نے ایک سال تک کس طرح تمہاری پرورش کی، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ تمہاری سلامتی اور حفاظت کی خاطر ہی میں نے تمہیں امریکا بھجوادیا تھا۔ یہاں قدم قدم پر تمہاری جان کو خطرہ ہے اور......''

''یہ ساری باتیں مجھے بھی معلوم ہیں ماں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ میری جان کی پروانہ کریں۔ میں اپنی اور آپ کی حفاظت کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جو میلی نظر سے میری ماں کی طرف دیکھے گا، میں اس کی آنکھیں نکال لوں گا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے ابھی اپنے ساتھ گھر لے کر چلیں۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔''

''مجھے معلوم ہے میرے لعل۔'' انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ٹشو پیپر کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''تم اس قابل ہو گئے ہو کہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالو تو اسے دانتوں پسینا آجائے۔ تم میرے ایک ایک دکھ کا مداوا کرنے کی سکت رکھتے ہو۔ مجھے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا ہے لیکن ......'' انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لمحاتی توقف کیا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولیں۔

''لیکن سردست میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ تم اسے میری مجبوری سمجھ لو یا حالات کی ستم ظریفی......''

''ماں! مجبوری کا ذکر آپ نے پہلے بھی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسی کون سی مجبوری ہے جو آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتیں؟''

''جب تم میرے حالات سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لو گے تو میری مجبوری تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''میں آپ کے حالات سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ہی تو آپ کے ساتھ جانے کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''جب تک میں آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کی بپتا نہیں سنوں گا، مجھے آپ کی زندگی

کے حالات سے آگاہی حاصل نہیں ہوگی۔''

''میری داستانِ غم سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے تمہیں میرے ساتھ بیٹھنا ضروری نہیں ہے۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولیں۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔'' آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر میں آپ کے پاس نہیں بیٹھوں گا یا آپ میرے ساتھ نہیں بیٹھیں گی تو میں آپ کی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں کیسے جان سکوں گا؟''

''میں نے اس کا بندوبست کررکھا ہے؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

میں الجھ کر رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کیسا بندوبست ماں؟''

''ڈائری......!'' وہ متحمل لہجے میں بولیں۔'' میں نے ایک ڈائری میں اپنی داستانِ حیات رقم کررکھی ہے۔ میں مذکورہ ڈائری عظیم کے ہاتھ تمہارے لیے بھیج رہی ہوں۔ تم پورے اطمینان کے ساتھ رات میں اس ڈائری کا مطالعہ کرو۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں آئندہ کیا کرنا ہے......''

''کیا مطلب!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔'' مجھے کس چیز کا فیصلہ کرنا ہے؟''

''یہ کہ......'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولیں۔'' تمہیں میرے ساتھ رہنا چاہیے یا نہیں۔''

''کیوں......؟'' میں نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔ ''اس ڈائری میں ایسا کیا خطرناک راز چھپا ہوا ہے؟''

''جس طرح ہر سکے کے دو رخ ہوتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔'' اسی طرح انسان کی زندگی بھی دھوپ اور چھاؤں سے عبارت ہے، خوشی اور غم کا مرقع ہے، اذیت اور راحت کا سنگم ہے، ہار اور جیت کا کھیل ہے اور......اور......نیکی اور بدی کا ملاپ ہے۔ ممکن ہے، میری زندگی کی کہانی کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرنے کے بعد تم میرے ساتھ رہنا پسند نہ کرو......''

''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ماں!'' میں نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قدرے تیز آواز میں کہا۔'' مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ آپ اچھی ہیں یا بری۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ میری ماں ہیں اور ماں اپنی اولاد کے لیے کسی بھی طور، کسی بھی حال میں بری نہیں ہوتی۔ میں ہر صورت میں اور ہر قیمت پر آپ کے ساتھ، آپ کے سائے میں رہنا چاہوں گا اور بہ فرضِ محال......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہاں پاکستان میں ہمارا ایک ساتھ رہنا ممکن نہ ہوا تو میں آپ کو امریکا لے جاؤں گا پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کرسکے گی۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے میرے بچے۔'' وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔'' تم آج رات میں میری ڈائری کو پوری توجہ سے پڑھ لو۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ میں بھی ان کی تقلید میں کھڑا ہوگیا۔ یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ اب رخصت ہوں گی۔

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیڈ روم سے باہر نکل آئے۔ عظیم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ہم تینوں بالائی منزل سے زیریں منزل پر پہنچے۔ اس دوران میں ہمارے بیچ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہم خاموشی سے چلتے ہوئے گھر کے صحن میں نکل آئے۔ عظیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''برو! آپ باہر جا کر پاپا کے ساتھ بیٹھو۔ میں میڈم کو ان کے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔''

میں اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

ماں، عظیم کے ساتھ سیاہ ٹویوٹا کرولا کی جانب بڑھ گئیں۔ اس دوران میں اکبر نے بنگلے کا گیٹ وا کردیا تھا۔ مذکورہ بنگلے میں آمد و شد کے لیے دو ایک جیسے عظیم الشان گیٹ بنے ہوئے تھے۔ عظیم نے عقبی نشست کا دروازہ کھول کر پہلے ماں کو گاڑی میں بٹھایا پھر دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں چپ چاپ یہ منظر دیکھتا رہا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور سبک خرامی سے چلتے ہوئے بنگلے سے نکل گئی۔ میں بنگلے کے بیرونی حصے میں دیوار کے ساتھ بنی پھولوں والی کیاریوں کی طرف بڑھ گیا جہاں حفیظ کپور صاحب اپنے دوست مقبول بھٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ایک کرسی سنبھال لی اور یکے بعد دیگرے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا شیخ صاحب چلے گئے؟''

''ہاں۔ وہ تو گئے۔'' کپور صاحب نے جواب دیا۔ ''اور شکر کرو کہ تم سے ملے بغیر ہی وہ چلے گئے۔ خیر......'' انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک قہقہہ لگایا پھر مجھ سے پوچھا۔'' تم سناؤ، ماں سے ملاقات کیسی رہی؟''

بات ختم کرکے وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ ملاقات انتہائی نامکمل اور تشنہ رہی۔''

ان لمحات میں میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ میں اس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک طرف ماں سے ملنے کی بے پناہ خوشی بھی محسوس ہورہی تھی تو دوسری جانب ماں کے پراسرار رویّے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر اس ملاقات کے نتیجے میں، میں کافی حد تک مایوس ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ بہت کچھ میری توقعات کے برعکس پیش آیا تھا۔ خیر، میں ماں سے ملاقات کے بعد ڈسٹرب ہوگیا تھا۔ دل کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ اگر دماغ کا بوجھ قدرے کم ہوا تھا تو دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ طبیعت میں بے چینی اور مزاج میں بے قراری در آئی تھی۔

''مایوسی گناہ ہے میری جان۔'' کپور صاحب نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے کبھی کنوئیں کی بورنگ ہوتے دیکھی ہے؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''جب پانی کے حصول کے لیے زمین میں کنواں کھودا جاتا ہے یعنی بورنگ کی جاتی ہے تو پہلے سوکھی مٹی نکلتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''اس کے بعد نم مٹی، پھر گیلی مٹی، پھر گارا، پھر مٹیالا پانی، پھر صاف مگر کھارا پانی اور سب سے آخر میں صاف وشفاف میٹھا پانی۔ اسی پانی کے حصول کے لیے یہ سارا کشٹ اٹھایا جاتا ہے یعنی گوہرِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔'' لمحاتی توقف کرکے انہوں نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''انسان کی زندگی کے معاملات بھی اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وقت انسان کو مختلف آزمائشوں سے گزارتا ہے۔ زندگی قدم قدم پر انسان کا امتحان لیتی ہے۔ جو لوگ مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوتے ہیں، کامیابی ان کے لیے فرشِ راہ بن جاتی ہے۔ آج اپنی والدہ سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ کل دوسری ملاقات ہوگی پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلے گا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ رفتہ رفتہ گزرتے وقت کے ساتھ تمہاری تشنگی ختم ہوجائے گی۔ آج جو کچھ حاصل ہوا، اس پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ کل تمہیں آج سے بھی زیادہ نوازے گا۔''

''ان شاء اللہ......!'' میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''انکل! تھوڑی دیر پہلے آپ نے یہ کیوں کہا کہ...... میں شکر کروں کہ شیخ صاحب مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے؟''

''شیخ صاحب خاصے رنگین مزاج انسان ہیں۔'' انہوں نے معنی خیز انداز میں بتایا۔ ''تم نے اپنی زندگی میں شامل تین عورتوں کا ذکر کیا تو ان کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ سلمٰی صاحبہ اور تمہارے بیچ رشتے کے بارے میں تو میں نے انہیں بتا دیا تھا۔ وہ باقی دو عورتوں یعنی شارو اور ڈیلفینا کے حوالے سے تم سے تفصیلی ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ ایک وہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور دوسری وہ جو تمہیں اپنے ہاتھ میں کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ تم میری بات سمجھ گئے ہونا......؟''

''جی...... اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب ہم سب افطار سے پہلے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر ان عورتوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے مگر اسی وقت اذان ہوگئی اور شیخ صاحب کو مجھ سے سوال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر مقبول بھٹی نے کہا۔

''سائیں! مجھے اجازت دیں۔'' اس کا مخاطب حفیظ کپور تھا۔ ''گھر جا کر تراویح پڑھوں گا اور پھر کچھ آرام کروں گا۔ سحری میں بھی اٹھنا ہے۔''

''ٹھیک ہے بھائی! میں آپ کو ڈراپ کرا دیتا ہوں۔'' حفیظ کپور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عظیم واپس آجائے تو میں آپ کو اس کے ساتھ روانہ کرتا ہوں۔''

''حفیظ بھائی! تکلف کی ضرورت نہیں۔'' بھٹی نے بڑی رسان سے کہا۔ ''میں رکشا میں چلا جاؤں گا۔''

''آپ رکشا میں چلے آئے یہی کافی ہے۔'' حفیظ کپور نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''ٹھہریں، میں آپ کے لیے کوئی اور بندوبست کرتا ہوں۔ عظیم کے آسرے پر بیٹھا نہیں جاسکتا۔'' پھر بات کے اختتام پر انہوں نے بہ آوازِ بلند اپنے گھریلو ملازم کو پکارا۔

''اکبر بادشاہ......!''

اکبر اور اس کا بیٹا اصغر حفیظ کپور کی خدمات پر مامور تھے۔ ان دونوں کا تعلق اندرونِ سندھ سے تھا تاہم وہ کل وقتی ملازم تھے اور بنگلے کے پہلو میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں قیام پذیر تھے۔ وہ ایک دو ماہ کے بعد باری باری ہفتے دس دن کی چھٹی پر اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ حفیظ کپور اکبر کو عموماً اکبر بادشاہ اور اصغر کو ڈاکٹر صاحب کہہ کر

پکارتا تھا۔ اصغر کو ڈاکٹر کہنے کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ کپور صاحب کو دوا کھلانے کی ذمے داری اصغر کی تھی۔

اگلے ہی لمحے اکبر وہاں حاضر ہو گیا۔ کپور صاحب نے اس سے کہا کہ علی بھائی کو بلاؤ۔ تھوڑی دیر میں گول مٹول علی کپور ہمارے سامنے موجود تھا۔

''علی! تم ہما کی گاڑی میں بھٹی صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔'' حفیظ کپور نے بیٹے کو ہدایات دیں۔

''جی پاپا۔'' علی نے فرماں برداری سے کہا۔

''تم اکیلے نہیں جانا۔'' کپور صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''بھائی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ دونوں گپ شپ کرتے ہوئے واپس آ جانا۔''

''بھائی!'' سے کپور صاحب کی مراد یقیناً میں ہی تھا۔ علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے پاپا۔''

علی کپور کی ہمشیرہ ہما کپور کی وہائٹ سوکنسف میں ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ مقبول بھٹی کی رہائش گلستانِ جوہر میں تھی۔ علی نے ان سے پوچھا۔

''آپ اپنے ہی گھر جائیں گے یا اپنی بیٹی کے گھر جانا ہے؟''

''علی بھائی! میں اپنے گھر جاؤں گا۔'' بھٹی صاحب نے جواب دیا۔

دورانِ سفر میں علی نے مجھے بتایا کہ بھٹی صاحب کی بیٹی بھی گلستانِ جوہر ہی میں رہتی تھی اور بھٹی صاحب ان کے گھر سے واپسی پر اکثر بیٹی کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔

''علی بھائی......!'' بھٹی صاحب نے لفظ ''علی'' کو ایک خاص انداز میں کھینچتے ہوئے کہا۔ ''عظیم بھائی کا دوست بہت زبردست انسان ہے۔''

مقبول بھٹی ان لمحات میں میری تعریف کر رہا تھا۔ میں نے اس مختصر سی ملاقات میں بھٹی صاحب کو بہت گہرا اور بہت ''کرنی والا'' محسوس کیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، وہ بے پناہ روحانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس کا وجدان بہت متحرک تھا۔ اس نے میرے بارے میں بڑے درست اندازے لگائے تھے اور میں درحقیقت اس کی بتائی ہوئی باتوں کو ''اندازے'' کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے پاس یقیناً پراسرار قوتیں تھیں۔ میری معلومات کے مطابق، بعض لوگوں کے خیال میں بھٹی صاحب مؤکلات سے کام لیتے تھے اور کچھ کا ماننا یہ تھا کہ ان کے قبضے میں جنات ہیں۔ بہرحال، یہ بات طے تھی کہ وہ ایک باکمال انسان تھے۔

''بھٹی صاحب آپ کی تعریف کر رہے ہیں بھائی۔'' علی نے مجھ سے کہا۔

علی اس وقت گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے برابر میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بھٹی صاحب گاڑی کی عقبی نشست پر براجمان تھے۔ میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے علی سے کہا۔

''اگر بھٹی صاحب میری تعریف کر رہے ہیں تو ان سے کہیں کہ میرے موجودہ حالات کے بارے میں کچھ بتائیں......!''

میں نے یہ فرمائش خلافِ مزاج کی تھی۔ میں اپنے بارے میں جاننے کے حوالے سے کسی سے سوال کرنے کا عادی نہیں تھا لیکن اپنی والدہ سے مختصر سی تشنہ ملاقات کے بعد میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا، ان میں میرا یہ فعل اضطرابی سے زیادہ اضطراری تھا۔ پچھلے دو گھنٹے میں پیش آنے والے واقعات نے مجھے ذہنی طور پر بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا اور میرا یہ استفسار اسی ذہنی کیفیت کا نتیجہ تھا۔

''سائیں! یہ تو ہمیں بھی پتا ہے کہ اسد بھائی زبردست انسان ہیں۔'' علی نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے مقبول بھٹی سے کہا۔ ''آپ ذرا بھائی کے مستقبل کے بارے میں بتائیں۔''

''سائیں! ہر چیز کا علم صرف اللہ کو ہے۔'' بھٹی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا گہرا تعلق ہے ان میں سے دو عورتیں اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور بے ساختہ میں نے گردن موڑ کر عقبی نشست پر براجمان مقبول بھٹی کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟''

''سائیں! میں اللہ کا بندہ ہوں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔''

بھٹی صاحب کے معصومانہ انکشاف نے میرے اندر سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ یہ کوئی سرسری یا معمولی بات نہیں تھی۔ افطار سے پہلے انہوں نے ''سی ایس ڈی'' کا ذکر کر کے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے اپنی بات کی وضاحت میں یہ بھی بتایا تھا کہ میری زندگی میں جن تین عورتوں کا زیادہ عمل دخل ہے، ان کے نام سی، ایس اور ڈی سے شروع ہوتے ہیں۔ بھٹی صاحب کی یہ بات صد

فیصد درست بھی تھی یعنی ''سی'' سے شارو، ''ایس'' سے سلمٰی اور ''ڈی'' سے ڈیلفینا۔ میری معلومات کے مطابق، ڈیلفینا امریکا میں تھی، شارو کو لیونارڈو نامی غنڈے نے لیک جیکسن (ٹیکساس) سے اغوا کر کے ہوانا (کیوبا) پہنچا دیا تھا اور ایس (سلمٰی) کی تلاش میں، میں امریکا سے پاکستان آیا تھا اور چند منٹ پہلے میری والدہ صاحبہ سے ملاقات بھی ہوگئی تھی اور اب ...... بھٹی صاحب فرمارہے تھے کہ ان تین عورتوں میں سے دو اس وقت پاکستان میں موجود تھیں مگر شارو اور ڈیلفینا میں سے کون؟

یہ سوال میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''بھٹی صاحب! یہ میں بھی جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے ہیں اور یہ کہ اللہ آپ سے راضی بھی ہے جبھی اس نے آپ کو یہ علم بھی عطا کر رکھا ہے۔ حضرت! میں اپنی ماں سلمٰی سے ملاقات کر چکا ہوں۔ اب آپ مالک کے حکم سے یہ فرمایئے کہ شارو اور ڈیلفینا میں سے دوسری کون اس وقت پاکستان میں موجود ہے؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''لیکن......''

انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''لیکن کیا؟''

''وہ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی ہے، تمہاری بہت جلد اس سے ملاقات ہوگی۔'' بھٹی صاحب نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یہیں...... کراچی میں......''

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ شارو کو تو لیونارڈو نے ہوانا پہنچا دیا تھا۔ پریسٹن ہالو (ڈیلس) والے بنگلے میں ڈیلفینا نے مجھے شارو کے کیوبا اور ہوانا والے ویڈیو کلپس بھی دکھائے تھے۔ اس بات کا امکان صفر کے برابر تھا کہ شارو، لیونارڈو کی قید سے آزاد ہو کر کراچی پہنچ گئی ہو۔ تو کیا...... ڈیلفینا میرے تعاقب میں یہاں آ گئی تھی......؟

بھٹی صاحب کے الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے تھے...... ''اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا تعلق ہے ان میں سے دو اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔''

میں ڈیلفینا کو پریسٹن ہالو میں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بھٹی صاحب کی بیان کردہ تیسری عورت ڈیلفینا تھی تو پھر دوسری عورت یعنی شارو کو پاکستان میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ بھٹی صاحب نے تیسری عورت کی موجودگی امریکا میں بتائی تھی اور اگر ڈیلفینا میرے تعاقب میں امریکا سے پاکستان آئی تھی تو پھر شارو کو امریکا میں ہونا چاہیے تھا لیکن میری معلومات کے مطابق، شارو لیونارڈو کی کسٹڈی میں کیوبا کے شہر ہوانا میں تھی جہاں سے اسے بہاماز کے شہر ناسو پہنچایا جانے والا تھا۔

ان لمحات میں میرا ذہن بری طرح چکرا کر رہ گیا تھا۔ ایک پل کے لیے یہ خیال بھی آیا کہ عین ممکن ہے، ڈیلفینا نے مجھ سے دروغ گوئی کی ہو۔ مطلب یہ کہ شارو کو امریکا ہی میں کہیں رکھا گیا ہو لیکن مجھ سے اپنی بات منوانے کے لیے ڈیلفینا نے یہ سارا ناٹک کیا ہو۔ ڈیلفینا اچھی طرح جانتی تھی کہ شارو میری دوست ہے۔ میں اس کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان دنوں لیونارڈو سے میری اچھی خاصی مخاصمت چل رہی تھی۔ لیک جیکسن کی ایک سنسنان سڑک پر ڈیلفینا سے پہلی بار میرا سامنا ہوا تھا۔ میں اس وقت لیونارڈو کے غنڈوں سے نبرد آزما تھا اور شارو بھی اپنے گٹار سمیت میرے ساتھ تھی۔ ڈیلفینا کی آمد پر وہ لوگ وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا...... ممکن ہے، شارو کو ڈیلفینا ہی نے کہیں غائب کروا دیا ہو اور اس کے اغوا کا معاملہ لیونارڈو کے کھاتے میں ڈال کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی ہو۔ ڈیلفینا عرف ڈیلٹی اتنی بارسوخ ہسپانوی دوشیزہ تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانا جانتی تھی۔ میں نے اس کی اپروچ کے نظارے ہوسٹن اور ڈیلس میں دیکھے تھے۔ وہ یہودیوں کی ایک سیکرٹ سوسائٹی کی ممبر تھی۔ وہ مجھے بھی ''اسکل اینڈ بونز'' نامی اس سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی تھی مگر میں نے پریسٹن ہالو والے بنگلے میں بڑی بے دردی سے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ ڈیلٹی کے غرور اور انا پر ایک کاری ضرب تھی۔ اس کی پشت پر نہایت ہی طاقتور افراد تھے۔ میں نے اس کی عمدہ کارکردگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ جس یہودی لابی سے تعلق رکھتی تھی، وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی شخص کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے......!

میں نے پریسٹن ہالو والے بنگلے پر ڈیلفینا کی معیت میں جو بہتر گھنٹے گزارے تھے، اس عرصے کے ایک ایک منٹ سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے مجھ پر اچھا خاصا وقت انویسٹ کیا تھا اور مجھے زیر بار کرنے کے لیے اس نے مجھے قتل کے ایک کیس میں سے اس طرح نکال لیا تھا جیسے مکھن میں سے کھینچ کر بال کو نکالا جاتا ہے۔ لیک جیکسن والے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں لیونارڈو کا ایک آدمی پیبلو

میرے ہاتھوں بری طرح پٹنے کے بعد جہنم واصل ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں لیک جیکسن سے نکل آیا تھا۔ یوسٹن پہنچ کر میں نے ڈیلفینا سے مدد کی درخواست کی تھی اور اس نے اس کمال سے میری مدد کی کہ میں حیران رہ گیا تھا۔ ڈیلفینا کے ہی ایما پر میں یوسٹن سے ڈیلس پہنچا تھا اور پھر ڈیلفینا کی موجودگی میں، پریسٹن ہالو والے بنگلے پر ایک نیوز بلیٹن نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ خبر کے مطابق، پولیس نے پبلو کے قاتل کو گرفتار کرلیا تھا۔ مذکورہ قاتل کا نام ایلفیڈ رو تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ایلفیڈ رو نے پولیس کی تحویل میں پبلو کے قتل کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔ ڈیلفینا نے مجھے قتل کے اس کیس سے نکالنے کے لیے یہ ڈراما کیسے رچایا ہوگا، اس سے اس کی طاقت اور رسائی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا......!

میں نے مقبول بھٹی کو اس حوالے سے کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی مقام پر اٹک کر رہ گئی تھی۔ وہ میرے ہر سوال کے جواب میں کہہ دیتا۔

''سائیں! میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا......''

افطار سے پہلے ہمارے بیچ جو گفتگو ہوئی تھی، اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ میرے بارے میں بھٹی صاحب کی پیش گوئیاں اور انکشافات بڑے سنسنی خیز اور حیران کن تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ کہیں مقبول بھٹی بھی کسی سیکرٹ سوسائٹی سے وابستہ تو نہیں تھا؟

اگرچہ یہ ایک عجیب و غریب سوال تھا لیکن اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ بس، کوئی کرنے والا ہونا چاہیے......!

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، یعنی انتیس جون، اتوار کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں خالی ذہن کے ساتھ بیڈ روم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس ''ٹہل قدمی'' کا سبب وہ بے چینی اور بے قراری تھی جو ماں کی ڈائری پڑھنے کے بعد میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ نیلی جلد والی وہ ڈائری اپنے وجود میں خوفناک طوفان چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ میری ماں کی زندگی کی مختصر رپتا تھی۔ ماں نے مذکورہ ڈائری میں خود پر ٹوٹنے والی قیامتوں کو رقم کیا تھا۔ خاص طور پر میرے باپ کے قتل کے بعد ماں کو جن نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا، اس کی تفصیل ڈائری میں درج تھی اور یہ ڈائری ماں نے خصوصاً میرے لیے ہی تیار کی تھی تاکہ میں ان کی زندگی کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہوجاؤں۔ وہ حالات ایسے نہیں تھے کہ ایک ماں اپنے جوان بیٹے کے روبرو بیٹھ کر بیان کرتی۔ ایسے واقعات کو سنانے کے لیے لوہے کا دل اور سننے کے لیے پتھر کا دماغ چاہیے ہوتا ہے۔ میری ماں کے پاس آہنی دل تھا اور نہ میرے پاس چٹانی دماغ لہٰذا ماں نے ہم دونوں کی آسانی کے لیے الفاظ کا سہارا لیا تھا۔ یہ اس کی بے بسی کی انتہا تھی۔

میں نے اس ڈائری کی تحریر کو ایک بار شروع کیا تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ میں جوں جوں اپنی ماں کی داستانِ حیات کی گہرائی میں اترتا چلا گیا، توں توں میرا دماغ سن اور حواس معطل ہوتے چلے گئے اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں خالی الذہن ہوکر رہ گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور دماغ پر سناٹے نے قبضہ جمالیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں زندہ نہ رہا ہوں۔ ماں کی پُرآلام کہانی پڑھ کر میرا کلیجا پھٹ گیا ہو، دماغ کے پرخچے اڑ گئے ہوں اور حرکتِ قلب بند ہوگئی ہو...... میں زندگی سے بہت دور، موت کی وادی میں چلا گیا ہوں۔

میں کافی دیر تک اسی اذیت ناک کیفیت میں رہا پھر خالی ذہن کے ساتھ بیڈروم میں ٹہلنا شروع کردیا تھا۔

میرے والد صاحب حیدر علی کی کچھ لوگوں سے دشمنی تھی۔ والد کراچی کے ایک معروف بزنس مین تھے اور میرے والدین کے پاس مالک کا دیا سب کچھ تھا۔ میری پیدائش سے چھ ماہ پہلے میرے باپ کو قتل کردیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میری ماں نے دردر کی ٹھوکریں کھائیں اور خود کو دشمنوں کی نگاہ سے چھپا کر مجھے جنم دیا۔ میری حفاظت کی خاطر ایک سال کی عمر میں مجھے کراچی سے نیویارک بھیج دیا گیا۔ میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں دشمنوں کے شر سے محفوظ اور ان کی دست برد سے دور رہوں۔ یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوا اور اس مشن میں مرزا عامر بیگ، جاوید واسطی اور انکل علی سلطان نے بھی بہت اہم کردار ادا کیے۔

ماں نے اپنی داستان کے آخر میں تفصیلاً بتایا تھا کہ کن خوفناک اور نامساعد حالات میں میرے والدین کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد دشمنوں نے میرے والدین کا جینا عذاب کردیا تھا۔ اس بیان کے بعد ماں نے اس ڈائری میں میرے والد کے دشمنوں کے بارے میں بھی بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ میں ان معلومات کی روشنی میں بہ آسانی اپنے باپ کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔

ماں نے مجھے دشمنوں سے بچا کر محفوظ فاصلے پر پہنچادیا

تھا لیکن وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ عیار اور طاقتور دشمنوں نے اسے تباہ و برباد کر کے ایک ایسا گھناؤنا کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا جسے بیان کرنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ میری ماں حالات اور وقت کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔ وہ ہتھیار پھینک کر حالات کے دھارے میں کسی سوکھے پتے کے مانند بہنے پر مجبور ہو گئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے طاقت اور اختیار حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے دشمنوں سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے دو چیزوں کا انتظار تھا۔ نمبر ایک، وہ خود کو بے پناہ طاقتور اور بااختیار بنانا چاہتی تھی۔ نمبر دو، وہ میری تعلیم کے مکمل ہونے تک خاموش بیٹھی تھی۔ وہ ایک خاص وقت پر مجھے پاکستان بلانا چاہتی تھی اور اس کے مطابق، میں وقت سے پہلے یہاں چلا آیا تھا اور میری آمد نے ماں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

ماں کے ذہن میں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا کون سا منصوبہ تھا، اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ماں نے اس حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ڈائری سے بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، وہ ماں کے ذہن ہی میں تھا۔ میری اچانک یہاں آمد پر وہ جس طرح پریشان ہو گئی تھیں، اس سے میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ میرے یہاں آنے سے ان کی پلاننگ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

اس وقت میری ماں کراچی کی ایک صاحب ثروت اور بااثر عورت تھی۔ اس کی رہائش ڈیفنس سوسائٹی کے علاقے زمزمہ میں، ایک عالی شان بنگلے میں تھی اور وہ...... میڈم سلمٰی کہلاتی تھیں!

ماں پر گزرنے والی قیامتوں کا احوال پڑھ کر میرا دماغ آگ کا گولہ بن گیا تھا۔ ایک آتشی اذیت میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی اور مجھے اپنے جسم و جاں کسی ہلاکت خیز طوفان کی زد پر محسوس ہوتے تھے۔ ڈائری کے آخر میں ماں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھا تھا۔

''میرے بچے! میری خواہش ہے کہ تم پہلی فرصت میں واپس امریکا چلے جاؤ۔ ابھی تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں جب مناسب سمجھوں گی تو تمہیں بلا لوں گی۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو۔ مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں چند چیزیں ٹھیک کر لوں۔ پھر ہم مستقل ساتھ رہیں گے۔ امید ہے، کوئی سوال کیے بغیر تم فوراً میرے مشورے پر عمل کرو گے۔''

ماں کا ہر حکم سر آنکھوں پر لیکن میں ان کے بارے میں جتنا کچھ جان چکا تھا، ان حالات میں، میں انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ڈائری کی آخری سطور سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ انہوں نے تازہ تازہ رقم کی تھیں۔ ڈائری کا چوتھائی بھر حصہ خالی تھا یعنی میں اگر اچانک پاکستان نہ آ جاتا تو ان خالی صفحات پر ماں نے اور بھی بہت کچھ تحریر کرنا تھا۔ ماں کو پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جان کر مجھے دلی دکھ ہوا تھا۔ کاش...... یہ سب نہ ہوا ہوتا! ایک عزت دار عورت سلمٰی حیدر علی کو ''میڈم سلمٰی'' بننے تک جن اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑا تھا، کاش وہ سانحات وقوع پذیر نہ ہوئے ہوتے...... کاش......!

وقت بہت ظالم ہے۔ یہ اپنی مخصوص رفتار اور منفرد مزاج کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہ کسی کے لیے اپنے مزاج اور رفتار میں تبدیلی نہیں لاتا۔ اسے کسی کی خوشی یا غم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ سفاک وقت انسانوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستانیں رقم کرتا رواں دواں رہتا ہے۔ گزرا ہوا وقت اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ گزرے ہوئے وقت کو کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ بیتے ہوئے ماہ و سال کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا......!

ماں کی مجبوری، بے بسی اور لاچاری نے اسے عجیب مقام پر لاکھڑا کیا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ حالات کی کڑوی سچائی کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ماں کی بپتا کو پڑھ کر میرے وجود میں ایک زہریلی تلخی سی گھل گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں ماں کے ماضی کو تبدیل نہیں کرسکتا تھا لیکن میری ماں کو یہاں تک پہنچانے میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا، میں انہیں ضرور کیفر کردار تک پہنچا سکتا تھا اور...... لازمی مجھے یہ کرنا تھا۔ میری ماں کی بربادی کے ذمے دار میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتے تھے۔ مجھے ان غلیظ لوگوں کے سروں کے اوپر سے آسمان کو ہٹانا تھا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کو کھینچ لینا تھا۔ میں نے خود سے عہد کیا...... اس کرۂ ارض پر کہیں انہیں جائے اماں نہیں ملے گی۔ میں ان پر عرصۂ حیات تنگ کردوں گا...... ان شاء اللہ!

میں ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے بیڈ روم کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کی سمت ٹہل رہا تھا۔ کمرے کا ائرکنڈیشنر بڑی سبک خرامی سے چل رہا تھا۔ اندرونی ماحول ایک دم چل تھا لیکن میرے وجود میں ایک قیامت برپا تھی۔ میرا تن بدن جہنمی شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ دہکتے ہوئے دل

اور سلگتے ہوئے دماغ نے ایک ہنگامی فیصلہ سنادیا۔ یہ دونوں شاذ و نادر ہی کسی ایک نقطے پر اتفاق کرتے ہیں اور جب یہ متفق ہوجاتے ہیں تو پھر بڑے زبردست نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دل و دماغ کی باہمی مشاورت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

''مجھے ابھی اور اسی وقت اپنی ماں کے پاس جانا چاہیے اور بہت سے امور پر ان سے کھل کر بات کرنا چاہیے۔''

اس فیصلے کے بعد میں بیڈروم سے نکل آیا پھر میرے قدم خود بہ خود عظیم والے بیڈروم کی جانب بڑھ گئے۔ اس وقت ایک یہی ایسا شخص تھا جو مجھے میری ماں کے پاس پہنچا سکتا تھا۔ عظیم اپنے دو بچوں علیم اور طیبہ کے ساتھ ماسٹر بیڈروم میں موجود تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہوگا۔ میری یادداشت میں عظیم کی بتائی ہوئی یہ بات محفوظ تھی کہ رمضان کے مہینے میں وہ رات بھر جاگتا ہے اور سحری کے بعد سوتا ہے۔ میں نے عظیم والے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی اور ایک جانب کھڑا ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں عظیم کھڑا دکھائی دیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''برو! خیریت تو ہے نا......؟''

''اگر خیریت ہوتی تو تمہیں رات کے آخری پہر ڈسٹرب نہ کرتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

''کیا ہوا برو......؟'' اس کی حیرت تشویش میں بدل گئی۔ ''مجھے بتاؤ، آخر مسئلہ کیا ہے؟''

''بیڈروم کے اندر میرا دم گھٹ رہا تھا۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''کھلی فضا میں سانس لینے کو جی چاہ رہا تھا اس لیے میں کمرے سے باہر نکل آیا۔''

''اوہ......!'' وہ اپنے بیڈروم سے باہر نکلتے ہوئے بولا پھر دروازہ بند کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ''کیا تمہارے والے بیڈروم کا اے سی ٹھیک سے کام نہیں کررہا؟''

''اے سی اپنی جگہ زبردست کولنگ کررہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر دم گھٹنے کا سبب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''نیلی جلد والی وہ ڈائری جو ماں نے تمہارے ہاتھ میرے لیے بھیجی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس ڈائری کی تحریر نے میرے دل و دماغ میں ایک بھونچال سا پیدا کردیا ہے۔''

''چلو، چھت پر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''اس ڈائری میں ایسا کیا ہے جس نے تمہاری یہ حالت بنادی ہے؟''

''وہ ڈائری کسی ایٹم بم سے کم نہیں۔'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔ ''اس وقت میرے تن من کی وہی حالت زار ہے جو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کی تھی۔''

''اوکے...... مگر یہ تو بتاؤ، اس ڈائری کے اندر لکھا کیا ہے؟'' وہ قدرے اصراری انداز میں مستفسر ہوا۔

''کیا دونوں بچے سوگئے ہیں؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''دو گھنٹے پہلے علیم اور طیبہ نے اپنی ماں مہرالنسا اور دونوں بہنوں...... ...... سے بات کی تھی۔ اس وقت وہ دونوں گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔

''اسد! تم نے بتایا نہیں، اس ڈائری کے اندر تمہاری والدہ نے کیا تحریر کررکھا ہے؟''

ہم باتیں کرتے ہوئے بنگلے کی چھت پر پہنچ گئے۔ عظیم کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ چھت کے ایک حصے میں مختلف پرندوں کے کنگ سائز پنجرے بنے ہوئے تھے۔ عظیم کے بیٹے علیم کو پرندے پالنے کا شوق تھا۔ پرندوں کے علاوہ علیم نے گھر میں خرگوش اور بلیاں بھی جمع کررکھی تھیں۔ چھت کے سامنے والے حصے میں تین چار کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں اور مذکورہ کرسیوں سے چند قدموں کی دوری پر پانی والی ٹینکی بنی ہوئی تھی۔

چھت پر پہنچ کر میں نے چند گہری سانسیں لیں پھر ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عظیم کی سوالیہ نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اب کی بار وہ زبان سے کچھ نہیں بولا تاہم اس کی خاموش نگاہ مجھ سے مسلسل یہ پوچھ رہی تھی کہ نیلی جلد والی ڈائری میں ایسا کیا میں نے پڑھ لیا ہے جس کے بعد ائرکنڈیشنڈ آرام دہ بیڈروم میں میرا دم گھٹنے لگا تھا......؟

میں نے اسے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر عظیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بتایا۔

''عظیم! میری ماں نے اس ڈائری میں اپنی زندگی کی کہانی تحریر کررکھی ہے۔ وہ کہانی جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایک عزت دار شریف عورت کو وقت

کی گردش اور حالات کی ستم ظریفی نے کس طرح ''میڈم سلمٰی'' بنادیا ہے۔''

''اوہ......!'' اس نے متاسفانہ انداز میں کہا اور مجھ سے نگاہ چرانے لگا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''عظیم! تم میری ماں کو کب سے جانتے ہو؟''

''کل رات سے......'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

''جب ہمارے بیچ فون پر بات ہو رہی تھی۔ تمہیں اس ہستی تک پہنچنا تھا جس کی تلاش میں تم امریکا سے پاکستان آئے ہو۔ میں نے جب تم سے پوچھا کہ کیا تمہاری مطلوبہ ہستی کوئی خاتون ہے اور کیا اس کا نام سلمٰی ہے؟ تو جواب میں تم نے مجھ سے استفسار کیا تھا...... تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟''

''ہاں...... یہ ساری گفتگو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ اس وقت تم نے مجھ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ تم میرے حوالے سے بہت کچھ جان چکے ہو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''عظیم! میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔''

''اسد...... تم میرے دوست ہو۔'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور مجھے دوستی نبھانا آتا ہے۔ پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو......!''

''تم میڈم سلمٰی کو کب سے جانتے ہو؟'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''لگ بھگ دو سال سے۔''

''کیا کبھی تمہارا وہاں میڈم سلمٰی کے بنگلے پر جانا بھی ہوا؟''

''کبھی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''سچ کہہ رہے ہو نا......؟''

''صد فیصد سچ!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی زمانے میں بہت رنگین طبع اور کھلنڈرا ہوا کرتا تھا۔ میرا سرکل بہت وسیع تھا۔ دوست مجھے ''ملے بلوائے'' کہتے تھے۔ میں حسین تتلیوں کے تعاقب میں نگر نگر گھومتا رہتا تھا۔ اپنی من پسند لڑکی کے حصول کے لیے مجھے کبھی خواری نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ میرے دوست مجھے شکرا کہا کرتے تھے پھر ایک دن سب ختم ہوگیا......''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس پر بات ادھوری چھوڑی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''ایسا کیا ہوگیا تھا کہ...... سب کچھ ختم ہوگیا؟''

''مہر النسا سے میری شادی ہوگئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''شادی کے بعد میں نے خود کو بالکل بدل ڈالا تھا۔ ہر قسم کی آوارگی کو ترک کرکے میں صرف اور صرف مہر النسا کا ہو کر رہ گیا تھا اور آج تک اسی کا ہوں لیکن اس وفاداری کا صلہ مجھے یہ ملا کہ میں نہ تو پاپا کی نظر میں ایک اچھا انسان ہوں اور نہ ہی مہر النسا آنکھیں بند کرکے مجھ پر بھروسا کرتی ہے۔ اسے شک ہے کہ میں اب بھی لڑکیوں اور عورتوں کے چکر میں رہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مہر النسا کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ پاپا نے اس کے سامنے مجھے جیسا بنا کر پیش کیا ہے وہ میرے بارے میں ویسا سوچنے پر مجبور ہے۔ اینی ہاؤ، میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے پچھلے بارہ سال میں کبھی مہر النسا سے بے وفائی نہیں کی۔ میں صرف اپنے ضمیر اور اپنے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔ باقی کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے، اس کی مجھے پروا نہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اگر لوگوں کی ساری پروا ہم ہی کرلیں گے تو پھر وہ بے چارے کیا کریں گے؟ کچھ کام دوسروں کے کرنے کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہئیں۔''

میرے اس تبصرے پر عظیم نے کچھ کہا نہیں، خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اپنے پہلے والے سوال کو دوسرے زاویے سے اس کے سامنے رکھا۔

''اگر تمہارا کبھی میڈم سلمٰی کے بنگلے پر جانا نہیں ہوا تو پھر تم انہیں کیسے جانتے ہو؟ تم میری ماں کو ان کے گھر سے لے کر آئے تھے اور انہیں ڈراپ کرنے بھی گئے تھے......؟''

''اس بارے میں تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔'' عظیم نے کہا۔ ''تم نے مجھے جو چالیس نمبرز چیک کرنے کے لیے دیے تھے ان میں سے ایک فون نمبر نزاکت شاہ کا نکل آیا تھا۔ نزاکت شاہ سے میری اچھی جان پہچان ہے اور یہ جان پہچان ہمارے ایک مشترکہ دوست سہیل کے توسط سے تھی۔ نزاکت شاہ میڈم سلمٰی یعنی تمہاری والدہ کے پاس ملازم تھا جو دو ماہ پہلے ملازمت چھوڑ کر متحدہ عرب امارات کی ریاست راس الخیمہ جاچکا ہے۔ میں نے اپنے جس دوست سہیل کا ذکر کیا ہے، اس کا میڈم سلمٰی کے یہاں آنا جانا تھا۔ میں نے سلمٰی صاحبہ کا ایڈریس سہیل ہی سے حاصل کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری بات میری سمجھ میں آگئی اور اس امر کا بھی مجھے یقین ہے کہ تم کسی قسم کی غلط بیانی سے کام

نہیں لے رہے ہو۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس معاملے کا ایک زاویہ میرے ذہن کو الجھا رہا ہے۔''

''کون سا زاویہ؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جب تمہیں سہیل کے توسط سے میری ماں کی رہائش گاہ کا پتا چل گیا تھا تو پھر یہ سارا ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''تم مجھے اپنے ساتھ لے کر زمزمہ والے بنگلے پر جاسکتے تھے...... مجھے پورا دن سسپنس میں رکھ کر میری ماں کو یہاں لانے میں کون سی منطق یا مصلحت پنہاں تھی؟''

''تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے اور میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب تمہاری زبانی اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ تمہیں جن خاتون کی تلاش ہے، وہ وہی میڈم سلمٰی ہیں جو زمزمہ والے بنگلے پر ہوتی ہیں تو مجھے یہ اچھا محسوس نہیں ہوا کہ میں تمہیں ڈائریکٹ وہاں لے کر جاؤں کیونکہ یہ بات بھی میرے علم میں آچکی تھی کہ میڈم سلمٰی تمہاری والدہ ہیں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اسد! تم میرے دوست ہو۔ میں نے دل و جان سے تمہیں اپنا سچا دوست مانا ہے لہٰذا تمہاری ماں کی عزت و تکریم مجھ پر ایسے ہی لازم ہے جیسے میں اپنی ماں کی کرتا ہوں۔ میری نظر میں سلمٰی صاحبہ اور سعیدہ سلطانہ میں کوئی فرق نہیں اسی لیے جب مجھے تمہارے اور سلمٰی صاحبہ کے رشتے کے بارے میں پتا چلا تو میں نے تمہیں وہاں لے جانے کے بجائے اپنے گھر پر اس ملاقات کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تمہارا معاملہ پاپا کے سامنے رکھا تو انہوں نے بھی میری تجویز کی تائید کردی۔ اس طرح میں سلمٰی صاحبہ کو تم سے ملوانے کے لیے اپنے گھر لے آیا۔''

''تم نے میرا معاملہ اپنے پاپا کے سامنے رکھا...... سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے ایک نازک سوال کیا۔

''دیکھو اسد! پاپا میرے بارے میں چاہے کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں انہیں ایک دانا و بینا تجربہ کار انسان سمجھتا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا میں نے ان سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ میں نے پاپا کو تمہارے اور سلمٰی صاحبہ کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے تجویز کیا کہ تمہیں سلمٰی صاحبہ کے گھر لے کر جانا اور اس ماحول سے روشناس کرانا ٹھیک نہیں ہوگا چنانچہ اس ملاقات کے لیے ہمارے گھر کا انتخاب کیا گیا۔''

''ہوں......'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''برو! تمہیں اپنے ذہن پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ اپنایت بھرے لہجے میں بولا۔ ''جب تم میرے دوست ہو تو تمہاری ماں، میری ماں ہے۔ تمہاری ماں کی عفت، میری ماں کی عفت ہے۔ میرا گھر، تمہارا گھر ہے۔ ہم دونوں کی خوشیاں اور غم مشترک ہیں۔ تم مجھے زندگی کے ہر قدم پر اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے۔ ہماری دوستی چندروزہ نہیں، یہ زندگی بھر کا رشتہ ہے۔ یہ ہماری آخری سانسوں تک کا ناتا ہے......''

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں بازو وا کر کے کھڑا ہوگیا۔ میری دیکھا دیکھی عظیم نے بھی کرسی چھوڑ دی اور وارفتگی سے آگے بڑھ کر میرے سینے سے لگ گیا۔ میں نے شدتِ جذبات سے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

اس معانقے میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ ہماری زبانیں خاموش تھیں، صرف دل دھڑک رہے تھے۔ دل کو کچھ کہنے کے لیے زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی زبان ہوتی ہے جو جذبات کی ترجمان ہوتی ہے، دوستی کی پہچان ہوتی ہے، عزتوں کی نگہبان ہوتی ہے۔ یہ الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی، سروں کا تاج اور روحوں کی معراج ہوتی ہے۔

ہم جدا ہو کر دوبارہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تو مجھے اپنے دل کے بوجھ میں کافی حد تک کمی محسوس ہوئی۔ عظیم کی بے لوث محبت اور خلوص نے میرے ذہنی خلفشار کو خاصا کم کردیا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں عظیم کو نیلی جلد والی ڈائری کے مندرجات سے آگاہ کردیا۔

اس نے نہایت ہی توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر وہ دوستانہ انداز میں بولا۔

''نو ایشو...... برو! سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''تم اپنے والدین کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے جو بھی منصوبہ بندی کرو، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تمہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''میں فکرمند نہیں ہوں عظیم۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ مالک سب ٹھیک کردے گا لیکن......''

''لیکن کیا برادر؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''میں ماں کی ڈائری میں درج آخری الفاظ سے الجھ کر رہ گیا ہوں۔'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

کی گردش اور حالات کی ستم ظریفی نے کس طرح "میڈم سلمٰی" بنا دیا ہے۔"

"اوہ......!" اس نے متاسفانہ انداز میں کہا اور مجھ سے نگاہ چرانے لگا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "عظیم! تم میری ماں کو کب سے جانتے ہو؟"

"کل رات سے......" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

"جب ہمارے بیچ فون پر بات ہو رہی تھی۔ تمہیں اس ہستی تک پہنچنا تھا جس کی تلاش میں تم امریکا سے پاکستان آئے ہو۔ میں نے جب تم سے پوچھا کہ کیا تمہاری مطلوبہ ہستی کوئی خاتون ہے اور کیا اس کا نام سلمٰی ہے؟ تو جواب میں تم نے مجھ سے استفسار کیا تھا...... تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟"

"ہاں...... یہ ساری گفتگو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ اس وقت تم نے مجھ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ تم میرے حوالے سے بہت کچھ جان چکے ہو......" لمحاتی توقف کر کے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"عظیم! میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔"

"اسد...... تم میرے دوست ہو۔" وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور مجھے دوستی نبھانا آتا ہے۔ پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو......!"

"تم میڈم سلمٰی کو کب سے جانتے ہو؟" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ "لگ بھگ دو سال سے۔"

"کیا کبھی تمہارا وہاں میڈم سلمٰی کے بنگلے پر جانا بھی ہوا؟"

"کبھی نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"سچ کہہ رہے ہونا......؟"

"صد فیصد سچ!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں کسی زمانے میں بہت رنگین طبع اور کھلنڈرا ہوا کرتا تھا۔ میرا سرکل بہت وسیع تھا۔ دوست مجھے "بلے بلوائے" کہتے تھے۔ میں حسین تتلیوں کے تعاقب میں نگر نگر گھومتا رہتا تھا۔ اپنی من پسند لڑکی کے حصول کے لیے مجھے کبھی خواری نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ میرے دوست مجھے ٹھرکا کہا کرتے تھے پھر ایک دن سب ختم ہو گیا......"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس پر بات ادھوری چھوڑی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "ایسا کیا ہو گیا تھا کہ...... سب کچھ ختم ہو گیا؟"

"مہر النسا سے میری شادی ہو گئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "شادی کے بعد میں نے خود کو بالکل بدل ڈالا تھا۔ ہر قسم کی آوارگی کو ترک کر کے میں صرف اور صرف مہر النسا کا ہو کر رہ گیا تھا اور آج تک اسی کا ہوں لیکن اس وفاداری کا صلہ مجھے یہ ملا کہ میں نہ تو پاپا کی نظر میں ایک اچھا انسان ہوں اور نہ ہی مہر النسا آنکھیں بند کر کے مجھ پر بھروسا کرتی ہے۔ اسے شک ہے کہ میں اب بھی لڑکیوں اور عورتوں کے چکر میں رہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مہر النسا کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ پاپا نے اس کے سامنے مجھے جیسا بنا کر پیش کیا ہے وہ میرے بارے میں ویسا سوچنے پر مجبور ہے۔ اینی ہاؤ، میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے پچھلے بارہ سال میں کبھی مہر النسا سے بے وفائی نہیں کی۔ میں صرف اپنے ضمیر اور اپنے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔ باقی کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے، اس کی مجھے پروا نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "اگر لوگوں کی ساری پروا ہم ہی کر لیں گے تو پھر وہ بے چارے کیا کریں گے؟ کچھ کام دوسروں کے کرنے کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہئیں۔"

میرے اس تبصرے پر عظیم نے کچھ کہا نہیں، خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اپنے پہلے والے سوال کو دوسرے زاویے سے اس کے سامنے رکھا۔

"اگر تمہارا کبھی میڈم سلمٰی کے بنگلے پر جانا نہیں ہوا تو پھر تم انہیں کیسے جانتے ہو؟ تم میری ماں کو ان کے گھر سے لے کر آئے تھے اور انہیں ڈراپ کرنے بھی گئے تھے......؟"

"اس بارے میں تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔" عظیم نے کہا۔ "تم نے مجھے جو چالیس نمبرز چیک کرنے کے لیے دیے تھے ان میں سے ایک فون نمبر نزاکت شاہ کا نکل آیا تھا۔ نزاکت شاہ سے میری اچھی جان پہچان ہے اور یہ جان پہچان ہمارے ایک مشترکہ دوست سہیل کے توسط سے تھی۔ نزاکت شاہ میڈم سلمٰی یعنی تمہاری والدہ کے پاس ملازم تھا جو دو ماہ پہلے ملازمت چھوڑ کر متحدہ عرب امارات کی ریاست راس الخیمہ جا چکا ہے۔ میں نے اپنے جس دوست سہیل کا ذکر کیا ہے، اس کا میڈم سلمٰی کے یہاں آنا جانا تھا۔ میں نے سلمٰی صاحبہ کا ایڈریس سہیل ہی سے حاصل کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی اور اس امر کا بھی مجھے یقین ہے کہ تم کسی قسم کی غلط بیانی سے کام

"ان الفاظ میں ایسا کیا ہے برو......؟"

"ماں نے اپنی داستانِ حیات کے آخر میں مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں پہلی فرصت میں واپس امریکا چلا جاؤں۔" میں نے عظیم کو بتایا۔ "ان کے الفاظ میں ایک خاص قسم کا حکم پایا جاتا ہے۔"

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ ماں کے پیشِ نظر میرا تحفظ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے وہ مجھے خود سے فی الحال دور رکھنا چاہتی ہیں لیکن ماں کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے بعد اب میرے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ انہیں تن تنہا یہاں چھوڑ کر واپس امریکا چلا جاؤں۔ لہٰذا میرا فیصلہ یہی ہے کہ جب تک میں اپنی ماں کو اس مقام تک پہنچانے والوں کو عبرتناک انجام تک نہ دھکیل دوں، ماں سے دور جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا......؟"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور میں اس معاملے میں تمہارا ہم خیال بھی ہوں۔ تم نے ڈائری میں درج جن آخری الفاظ کا ذکر کیا ہے، ایسی ہی بات سلمٰی صاحبہ نے مجھ سے بھی کی تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جب میں انہیں گھر چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو انہوں نے تاکیداً مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں کسی طرح سمجھا بجھا کر واپس امریکا بھیج دوں۔" عظیم نے بتایا۔

"ہوں......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ "لیکن میں کسی بھی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گا۔ میرے پیشِ نظر اس وقت دو مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے حصول سے قبل میں کسی تیسرے کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"کون سے دو مقاصد؟" عظیم نے استفسار کیا۔

"نمبر ایک...... مجھے پہلی فرصت میں ماں کو گناہ کی اس دلدل سے نکالنا ہے۔" میں نے پُرعزم انداز میں کہا۔ "نمبر دو...... اس دلدل میں ان تمام افراد کو غرق کرنا ہے جو میرے باپ کے قاتل اور میری ماں کی بربادی کے ذمے دار ہیں۔"

"ان میں سے نمبر ایک کام فوری طور پر کرنے کا ہے۔" عظیم نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "سلمٰی صاحبہ کو سردست اس گھناؤنے منظر سے غائب ہو جانا چاہیے۔ کام نمبر دو کے بارے میں اس کے بعد منصوبہ بندی کی جا سکتی

ہے۔ میں کل کسی وقت پاپا سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ وہ سلمٰی صاحبہ کی رہائش کی تبدیلی یعنی ان کی گمنام زندگی کی شروعات کے لیے کوئی بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔"

"تم بالکل ٹھیک انداز میں سوچ رہے ہو عظیم۔" میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کا آئیڈیا ہے لیکن میں کل کا انتظار نہیں کرسکتا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں برو؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"تم کل کسی وقت اپنے پاپا کو اعتماد میں لے کر اس ایشو پر بات کرنے کا ارادہ رکھتے ہو اور میں ابھی...... اسی وقت اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ماں کو اس بات پر راضی کرنا ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے سیٹ اپ سے منہ موڑ کر کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہوجائیں۔ وہ اپنے کسی بھی تعلق دار سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ کسی کو کچھ پتا نہ ہو کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کررہی ہیں۔ اس دوران میں، میں اپنے اور اپنے والدین کے دشمنوں سے نمٹ لوں گا اور ماں کے یہاں سے امریکا شفٹ ہونے کا بندوبست بھی کرلوں گا۔"

"گڈ آئیڈیا۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا پھر پوچھا۔ "کیا تمہاری والدہ اس بات کے لیے راضی ہوجائیں گی؟"

"مجھے خود پر پورا بھروسا ہے کہ میں انہیں اس کام پر آمادہ کرلوں گا۔" میں نے تیقن سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے......" عظیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ہم اس سلسلے میں کل کسی وقت تمہاری والدہ سے ملاقات کرتے ہیں۔"

"کل نہیں، آج!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ابھی اور اسی وقت......!"

"او کے!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر بولا۔ "لیٹس گو۔"

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے چھت سے نیچے اتر آئے۔ عظیم نے اس بیڈروم کے اندر جھانک کر دیکھا جہاں علیم اور طیبہ پرسکون نیند سو رہے تھے پھر وہ مجھے ساتھ لے کر بنگلے کے صحن میں پہنچ گیا۔ بنگلے کے سامنے والے حصے میں دونوں کونوں پر دو عظیم الشان منقش چوبی گیٹ بنے ہوئے تھے۔ دونوں گیٹ سے بنگلے کے اندرونی حصے تک ایک مختصر ڈرائیو وے تھا۔ یہ دونوں ڈرائیو وے گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اس وقت ایک ڈرائیو وے یعنی پارکنگ خالی نظر آرہا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وٹز پارک کی جاتی تھی۔ مذکورہ گاڑی اس وقت مکینک کے پاس تھی۔ دوسرے ڈرائیو وے پر سیاہ ٹویوٹا کرولا موجود تھی۔ دونوں ڈرائیو ویز کے بیچ میں ماربل کے فرش والا ایک کشادہ حصہ تھا جہاں پر حفیظ کپور صاحب کی مخصوص چارپائی بچھی رہتی تھی۔ وہ دونوں جانب تکیے لگائے اسی چارپائی پر فروکش ہوا کرتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے آنے والے افراد کی بھی اکثر و بیشتر اسی فرش پر سٹنگ ہوا کرتی تھی۔ آپ سٹنگ سے مراد کوئی فرشی نشست نہیں سمجھ لیجیے گا۔ ملاقاتیوں کے لیے پلاسٹک اور لکڑی کی درجن بھر کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ، عموماً ویک اینڈ پر کپور صاحب اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کے لیے اسی مقام پر ڈنر کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

عظیم گیٹ کی جانب بڑھا تو میں نے پوچھا۔ "کیا تم پاپا کو اپنی روانگی کے بارے میں بتاؤ گے؟"

"نہیں!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "پاپا اس وقت گہری نیند میں ہوں گے لہٰذا انہیں جگانا اور کچھ بتانا مناسب نہیں ہوگا بلکہ ہم کسی کو کچھ بتائے بغیر ہی یہاں سے رخصت ہوں گے۔"

"جب یہاں گاڑی موجود نہیں ہوگی تو گھر والوں کو تشویش ہوسکتی ہے۔" میں نے ایک نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "گاڑی کو غائب پاکر بنگلے کے بالائی حصے کا رخ کیا جائے گا اور وہاں ہم دونوں بھی غیر موجود ہوں گے۔ ہماری غیر حاضری گھر والوں کو پریشانی میں مبتلا کرسکتی ہے۔"

"تمہاری تشویش اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔" وہ بڑی رسان سے بولا پھر پورا گیٹ وا کرنے کے بجائے مین گیٹ کے اندر بنے ہوئے منی ڈور کو کھولتے ہوئے بتانے لگا۔ "لیکن ہم گاڑی لے کر نہیں جارہے اس لیے کسی کو ہمارے حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس وقت تمام گھر والے سو رہے ہیں۔ ان کے بیدار ہونے سے پہلے ہم واپس لوٹ آئیں گے۔ ہماری آمد وجامد کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"

"کیا زمزمہ کا علاقہ یہاں سے واکنگ ڈسٹینس پر ہے جو ہم گاڑی نہیں لے کر جارہے؟" میں نے متذبذب لہجے میں دریافت کیا۔ "تم جب ماں کو چھوڑنے گئے تھے تو کافی دیر کے بعد واپس آئے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علاقہ یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے......!"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "زمزمہ کا علاقہ یہاں سے خاصا دور ہے اور ہم وہاں بہ ذریعہ ٹیکسی جائیں گے۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "کیا رات کے اس پہر ہمیں کوئی ٹیکسی آسانی سے مل جائے گی؟"

"امید ہے، مل جائے گی۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "ٹیکسی نہیں تو رکشا ضرور مل جائے گا۔ یہاں نزدیک ایک جگہ رکشا اور ٹیکسی کھڑے رہتے ہیں۔"

انسان کی نیت صاف، ارادہ نیک، عزم پختہ اور کوشش مثبت ہو تو ناممکن کو ممکن بننے میں وقت نہیں لگتا۔ ہم اپنی اسٹریٹ سے نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر پہنچے، ہمیں سامنے سے ایک یلو کیب مل گئی۔

☆☆☆

وہ رات کا آخری پہر تھا اس لیے سڑک بالکل خالی تھی۔ دن میں یہ روڈ ٹریفک کے ازدحام کے باعث ایک ہنگامی کیفیت کی غماز دکھائی دیتی تھی لیکن اس وقت تاحدِ نگاہ کوئی گاڑی نظر آرہی تھی لہٰذا ہماری یلو کیب سڑک پر اس طرح رواں دواں تھی جیسے کوئی تیز رفتار موٹر بوٹ سمندر کے سینے پر پھسلتی چلی جارہی ہو۔

عظیم نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "برو! اس وقت تین بجنے والے ہیں۔ لگ بھگ پندرہ منٹ میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ اگر تم اتفاق کرو تو......!"

"کیا تجویز ہے؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "اتفاق یا اختلاف کرنے کا فیصلہ تو تجویز سننے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔"

"انتہائے سحر لگ بھگ سوا چار بجے ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ میڈم سلمٰی کو آمادہ کرنے کے لیے تمہیں وہاں اچھا خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ اگر میں تمہیں وہاں پہنچا کر اسی ٹیکسی میں واپس آجاؤں تو کیسا رہے گا؟ اس طرح تم ان سے پوری تسلی سے بات بھی کرلو گے اور میں سحری کے وقت سے پہلے گھر واپس بھی آجاؤں گا لہٰذا گھر والوں کو ہمارے منصوبے کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بعدازاں جب تم اس اہم میٹنگ سے فارغ ہوجاؤ گے تو مجھے فون کردینا۔ میں تمہیں پک کرلوں گا۔ اس میٹنگ میں، تم دونوں کے بیچ جو بھی طے ہوگا اس کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تمہارا آئیڈیا زبردست ہے لہٰذا میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ماں سے اپنی بات منوائے بغیر وہاں سے اٹھوں گا نہیں اور میں محسوس کررہا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے اچھی خاصی محنت کرنا پڑے گی جس میں وقت تو لگے گا۔"

"یہ اہم میٹنگ ماں بیٹے کے بیچ ہی میں ہو تو اچھا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا وہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے عظیم! تم واپس گھر آکر یہاں کے معاملات کو دیکھنا اور میں وہاں کی سچویشن کو اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "جب ہم دونوں اپنے اپنے حصوں کا کام نمٹانے میں کامیاب ہوجائیں گے تو پھر فون پر رابطہ کرکے ملاقات کی سبیل نکال لیں گے۔"

"اوکے......ڈن!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

ہمارے درمیان اسی نوعیت کی بات چیت کا سلسلہ جاری رہا اور ٹیکسی نے ہمیں ڈی ایچ اے کے قلب میں واقع زمزمہ کے پوش علاقے میں پہنچادیا۔ عظیم نے ٹیکسی ڈرائیور کی راہ نمائی کی اور چند لمحات کے بعد ہم اس بنگلے کے سامنے پہنچ گئے جہاں میری ماں رہائش پذیر تھیں۔

بنگلے کا گیٹ بند تھا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اس وقت کسی بھی گھر کا داخلی دروازہ بند ہی ہونا چاہیے تھا۔ عظیم نے مجھ سے کہا۔

"اسد! تم جاکر بنگلے کی ڈور بیل بجاؤ۔ میں ادھر ٹیکسی ہی میں بیٹھا ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے باہر آگیا۔

مذکورہ بنگلا "سرتاپا" سفید تھا۔ بنگلے کی دیدہ زیبی اور دل کشی اپنی جگہ اہمیت کی حامل تو تھی ہی لیکن اس کے برف کے مانند سفید رنگ نے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگادیے تھے۔ تاریک رات میں وہ سفید بنگلا کسی خواب محل کا منظر پیش کرتا تھا۔ یہ دل فریب نظارہ دیکھنے والے کی آنکھوں کو مسحور، دماغ کو مخمور اور دل کو مسرور کرتا تھا۔

میں جیسے ہی بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھا اور ڈور بیل بجانے کے لیے ہاتھ کو بٹن کی سمت بڑھایا، ایک رعب دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ کون ہو اور اس وقت یہاں کیا لینے آئے ہو؟"
میری نگاہ نے اس سوالیہ آواز کا تعاقب کیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ آواز بنگلے کے اندرونی حصے میں گیٹ کے قریب بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں سے آئی تھی۔ یقیناً یہ منی روم کسی گارڈ یا چوکیدار کے تصرف میں تھا جو اس بنگلے کی حفاظت پر مامور تھا لیکن اس دوران میں، میں نے میکانکی انداز میں ڈور بیل کا بٹن دبا دیا تھا۔

بنگلے کے اندرونی حصے میں گھنٹی بج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس شخص کا چہرہ بھی نظر آ گیا جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے استفسار کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود کھڑکی کے راستے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"بھائی! کیا مسئلہ ہے؟ تم کون ہو اور کس سے ملنے آئے ہو؟"

اس کے استفسارات میں درشتی پائی جاتی تھی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ کو صحیح معنوں میں ایسا ہی دبنگ ہونا چاہیے تھا۔ میں اس کے نزدیک چلا گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

"میرا نام اسد علی ہے اور میں میڈم سے ملنے آیا ہوں۔"

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "میڈم اس وقت کسی سے نہیں مل سکتیں۔ آپ کل دن میں کسی وقت آنا۔"

"مجھے ابھی اور اسی وقت سلمٰی صاحبہ سے ملنا ہے۔" میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ "مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔"

"کام ضروری ہو یا غیر ضروری لیکن میڈم اس وقت سو رہی ہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "اور میں کسی بھی قیمت پر انہیں اٹھا نہیں سکتا۔"

"تم جا کر انہیں بتاؤ کہ اسد علی آیا ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ میرا نام سنتے ہی بیدار ہو جائیں گی۔"

میں نے دانستہ اسے یہ نہیں کہا تھا کہ سلمٰی صاحبہ سے ان کا بیٹا ملنے آیا ہے۔ میں اس راز کو ماں کی اجازت بغیر کسی اجنبی پر نہیں کھول سکتا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ مجھے اندر جانے کی اجازت دینے کو قطعاً آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے عظیم نے صورتِ حال کو بھانپ لیا اور ٹیکسی سے نکل کر میرے قریب آ گیا۔

عظیم کو دیکھ کر سیکیورٹی گارڈ کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے عظیم کو سلام بھی کیا۔ عظیم نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔

"اسد صاحب کو میڈم سے ملوا دو۔ یہ بہت دور سے آئے ہیں۔ ان کا فوری طور پر میڈم سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن میڈم اس وقت اپنے بیڈروم میں سو رہی ہیں۔" سیکیورٹی گارڈ نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ "جب سے آپ انہیں چھوڑ کر گئے ہیں وہ اپنے بیڈروم میں بند ہیں۔ انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ آج وہ دیر تک سوئیں گی لہٰذا انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"میں تمہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گا۔" عظیم نے گارڈ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "تم ایک کام کرو۔ اسد صاحب کو اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا دو۔ میڈم جب بھی بیدار ہوں، تم ان سے اسد صاحب کی ملاقات کروا دینا۔"

"آپ اسد صاحب کی گارنٹی لیتے ہیں......؟" گارڈ نے متذبذب انداز میں عظیم سے استفسار کیا۔

جواب میں عظیم نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں مجھ پر بھروسا ہے؟"

"جی صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جب میڈم آپ کے ساتھ، آپ کی گاڑی میں بنگلے سے باہر جا سکتی ہیں تو آپ میرے لیے قابلِ اعتماد ہیں۔"

"اگر میں تمہارے لیے قابلِ اعتماد ہوں تو بس پھر تم میری بات کو مان لو۔" عظیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسد صاحب تمہاری میڈم کی نظر میں مجھ سے بھی زیادہ قابلِ بھروسا ہیں۔ میں میڈم کو انہی سے ملوانے کے لیے یہاں سے لے کر گیا تھا۔ اس ملاقات میں کچھ چیزیں طے ہونا باقی رہ گئی تھیں جو فوری طور پر ڈسکس ہونا بہت ضروری ہیں۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔" سیکیورٹی گارڈ نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسد صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتا ہوں۔ اگر میڈم خود ہی بیدار ہو گئیں تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں صبح تک میڈم کے اٹھنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"اوکے...... ٹھیک ہے۔" عظیم نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیسٹ آف لک...... میں جاگ رہا ہوں۔ اگر کوئی ضروری بات ہوئی تو مجھے فون کر لینا۔"

"شیور!" میں نے کہا۔

عظیم مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہوا تو

میں سکیورٹی گارڈ کی معیت میں بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔

ماں کا بنگلا جتنا عالی شان باہر سے نظر آتا تھا، اس سے کہیں زیادہ دل کش وہ اندر سے تھا۔ بنگلے کی اندرونی عمارت بھی ایک دم سفید تھی اور مین گیٹ سے لے کر رہائشی حصے تک ایک کشادہ گراسی لان تھا۔ اس رہائش گاہ کو دیکھ کر ذہن میں "وہائٹ ہاؤس" کے الفاظ ابھر آتے تھے یعنی دودھ میں نہایا ہوا انڈے کے مانند ایک خوب صورت اور دیدہ زیب گھر جسے کسی اعلیٰ ذوق کے مالک شخص نے بڑے چاؤ سے تعمیر کرایا ہو۔

بنگلے کے مین گیٹ سے ڈرائنگ روم تک کے سفر کے دوران میں مجھے سکیورٹی گارڈ...... کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اس شخص کا نام جمشید تھا اور وہ ایک طویل عرصے سے سلمٰی صاحبہ کے پاس ملازمت کررہا تھا۔ جمشید سکیورٹی گارڈ رچوکیدار والی مخصوص یونیفارم میں ملبوس تھا اور جب وہ مجھے ڈرائنگ روم تک چھوڑنے آرہا تھا تو ایک دم چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنی گن کو بھی بڑی مستعدی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔

جمشید مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر واپس چلا گیا تو میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک سجا سجایا روایتی ڈرائنگ روم تھا جہاں پر کم و بیش بہ یک وقت بیس افراد کے بیٹھنے کے لیے قیمتی صوفے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر کسی معروف آرٹسٹ کے فن پارے آویزاں کیے گئے تھے۔ ان پینٹنگز میں بڑی معنویت چھپی ہوئی تھی۔ میں کافی دیر تک ان مصوری کے شاہ کاروں کے مشاہدے میں کھویا رہا۔

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ ماں کے بنگلے کے اندر داخلے کے سلسلے میں عظیم نے میری بہت مدد کی تھی۔ جمشید، عظیم کا صورت آشنا تھا کیونکہ آج شام میں ماں عظیم کی گاڑی میں یہاں سے رخصت ہوئی تھیں اور عظیم ہی پھر انہیں واپس بھی چھوڑنے آیا تھا لہٰذا عظیم، جمشید کی نظر میں ایک قابلِ بھروسا شخص تھا۔ اسی وجہ سے جمشید نے عظیم کی سفارش پر مجھے بنگلے کے اندر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

میں اس وقت اپنی ماں کے گھر میں بیٹھا تھا۔ وہ ماں جسے انیس سال کے بعد آج پہلی مرتبہ میں نے دیکھا تھا۔ جب میں ایک سال کا تھا تو حالات کے جبر اور وقت کی سفاکی نے مجھے ماں سے جدا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ میری سلامتی اور حفاظت کی خاطر ماں نے مجھے ایک سال کی عمر میں کراچی سے نیویارک بھیج دیا تھا۔ اب میں بیس سال کا ایک گبرو جوان تھا۔ جب ماں نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر مجھے خود سے دور کیا اس وقت میں سوچنے سمجھنے کی باقاعدہ اور شعوری صلاحیت سے مالا مال نہیں تھا۔ ایک سال کے بچے کی بھلا کیا سوچ ہوگی لیکن اب میں عاقل، بالغ اور جوان ہو چکا تھا اور ہر قسم کے حالات کی سنگینی اور نزاکت کو گہرائی تک بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔

ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا میں صرف اور صرف اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری ماں نے اس دوران میں بہت زیادہ تکلیف اور اذیت اٹھائی تھی۔ میرے باپ کے قتل کے بعد تو دشمنوں نے ماں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا۔ یہ ماں کی ہمت تھی کہ وہ اب تک زندہ تھیں۔ وہ نہ صرف زندہ تھیں بلکہ انہوں نے خود کو معاشرے میں خاصا مضبوط اور بارسوخ بھی بنالیا تھا۔

ماں کی مضبوطی اور بااختیاری کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹ سی گئی۔ اس چھناکے کی آواز صرف میرے احساس نے سنی تھی اور اس ٹوٹنے والی چیز کی نکیلی کرچیوں نے میرے احساس کی ساعت کو لہولہو کردیا تھا۔ میں حساس دل کا مالک ایک حقیقت پسند انسان ہوں لہٰذا میں اس تلخ حقیقت سے نگاہ چرا نہیں سکتا تھا کہ ماں کو اتنا بااثر اور مضبوط بننے کے لیے کیسی کیسی شرمناک قربانیاں دینا پڑی تھیں۔ انہوں نے دشمنوں سے بچا کر مجھے ایک محفوظ مقام تک تو پہنچا دیا تھا لیکن وہ اپنی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ ذلیل اور کمینے دشمنوں نے اس مجبور عورت کو اپنی طاقت اور اثر رسوخ کے بل پر، ایک ایسی گھناؤنی راہ پر چلنے کے لیے چھوڑ دیا تھا جس کی پہلی اور آخری منزل تباہی و بربادی ہی ہے۔ میری ماں لاچاری اور بے بسی کے عالم میں وقت اور حالات کے دھارے میں بہتی ہوئی یہاں تک آگئی تھی۔

زمانہ سب سے بڑا استاد، زندگی سب سے بڑی راہ نما اور دنیا سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمانے، زندگی اور دنیا نے ماں کو بہت کچھ سکھا دیا تھا لیکن بس......!

میں یک لخت صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ میری ایک اضطراری حرکت تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور پورے وجود میں ایک خوفناک طوفان چنگھاڑ رہا تھا۔ ماں کی زندگی میں در آنے والی اذیتوں نے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خوفناک طوفان مجھے ریزہ ریزہ کردے گا...... میں

فضائے بسیط میں بکھر کر بے نام و نشان ہو جاؤں گا۔
وقت نے میری ماں کے خلاف بڑی خوفناک چال چلی تھی۔ اس شاطر کی چالیں ایسی ہی خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ یہ بادشاہ ہے، بااختیار ہے۔ کائنات کی ہر شے پر اسے قدرت حاصل ہے۔ یہ مرضی کا مالک ہے اور من مانی کرنے کے لیے ہر لحہ آزاد ہے۔ اس کی صوابدید ہے کہ یہ جب چاہے، جس کی زندگی میں زہر بھر دے یا امرت۔ اس کے فیصلے کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔
ان لمحات میں، میں ایک دوسرے زاویے سے بھی سوچ رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت کی طاقت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہے لیکن اس کی گردش بھی بے معنی نہیں۔ یہ حالات کو کبھی سازگار اور کبھی ناسازگار بنا کر انسان کو کچھ سمجھانے اور سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان وقت کے اشاروں کو سمجھنے لگے اور اس کی منشا سے سبق سیکھنے لگے تو پھر کوئی مسئلہ، مسئلہ نہیں رہتا۔ ہر درد کی دوا اور ہر دکھ کا مداوا ممکن ہو جاتا ہے۔
ان انتہائی جذباتی ساعتوں میں، میں نے دل کی گہرائیوں سے عزم کیا کہ میں اپنی ماں کے ہر درد کی دوا بن جاؤں گا، ان کے ہر دکھ کا مداوا کر کے رہوں گا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے یقیناً ان معاشرتی ناسوروں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننا تھا جنہوں نے میری ماں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں میرے بدترین انتقام سے بچا نہیں سکتی تھی...... کبھی نہیں، کسی بھی قیمت پر نہیں!
اس پُرعزم فیصلے کے بعد مجھے اپنے وجود میں ایک اطمینان سا اترتا محسوس ہوا۔ دل پُرسکون اور دماغ شانت ہو گیا تھا۔ میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے جمشید ڈرائنگ روم میں نمودار ہوا۔
میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "صاحب! میڈم نے آپ کو بلایا ہے۔"
"کیا سلمٰی صاحبہ بیدار ہو گئی ہیں......؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔
"جی صاحب!" جمشید نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ابھی انہوں نے مجھے انٹرکام پر بتایا ہے کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے جس نوجوان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے، اسے ان کے پاس لے آؤں۔"
"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جمشید سے پوچھا۔ "کیا تم نے میڈم کو میری آمد کی اطلاع دے دی تھی؟"
"نہیں......" اس نے گردن کو نفی میں جنبش دی۔
"پھر...... پھر انہیں کیسے پتا چلا؟" میرے سوال میں حیرت چھپی تھی۔
"انہوں نے آپ کو کیمرے میں دیکھ لیا ہوگا۔" اس نے بتایا۔
"کیمرے میں......" میں چونک اٹھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"اس بنگلے کے گیٹ پر اور بنگلے کے عقبی حصے میں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ان کیمروں کا کنٹرول میڈم کے بیڈ روم میں ہے۔"
"اوہ......" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "تمہارا مطلب ہے سی سی ٹی وی کیمرے؟"
"جی جی...... وہی۔" وہ جلدی سے بولا۔
"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سلمٰی صاحبہ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔" میں نے اس کے ساتھ بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔"
"جناب! میں تو میڈم کا ملازم ہوں، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "میڈم رات کو جب باہر سے واپس آئی تھیں تو انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا، اب وہ اپنے کمرے میں آرام کریں گی لہٰذا انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"
ہم باتیں کرتے ہوئے ایک دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ جمشید نے مجھ سے کہا۔ "یہ میڈم کا بیڈ روم ہے۔ انہوں نے مجھے آپ کو یہیں تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ آپ دروازے پر دستک دے کر اندر جا سکتے ہیں۔"
میرا دل دھڑک اٹھا۔ ماں سے ملاقات کا تصور ہی بڑا سنسنی خیز اور فرحت بخش تھا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ چند گھنٹے پہلے میں عظیم کے گھر میں ان سے پہلی ملاقات کر چکا تھا لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری نگاہ پہلی مرتبہ ان کا دیدار کرنے والی ہو۔ شاید یہ احساس اس تڑپ کا ردِعمل تھا جو برسوں سے میرے دل و دماغ میں رچی بسی تھی۔ اپنے والدین سے محرومی کے خیال نے میری یادداشت میں بسیرا کر رکھا تھا۔ انسان سالہا سال سے جس چیز سے دور رہا ہو جب پھر برسوں بعد وہ چیز اس کے سامنے آجائے تو جاگتی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا۔ ان لمحات میں

میرے ذہن کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔

"تم جاؤ۔" میں نے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں میڈم سے خود ہی ملاقات کرلوں گا۔ تمہارا وہاں گیٹ پر موجود رہ کر ڈیوٹی دینا زیادہ ضروری ہے۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ وا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنی ماں کے بیڈروم کے اندر تھا۔

ماں نے جی بھر کر مجھے پیار کیا۔ عظیم کے گھر میں بھی انہوں نے مجھ پر اپنی محبت نچھاور کی تھی لیکن تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ وقت، مقام اور ماحول سے انسان کے جذبات کے اظہار میں کافی فرق آجاتا ہے۔ عظیم کا گھر ماں کے لیے پرایا گھر تھا اور اس وقت وہ اپنے ذاتی بنگلے میں تھیں۔ وہ زیادہ اعتماد، تحفظ اور والہانہ پن سے اپنے جذبات کی تسکین کرسکتی تھیں اور میرے ذہن و دل کی کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔

جب ہم نارمل انداز میں گفتگو کرنے کے قابل ہوئے تو میں نے کہا۔ "ماں! آپ ابھی تک جاگ رہی تھیں؟"

"ہاں!" انہوں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور زیرِلب مسکراتے ہوئے بتایا۔ "مجھے تمہارا انتظار تھا اس لیے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"میرا انتظار......" میں نے حیرت بھری نظر سے انہیں دیکھا۔ "لیکن آپ تو عظیم کے گھر سے جس انداز میں رخصت ہوئی تھیں اور ڈائری کے آخری الفاظ میں آپ نے جس طرح مجھے فی الفور واپس امریکا چلے جانے کی ہدایت کی تھی، اس سب کے بعد میرے انتظار کا جواز باقی کہاں رہتا تھا؟"

"ہر چیز کا جواز ہر وقت باقی رہتا ہے میرے لعل۔" وہ بڑے دلار سے بولیں پھر میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے باپ کی ٹرو کاپی ہو۔ ایک دم ضدی اور معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے سرگرم۔ مجھے یقین تھا کہ تم میری ڈائری کو پڑھنے کے بعد فوری طور پر ادھر کا رخ کرو گے اس لیے میں تمہارے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ تم اس وقت تک سکون سے بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے جب تک اس معاملے کو کسی منطقی انجام تک نہ پہنچادو۔"

"میرے بارے میں آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کی داستانِ حیات پوری توجہ سے پڑھ لی ہے اور اپنے دشمنوں کو یادداشت کے خانے میں محفوظ کرلیا ہے۔ میں ان شیطانوں کے ساتھ جو بھی سلوک کروں گا وہ ان کے علاوہ دیکھنے والوں کے لیے بھی باعثِ عبرت ہوگا لیکن آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا......"

"کیسا وعدہ؟" انہوں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"جب میں آپ سے بچھڑا اس وقت میری عمر صرف ایک سال تھی۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "آج میں بیس سال کا ہوچکا ہوں۔ بائیس دسمبر کو میرا برتھ ڈے ہوگا۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ ان انیس سالوں میں آپ کی زندگی میں جو جو تلخ واقعات پیش آئے، ہم ان پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ آپ آج بھی میرے لیے ایک عظیم ماں ہیں...... پاک دامن اور عفت مآب۔ قابلِ احترام ممتا کا خزانہ۔"

"میں خود بھی ان زہریلی یادوں کو دہرا کر اپنے دکھوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اذیت بھرے لہجے میں بولیں۔ "میرے نصیب میں جو لکھا تھا وہ ہو کر رہا......"

"یہ ٹھیک ہے کہ انسان اپنے نصیب سے لڑ نہیں سکتا۔" میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "اب بھی وہی ہوگا جو ہمارے نصیب میں رقم ہے لیکن یہ پہلے سے کافی مختلف ہوگا۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو میرے بچے؟" وہ چونکتا انداز میں مجھے تکنے لگیں۔

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا مالک زبردست انصاف کرنے والا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس مالک نے آپ کو اور مجھے جن آزمائشوں سے گزارا ہے، اس کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد پوشیدہ ہے۔ انسان مالک کی مصلحتوں، منطقوں اور حکمتوں کو سمجھ نہیں پاتا لیکن میں ایک بات بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ چکا ہوں۔"

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو ماں نے پوچھا۔ "کون سی بات میرے بچے؟"

"اس بنگلے میں یہ آپ کی آخری رات ہے۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "کل میں آپ کو کہیں اور شفٹ کردوں گا اور جب تک ایسا ہو نہیں جاتا، میں سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہوں گا۔ آپ مجھے کہیں جانے کو نہیں کہیں گی...... بس۔"

"میں خود بھی اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں اور اسے خیرباد کہنا چاہتی ہوں۔" وہ دکھی لہجے میں بولیں۔ "مگر یہ کام ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مترادف نہیں ہے۔ مجھے اس سیٹ اپ سے نکلنے کے لیے کچھ وقت لگے گا۔"

"ماں! آپ نے مجھے جنم دیا ہے۔ آپ مجھ سے بڑی ہیں، مجھ سے زیادہ سمجھدار اور زمانہ شناس ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں ایک بات جانتا ہوں کہ ہنگامی نوعیت کے فیصلے یا تو فی الفور کیے جاسکتے ہیں اور یا پھر کبھی بھی نہیں کیے جاسکتے۔ میں آپ کے معاملے کو ناممکن سے پہلے ممکن بنانا چاہتا ہوں۔ آنے والی رات آپ اس غلاظت بھرے ماحول میں نہیں گزاریں گی۔ میں آپ کے لیے کسی محفوظ اور پاکیزہ رہائش کا بندوبست کردوں گا۔ ایک ایسی جگہ جس کے بارے میں آپ کے کسی جاننے والے کو معلوم نہیں ہوگا۔ کوئی آپ سے رابطہ نہیں کرسکے گا......"

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھیں۔ "آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں آپ کو اپنے ساتھ امریکا لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے میرے بچے؟" وہ بے یقینی سے بولیں۔

"آپ کا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

"آپ نے اس پاسپورٹ پر ٹریول بھی کیا ہوگا؟"

"ہاں۔ میں کئی بار دبئی جاچکی ہوں۔" انہوں نے بتایا۔

"اس کے علاوہ اور کہیں ٹریول کیا ہے؟"

"ایک مرتبہ ملائیشیا اور دو دفعہ تھائی لینڈ بھی گئی ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "اب میں آپ کے امریکا کے ویزا کے لیے آن لائن اپلائی کررہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر آپ کو امریکا کا ویزا مل جائے گا۔"

"کیا امریکا کا ویزا حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہے......" انہوں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ "تم وزٹ ویزا کی بات کررہے ہو نا؟"

"جی ماں! میں وزٹ ویزا ہی کی بات کررہا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس دنیا میں کوئی بھی کام آسانی سے نہیں ہوتا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے۔ امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے جو بھی بنیادی تقاضے ہیں وہ میں آپ کے لیے آسانی سے پورے کرواسکتا ہوں۔ اس لیے مجھے صد فیصد یقین ہے کہ آپ کو ویزا مل جائے گا۔"

"مثلاً وہ بنیادی تقاضے کیا ہیں؟" انہوں نے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی پراپرٹی کی اس وقت کیا ویلیو ہوگی۔" میں نے سوال کیا۔ "وہ پراپرٹی جو آپ کے نام پر ہے؟"

"کم از کم پندرہ کروڑ روپے اس بنگلے کی قیمت ہوگی۔" انہوں نے بتایا۔

"گڈ!" میں نے تسلی بخش انداز میں کہا اور پوچھا۔ "بینک بیلنس کی کیا پوزیشن ہے؟"

"میرا موجودہ بیلنس پچاس لاکھ سے اوپر ہی ہوگا۔"

"اور گاڑی؟"

"وہ بھی تیس لاکھ کے آس پاس ہے۔"

"بس تو آپ کی طرف سے معاملہ ایک دم زبردست ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بس تو پھر کیا مشکل ہے جب آپ تمام تر تقاضے پورے کرنے کے قابل ہیں تو آپ آرام سے امریکا جاسکتی ہیں۔

"میں آج ہی انکل علی سلطان سے بات کرکے تمام ضروری کاغذات منگوالیتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ کام آپ کے کرنے کے ہیں۔"

"مجھے کون سے کام کرنا ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"نمبر ایک۔ اپنے بینک سے پچھلے چھ ماہ کی "بینک اسٹیٹ منٹ" نکلوالیں جس کا کلوزنگ بیلنس بیس لاکھ سے زیادہ کا ہونا چاہیے۔"

"یہ کام ہوجائے گا۔" وہ یقینی لہجے میں بولیں۔ "کلوزنگ بیلنس پچاس لاکھ سے اوپر ہی ہوگا۔"

"ویری گڈ۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "نمبر دو۔ کسی بھی نوٹری پبلک کے پاس جاکر آپ بنگلے اور گاڑی کی اونر شپ کا ایفی ڈیوٹ بنوالیں جس میں ان دونوں چیزوں کی مالیت کا ذکر بھی ہو۔ اسٹیمپ پیپر پر بنتے ہوئے اس ایفی ڈیوٹ میں آپ اپنی جیولری اور دیگر قیمتی چیزوں کی مالیت کا بھی اندراج کرواسکتی ہیں۔"

"یہ کام بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔" ماں نے کہا۔ "کل دن میں ہوجائے گا۔"

"اس کے علاوہ آپ اپنے دو سال کے ٹیکس ریٹرنز اور این ٹی این کارڈ کی کاپی بھی کروالیں۔"

"اور کچھ......؟" ماں نے محبت پاش سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"بس اور کچھ نہیں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "باقی کے سارے کام میں عظیم کی مدد سے نمٹالوں گا۔ آج کل اس کی مسز دو بچوں کے ساتھ امریکا

گھومنے گئی ہوئی ہے۔''

''عظیم مجھے کافی سمجھدار اور مخلص لگا ہے۔'' ماں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ تمہیں یہاں چھوڑنے بھی آیا تھا۔ میں نے کیمرے کی آنکھ سے اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔''

''عظیم اور اس کی پوری فیملی بہت ملنسار اور ہمدرد لوگ ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے باپ حفیظ کپور سے بھی ملا ہوں۔ بہت ہی ڈیشنگ اور اونچی پہنچ والا انسان ہے۔''

''مجھے بھی شام میں ان کے گھر جا کر اچھا لگا تھا۔'' ماں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ لوگ ہندو کمیونٹی سے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ ''کپور'' لگا ہوا ہے اس لیے پوچھ رہی ہوں......!''

میں نے ماں کو اس فیملی کے بارے میں اپنی معلومات کے مطابق، نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں بتانے کے بعد کہا۔ ''تین چار نسلیں پہلے ان کے آباؤاجداد ہندو ہوا کرتے تھے پھر جب ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تو یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ آزادی کے بعد یہ لوگ سرگودھا میں آباد ہوئے تھے پھر کاروبار کے سلسلے میں کراچی چلے آئے مگر فیملی کا سرنیم انہوں نے چھوڑا نہیں۔ ان کے خاندان کے تمام افراد کے نام کے ساتھ ''کپور'' لگا ہوا ہے۔ حفیظ کپور صاحب کراچی کے بہت بڑے امپورٹر ہیں۔''

''تمہاری یہ خوش قسمتی ہے کہ یہاں پہنچتے ہی تمہیں اچھے اور مخلص لوگوں کا ساتھ مل گیا۔'' پوری بات سننے کے بعد ماں نے کہا۔

''وہ اس لیے کہ یہاں میری آمد کا مقصد نیک تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انسان کی نیت صاف ہو تو مالک ضرور اس کی مدد کرتا ہے۔ دیکھ لیں، میں نے کتنی آسانی سے آپ کو تلاش کر لیا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو میرے لعل!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ''اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ اب تم تھوڑا آرام کر لو۔''

''ابھی میرا کام مکمل نہیں ہوا ماں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے کام، پھر آرام۔''

''اب کیا کرنا باقی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''دو اہم کام ابھی نمٹانا ہیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انکل علی سلطان کو فون کر کے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنا ہے اور عظیم سے کہہ کر آپ کی رہائش کا کوئی محفوظ اور مضبوط بندوبست کرنا ہے۔''

''یہ کام کل دن میں بھی ہو سکتے ہیں۔'' وہ ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔ ''میں دیکھ رہی ہوں، تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ ایک بھرپور اور گہری نیند لے لو۔ کل کی کل دیکھ لیں گے۔''

''نیند میں ضرور لوں گا ماں اور آپ کے بنگلے پر تو یقیناً مجھے بہت پرسکون نیند آئے گی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے دو ضروری کالز کر لوں۔''

وہ مجھے دیکھ کر زیر لب مسکراتی چلی گئیں۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی معنی خیزی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں ماں؟''

ان کے ہونٹوں سے یک بہ یک مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اب ان کی آنکھوں اور چہرے پر اداسی خیمہ زن نظر آ رہی تھی۔ اس تیزی سے بدلتی ماں کی حالت نے مجھے پوچھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا ہوا ماں...... آپ اچانک دکھی کیوں ہو گئی ہیں؟''

''کچھ نہیں میرے بچے۔'' وہ آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''تمہارے ضدی انداز کو دیکھ کر مجھے حیدر علی کی یاد آ گئی تھی۔ مجھے پتا ہے، جب تک تم یہ دو فون کالز نہیں کر لو گے، تمہیں قرار نہیں آئے گا۔ تم مزاج، عادات اور انداز میں اپنے باپ کی زندہ مثال ہو۔ اس پر قدوقامت اور شکل وصورت بھی ہوبہو حیدر علی جیسی ہی ہے۔ تم اپنے باپ کی جوانی کی تصویر ہو اسی لیے......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئیں تو میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ''اسی لیے کیا ماں؟''

''تمہارے باپ کے قاتل اور ہمارے دشمن ابھی زندہ ہیں اور اسی شہر میں موجود ہیں۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولیں۔ ''اس لیے میں خوفزدہ ہوں کہ ان میں سے کسی کی تم پر نظر نہ پڑ جائے۔ میں تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم ایک ماں کے دل کی کیفیت کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے میرے بچے۔ میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی تبھی...... تبھی میں نے تمہیں فوراً امریکا واپس چلے جانے کے لیے کہا تھا۔''

یہ سچ ہے کہ اولاد اپنے والدین کے جذبات کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکتی اور ماں کی ممتا کا تو انداز ہی بڑا منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے تحفظ کے لیے بے حد فکرمند ہوتی ہے اور اگر کوئی ماں اپنے شوہر کو کھو چکی

ہو، اپنی زندگی کی قیمتی چیزیں لٹا چکی ہو، اس نے دردر کی ٹھوکریں کھائی ہوں، اذیت ناک دن اور کرب ناک راتیں اس کا مقدر ٹھہری ہوں تو ایسی ماں کی حساسیت اور تحفظات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کے وسوسے، اندیشے اور خدشے لامحدود ہوجاتے ہیں۔ میں ماں کی ذہنی کیفیت کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ میں ان کی متاع عزیز، ان کی واحد امید تھا۔ وہ اس قیمتی اثاثے کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھیں اسی لیے میری حفاظت کے حوالے سے بے پناہ فکر مند تھیں۔

''ماں جی! میں کوئی ننھا منا کمزور سا بچہ نہیں ہوں جو دشمن مجھے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔'' میں نے ان کے خطرات میں گھرے ہوئے دل و دماغ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ان کمینوں سے نمٹنے اور انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی اور آپ کی حفاظت کرنا بہ خوبی جانتا ہوں۔''

''نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں۔ ''میں تمہیں کسی بھی قسم کی جہنمی آگ میں کودنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''اگر میں ان ذلیل لوگوں کو نمونہ عبرت نہیں بناؤں گا تو آپ کا انتقام کیسے پورا ہوگا ماں......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اپنی ماں کے مجرموں کو ایسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

''تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا میرے لعل!'' وہ اصراری لہجے میں بولیں۔

''کون سا حکم؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''تم مجھے مل گئے ہو تو میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔ ''تم بھی دشمنوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ کا غضب خود ہی ان درندوں سے حساب کتاب کرلے گا۔''

''اوکے......!'' میں نے ماں کی خواہش کے سامنے سپر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بات مانتے ہوئے دشمنوں سے انتقام کے خیال کو دل سے نکال رہا ہوں۔ اس کے بدلے میں آپ کو بھی میری ایک بات ماننا ہوگی......!''

''ایک نہیں، میں تمہاری دس باتیں مانوں گی میری جان۔'' وہ جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں کسی بھی قیمت پر تمہیں کھونا یا تمہیں کوئی نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتی۔ میرا دل پہلے ہی چھلنی ہوچکا ہے۔ اگر تمہارا ایک بال بھی بیکا ہوگا تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوسکے گا۔''

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کی خواہش کا پورا احترام کروں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی مجھ سے وعدہ کریں کہ میں آپ کو پاکستان سے امریکا پہنچانے کے سلسلے میں جو بھی اقدام کروں گا، آپ کسی بھی مرحلے پر میری راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گی۔ اگر آپ نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تو ایک ماہ سے پہلے ہم امریکا میں ہوں گے اور انشاء اللہ، عید ہم وہیں پر منائیں گے۔ پھر ساری زندگی ہم وہیں رہیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولیں پھر کہا۔ ''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری کوششوں کے راستے میں حائل نہیں ہوں گی لیکن چند ضروری معاملات کو نمٹانا بہت ضروری ہے۔''

''مثلاً کون سے معاملات؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وزٹ ویزا کے لیے اپلائی کروں گی تو ایک خاص مدت کے بعد تو مجھے واپس پاکستان آنا پڑے گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ''پھر ہم ساری زندگی ایک ساتھ امریکا میں کیسے رہ سکیں گے؟''

''آپ نے بہت اہم سوال کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر مجھے امید ہے کہ آپ کو پانچ سال کے لیے ملٹی پل وزٹ ویزا جاری کردیا جائے گا جو کہ عام طور پر ان دنوں دیا جارہا ہے۔''

''تو کیا ان پانچ سالوں میں مجھے ہر چھ ماہ کے بعد پاکستان آنا ہوگا؟'' ماں کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔

''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......! اگر میں چھ ماہ سے زیادہ عرصے تک وہاں رکوں گی تو یہ اوور اسٹے کہلائے گا جو کہ یقیناً غیرقانونی ہوگا۔''

میں نے بتایا۔ ''میں نے وہاں پہنچتے ہی آپ کا اسائلم اپلائی کردینا ہے۔''

''اسائلم......یعنی سیاسی پناہ؟'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''ہاں۔ پولیٹیکل اسائلم کو سیاسی پناہ ہی کہا جاتا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''بس یہ ثابت کرنا ہوگا کہ پاکستان میں آپ کی جان کو شدید نوعیت کا خطرہ ہے اس لیے آپ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا میں سیاسی پناہ لے رہی ہیں۔''

''لیکن یہ کس طرح ثابت کیا جائے گا۔'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟''

"مطلب یہ کہ اسائلم والا کام آسانی سے ہوجائے گا؟" ماں نے تصدیقی انداز میں استفسار کیا۔

"جی ماں۔ ایک سو ایک فیصد ہوجائے گا۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "پھر آپ کا کیس تو ویسے بھی جینوئن ہے۔ پاکستان میں آپ کے دشمنوں کی کمی نہیں۔ آپ کا شوہر اسی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ وکیل بڑی مہارت سے آپ کا کیس تیار کرکے فائل کرے گا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سارے مراحل طے ہوتے چلے جائیں گے۔"

"گڈ!" ماں کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی۔ "کیا اسائلم فائل ہوجانے کے بعد میری امریکا میں موجودگی قانونی حیثیت اختیار کرجائے گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی، بالکل ایسا ہی ہوگا۔" میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے بتایا۔

"یہ کام ہوجائے گا مگر مرحلہ وار اور اس میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب عظیم تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو......"

"برو! کیا سچویشن ہے؟" اس نے پوچھا۔ "سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" میں نے جواب دیا۔ "ماں میری بات ماننے کے لیے راضی ہوگئی ہیں۔ اب تم صبح اس سلسلے میں پاپا سے تفصیلی بات کرلو۔ میں جلد از جلد ماں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہوجائے گا یار، ٹینشن نہ لو۔" وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ "تم پاکستان کے جس شہر میں کہو گے یا تمہاری والدہ جس شہر میں رہنا پسند کریں، ہم ان کی بہ حفاظت رہائش کا بندوبست کردیں گے۔"

"تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں...... بولو۔"

"میں ماں کو امریکا کا وزٹ ویزا اپلائی کرانا چاہتا ہوں۔" میں نے عظیم کو بتایا۔ "اس سلسلے میں ان کا آن لائن فارم تم نے ہی بھرنا ہے۔"

"فکر نہ کرو برو...... میں یہ کام کردوں گا، انشاء اللہ!" اس نے کہا پھر پوچھا۔ "برو! یہ کینیڈا کا کیا حساب ہے؟" عظیم نے اچانک امریکا سے کینیڈا میں چھلانگ لگادی تھی لہٰذا میں نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں، تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟"

"ارے یار...... میں کینیڈا کے ویزا کی بات کررہا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں کینیڈا کے ویزا کے لیے اپلائی کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے ایک دو دوست بھی رہتے ہیں۔ جب میں امریکا گیا تھا تو میں نے کینیڈا میں ان کے پاس جانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ مجھے امریکا سے کینیڈا کا ویزا نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے مجھے اپنے ملک پاکستان سے ہی کینیڈا کا ویزا لے کر آنا پڑے گا۔"

"بالکل!" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "دنیا میں ستائیس ملک ایسے ہیں جو پاکستانیوں کو آن ارائیول انٹری دے دیتے ہیں۔ باقی تمام ملکوں کی سیر کے لیے آپ کو پاکستان ہی سے ویزا لینا پڑتا ہے۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "تم اپنے کسی کینیڈین دوست سے انوی ٹیشن منگوالو۔ باقی کا پروسس میں تمہیں بتادوں گا۔ کینیڈا کے وزٹ ویزا کے لیے انوی ٹیشن بہت ضروری ہے۔"

"اوکے...... یہ بتاؤ، تمہارا کیا پروگرام ہے۔ کیا میں تمہیں لینے آؤں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "میں یہیں پر ایک بھرپور نیند لینا چاہتا ہوں۔ تم سے کل ہی دن میں کسی وقت ملاقات ہوگی۔"

"ٹھیک ہے برو! اپنا خیال رکھنا۔" اس نے کہا۔

میں نے بھی جواباً اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ "شیور...... اور تم بھی۔"

ہمارے بیچ سیلولر رابطہ موقوف ہوا تو ماں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں مل کر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کھول لو۔ تمہارا یہ کام خوب چلے گا۔"

"میرا یہ کام کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں لیکن میں اس ذکر کا شکرگزار ضرور ہوں۔" میں نے گہری نظر سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئیں۔ "تم کس ذکر کے شکرگزار ہو؟"

"ریکروٹنگ ایجنسی والے کام کے ذکر کا۔"

"میں سمجھی نہیں!" ان کی الجھن میں حیرت در آئی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس ذکر نے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جو بکھیر دی ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ انہیں خوش دیکھ کر میں بھی مسرت سے کھل اٹھا پھر میں نے کہا۔

"ماں! تھوڑی دیر پہلے میں نے دو ضروری کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ ان میں سے ایک کام تو خود ہی ہوگیا

یعنی مجھے عظیم سے بات کرنا تھی اور اس کی کال آ گئی۔ اب دوسرا کام یہ ہے کہ مجھے انکل علی سلطان سے بات کرنا ہے تاکہ آپ کے ویزا کے حصول کے لیے ضروری ڈاکیومینٹس منگوا سکوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ماں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کام بھی کر ہی ڈالو۔''

میں نے اپنے سیل فون سے انکل سلطان کا نمبر ملایا۔ اس وقت کراچی میں اتوار انتیس جون صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ ٹیکساس کراچی سے تیرہ ہزار سات سو کلومیٹر مغرب میں واقع ہے اور دونوں مقامات کے معیاری وقت میں پورے دس گھنٹے کا تفاوت ہے یعنی ٹیکساس کا وقت کراچی کے مقابلے میں دس گھنٹے پیچھے ہے لہٰذا اس وقت بے سٹی (ٹیکساس) میں ہفتہ اٹھائیس جون شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔

دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی لیکن میری کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے دو تین مرتبہ ٹرائی کیا پھر سیل فون کو ایک طرف رکھ دیا۔ ماں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''انکل فون اٹینڈ نہیں کر رہے۔'' میں نے بتایا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولیں۔ ''کل بات کر لینا ان سے، ابھی تمہیں فوری طور پر سو جانا چاہیے۔ تمہاری آنکھوں میں بے پناہ نیند بھری ہوئی ہے۔ ایک طویل اور بھرپور نیند لے لو گے تو ہشاش بشاش ہو جاؤ گے۔''

ماں کا مشورہ انتہائی معقول اور موقع محل کے عین مطابق تھا۔ میں نے ان کے مشورے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ ان لمحات میں، میں خود بھی نیند کی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

ماں نے مجھے اپنے بیڈ روم کے برابر والے بیڈ روم میں پہنچا دیا اور کہا۔ ''یہاں آرام سے تم اپنی نیند پوری کر سکتے ہو۔ جب تک خود آنکھ نہ کھلے، اٹھنے کی کوشش نہیں کرنا۔''

''جی ماں۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

کچھ تو وہ بیڈ نہایت ہی دبیز اور آرام دہ تھا اور کچھ میں بھی کافی دیر کا جاگا ہوا تھا۔ اس پر مستزاد ماں سے ہونے والی ملاقات نے میرے دل و دماغ کو پُرسکون کر دیا تھا لہٰذا میں بستر پر گرتے ہی نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

آج سونے سے پہلے مجھے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایات دینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ یہ میری ہمیشہ سے عادت رہی تھی کہ میں سونے سے قبل آٹو سجیشن (خود ترغیبی) کے ذریعے اپنے دماغ کو ایک خاص وقت تک سونے کی ہدایت کیا کرتا تھا اور یہ بھی کہ اس مقررہ وقت بیداری سے پہلے اگر میری جائے آرام پر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی توقع ہو یا کسی حوالے سے میری جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو وقتِ مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ کھل جائے...... لیکن آج اس اقدامات اور تحفظات کی ضرورت نہیں تھی۔

اس وقت میں اپنی ماں کے سائے میں سو رہا تھا۔ کسی بھی بچے کے لیے اس کی ماں کا سایہ سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ ہوتی ہے اور اس کے لیے بچے کی عمر کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ بچہ ایک ماہ کا بھی ہو سکتا ہے، ایک سال کا بھی اور بیس سال کا بھی۔ مالک ہر بچے پر اس کی ماں کا سایہ سلامت رکھے......!

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں نے ایک طویل، بھرپور انگڑائی لے کر بستر چھوڑ دیا اور فریش اپ ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ایک دم تر و تازہ ہو چکا تھا۔

علی الصباح سونے سے پہلے میں نے اپنے سیل فون کو سائلنٹ موڈ پر سیٹ کر دیا تھا لہٰذا اس دوران میں میرے سیل فون پر جو بھی کالز اور ٹیکسٹ میسج آئے ہوں گے، ان کی مجھے خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چیک کرنے کے لیے سیل فون اٹھا لیا۔

عظیم کی تین کالز اور ایک ٹیکسٹ میسج لگا ہوا تھا اور ان رابطوں کا وقت ایک بجے کے اریب قریب کا تھا۔ گویا لگ بھگ ایک گھنٹا پہلے اس نے مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ٹیکسٹ میسج کھول کر پڑھا۔ عظیم نے لکھا تھا۔

''برو! لگتا ہے، خوب جی بھر کر سو رہے ہو اسی لیے میری کال اٹینڈ نہیں کر رہے۔ اینی ہاؤ، جب بھی آنکھ کھلے، مجھ سے رابطہ کرنا۔''

میں نے عظیم کو کال کی۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹینڈ کر لیا اور میری ''ہیلو'' کے جواب میں اس نے کہا۔

''ہاں بھائی! نیند پوری ہو گئی؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے تمہیں کال کر رہا ہوں۔''

''گڈ!'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ''برو! پاپا سے میری بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے

آگاہ کردیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب انتظام ہوجائے گا۔"

"تھینکس گاڈ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔"

"پاپا نے تمہیں آج افطار کے بعد گھر پر بلایا ہے۔" عظیم نے بتایا۔ "وہ تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"بالکل...... کیوں نہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

"تم آٹھ اور نو بجے کے بیچ ریڈی رہنا۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"اوکے برادر! میں تمہیں تیار ملوں گا۔" میں نے جواباً کہا۔

ہم نے ایک دوسرے کو "اللہ حافظ" کہہ کر سلسلۂ رابطہ موقوف کردیا۔

اس وقت مجھے بھوک کا احساس ہورہا تھا۔ میں بیڈ روم سے باہر نکل آیا تاکہ دیکھ سکوں، ماں کہاں ہے اور کیا کررہی ہے۔ آج میں روزہ نہیں رکھ سکا تھا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی نماز روزے کا پابند انسان نہیں تھا۔ بس، جب بھی دل کا بوجھ حد سے تجاوز کر جاتا تو میں مالک کی بارگاہ میں حاضر ہوجاتا تھا۔ اس کے سامنے چند منٹ کے لیے سجدہ ریز ہونے سے من کا بوجھ ہلکا ہوجاتا تھا اور گزشتہ روز میں نے جو روزہ رکھا تھا وہ ایک خاص نوعیت کی منت کا حامل تھا۔ میری یہ منت ماں سے ملاقات کی صورت میں پوری ہوگئی تھی۔

ماں مجھے کچن میں مل گئیں۔ وہ کوکنگ میں مصروف تھیں۔ میرے قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بے حد شفیق مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"آ گیا میرا شہزادہ......!"

"جی ماں۔" میں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے گھر میں کچن سنبھالنے کے لیے کوئی میڈ نہیں رکھی؟"

"میرے پاس ایک نہایت ہی تجربہ کار باورچی ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "لیکن وہ سنڈے کو چھٹی کرتا ہے تاہم ہفتے کی شام کو وہ مختلف قسم کے کھانے پکا کر رکھ جاتا ہے تاکہ سنڈے کو مجھے کوئی دشواری نہ ہو۔ اس وقت بھی گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ میں تو بس کھانے کو لائن اپ کررہی ہوں......" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئیں پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولیں۔

"میں کافی دیر سے اٹھی ہوئی ہوں۔ جب تم بیدار ہوئے تو مجھے پتا چل گیا تھا اس لیے تمہاری خاطر تواضع کے بندوبست میں مصروف ہوگئی۔"

"یہ تو آپ نے بہت نیک کام کیا ہے۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "اس وقت مجھے شدید نوعیت کی بھوک محسوس ہورہی ہے۔"

"میں صدقے جاؤں میرے لعل......!" وہ ماتا بھرے لہجے میں بولیں۔ "تم ڈائننگ روم میں جاکر بیٹھو۔ میں کھانا لگارہی ہوں۔"

"اس کام میں، میں بھی آپ کی مدد کروں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ایک جوان بیٹے کی موجودگی میں سارا کام اکیلی ماں ہی کیوں کرے گی؟"

"اللہ تمہیں نظرِبد سے بچائے۔" وہ وارفتگی کے عالم میں بولیں۔ "اور تمہاری عمر دراز کرے......!"

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ماں بیٹا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے پیٹ پوجا میں مصروف تھے۔ کھانے کے دوران میں ہمارے بیچ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ماں نے کہا۔ "علی! تم نے میرے ذمے جو دو کام لگائے تھے، وہ آج ممکن نہیں ہیں کیونکہ آج سنڈے ہے لہٰذا وہ کام کل ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ پائیں گے۔"

میں نے ماں سے یہ سوال نہیں کیا کہ...... کون سے دو کام؟ کیونکہ مذکورہ دونوں کام میرے ذہن میں تازہ تھے۔ میں نے ماں سے کہا تھا کہ انہیں پچھلے چھ ماہ کی بینک اسٹیٹ منٹ حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کسی نوٹری پبلک سے بنگلے، گاڑی اور جیولری کی ملکیت اور مالیت کا ایفی ڈیوٹ بنوانا ہے۔ یہ دونوں کام یقیناً آج نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے فرماں برداری سے کہا۔

"کوئی بات نہیں ماں۔ آپ یہ کام منڈے کو کرلیجیے گا۔"

پھر میں نے انہیں عظیم سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے پوچھا۔ "تم شام کو عظیم کے ساتھ جاؤ گے تو کیا رات کو وہیں رکو گے یا واپس آؤ گے؟"

"اس بارے میں، میں نے ابھی تک سوچا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس بات کا فیصلہ وہاں کی سچویشن کو دیکھنے کے بعد کروں گا۔ ویسے میری خواہش تو یہی ہے کہ واپس آپ کے پاس آؤں۔"

"میری بھی یہی تمنا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے

میں بولیں۔

"جب ہم دونوں کی آرزو ایک جیسی ہے تو پھر وہی ہوگا جیسا ہم چاہتے ہیں۔" میں نے قطعی انداز میں کہا۔ "میں ہر قیمت پر واپس آپ کے پاس آؤں گا۔"

"ان شاءاللہ......!" وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔

ہم کھانے سے نمٹنے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے اور ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ ماں میری تعلیم، تربیت اور دیگر سرگرمیوں کے بارے میں مختلف نوعیت کے سوال کرنے لگیں۔ جواب میں، میں مختصر مگر جامع انداز میں انہیں اپنی زندگی کے اہم واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ گہری دلچسپی اور توجہ سے میری بات سن رہی تھیں۔ جب میں سب کچھ بیان کر چکا تو انہوں نے کہا۔

"امریکا میں معاشرتی ماحول بہت آزاد ہے۔ تمہاری تو بہت سی گرل فرینڈز بھی ہوں گی......؟"

ماں کے اس سوال پر میں بے ساختہ مسکرا اٹھا اور کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ماں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ چھیڑنے والے انداز میں بولیں۔

"ان کاموں کی کبھی مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"تم کہیں...... مجھ سے کچھ...... چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہے......" وہ شک زدہ نظر سے مجھے ٹٹولتے ہوئے بولیں۔ "یہ ٹھیک ہے کہ میں رشتے میں تمہاری ماں ہوں لیکن تم مجھے ایک دوست سمجھ کر سچ سچ بتادو۔"

"اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں اپنی ماں کو ضرور بتادیتا۔" میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب کوئی عشق کا قصہ نہیں، کوئی محبت کی کہانی نہیں؟"

وہ بدستور مجھے کریدنے کی مہم میں مصروف نظر آتی تھیں۔

میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "اپنی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے ماں۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔"

"لڑکیوں سے دوستیاں تو ہوں گی......؟"

"لڑکیوں نہیں، لڑکی!" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی سے میری بڑی گہری دوستی تھی۔"

بات کے اختتام پر میرے لہجے میں اداسی در آئی۔ ماں نے میرے چہرے کے تاثرات کو بھانپ لیا اور قدرے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

"دوستی تھی...... کا کیا مطلب ہے علی؟"

"وہ لڑکی اب مجھ سے بہت دور جا چکی ہے۔" میں نے بتایا۔ "میرے ایک دشمن نے اسے اغوا کرلیا تھا۔"

"کون تھی وہ؟" انہوں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ "اس کا نام کیا تھا؟"

"شارو......!" میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں جواب دیا۔

"شارو!" ماں نے دہرایا۔ "بہت ہی خوب صورت نام ہے۔"

"شارو ہسپانوی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں، خوب صورت پھول۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "شارو اپنے نام کی طرح انتہائی دل کش اور حسین و جمیل تھی۔ اس کا تعلق برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو سے تھا۔ وہ گٹار بجانے کی ماہر تھی۔"

"میرے بچے! تمہاری ٹریجڈی میں "تھی" کا بہت عمل دخل نظر آتا ہے۔" ماں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کہیں خدانخواستہ......"

"نہیں!" میں نے ماں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وحشت بھرے لہجے میں کہا۔ "شارو زندہ ہے مگر ایک دشمن نے شارو کو مجھ سے دور کردیا ہے...... بہت دور......"

"مجھے اپنے اس دشمن کے بارے میں بتاؤ۔" وہ گمبھیر انداز میں بولیں۔ "میں شارو کے اغوا کا قصہ بھی سننا چاہتی ہوں۔"

جواب میں، میں نے ماں کو شارو سے اپنی دوستی، لیونارڈو سے اپنی دشمنی اور شارو کے اغوا کی تفصیلی روداد سنادی۔ پوری بات سننے کے بعد ماں نے کہا۔

"چھوٹی سی عمر میں تم نے کیسی خطرناک دشمنی پال لی ہے میرے لعل!"

"ماں! میں نے کہیں کسی سیانے کا ایک قول پڑھا تھا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر آپ کے آس پاس کوئی آپ کی بات کی مخالفت کرنے والا نہ ہو یعنی کوئی ایک بھی آپ کا دشمن نہ ہو تو سمجھ لیں کہ آپ کوئی اچھے انسان نہیں ہیں۔ جس شخص سے ہر کوئی خوش ہو، اس کے منافق ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو علی!" ماں نے تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک شارو پر بات ہوتی رہی پھر موضوع گفتگو انکل علی سلطان کی طرف مڑ گیا۔ ماں اس محسن و مربی شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی جو میری پرورش

اور تعلیم و تربیت میں کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ میں نے ماں کو انکل علی سلطان، ان کی بیوی ریٹا میگڈالین اور ان کی بیٹی نفی کے بارے میں تفصیلاً بتادیا۔

ہمارے مابین گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ نگینہ نامی ایک عورت ماں سے ملنے آگئی۔ جمشید نے اس کے آنے کے بارے میں ماں کو بتایا تھا۔ میں نے مذکورہ عورت کی آمد کا سنا تو وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف جانے لگا تا کہ ماں آرام سے تنہائی میں نگینہ سے بات کر سکے۔

ماں نے مجھے روک لیا اور کہا۔ ''علی! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں نے نگینہ سے چند ضروری باتیں کرنے کے لیے اسے یہاں بلایا ہے اور یہ تمام گفتگو میں تمہاری موجودگی میں کرنا چاہتی ہوں۔''

میں دوبارہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے نگینہ آنٹی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ماں اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑی نہیں ہوئیں بلکہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دوستانہ انداز میں کہا۔

''آؤ نگینہ...... میں تمہارا ہی انتظار کررہی تھی...... آؤ، بیٹھو۔''

''میڈم! آپ بلائیں اور میں نہ آؤں یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ چہک کر بولی۔ ''دیکھ لیں، میں حاضر ہوگئی ہوں۔''

ڈرائنگ روم کی نشست سنبھالنے سے پہلے نگینہ آنٹی نے ایک خاص انداز میں مجھے سلام بھی کیا تھا۔ اس عورت کے انداز و اطوار نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی مگر اس نے خود کو پچیس تیس کا دکھائی دینے کے لیے اچھا خاصا اہتمام کررکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں، وہ عورت مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔

نگینہ نے ماں سے میرے بارے میں استفسار کیا۔ ''میڈم! آپ نے اس نوجوان کا تعارف نہیں کرایا۔ کیا یہ آپ کے مہمان ہیں؟''

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لو۔'' ماں نے گول مول جواب دیا۔ ''یہ میرے ایک عزیز ہیں۔ ادھر جدہ میں ہوتے ہیں۔''

''ماشاء اللہ!'' وہ توصیفی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کے گھر کے قریب سے آئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی انہیں دیکھ کر۔ اللہ انہیں بری نظر سے بچائے۔ بہت ہینڈسم اور اسمارٹ ہیں۔''

آنٹی نگینہ نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ ماں کے ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے نگینہ کے ریمارکس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''اور سناؤ، کام کیسا چل رہا ہے؟''

''میڈم! آپ کو تو پتا ہی ہے، رمضان کے مہینے میں کام آدھا بھی کہیں رہ جاتا۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''بس دال دلیا چل رہا ہے۔ آپ سنائیں؟''

''بس ہم بھی بیٹھے ہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔'' ماں نے کہا۔

''میڈم! مجھے معلوم ہے، آپ کے ہاں تو پورا رمضان آف ہوتا ہے۔'' وہ آنکھوں کو عجیب سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی پھر میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ نے مجھے اپنے ان عزیز کی کسی خدمت کے سلسلے میں بلایا ہے؟''

''ارے نہیں۔'' ماں نے جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان کی خدمت کے لیے تو میں اکیلی ہی کافی ہوں۔ تمہیں میں نے ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔''

''آپ حکم کریں میڈم!'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

آنٹی نگینہ اور ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو اگرچہ مجھے اچھا خاصا ڈسٹرب کررہی تھی لیکن ماں کا حکم تھا اس لیے میں وہاں بیٹھنے پر مجبور تھا۔ اگر ماں نے مجھے تاکید نہ کی ہوتی تو میں کب کا اٹھ کر جاچکا ہوتا۔ ماں نے آنٹی نگینہ کی بات کے جواب میں کہا۔

''میں رمضان کے آخری عشرے میں عمرے پر جارہی ہوں اور واپسی عید کے بعد ہی ہوگی۔''

''مبارک ہو میڈم۔'' وہ خوشی سے دیدے پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے۔''

''اس عمرے کے تمام تر انتظامات رفیق صاحب نے کیے ہیں۔'' ماں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''عمرے کے علاوہ...... تمام ایام میں جدہ میں انہی کے پاس قیام کروں گی۔''

ماں نے نگینہ سے میرا تعارف ''رفیق'' نامی شخص کی حیثیت سے کرایا تو میں نے ماں کی تصدیق میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

''ویسے تو میرا عید کے فوراً بعد واپسی کا ارادہ ہے لیکن دیر بھی ہوسکتی ہے۔'' ماں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میں نے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ اس دوران میں میری بچیاں تمہارے ہاتھ کے نیچے رہیں گی۔ ان کے تمام معاملات کو تم خود کنٹرول کروگی۔ ویسے تو سارا سیٹ اپ بنا ہوا ہے لیکن تمہیں پتا ہے، کسی تجربہ کار کی کڑی

نگرانی بھی چاہیے ہوتی ہے۔ تمہارے سوا مجھے اور کوئی قابلِ بھروسا نظر نہیں آ رہا۔''

''میڈم! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے جو آپ مجھ پر اس قدر اعتماد کر رہی ہیں۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ ایک ماہ کے بعد واپس آئیں یا ایک سال تک وہاں قیام کریں، ان شاء اللہ...... میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ ویسے تو آپ کا سسٹم ہی اتنا آرگنائز ہے کہ نہ تو مجھے کوئی دشواری ہوگی اور نہ ہی آپ کی پانچ بچیوں کو کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''میں شیلا، آرزو، روبی، بینا اور سحرش کو بھی اچھی طرح سمجھا دوں گی۔'' ماں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اور جانے سے پہلے تم لوگوں کی روبرو ملاقات بھی کرا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے میڈم! آپ بے فکر ہو کر عمرے پر جائیں۔'' آنٹی نگینہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''میں سب سنبھال لوں گی۔''

نگینہ مزید چند منٹ وہاں بیٹھی پھر رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے خفگی آمیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ سب کیا تھا ماں......؟''

''ایک تلخ حقیقت۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولیں۔ ''ایک کڑوی سچائی۔''

''لیکن کیا یہ سب میرے سامنے کرنا ضروری تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں نے ضروری سمجھا اس لیے کیا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ''تم سے ملنے کے بعد میں نے اس لائن کو ترک کر دیا ہے۔ اس لائن پر رہتے ہوئے اگر میں تمہارے سامنے اس قسم کی میٹنگ کرتی تو پھر یہ تمہارے لیے تکلیف کا باعث اور میرے لیے وجۂ ندامت ہوتا۔ میں اندر سے تبدیل ہو گئی ہوں مگر میرے ساتھ منسلک لوگ تو تبدیل نہیں ہوئے۔ میں ان پانچ بچیوں کی سرپرست ہوں۔ مجھے اپنی راہ پکڑنے سے پہلے ان کا کوئی نہ کوئی بندوبست تو لازمی کرنا ہے نا......'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''کوئی مسافر بس روڈ پر چلتے چلتے جب اچانک خراب ہو جاتی ہے تو بس کا ڈرائیور ان پسنجرز کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ اخلاقی تقاضے نبھاتے ہوئے وہ پیچھے سے آنے والی بس کو روکتا ہے اور اپنے مسافروں کو اس بس پر سوار کراتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی کر رہی ہوں میرے بچے۔ تم اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔ سچائی کا سامنا کرنے سے انسان کی ہتک نہیں ہوتی بلکہ ایسے تجربات اسے باہر سے توانا اور اندر سے مضبوط کرتے ہیں...... کیا سمجھے!''

''میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ماں۔'' میں نے اعترافِ حقیقت کرتے ہوئے کہا۔ ''واقعی، جب آپ نے اس گمنام دنیا کو خیرباد کہہ دیا ہے تو پھر ان چھوٹی موٹی چیزوں کو ڈسکس کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......!''

''کون سی بات؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آپ نے اپنی بچیوں کا ذکر کرتے ہوئے پانچ فیملیو روبی، شیلا، آرزو، بینا اور سحرش کے نام گنوائے تھے مگر اس بنگلے میں مجھے ان میں سے ایک بھی دکھائی نہیں دی۔ کیا وہ لوگ کہیں گئی ہوئی ہیں؟''

''اس بنگلے میں صرف میں رہتی ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''وہ پانچوں بچیاں یہاں قریب ہی ایک دوسرے بنگلے میں رہتی ہیں جہاں ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے اپنے شعبے کے ماہرین موجود ہیں جو ان کے کھانے پینے، سونے جاگنے کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ انہیں کب مساج کرانا ہے، کب اسٹیم باتھ لینا ہے، کس وقت کون سی ایکسرسائز کرنا ہے، ان تمام امور کا باقاعدہ ایک ٹائم ٹیبل بنا ہوا ہے۔ اس بنگلے پر ان کے لیے ایک مربوط نظام بنا ہوا ہے تاکہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور وہ ٹینشن فری لائف کو انجوائے کر سکیں۔''

یہ سب بتاتے ہوئے ماں کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کاش! ان پانچ بچیوں کے دل و دماغ میں بھی کوئی انقلاب برپا ہو جائے۔ وہ بھی برائی کی اس راہ کو ترک کر کے سیدھے راستے پر آ جائیں......!''

''میرے بچے! ایسا سوچنا اور کسی بگڑے ہوئے انسان کے لیے اس نوعیت کی دعا کرنا یقیناً ایک اچھا عمل ہے۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولیں۔ ''لیکن نیکی کی راہ اختیار کرنے کے لیے انسان کو از خود کوشش کرنا پڑتی ہے، ایک کڑے فیصلے پر پہنچنے کے بعد سنگین حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے منہ زور طوفانوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے......'' انہوں نے

چند لمحات کی خاموشی اختیار کرنے کے بعد بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر انکشاف انگیز لہجے میں اضافہ کیا۔

"علی! میرے جگر...... تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ پانچوں بچیاں کیسی شاہانہ زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی "ڈیوٹی" بیرونِ ملک ہوتی ہے۔ وہ ہفتے میں صرف دو مرتبہ باہر جاتی ہیں اور وہاں ایک رات گزارنے کے بعد اگلی صبح واپس آجاتی ہیں۔ باقی پانچ دن عیش و آرام کرتی ہیں۔ وہ اس لگژری لائف کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔"

"میں تو ایک بات جانتا ہوں ماں......" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔" جب تک مالک کی طرف سے توفیق نہ ہو، انسان نیکی اور بھلائی کی طرف آ ہی نہیں سکتا۔ جب مالک کو منظور ہوگا تو ان بچیوں کے دل میں بھی کوئی صالح خیال ڈال دے گا پھر خود بہ خود ان کی دنیا بدل جائے گی۔"

"میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔" اللہ کی مرضی کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ انہیں نیک ہدایت دے۔"

"آمین......!" میں نے صدقِ دل سے کہا۔

"کل میں تمہیں ایک آدمی سے ملواؤں گی۔" ماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"اس کا نام نادر شاہ ہے۔ یہ شخص میرا سچا خیر خواہ ہے۔ نادر شاہ نے کئی نازک مواقع پر میری بے لوث مدد کی ہے۔ اس سے مل کر تمہیں بہت خوشی محسوس ہوگی۔"

"ٹھیک ہے ماں! میں نادر شاہ سے ضرور ملاقات کروں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر رسٹ واچ پر نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کیا۔"میرا خیال ہے انکل سلطان بیدار ہوچکے ہوں گے۔ مجھے ان سے بات کرنا چاہیے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" ماں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ بے سٹی (ٹیکساس) میں یہ صبح سات بجے کا وقت تھا۔ میں نے اپنے سیل فون سے انکل سلطان کا نمبر ملایا۔

دوسری جانب گھنٹی بجنے لگی پھر یہ گھنٹی بجتی چلی گئی مگر انکل نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ آج صبح سونے سے پہلے بھی میں نے انہیں فون کیا تھا لیکن انہوں نے میری کال پک نہیں کی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں انکل سلطان کو فون کروں اور وہ میرا فون نہ اٹھائیں۔

ان دنوں انکل کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ میں ان کے لیے فکرمند ہوگیا۔ میرے چہرے سے جھلکنے والی تشویش کو ماں نے نوٹ کرلیا۔

"کیا ہوا علی؟" انہوں نے پوچھا۔

"انکل فون اٹینڈ نہیں کررہے۔" میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔"مالک خیر کرے......!"

"اللہ خیر کرے گا میرے لعل۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔"تم ایک کام کرو......"

میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کون سا کام؟"

"تم نیویارک میں مرزا عامر بیگ کو فون کرو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔" ابھی صورتِ حال واضح ہوجائے گی۔"

ماں کی تجویز میرے دل کو لگی۔ اگلے ہی لمحے میں نے عامر بیگ کو فون لگادیا۔ عامر انکل بروکلین (نیویارک) میں رہتے تھے۔ میں پاکستان آنے سے پہلے ان سے ایک ملاقات کرچکا تھا۔ میرا پاکستان آکر اپنی ماں کی خیر خبر لینا بھی انہی کا آئیڈیا تھا۔

دوسری جانب کال ریسیو کرلی گئی پھر ایک مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔"ہیلو علی! بیٹا جی، کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں بیگ صاحب۔" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔"لیکن انکل سلطان کل سے میرا فون اٹینڈ نہیں کررہے۔ میں ان کے لیے بہت فکرمند ہوں۔"

"اوہ......" انہوں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔"کیا تم علی سلطان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے؟"

"نن...... نہیں......" میں نے لکنت زدہ انداز میں کہا پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔" کیا ہوا...... انہیں؟"

"علی سلطان کی ڈیتھ ہوگئی ہے......!" بیگ صاحب نے میری سماعت میں دھماکا کیا۔

میں سناٹے میں آگیا۔

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی ہنستوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

زندگی اداس ہے

ڈاکٹر شیر شاہ سیّد

محبت کی کسک میں جینے والے جانتے ہیں کہ کس اذیت میں وقت گزارتے ہیں... ایسا عشق جس میں محبوب کی ہنسی میں جلترنگ، بجنے لگیں اور آنسو دل میں درد کی لہر پیدا کردیں جبکہ... اس پر محبوب زندگی سے دور بھی ہوجائے تو اس میں تعجب نہیں کہ ہر جانب لہو برستا دکھائی دے... اس کی زندگی میں پھیلی اداسی بھی بے سبب نہیں تھی۔

تخلیقی عمل سے گزرنے والی ایک ماں کے دل کا خوفناک ڈر

"تم کوٹھے کی پیداوار ہو۔"
"کوٹھے کی پیداوار ہو...... طوائف ہو، طوائف ہو تم۔"
"گندی...... ملیچھ......"
"طوائف ہو، بازاری ہو۔"

"یہ آوازیں میرے کان میں آتی ہیں رفیق، میں کیا کروں۔" سیما نے میرے ہاتھوں کو زور سے پکڑ کر دبایا اور آنسو بھری بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے ماتھے کو چوم لیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پیار سے سمجھایا کہ نہیں سیما یہ سب بکواس ہے، بے کار کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہیں ہے محض وہم ہے تمہارا...... کوئی کیوں کہے گا ایسی باتیں...... گندی باتیں، تم نے کوئی خواب دیکھ لیا ہے۔

کاش یہ سب کچھ وہم ہوتا، محض وہم ہی ہوتا، ایک بُرا خواب ہوتا مگر یہ سب کچھ وہم نہیں تھا، بُرا خواب نہیں تھا، میری بے پروائی تھی، میری لاعلمی تھی اور میری جہالت تھی۔

مگر میں کرتا بھی کیا۔ نہیں، میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ماہر تھا، کمپیوٹر کی دنیا میں میرا نام تھا۔ انٹرنیٹ پر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا۔ لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے مجھے تلاش کرتے تھے۔ میں ان کے کمپیوٹر کے ایسے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کر لیتا جو کوئی بھی نہیں حل کر سکتا تھا۔ میں کمپیوٹر کے مسائل دیکھتا رہا، میری سیما اپنے مسئلوں میں الجھتی رہی۔ میں کمپنیوں کے، لوگوں کے، کارپوریشن کے، ملٹی نیشنل کے ہارڈ ڈسک کے اندر گھس کر انہیں سیدھا کرتا رہا، میری سیما کی روح اپنے جہنم میں جلتی رہی۔ میں بہت کچھ کر سکتا تھا، نہیں کر سکا۔ یہ کیا زندگی ہے، کیسا جیون ہے، میں کدھر آ گیا ہوں...... کیا کر بیٹھا ہوں اپنے ساتھ...... سیما کے ساتھ۔

وہ میری زندگی میں ایک خوشبو کی طرح آئی، پھر اس نے آہستہ آہستہ میرے چاروں طرف خوشبوؤں اور خوشیوں کی برسات کر دی۔ اس نے سب کچھ بدل دیا میرا۔ میں نیا نیا امریکا سے آئی ٹی میں ماسٹرز کر کے آیا تھا، سوچا تو نہیں تھا کہ پاکستان میں رہوں گا۔ خیال تھا کہ شادی کروں گا، کچھ مہینے خوب گھوموں گا، سوات، چترال، کوئٹہ، کشمیر۔ کافی جمع شدہ اثاثہ تھا میرے پاس، پھر اس دوران بیوی کے ویزا وغیرہ کا مسئلہ حل ہو جائے تو پھر دوبارہ امریکا چلا جاؤں گا۔ سلی کون ویلی میں میرے لیے نوکریوں کی کمی نہیں تھی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ امی کو سیما مل گئی، کراچی یونیورسٹی سے باٹنی میں ماسٹرز کیا تھا اس نے اور عبداللہ کالج میں نئی نئی لیکچرر اپائنٹ ہوئی تھی۔ میری بھانجی بھی عبداللہ کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے میری بہن کے سامنے میڈم سیما کی تعریفوں کے پل باندھ دیے، پھر باجی اور امی دونوں ہی عبداللہ کالج جا کر پسند کر آئیں اس سے۔

میری تو کوئی خاص پسند نہیں تھی، میں نے بس اتنی سی فرمائش کی تھی کہ امی! جب ساتھ چلے تو لوگ ڈر نہ جائیں۔

''جب تو ساتھ چلے گا اس کے، تو لوگ تجھ سے ڈر جائیں گے، اس سے نہیں، ایسی ہی بھولی بھالی سی ہے وہ۔''

امی نے بڑے پیار سے کہا تھا۔

امی اور باجی کے ہاں کرنے کے بعد میرا نہ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پھر بہت ہی شوق سے ہم دونوں کی شادی ہو گئی اور شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد جب ہم دونوں مری سے ہوتے ہوئے اور اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں اس کے ویزا کے لیے درخواست جمع کر کے واپس کراچی پہنچے تو میں نے ڈان اخبار میں اشتہار دیکھ کر ایک درخواست امریکن آئل کمپنی میں ڈال دی۔ اس کمپنی نے کراچی میں آفس کھولا تھا اور اندرونِ سندھ تیل کے لیے کھدائی کا کام شروع کیا تھا۔

ان لوگوں نے کراچی میں ہی مجھے اتنی زیادہ تنخواہ کی پیشکش کر دی کہ میں نے امریکا واپس جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ امی کی نظروں میں سیما کی قدر بڑھ گئی، ان کا خیال تھا کہ سیما نے مجھے قائل کیا ہے کہ میں کراچی چھوڑ کر نہ جاؤں ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو فوراً ہی امریکا روانہ ہو جاتی ہیں۔ جتنی جلدی سسرال کے کانٹوں، منڈوں سے نجات ملے اتنا ہی اچھا ہے۔ شاید بات صحیح بھی تھی۔ باٹنی کی اس پروفیسر میں امریکا جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی، اس نے مجھے بے پناہ چاہا اور میں بھی اسے بے انتہا پوجتا رہا تھا۔

چار سال تو بس دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے تھے، کبھی کراچی، کبھی ملائیشیا۔ کمپنی کے چکروں میں مجھے ان جگہوں پر جانا پڑتا اور سیما میرے ساتھ ہوتی۔ امریکا میں آٹھ سال گزار کر میں نے اتنی عیاشی نہیں کی جو مزے میں نے سیما کے ساتھ اٹھائے۔

امریکا میں تو پڑھائی تھی پھر کام اور مزید کام، اپنی حیثیت منوانے کے شوق میں کام ہی کام۔ جب میں نے ماسٹرز کر لیا تو پھر یہ لگن کہ بہت جلد اتنا کام کروں کہ کبھی بے روزگار ہونے کی نوبت نہ آئے اور ہوا بھی یہی۔ ماسٹرز کے بعد دو سال میں نے صرف کام کیا اور صرف ڈالرز کمائے جس کے نتیجے میں آئی ٹی کی مارکیٹ میں میری ساکھ بنی اور جو شاید مجھے سلی کون ویلی میں ہی ملتی۔

شروع کے دو سال تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال بچوں کی ضرورت نہیں ہے اور بعد کے دو سال گزرنے کے بعد ہم نے سوچنا ہی شروع کیا تھا کہ کسی گائناکولوجسٹ کے پاس جائیں، حمل کے لیے کچھ علاج کرائیں کہ وہ حاملہ ہو گئی۔ ہم دونوں کا دل جھوم جھوم اٹھا......

اس کے نو مہینے کے ایک ایک دن کا حساب میرے

پاس ہے۔ کب الٹیاں شروع ہوئیں......... کب سیما نے اپنے پیٹ میں بچے کی حرکت محسوس کی، سب کچھ ایک خواب کی طرح میرے دماغ میں محفوظ ہے۔

آج بھی اپنے کمرے میں آنکھیں بند کر کے لیٹتا ہوں تو آہستہ آہستہ سب کچھ دھیرے دھیرے ذہن کے پردے پر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ سیما کے حمل کے ساتھ ساتھ میں بھی گائنا کولوجسٹ بنتا جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں آتا اور کچھ سمجھ سے باہر ہوتا، پھر سیما کی گائنا کولوجسٹ سے ہر طرح کے سوالات کرتا، جو جواب وہ دیتی اس سے زیادہ تو مجھے انٹرنیٹ سے پتا رہتا تھا لیکن پھر بھی نہ جانے ایک خواہش سی ہوتی کہ یہ بھی پوچھ لوں وہ بھی پوچھ لوں...... اتنی ہی محبت تھی سیما سے مجھے۔ ٹوٹ کر چاہا تھا اسے اور اگر بس چلتا تو شاید کسی سیف میں احتیاط سے تالے میں بند کر کے رکھتا اسے۔

سولہویں ہفتے کے آخر میں جب اس کا الٹراساؤنڈ ہوا تو ہمیں پتا لگ گیا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ میری پیاری بیٹی۔ میں نے فوراً ہی کہہ دیا تھا کہ بانو نام ہوگا اس کا، مجھے پرانے نام پسند تھے۔ میری ایک خالہ جنھوں نے بچپن میں مجھے بہت پیار کیا تھا ان کا نام بھی بانو تھا۔ وہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے دوران جانے کیسے موت کا شکار ہوئی تھیں۔ ان کا پیار بھرا، مہربان چہرہ میرے ذہن کے کسی کونے میں آج بھی محفوظ تھا۔ سیما نے کہا تھا کہ نہیں یہ کنول ہوگی، ہماری کنول۔ بانو تو بہت پرانا نام ہے۔ ہم دونوں ہنس دیے تھے۔ اچھا تو تم اسے کنول کہنا، میں اسے بانو پکاروں گا۔ گھر میں وہ کنول ہوگی اسکول میں بانو۔ آخر دو دو نام بھی تو ہوتے ہیں لوگوں کے۔ ہم دونوں پھر ہنس دیے اور پھر روز ہی ہنستے رہے۔

ہمارے گھر میں ہر وقت ہی آنے والے مہمان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے پنک کپڑے بن رہے تھے، اس کے کمرے میں کھلونے جمع ہو رہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے یہ بھی حساب لگا لیا کہ اسے کب کس نرسری میں جانا ہوگا، کس اسکول میں پڑھنا ہے، مجھ سے اور اس سے پوچھے بغیر سیما نے اسے ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

''ہماری کنول ڈاکٹر بنے گی۔'' اس نے مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے بھائی ڈاکٹر کیوں، وکیل کیوں نہیں؟ اور کمپیوٹر انجینئر بننے میں کیا برائی ہے۔'' میں نے مذاق میں اس سے اختلاف کیا۔

''نہیں، میں نے کہہ دیا بس وہ ڈاکٹر بنے گی، صرف ڈاکٹر اور اچھی گائنا کولوجسٹ، جو مریضوں کے ہر سوال کا جواب دے گی، انھیں ٹالے گی نہیں، صرف پیسے نہیں کمائے گی بلکہ انسانیت بھی اس کے دل میں ہوگی۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بانو سے بھی پوچھا ہے تم نے آخر وہ کیا بننا چاہتی ہے، شاید وہ ڈاکٹر بننے سے منع کر دے۔ شاید اسے خون وغیرہ اچھا ہی نہ لگے، ارے بابا، بانو سے پوچھ تو لو۔'' میں نے اسے چھیڑا تھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ بانو نہیں کنول، اور دوسری بات یہ کہ بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا ڈاکٹر بننے میں۔ پوچھ بھی لیں گے وہ منع تھوڑی کرے گی۔ آخر میری بیٹی ہے کیوں نہیں مانے گی میری بات۔'' اس نے اور زیادہ سنجیدگی سے کہا تھا۔

''کنول نہیں بانو۔'' میں نے ہنس کر کہا تھا۔

''بانو نہیں کنول۔''

''بانو، بانو، بانو۔'' میں نے تکیہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے ہنستے ہوئے زور سے کہا۔ ''وہ تکیے سے بچنے کے لیے جھکی تھی اور ساتھ ہی چیخ مار کر اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی۔

''ارے کچھ ہو گیا ہے دیکھو بے تحاشا پانی جا رہا ہے۔'' میں فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ بچی کے گرد لپٹی ہوئی ممبرین پھٹ گئی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ لیبر شروع ہونے والا ہے۔ انٹرنیٹ پر بہت اچھی سی تصویر بنی ہوئی تھی اس پورے عمل کی۔ وہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے یک بیک آ گیا۔ اب فوراً ہی اسپتال جانا ہوگا، ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا۔ اب اڑتیس ہفتے ہو گئے ہیں۔ کسی بھی وقت درد شروع ہو سکتے ہیں فوراً ہی اسپتال آنا ہوگا۔ دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ ماں اور بچے دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے، میں نے جلدی سے امی کو بتایا اور اسی وقت اسے گاڑی میں لے کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔

باجی اور ان کی بیٹی بھی اسپتال آ گئے تھے۔ چھ گھنٹے کے اندر ہی اندر ہماری کنول پیدا ہو گئی۔ کسی آپریشن اور کٹ کے بغیر بالکل نارمل...... سات پونڈ کی ننھی سی گلاب کی کلی۔ اسے اٹھا کر میں نے چوما، اس کے گالوں کو، ماتھے کو، اپنے گالوں پر لگایا، اسے سینے سے لگا کر دل چاہا کہ اسے بھی دل میں سالوں، میرے آنسو نکل آئے۔ سیما کی آنکھوں میں بھی جل، ندی کی طرح چھلک رہا تھا۔

تین دن وہ اسپتال میں رہی۔ خاندان کا ہر ہر فرد اسے دیکھنے آیا۔ مٹھائیاں، کیک، پھول روزانہ مجھے اسپتال

سے گھر لانے پڑتے تھے۔ کس قدر خوش تھے سب لوگ، وہ ننھی سی گڑیا پورے خاندان کا مرکزِ نگاہ بن کر رہ گئی تھی۔

گھر آکر بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، سیما خطرے سے باہر نکل چکی تھی۔ گھر میں ایک چھوٹی سی بچی آگئی۔ میں دوبارہ اپنے روٹین کے کاموں میں لگ گیا۔ سیما کے کیس کی وجہ سے میں نے اپنے بہت سے دورے منسوخ کردیے تھے۔ سب لوگوں کو اس ڈیلیوری کا انتظار تھا۔ مجھے فوری طور پر سنگاپور جانا تھا جس کے لیے میں نے اپنی آمادگی کا اظہار کردیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو سیما کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ کنول اس کی گود میں تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔ یکایک یہ کیا ہوگیا ہے۔ میں فوراً ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا سیما، خیر تو ہے؟ کنول تو اچھی ہے نا؟ کیوں رو رہی ہو......؟''

اس نے اپنا سر میرے کاندھوں سے ٹکا دیا۔ ''نہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس رونا سا آگیا تھا یونہی بیٹھے بیٹھے۔'' اس نے آنکھوں سے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا مگر پھر بھی میں اس کے ساتھ بیٹھا رہا، بولتا رہا، ہنستا رہا اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔

''مجھے پرسوں سنگاپور جانا ہے سیما اور اب کی دفعہ اکیلے جانا ہوگا۔ کچھ کام رک گیا ہے وہاں پر۔ چلا جاؤں نا...... جانا تو ہوگا۔''

''ہاں ضرور جائیں امی تو ہیں یہاں پر۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

—پانچ دن سنگاپور میں بہت مصروف گزرے۔ میں روزانہ، تین چار مرتبہ فون کرکے پوچھتا۔ سیما سے باتیں کرتا، کنول کا رونا سنتا، جیسے ہی کام ختم ہوا میں پہلی فلائٹ پکڑ کر واپس آگیا۔

مجھے سب کچھ ٹھیک ہی لگا۔ رات گئے تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے پھر نیند آگئی۔ پھر نہ جانے رات کے کس لمحے میں میری آنکھ کھل گئی، سیما بستر پر نہیں تھی۔ میں تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو مگر جب کافی وقت نکل گیا تو میں نے اٹھ کر دیکھا باتھ روم میں کوئی نہیں تھا۔ میں دروازہ کھول کر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ سیما سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی ہے۔

بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے جیسے موم پگھل پگھل کر بہہ رہا ہو۔ میں بے قرار ہوگیا۔

''کیا ہوگیا سیما...... کیوں رو رہی ہو؟ خدا کی پناہ! سارا تمہارا دوپٹا آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے۔ میری جان کیا ہوگیا ہے تم کو......'' میں نے اسے لپٹا لیا۔

''نہ جانے کیا ہوگیا ہے رفیق۔ کچھ اچھا نہیں لگتا ہے مجھے۔ نہ کھانا، نہ گھر، نہ ٹی وی، نہ دوست، نہ رشتے دار، کیوں ایسی ہوگئی ہوں میں۔ بس دل کرتا ہے بیٹھ کر روتی رہوں، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہوں۔ کچھ ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

''چلو کمرے میں چلو۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پیار سے کہا اور اسے سہارا دے کر کمرے میں لے کر آیا، بستر پر لٹایا اور چادر اوڑھا کر کہا سو جاؤ...... بہت دیر تک آہستہ آہستہ میں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا پھر وہ گہری نیند سوگئی۔

صبح اٹھ کر میں آفس چلا گیا جہاں سے میں نے امی کو فون کرکے کہا کہ سیما کا خیال رکھیں نہ جانے کیوں کچھ پریشان سی ہے۔

''ارے بھئی تھکن ہوتی ہے نو مہینے کی تھکن، صبح ہوجائے گا سب کچھ۔'' امی نے مجھے پیار سے سمجھایا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی...... دوپہر کے بعد میں نے تین دفعہ بات کی تھی اس سے۔ اس کی آواز ٹھیک تھی مگر وہ شاید بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی آواز میں تو مٹھاس ہوتی تھی ہمیشہ کشش کی طرح۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ کیا ہوگیا ہے میری سیما کو۔ میں ذرا جلد ہی گھر آگیا۔ اسے زور دے کر تیار کرایا تھا، امی نے منع بھی کیا مگر میں نے کہا نہیں امی تھوڑا باہر کا چکر لگاؤں گا تو اچھا ہوگا، گھر میں بیٹھا بیٹھا آدمی پاگل ہوجاتا ہے۔

ہم نے کلفٹن میں سمندر کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کی۔ لہروں کے قریب بیٹھ کر انہیں گننے کی کوشش کی، اس کا ہاتھ تھام کر اور بچی کو گود میں لے کر تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے، پھر زمزمہ میں ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ وہ میرے ساتھ تھی، بات بھی کر رہی تھی مگر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ میں نے اسے لطیفے سنائے، کچھ امریکا کے وہ قصے جنہیں وہ بار بار سن کر ہنستی تھی مگر اب وہ رسپانس نہیں تھا، ایک ہاری ہوئی مسکراہٹ۔ ایک دھیما پن جیسے ٹیوب لائٹ کے سامنے کوئی لالٹین جل رہی ہو۔

گھر پہنچ کر اس نے کنول کو دودھ پلایا اور اپنے سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ اس نے سوال کیا۔ ''آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کرتے ہیں رفیق؟''

"یہ کیسا سوال ہے سیما، تم سے نفرت کا میں سوچ بھی نہیں سکتا ہوں، کیوں کروں گا نفرت۔ تم میری بیوی میری دوست ہو، میرے جنم جنم کی ساتھی، میرے خوابوں کی شہزادی، میری بانو کی ماں، میری کنول کی امی، کیسی بات کر رہی ہو تم۔" میں نے ایک سانس میں طویل جواب دے دیا تھا۔

"نہیں سچ کہیں؟ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہے۔" میں جھنجلا سا گیا، کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ نہیں میں اس سے نفرت نہیں کرتا ہوں، محبت ہے مجھے اس سے، بے شمار محبت ہے بلکہ میں پجاری ہوں اس کا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ دھیرے دھیرے اپنی انگلیوں سے اسے سہلاتی رہی، ایسا لگا جیسے آنسوؤں کو روک نہیں پا رہی ہے پھر بولی۔ "نہ جانے کیوں ایک ہول سا اٹھتا ہے میرے دل میں۔ ایسا لگتا ہے سب کچھ خالی ہے۔ یہ دل، یہ دماغ، میری روح، میرا جسم۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے کیوں لے آئی ہوں اس ننھی سی جان کو اس دنیا میں۔ کیا ہے اس دنیا میں۔ غم، پریشانی، دکھ، ناتمام حسرتیں، گولیاں، ایکسیڈنٹ، موت...... خدایا...... کیسے گزرے گی زندگی۔"

میں ساتھ لیٹا رہا پھر جانے کب ہم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن میں نے سیما کی گائناکولوجسٹ کو فون کیا۔ بڑی مشکل سے وہ ملی تھیں، کہنے لگیں۔ "میں فون پر مشورے نہیں دیتی ہوں۔ آج تو وقت نہیں ہے۔ کل آجایئے گا تو بات سن لوں گی۔ نارمل ڈلیوری کے بعد کیا ایمرجنسی ہوگئی، گھبرائیں مت، کل ملیے گا۔ شام کو 6 بجے میرے صدر والے کلینک میں۔ کل میں زمزمہ پر نہیں بیٹھتی ہوں۔"

میں گھر آیا تو امی بھی مجھے تھوڑی پریشان سی لگی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ دن بھر میں کچھ خاص نہیں کھایا ہے سیما نے۔ کوشش کے باوجود کچھ بات نہیں کی ہے اس نے۔ جب بھی کمرے میں گئی ہوں وہ کمرے میں خاموش بیٹھی نہ جانے دیوار پر کیا تکتی رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ باجی سے بھی بات کی ہے انہوں نے، وہ ایک تعویذ لے کر آ رہی ہیں۔ باجی کی نند کو بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا تو شاہ بابا سے تعویذ لے کر باندھا اور وہ ٹھیک ہوگئی تھی۔ بیٹا اللہ خیر کرے گا۔ انہوں نے پیار سے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا، میں کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سیما اسٹول پر خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر غضب کی ویرانی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہوں۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی، چہرے پر تاثر بھی بدلا پھر وہ زور زور سے بولی تھی۔ "نہیں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے، میں ٹھیک ہوں بالکل ٹھیک ہوں رفیق۔ بس یہ کنول تھوڑا زیادہ روئی تھی آج بہت ڈانٹا ہے اسے میں نے، اب ٹھیک ہے دیکھو سو رہی ہے آرام سے۔" میں نے بچی کو پیار کیا۔

"سیما تم نے کھانا نہیں کھایا آج۔ اگر کھاؤ گی نہیں تو طاقت کہاں سے آئے گی......"

"ہاں میں کھانا کھاؤں گی رفیق۔" اس نے آہستہ سے کہا تھا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے شروع ہوگئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے چہرے سے لگایا۔ "مجھے کچھ ہوگیا ہے...... مجھے کچھ ہوگیا ہے۔ آج میں نے کنول کو، اپنی کنول کو ڈانٹا ہے...... کل ماروں گی خدایا۔ اپنے بچے کو بھی کوئی ڈانٹتا ہے، اتنے چھوٹے بچے کو کوئی مارتا ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح سے اس کے آنسوؤں کو روکوں، اس کے رونے کو روکوں...... میں کھڑا تسلیاں دیتا رہا اور وہ روتی رہی...... نیچے سے باجی کی آواز آئی تو اس کا رونا بند ہوا تھا۔

اس رات بھی میں دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا...... میں نے نیند کی گولی دی تاکہ اسے نیند آجائے۔ تمام رات میری آنکھیں کھلتی بند ہوتی رہیں، نہ میں سویا نہ جاگا، صبح سیما کو سویا ہی چھوڑ کر آفس چلا گیا۔

شام کو ڈاکٹر صاحبہ سے ملا تو انہوں نے کہا کہ ہاں بچی ہونے کے بعد تھوڑا بہت ڈپریشن ہوتا ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے بالکل فکر مت کریں۔ ٹھیک ہوجائے گی آپ کی بیوی۔ ایسا بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جب چھ ہفتے ہوجائیں لے آیئے گا، میں دیکھ لوں گی۔ بس ذرا توجہ دیں۔ وقت دیں اسے، اصل میں شوہروں کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔

پندرہ سو روپے فیس مجھے دینے کا کوئی افسوس نہیں ہے، افسوس تو یہ ہے کہ کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا انہوں نے کہ وقت دیں اسے۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ وقت تو انہوں نے نہیں دیا، میری بات نہیں سنی، نہ یہ سمجھا کہ میں اس کی ویران آنکھوں کے بارے میں کیا بتا رہا ہوں، نہ یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی چند ہفتوں کی بچی کو ڈانٹ رہی ہے مار رہی ہے، وقت تو انہوں نے دینا تھا، وقت مجھ سے مانگ رہی ہیں۔ ارے میں تو جان دے دوں گا...... بغیر کسی فیس

کے۔ کاش یہ سب کچھ میں کہہ سکتا۔
اس رات اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے کانوں میں آوازیں آتی ہیں کہ وہ بدکردار ہے، طوائف ہے، ملیچھ ہے، گندی ہے، کوئی بار بار بولتا ہے اس کے کانوں میں۔
"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنی کنول کو کوئی نقصان پہنچا دوں گی، کچھ کر دوں گی۔ اس کا خیال رکھنا وہ ہماری بچی ہے، تمہاری بیٹی ہے......" وہ بار بار ایک بات کو دہرا رہی تھی۔
اس کے بازوؤں میں تعویذ بندھا ہوا تھا اور اس کے چہرے کی وحشت سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے آج تک افسوس ہے، سخت افسوس کہ سارے حمل کے دوران ایک ایک دن میں انٹرنیٹ کھول کر ماں اور بچے کے متعلق پڑھتا رہا، سمجھتا رہا، لیکن نہ جانے کیوں، حمل کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں، میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس جاہل اور لالچی گائناکولوجسٹ سے ملا جسے نارمل ڈلیوری اور سیزیرین سیکشن سے آگے شاید کچھ پتا نہیں تھا۔
میں نے اسے سمجھایا کہ نہیں سیما کوئی ماں اپنے بچے کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔ تم ٹھیک ہو یہ صرف بے کار کی آوازیں ہیں، اب تو باجی نے یہ تعویذ بھی پہنا دیا ہے، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کل سے چھٹی لے لوں گا۔ تمہارے ساتھ رہوں گا فکر نہ کرو۔
"ہاں تم کل سے آفس مت جانا۔ میرے ساتھ رہنا ہماری بچی کے ساتھ۔ کبھی کبھی میرا دل کہتا ہے کہ اس بچی کو مجھ سے نقصان پہنچے گا مگر میں اسے نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔ میں خود مر جاؤں گی رفیق لیکن اسے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ تم گھبراؤ مت۔ اپنا خیال رکھنا، میری بچی کا خیال رکھنا۔" وہ بار بار اپنے الفاظ کو دہراتی رہی۔ کبھی کنول کو چومتی تھی۔ کبھی مجھے گلے لگاتی تھی۔
مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میرا دل جیسے کوئی کتر کتر کر پھینک رہا ہو۔ میں نے اسے نیند کی دوا دی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی تھی، میرے بازوؤں کے تکیے پر سر لگائے، نہ جانے دیواروں پر کیا تکتی رہی تھی۔
دوسرے دن اسے سوتا چھوڑ کر آفس گیا تھا کہ وہاں جا کر ایک درخواست لکھنا اور بتانا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے نہیں آسکوں گا۔ وہاں بھی کمپنی کے کنٹری منیجر نے میرے لیے اپنے ایک دوست سائیکاٹرسٹ کو فون کر کے سیما کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ وقت دیں اسے۔ حمل کے بعد ڈپریشن کی شکایت ہوتی ہے جو خود بخود وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ وقت ان کے پاس بھی نہیں تھا، میں ان سے اسی وقت نہیں مل سکا، انہوں نے چار دن کے بعد شام کو بلایا تھا کہ سیما کو لے کر آؤں۔
میں گھر آیا تو وہ ابھی بھی سو رہی تھی، کنول کو امی جان نے باہر کا دودھ شروع کرا دیا تھا اور وہ اپنے پنگوڑے میں جھولنے کا مزہ لے رہی تھی۔
دوپہر کو ہم نے ساتھ کھانا کھایا، شام کو پھر ایسا لگا جیسے سیما سخت پریشان ہو رہی ہے۔ اس کے چہرے پر جیسے کسی نے کوئی ماسک چڑھا دیا ہو۔ سوچتی ہوئی، دور تک دیکھتی ہوئی، ویران ویران سی آنکھیں۔
اس نے ایک دفعہ بھی کنول کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔ مجھے بار بار ایسا لگتا جیسے وہ من ہی من میں دھیرے دھیرے رو رہی ہو۔
سونے سے پہلے اس نے مجھ سے پھر کہا۔ "وہ مجھے بلا رہے ہیں اپنے پاس، ان کی آوازیں آرہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تمہیں، بچی کو اس گھر کو چھوڑ دوں۔ کیوں بلا رہے ہیں وہ مجھے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔
میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے سمجھاتا رہا کہ کوئی نہیں بلا رہا ہے تمہیں۔ تم یہاں رہو گی میرے پاس ہمیشہ ہمیشہ۔
مگر وہ ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہی میرے پاس، دو دن کے بعد میں ایک ضروری دستخط کرنے آفس گیا اور جب واپس پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بیڈ روم میں بستر پر کرسی رکھ کر اپنے دوپٹے کو پنکھے سے باندھ کر گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ دروازہ توڑ کر ہی ہم لوگ اس کی لاش باہر نکال سکے تھے۔ سرہانے خط رکھا ہوا تھا۔
"مجھے لگتا ہے میں اپنی بچی کی جان لے لوں گی۔ بار بار کوئی مجھے کہتا ہے کہ میں اسے ختم کر دوں۔ میں اسے کیسے ختم کر سکتی ہوں۔ مگر مجھے اپنا اعتبار بھی نہیں ہے کہ کب کیا کر بیٹھوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں خود ہی چلی جاؤں۔ میری زندگی کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھنا رفیق اور میری بچی کا بھی۔"
خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اب میرے سامنے ایک اداس اور اجاڑ زندگی پڑی تھی۔

پہیلی کے مانند حرفوں میں بند...... نقب زنی کی انوکھی واردات

بعض اوقات سامنے کی چیز بھی انسانی آنکھ دیکھ نہیں پاتی اور نہ ہی عقل پہچان سکتی ہے... اسی کو عقل پر پردہ پڑنا کہتے ہیں۔وہ نقیب بھی اتنا ہی دیدہ دلیر تھا کہ سامنے کے سامنے بازی کھیل گیا اور قانون کے رکھوالے سمجھ ہی نہ پائے۔

دیدہ دلیر

سلیم انور

ریٹائرڈ اسکول ٹیچر فرانسس ویلنٹائن کو اپنی بیٹی لوسی اَرینز کیفے کے باہر ایک بینچ پر بیٹھی ہوئی ملی۔ لوسی نے اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائی ہوئی تھیں اور اپنی بیس بال کی سیاہ ٹوپی اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھی جس پر "شیرف" جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔

"تم قدرے پژمردہ دکھائی دے رہی ہو۔" فرانسس نے کہا۔

لوسی نے نظریں اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور دوپہر کی دھوپ میں آنکھیں میچتے ہوئے بولی۔ "ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"کیا بینک نے تمہارا چیک باؤنس کر دیا ہے؟ کیا تمہارے گھر پر کوئی درخت گر گیا ہے؟ نیٹ فلکس نے تمہارا سبسکرپشن کینسل کر دیا ہے؟"

"ارنی کیفے کے پاس میرے پسندیدہ ڈونٹس ختم ہو چکے ہیں۔"

"میں جانتی تھی کہ معاملہ کچھ سیریس ہے......"

فرانسس نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ہائی واوے تمہارا اسیل فون کہاں ہے؟''

''میری گشتی کار میں...... کیوں؟''

''جبھی تو اس کی گھنٹی بجے جارہی ہے۔ تمہارے ڈپٹی نے مجھے فون کیا تھا اور مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں تلاش کروں۔''

''کس لیے؟''

''وہاں ڈولن روڈ پر نقب زنی کی ایک واردات ہوئی ہے۔'' فرانسس نے بتایا۔

شیرف لوسی بینچ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور دھوپ کی عینک لگالی۔ ''کیا اس واردات کے لیے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہوگی؟''

''کیوں؟''

''میں ڈونٹس کے ساتھ زیادہ بہتر طریقے سے سوچ بچار کرسکتی ہوں۔''

''فکر مت کرو۔'' فرانسس نے کہا۔ ''سوچ بچار کا کام میں کرلوں گی۔''

☆☆☆

شیرف کے دفتر میں واپس پہنچ کر ڈپٹی میلون نے انہیں واردات کی مکمل تفصیل سے آگاہ کردیا۔

''آج صبح سویرے ٹمی ہیکٹر نامی ایک لڑکا لیو کریک برج کے نیچے مچھلی کا شکار کررہا تھا تو اسے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھاڑی کے کنارے سے چاروں ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا جب اوپر چڑھائی پر پہنچا تو وہاں اسے برج کے مغرب میں سوگز کے فاصلے پر ایک نئی سیاہ رنگ کی پک اپ دکھائی دی جو الیکٹرونکس ویئر ہاؤس کے عقب میں پارک تھی۔ جب ٹمی یہ منظر دیکھ رہا تھا تو سویٹ شرٹ جینز میں ملبوس ایک شخص جس نے کاؤبوائے ہیٹ پہنا ہوا تھا، عمارت کی عقبی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اندر باہر آجا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے راستے اندر سے بھاری بھرکم بکسے اٹھا کر اس سیاہ پک اپ میں لوڈ کررہا تھا۔ چند منٹ بعد اس شخص نے پک اپ اسٹارٹ کی تو گواہ ٹمی دبک کر چھپ گیا اور وہ پک اپ اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر سے برج پار کرگئی۔ تب ٹمی نے یہاں فون کردیا۔ میں نے فوراً ہی ویئر ہاؤس کے مالک کو فون کیا اور پھر جلد ہی اس نے اس بات کی تصدیق کردی کہ کئی ہزار ڈالرز مالیت کا سامان چوری ہوگیا ہے۔''

''عینی گواہ ٹمی اب کہاں ہے؟''

''وہ اپنے گھر پر ہے۔ وہ اسٹر ہیکٹر کا بیٹا ہے۔ اسے جانتی ہونا؟ اس نے کہا ہے کہ اگر ہم اس کے بیٹے سے مزید سوالات کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اس کے پاس آسکتے ہیں۔ لیکن میرے خیال سے وہ مجھے وہ سب کچھ بتا چکا ہے، جو وہ جانتا ہے۔''

''کیا اس نے بتایا کہ اس نے ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تھا؟''

''نہیں۔ پہلی مرتبہ تو فاصلہ بہت تھا پھر جب پک اپ اس کے سامنے سے گزری تو اس کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور ان کی رنگت سیاہ تھی۔ البتہ اس پک اپ پر ذاتی لائسنس ٹیگ لگا ہوا ہے۔ جیسے کہ لوگ ذاتی نمود کے لیے پلیٹ لگالیتے ہیں۔ ٹمی نے اس ٹیگ پلیٹ پر لکھا ہوا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے ڈپٹی میلون نے ایک نوٹ پیڈ اٹھایا اور اس پر لکھا ہوا نمبر پڑھنے لگا۔ ''ایس اے بی ای آر ٹو ٹی ایچ۔''

''سیبر ٹوتھ'' (S.A.B.E.R.2.T.H) لوسی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے دہرایا۔

''ٹیگ پلیٹ پر یہی لکھا ہوا تھا۔''

لوسی اپنی میز کے کنارے پر بیٹھ گئی اور ڈپٹی میلون کی جانب دیکھنے لگی۔ ''یہ کوئی لڑکا ہوگا...... ہے نا؟''

اس سے قبل کہ میلون کوئی جواب دیتا، فرانسس نے کمپیوٹر کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ''کیوں نہ ہم یہ نمبر کمپیوٹر پر چیک کرلیں تاکہ پتا چل جائے کہ یہ نمبر کس کے نام رجسٹرڈ ہے۔ کیا ہم آج ہفتے کو چھٹی کے دن بھی یہ چیک کرسکتے ہیں؟''

''یقیناً، کرسکتے ہیں۔'' میلون نے کہا۔ ''لیکن اس سے ہمیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ ٹمی نے جو پلیٹ دیکھی تھی، وہ پک اپ کے سامنے کے حصے پر لگی ہوئی تھی اور اس پر وہی نمبر لکھا ہوا تھا جو میں نے ابھی پڑھ کر سنایا تھا۔ وہ عقب میں لگی ہوئی پلیٹ کا نمبر نہیں تھا اور ٹمی نے بتایا ہے کہ وہ جس جگہ کھڑا ہوا تھا تو اس نے پک اپ کو برج پر سے گزرتے ہوئے پیچھے کی جانب سے نہیں دیکھا تھا۔''

''اور؟''

''اور یہ کہ اس ریاست میں لائسنس پلیٹ صرف عقب میں لگائی جاتی ہے۔'' لوسی نے کہا۔ ''رجسٹریشن نمبر کی پلیٹ ہمیشہ عقب میں ہوتی ہے۔''

ڈپٹی میلون نے تائید میں سر ہلادیا۔ ''سامنے لگی ہوئی ٹیگ پلیٹ وہ کوئی بھی ہوسکتی ہے جو آپ چاہتے ہیں...... مثال کے طور پر اسکول کا لوگو، کار ڈیلرشپ پلیٹ، کسی برادری یا گروہ سے متعلق کوئی مونوگرام...... یا کچھ

اور... اسی لیے انہیں اب بھی نمود و نمائش کی پلیٹ کہا جاتا ہے جو ذاتی پسند کی ہوتی ہیں اور ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ ہمیں اس سیاہ پک اپ کا اصلی پلیٹ نمبر معلوم نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود وہ جعلی پلیٹ تھی یا سامنے کی پلیٹ، یہ بچگانہ حرکت لگتی ہے۔" لوسی نے دوبارہ کہا۔ "کوئی بھی اپنی گاڑی پر سیمر ٹوتھ، کیوں لکھنا چاہے گا جبکہ اس لفظ کا کوئی مطلب بھی نہیں ہے؟"

"اور جب پتا چل جائے گا تو تمہیں یقیناً حیرت ہوگی۔" فرانسس نے کہا۔

پھر ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

میلون جو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اپنی آنکھیں ملنے لگا اور بولا۔ "ہمارے پاس ایک کام کی معلومات ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ڈولن روڈ زیرِ تعمیر ہے اور ویئر ہاؤس سے دو میل مغرب کی سمت جا کر بلاک ہو رہا ہے...... اور ٹمی نے بتایا ہے کہ اس نے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز چھ بج کر پندرہ منٹ پر سنی تھی اور پک اپ کو ساڑھے چھ بجے کے عین بعد جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ایک دستی گھڑی پہن رکھی تھی اور وہ وقت کے بارے میں بالکل پُر یقین تھا۔"

"تو پھر؟"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ برج پر چھ بجے سے پہلے سورج نکلنے کے بعد سے مچھلی کا شکار کر رہا تھا...... اور اس دوران برج پر سے کوئی بھی نہیں گزرا تھا اور چونکہ کریک برج ہی اس علاقے میں جانے یا وہاں سے نکلنے کا واحد راستہ ہے اور ٹمی نے ویئر ہاؤس کی جانب جاتے ہوئے پک اپ کو برج پر سے گزرتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھا تھا......"

"تو پھر یہ پک اپ یقیناً مخالف سمت سے آئی ہوگی۔" شیرف لوسی نے کہا۔

"درست! اس جانب سے جدھر سڑک کا کام ہو رہا ہے۔"

"تو پھر چور برج کے مغرب کی جانب دو میل کے ٹکڑے میں کسی جگہ رہتا ہے۔" فرانسس نے خیال ظاہر کیا۔

"غالباً۔"

"لیکن ٹمی نے پک اپ کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ لوڈ ہو چکی تھی...... اور مشرق کی سمت جا رہی تھی۔" لوسی نے کہا۔ "مغرب کی سمت نہیں۔"

ڈپٹی میلون نے اثبات میں سر ہلایا۔ "غالباً اس جانب جہاں چوری کا مال آسانی سے بیچا جا سکتا ہے۔"

شیرف لوسی میز کے کنارے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک لمبی آہ بھری۔

"یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ او کے میرا خیال ہے کہ تم اس علاقے میں چلے جاؤ اور وہاں کے رہائشیوں سے معلومات حاصل کرو۔ میلون! میں کمپیوٹر پر بیٹھ رہی ہوں اور ہاں۔ تم گھر چلی جاؤ!"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" فرانسس نے قدرے غراتے ہوئے کہا۔ "ٹھہر جاؤ میلون! میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔"

☆☆☆

چار گھنٹے بعد وہ تینوں ایک بار پھر یکجا ہو گئے۔

ان تینوں میں سے کسی ایک نے بھی ابھی لنچ نہیں کیا تھا۔ ڈپٹی میلون اور فرانسس کی علاقے کے دورے کے دوران وہاں کے رہائشیوں سے بات چیت بے سود ثابت ہوئی تھی اور انہیں کسی سے بھی ایسا جواب نہیں مل سکا تھا جو ان کی تفتیش میں مددگار ثابت ہو سکتا۔

البتہ موٹر وہیکل ڈپارٹمنٹ سے چیک کرنے پر شیرف لوسی کو یہ پتا چلا کہ نئے ماڈل کی تین سیاہ پک اپ اس علاقے کے رہائشی مالکان کے ناموں پر رجسٹرڈ ہیں جو یہ تھے۔

کلیرنس لیتھم، عمر بیالیس سال، جیف ویبسٹر، عمر چھیاسٹھ سال اور اسٹیفن ایبرنیتھی جونیئر، عمر اڑتالیس سال۔

شیرف لوسی نے فون پر یہ معلومات اپنے ڈپٹی میلون کو فراہم کر دی تھیں جو اس وقت اسی علاقے میں موجود تھا۔ اس نے فرانسس کے ساتھ مل کر ان تینوں کے انٹرویو لے لیے تھے۔

"کلیرنس لیتھم ایک اینٹیک ڈیلر ہے جس کا تعلق اسی ٹاؤن سے ہے۔" ڈپٹی میلون نے اپنی نوٹ بک میں سے شیرف لوسی کو پڑھتے ہوئے سنایا۔ "جیف ویبسٹر ایک ریٹائرڈ پروفیسر ہے جس کا تعلق نیش ول سے ہے اور اسٹیفن ایبرنیتھی جونیئر ایک رائٹر ہے جو ٹیری ہاٹ، انڈیانا سے منتقل ہو کر یہاں آیا ہے۔" میلون نے سر اٹھاتے ہوئے کہا اور مزید بولا۔ "پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ لیتھم سفر بہت کرتا ہے۔ میرے خیال سے چوری شدہ مال کو ٹھکانے لگانے کے لیے اسے رابطوں کی ضرورت پڑتی ہوگی اور پروفیسر ویبسٹر کی فیلڈ الیکٹرانکس ہے۔"

"ویل، کسی کو بھی حراست میں لینے کے لیے ہمارے پاس اس سے کہیں زیادہ معلومات ہونی چاہئیں۔"

اس موقع پر ایک اور ڈپٹی زیک ولسن ایک ہاتھ میں چکنے کاغذ کی تھیلی پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا یہ ڈونٹس ہیں؟" لوسی نے اس سے پوچھا۔
"بالکل تازہ ہیں۔ ارنیز ہی سے لایا ہوں۔"
"مجھے ان ہی کی طلب تھی۔" لوسی نے اپنی انگلیاں لہراتے ہوئے کہا۔
ڈپٹی زیک نے وہ تھیلی لوسی کو تھما دی۔ لوسی نے تھیلی میں سے ایک ڈونٹ نکالتے ہوئے ڈپٹی کا شکریہ ادا کیا اور اسے رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔
"سو تم نے تمام تینوں سیاہ پک اپس ڈھونڈ نکالی ہیں؟" شیرف لوسی نے ڈونٹ منہ میں چباتے ہوئے کہا۔
"تم نے انہیں خود دیکھا ہے؟"
میلون نے اثبات میں سر ہلایا۔" وہ اپنے اپنے ڈرائیو ویز میں پارک کھڑی تھیں۔ ان کے اندر کوئی سامان موجود نہیں تھا اور نہ ہی کوئی نمائشی پلیٹ سامنے کی جانب لگی ہوئی تھی۔" میلون نے قدرے توقف کیا۔" ہوسکتا ہے کہ ڈرائیور نے ٹمی کو دیکھا ہو کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اس لیے اس نے بعد میں وہ نمائشی پلیٹ اتار دی ہو۔"
"یا ہوسکتا ہے کہ وہ پک اپ ابھی تک واپس ہی نہ آئی ہو۔ وہ مشرق کی سمت گئی تھی...... اور ہوسکتا ہے ابھی تک گئی ہوئی ہو۔"
"ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔"
پھر ہر ایک اپنے اپنے طور پر سوچ میں پڑ گیا۔
"کیا کسی پڑوسی کو یاد ہے کہ اس نے کسی کو دیکھا ہو جس نے اپنی پک اپ پر "سیبر ٹوتھ" کا ٹیگ لگا رکھا تھا؟" شیرف لوسی نے پوچھا۔
میلون اور فرانسس دونوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلا دیے۔
اچانک فرانسس جس نے بے دھیانی میں ڈیسک پیڈ پر SABER2TH لکھا ہوا تھا، چونکتے ہوئے بولی۔" میں سمجھ گئی!"
"کیا سمجھ گئی؟" لوسی نے پوچھا۔
"میرا خیال ہے میں جان گئی کہ وہ پک اپ کون سی تھی!"
"یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"میں اس بارے میں پُریقین تو نہیں ہوں...... لیکن دو باتیں اس کو نمائشی پلیٹ کے ساتھ منسلک کر رہی ہیں۔"
"کیا دو باتیں؟"
"اس کا نام اور اس کا وہ ٹاؤن جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔" فرانسس نے جواب دیا۔
"جائے پیدائش؟" شیرف لوسی اور اس کا ڈپٹی میلون سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔" اس سے ہمیں کس طرح مدد مل سکتی ہے؟ لیتھم مقامی باشندہ ہے۔ وہسٹر لیسی میں پروان چڑھا ہے اور ایبرنیتھی انڈیانا میں پلا بڑھا ہے۔"
"غلط الفاظ کی چوائس۔" فرانسس نے کہا۔" میں کہتی تو یوں کہتی کہ مسٹر ایبرنیتھی کی پرورش انڈیانا میں ہوئی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
فرانسس نے دانت نکال دیے۔" مجھے یقین نہیں کہ وہ پروان چڑھ چکا ہے۔ ابھی اس کے اندر بچپنا باقی ہے۔"
"پہیلیاں مت بجھواؤ، کھل کر بات کرو، مام۔" لوسی نے زچ ہو کر کہا۔
فرانسس نے وہ نوٹ پیڈ اٹھایا جو وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی اور ان کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔
"لگتا ہے کہ تم دونوں حجری دور کے انسان ما قبل تاریخ کے دور کی فلمیں بہت زیادہ دیکھتے رہے ہو۔ SABER2TH کا مطلب قطعی طور پر مختلف ہوسکتا ہے۔"
"جیسے کہ......؟"
"SABER2، ایس ایبرنیتھی جونیئر کا مخفف ہوسکتا ہے۔" فرانسس نے الفاظ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" اور TH سے مراد......"
"ٹیری ہاٹ ہے۔" میلون نے بات مکمل کر دی۔ اس کی آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔
فرانسس کے ہونٹوں پر ایک فخریہ مسکراہٹ ابھر آئی۔" بالکل درست۔"
لوسی ایک لمحے کے لیے خاموش رہی اور اس بات پر غور کرنے لگی پھر بولی۔" کیا اسے حراست میں لینے کے لیے یہ کافی ہے؟"
"اسے تفتیش کے لیے حراست میں لینے کے لیے بھی کافی ہے۔ یہی ہمارا مطلوبہ شخص ہے!"
شیرف اور ڈپٹی شیرف دونوں دروازے کی جانب چل پڑے۔" یہاں سے ہم اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں، مام۔" لوسی نے پلٹتے ہوئے فرانسس سے کہا۔" اب تم گھر جاسکتی ہو۔"
"نہیں۔" فرانسس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔" میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔ میں اس دیدہ دلیر چور کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"
اور پھر وہ تینوں اسٹیفن ایبرنیتھی جونیئر کو حراست میں لینے کے لیے اس کی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغامِ حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی ... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوعِ انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا ... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قیدو بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد

چوتھا حصہ

سب بھائیوں نے یہی طے کیا کہ اس وقت اس بحث کو نہ چھیڑا جائے۔ ہوسکتا ہے قحط ختم ہوجائے۔ ہمیں اناج کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

بستی کے اور لوگ بھی اناج لینے کے لیے مصر گئے ہوئے تھے جواب لوٹ کر آرہے تھے۔ ان کی زبانی بھی حاکم مصر کی تعریفیں سنی جارہی تھیں۔ یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کسی کو نہیں سنایا تھا کہ وہ حاکم اتنا فراخ دل ہے کہ

اناج بھی دیا اور قیمت میں ادا کی ہوئی رقم بھی واپس کردی لیکن وہ اکیلے میں بیٹھ کر اس پر غور ضرور کرتے تھے۔
''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے ہمیں دوبارہ بلانے کے لیے یہ جال پھینکا ہو؟'' شمعون نے کہا۔
''اسے ہم بھائیوں کی ذات میں کیا دلچسپی ہے جبکہ وہ ہمیں جاسوس بھی قرار دے چکا تھا۔'' یہوداہ نے پوچھا۔
''شاید اس لیے کہ ہم بنیامین کو لے کر پہنچیں۔'' شمعون نے کہا۔
''سوال یہ ہے کہ وہ بنیامین کو بلانے پر کیوں بضد ہوا؟''
''کہیں وہ کوئی ایسا شخص تو نہیں جو ہمارے پچھلے تمام واقعات کو جانتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ہم بہت خطرے میں پھنس گئے ہیں۔'' راوبین نے اظہار کیا جو خاصی دیر سے چپ بیٹھا تھا۔
''تم کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ یوسف تھا۔'' شمعون پھر بولا۔
''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ اگر وہ یوسف ہوتا تو ہمیں پہچان چکا ہوتا اور جو کچھ ہم اس کے ساتھ کر چکے ہیں اس کے بدلے میں وہ ہماری بوٹیاں کر کے چیلوں کو کھلا چکا ہوتا۔''
''ہم مصر میں اتنے دن رہ کر آ گئے۔ ہم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ اگر یوسف ہوتا تو ہم اسے نام ہی سے پہچان چکے ہوتے۔''
''میں نے پوچھا تھا کسی سے۔'' لاوی نے دخل دیا۔ ''اس شخص نے مجھے اس کا نام ''ضفناب فیح'' بتایا تھا۔''
(فرعون نے توریت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کا نام ''ضفناب فیح'' رکھ دیا تھا)۔
''وقت کے ساتھ انسان کی شکل بدل جاتی ہے۔ نام تو وہی رہتا ہے۔'' شمعون نے بے پروائی سے کہا۔
''تم لوگ یہ بحث لے کر بیٹھے ہی کیوں ہو؟'' راوبین نے انہیں ٹوکا۔ ''کہاں مصر کا حاکم، کہاں ہمارا ناکارہ بھائی یوسف۔ اگر وہ مصر گیا بھی ہوگا تو غلام بن کر کسی گھر کا سودا سلف لاتا پھر رہا ہوگا یا مر کھپ گیا ہوگا۔ تم حاکم مصر سے یوسف کو کیوں ملا رہے ہو؟''
''میں پھر یہی سوال کروں گا۔'' شمعون نے کہا۔ ''وہ ہم میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا تمہارے باپ ابھی زندہ ہیں؟''
''شاید اس لیے پوچھا ہو کہ وہ اپنے حصے کا اناج لینے کیوں نہیں آئے۔''
''کسی اور سے تو کچھ نہیں پوچھا۔ ہم ہی سے کیوں پوچھا؟''
''مصر کا جادو بہت مشہور ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے جادو کے زور پر ہمارے دلوں کا حال جان لیا ہو۔ ہم یہ سوچ کر بھی تو گئے تھے کہ یوسف کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے سرائے میں دو ایک لوگوں سے پوچھا بھی تھا کہ بہت دن پہلے کوئی غلام یہاں فروخت ہونے آیا تھا؟ ہر جگہ سے یہی جواب ملا تھا کہ غلام تو یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ کیا خبر تم کس کی بات کر رہے ہو اور کیا خبر وہ کس شہر میں بیچا گیا ہو۔ ہمارے دلوں کا حال جان کر ہی وہ ہمیں جاسوس کہہ رہا ہوگا۔''
''لاوی! تم ہمیشہ بے وقوفی کی بات کرتے ہو۔ وہ حاکم ہے کوئی جادوگر نہیں۔ یہ مصری لوگ ہم کنعانیوں سے جلتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایسی باتیں کر رہا تھا۔ بعد میں نرم بھی پڑ گیا تھا اسی لیے اس نے رقم بھی واپس کردی۔ اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا ہوگا۔ اس وقت تو یہ طے کرو کہ اگر ہمیں اگلی مرتبہ جانا پڑا تو بنیامین کو کیسے لے کر جائیں گے۔''
''اس کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ اس وقت خاموش ہو جاؤ۔ اگر قحط نے طول پکڑا تو پھر کوشش کر کے دیکھ لیں گے ورنہ ہم کہہ دیں گے کہ ہم جو اناج لائیں گے اس میں سے کسی کو کچھ نہیں دیں گے۔''
قحط تھا کہ روز بروز شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ زمین کا سینہ چٹخنے لگا تھا۔ کھیتیاں ویران ہوگئی تھیں۔ اب یہ فکر بھی دامن گیر ہوتی جارہی تھی کہ دیر لگائی تو کہیں مصر میں بھی غلہ ختم نہ ہوجائے۔ جو کچھ مصر سے لائے تھے، اب وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ تمام بیٹے ایک مرتبہ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے آئے۔
''اناج ختم ہو رہا ہے۔ ہمیں اناج خریدنے کے لیے ایک مرتبہ پھر مصر کا سفر اختیار کرنا پڑے گا۔''
''تو جاؤ میں نے تمہیں کب روکا ہے۔''
''صرف ہمیں جانا ہوتا تو جا کر آ بھی چکے ہوتے۔ وہاں کے حاکم نے تو یہ کہا ہے کہ تم میرا منہ نہ دیکھو گے جب تک تمہارا بھائی تمہارے ساتھ نہ ہو اور تم اسے ہمارے ساتھ جانے نہیں دیتے۔ اگر تم ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دو تو ہم جائیں

گے اور تمہارے لیے اناج مول لائیں گے ورنہ ہم نہیں جائیں گے۔"

یہوداہ نے بھی نہایت لجاجت سے کہا۔" ہمارے بال بچوں کا تو خیال کرو۔ وہ بھوک سے مرجائیں گے۔ بنیامین کی ضمانت میں لیتا ہوں۔ اگر یہ نہ آئے تو اسے میرے ہاتھ سے واپس مانگنا۔"

"اس شریف آدمی نے رقم بھی واپس کردی تھی۔ اگر ہم واپس نہ گئے تو وہ ہمیں چور سمجھے گا۔ ہمیں جا کر اس کی وہ رقم بھی اسے واپس کرنی ہے۔" راوبین نے ایک اور دلیل پیش کی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کچھ دیر سر جھکائے کچھ سوچتے رہے پھر جیسے ہاتفِ غیبی نے انہیں کچھ سکھا دیا۔ آیاتِ الہامی ان کے قلب پر ظاہر ہوئیں۔

"بنیامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرلو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ گھیر لیے جائیں اور ہر طرح مجبور نہ کردیے جائیں، ہم ضرور ضرور اس کو تیرے پاس صحیح سلامت لوٹائیں گے۔"

تمام بیٹوں نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا اور ہر طرح اطمینان دلایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔"یہ جو کچھ ہوا محض اسبابِ ظاہری کی بنا پر ہے ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت اور کیا ہم اور کیا ہمارا عہد، ہم سب کو اپنے اس معاملے کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہیے۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا۔" ہم نے جو قول و قرار کیا اس پر اللہ نگہبان ہے۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر تھے۔ وہ وہی کرتے تھے جس کا حکم ہوتا تھا۔ اللہ ان کا امتحان لے رہا تھا۔ پہلی مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی انہوں نے اللہ کے حکم سے بھائیوں کے ساتھ بھیجا تھا اور اب اللہ کا حکم ہوا تو بنیامین کو بھیجنے پر بھی تیار ہو گئے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ اس بیٹے کے ذریعے ہی تجھے یوسف کا سراغ مل جائے گا۔

جب تمام بیٹے چلنے کی تیاری کر رہے تھے اور بنیامین بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نصیحت کی۔

"دیکھو سب ایک ہی دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچاسکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہے۔ فرماں روائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا اور تمام بھروسا کرنے والوں کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اس لیے میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر ہے۔"

علمائے تفسیر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ پہلی مرتبہ ان بھائیوں کا اچھی طرح استقبال کیا تھا۔ ان پر جاسوسی کا الزام لگایا ضرور تھا لیکن اس بہانے سے انہیں تین دن اپنے پاس ٹھہرایا بھی تھا تاکہ گھر کے حالات معلوم کر سکیں۔ لوگوں کو تو یہ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو یہی سمجھے تھے کہ یہ کوئی خاص لوگ ہیں جو حاکمِ مصر کے مہمان بنے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اب یہ نہیں چاہتے تھے کہ تمام بھائی ایک ساتھ مصر میں داخل ہوں اور لوگ ان سے حسد کرنے لگیں اور آزار پہنچانے کی کوشش کریں۔

توریت کو بنیاد بنا کر بعض مفسرین نے اس نصیحت کا سبب یہ بتایا ہے کہ چونکہ برادرانِ یوسف پر جاسوسی کا الزام لگایا جاچکا تھا لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام نے سوچا کہ اگر گیارہ نوجوان کروفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیزِ مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہو جائیں۔

"پھر جب مصر میں اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا تو یہ احتیاط ان کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کے جی میں جو اس نے پورا کیا اور بلاشبہ وہ صاحبِ علم تھا اور ہم نے ہی اس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بڑی نصیحتوں اور حاکمِ مصر کے لیے تحائف دے کر بیٹوں کو رخصت کیا۔ ان بھائیوں کو اپنی بہادری اور دلاوری پر بڑا ناز تھا۔ وہ بنیامین کو لے کر چلے لیکن گھر سے نکلتے ہی انہوں نے طے کرلیا تھا کہ مصر تک پہنچتے پہنچتے اسے اتنا ستائیں گے کہ خون کے آنسو رو دے گا۔ ہمارا باپ اسے ہمارے ساتھ بیٹھنے تک نہیں دیتا تھا، اب موقع ملا ہے تو اگلے پچھلے سب حساب چکا دیں گے۔

جب کنعان سے باہر نکل آئے تو ان بھائیوں نے طنز اور طعنوں کے تیر برسانے شروع کر دیے۔

''ہاں بھئی، اپنے باپ کے لاڈلے۔ تجھے ہمارے ساتھ چلنا کیسا لگ رہا ہے؟''
''تم بھی کوئی غیر تو نہیں، میرے بھائی ہو۔''
''تم بھائی سمجھو لیکن ابا جان ہمیں غیر ہی سمجھتے ہیں۔ اگر نہ سمجھتے تو ہمارے مقابلے میں تجھے اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ بیٹے تو ان کے صرف دو ہیں۔ ایک یوسف تھا ایک تم ہو اور اتفاق سے تم اب ہماری مٹھی میں ہو۔''
''ابا جان نے مجھے تم پر بھروسا کر کے تمہارے ساتھ بھیجا ہے اور تم یہ سلوک کر رہے ہو۔''
''مصر جا رہے ہو ذرا اپنے بھائی یوسف کو تلاش کرنا۔ نہ جانے کہاں غلامی کر رہا ہوگا۔''
''اس کا ذکر مت کرو۔ دیکھتے نہیں یوسف کے غم میں ابا جان کی کیا حالت ہوگئی ہے۔''
''ایسا نہ ہو، اب انہیں تمہارا غم بھی لگ جائے۔''
یہ بنیامین کو کھلی دھمکی تھی لیکن انہوں نے مصر پہنچنے تک بنیامین کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بس زبانی تنگ کرتے رہے، یہی ان کا مقصد بھی تھا۔ مصر کے قریب پہنچ کر وہ ایک سرائے میں ٹھہر گئے تاکہ ایک دن آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر شہر میں داخل ہوں۔ بنیامین یہاں تک ان کے ساتھ تھا۔ رات میں بھائیوں نے ایک نئی شرارت سوچ لی۔
''صبح ہمیں شہر میں داخل ہونا ہے۔''
''ہم نہایت سعادت مند اولاد ہیں۔ باپ کی نصیحت کبھی نہیں ٹالتے۔'' ایک بھائی نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ابا جان نے کہا تھا تمام بھائی مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔ ہم یہی کریں گے۔ شہر کے پانچ دروازے ہیں اور ہم دس ہیں۔ دو دو کر کے ہر دروازے سے داخل ہو جائیں گے۔''
''تم بھول رہے ہو رادبین۔ ہم دس نہیں گیارہ ہیں۔ بنیامین کو کیوں بھول گئے ہو؟''
''اچھا تو تم اسے بھی گن رہے ہو۔ بھائی تو ہم دس ہی ہیں۔ وہ تو یوسف کا بھائی ہے۔ اگر آج یوسف زندہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ کسی دروازے سے داخل ہوتا۔ ہم اسے اتنی رعایت دیتے ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد کسی بھی دروازے سے داخل ہو جائے۔''
''اگر یہ واپس کنعان چلا گیا؟''
''تو ہم کہہ دیں گے کہ یہ بھاگ کر آ گیا۔''
''اس کے بغیر حاکمِ مصر ہمیں اناج دے دے گا؟ کیا ہم جھوٹے نہیں پڑ جائیں گے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر نہیں آئے اور یہوداہ جو ابا جان سے وعدہ کر کے آیا تھا اس کا کیا ہوگا؟''
ان بھائیوں نے اتنی بحث کے باوجود بنیامین کو سرائے میں چھوڑا اور خود دو دو کر کے پانچوں دروازوں سے شہر میں داخل ہو گئے۔
وہ اس شہر میں پہلے بھی آ چکے تھے لہٰذا راستوں کا علم تھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہو کر سب اسی سرائے میں پہنچ جائیں جہاں پہلی مرتبہ آ کر ٹھہرے تھے۔ پھر جس دن غلہ تقسیم ہو سب ایک ساتھ حاکمِ مصر کے سامنے نہ جائیں بلکہ دو دو کر کے اپنا حصہ لینے جائیں۔ اس طرح حاکم کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ یہ وہی بھائی ہیں جن سے چھوٹے بھائی کو لانے کے لیے کہا تھا۔ یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حاکم دراصل یوسف ہے جو انہیں ایک ایک کر کے اچھی طرح پہچانتا ہے۔
بنیامین سرائے میں بیٹھا رہ گیا اور تمام بھائی مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہو گئے۔ بنیامین کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا لیکن جب اسے اندازہ ہوا کہ بھائی جا چکے ہیں تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ یہاں کوئی اس کی زبان سمجھنے والا بھی نہیں تھا۔ سرائے چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ سرائے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ سواریاں بھی اس کے بھائی اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ وہ اسی پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ ایک شخص سرائے میں داخل ہوا اور اس کے سامنے آیا۔ اس کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بنیامین کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ شخص عبرانی زبان میں بات کر رہا تھا۔
''اے لڑکے! تو پریشان کیوں ہے؟''
''میرے بھائی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔''

''تم کہاں جانا چاہتے ہو؟''

''جہاں میرے بھائی ہیں، مجھے وہاں پہنچا دو۔''

''کمال ہے! تمہارے بھائی تمہیں چھوڑ کر چلے گئے اور تم پھر بھی ان کے پاس جانے کی خواہش کررہے ہو۔''

''ہم یہاں اناج لینے آئے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ نہیں گیا تو انہیں اناج کم ملے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دیتا ہوں جہاں تمہارے بھائی گئے ہیں۔ عنقریب میں تم سے پھر ملاقات کروں گا۔''

بنیامین یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ ملاقات کیوں کرو گے اور وہ شخص دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی دو آدمی اندر آئے، یہ بھی اس سے اس کی زبان میں بات کررہے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور ایک دروازے سے داخل ہو کر ایک سرائے کے سامنے پہنچ گئے۔

''اندر چلے جاؤ۔ تمہارے بھائی تمہیں مل جائیں گے۔''

بنیامین جیسے ہی اندر گیا، اس کی ملاقات اپنے بھائیوں سے ہوگئی۔ وہ سادہ لوح انہیں دیکھتے ہی بڑے بھائی سے لپٹ گیا۔ اس کا نام راوبین تھا۔

وہ تمام بھائی اسے دیکھ کر حیران ہوئے لیکن یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے جان بوجھ کر چھوڑ آئے تھے بلکہ خوش ہوئے اور اس سے پوچھنے لگے۔

''تو ہماری غفلت سے وہیں رہ گیا تھا پھر تو یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ دروازے سے داخل ہونے کے لیے تو پیسے دینے پڑتے ہیں۔ تیرے پاس پیسے کہاں سے آئے؟''

بنیامین نے تمام واقعہ بے کم وکاست سنا دیا۔ یہ واقعہ سن کر تمام بھائی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ بنیامین ایک کونے میں بیٹھا رہا۔

''اس کا مطلب ہے ہماری نگرانی کی جارہی ہے۔ کسی کو معلوم تھا کہ بنیامین کو ہم چھوڑ کر آگئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم یہاں آکر کس سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ شخص کون ہے جسے بنیامین کی اتنی فکر ہے اور ہمارے بارے میں اتنی معلومات رکھتا ہے؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یوسف ہمارے آس پاس کہیں موجود ہو؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ ہمیں معلوم ہے یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا تھا۔ ہم نے خود اسمٰعیلی تاجروں کے ہاتھوں اس کا سودا کیا تھا۔ وہ تاجر اسے یقیناً مصر لے کر آئے ہوں گے اور کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔ جب وہ زندہ ہے تو ہمارے آس پاس بھی ہوسکتا ہے۔''

''ہمارا بوڑھا ہمسایہ ٹھیک ہی کہتا ہے کہ اس نے یوسف کو یہاں دیکھا ہے۔''

''وہ یہ بھی تو کہہ رہا تھا کہ یوسف کو کسی جرم میں قید ہوگئی تھی۔''

''تو کیا وہ ہمیشہ قید میں رہے گا، ہوسکتا ہے قید سے رہائی مل گئی ہو اور اب وہ چھپ کر ہماری نگرانی کررہا ہو۔''

''یہ سب ہمارا وہم ہے۔ اگر اسے رہائی مل گئی ہوتی بلکہ... میں تو کہتا ہوں اگر وہ زندہ ہوتا تو کنعان ضرور آتا۔ وہ بھلا باپ سے دور کیسے رہ سکتا ہے۔''

''ہمارے خوف نے اسے آنے نہیں دیا ہوگا۔''

''بہرحال وہ کوئی بھی ہے، ہماری نگرانی ضرور کررہا ہے۔ اب تو یہی ہوسکتا ہے کہ جلد سے جلد اناج خریدو اور چلنے کا سامان کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بنیامین ہی کو ہمارے خلاف کردے۔''

دو دن ٹھہرنے کے بعد اعلان ہوا کہ آج اناج تقسیم کیا جائے گا۔ ان میں سے دو بھائیوں نے کہا آج ہم حاکمِ مصر کے سامنے جاتے ہیں اور اپنے حصے کا غلہ لے کر آجاتے ہیں۔ اسی طرح باری باری جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں پہچان گیا تو بنیامین کو لے جائیں گے ورنہ اسے یہیں رہنے دیں گے۔ گھر جا کر کہہ دیں گے کہ حاکم نے بنیامین کے حصے کا اناج نہیں دیا۔

ان بھائیوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ وہ بنیامین سے حسد کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ حاکمِ مصر اس کے ساتھ اعزاز

سے پیش آئے۔ یہ خیال انہیں اس لیے تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ضد کر کے بنیامین کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔
جب وہ دونوں بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گئے تو انہوں نے پہچان لیا جبکہ یہ بھائی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ ایک ساتھ نہیں جائیں گے تو حاکم (حضرت یوسف علیہ السلام) انہیں پہچان نہیں سکے گا۔
''میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر آئندہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ نہ لائے تو مجھے منہ مت دکھانا۔'' حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں سامنے دیکھ کر کہا۔
''ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ سرائے میں ہمارے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔''
''پھر تم اکیلے کیوں آگئے؟''
''ہمارے باپ نے ہم سے چلتے وقت کہا تھا، ہم مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں اور ایک ساتھ آپ کے سامنے نہ آئیں۔ دیکھنے والے حسد کریں گے اور دشمنی اختیار کریں گے۔ اپنی باری پر ہمارا چھوٹا بھائی بھی آپ کے پاس اپنا حصہ لینے آئے گا۔''
''تمہیں اس وقت تک اناج نہیں ملے گا جب تک تم ایک ساتھ نہیں آجاتے۔ تم جاؤ اور سب مل کر میرے پاس آؤ۔''
ان دونوں کو اناج نہیں ملا اور یہ واپس آگئے۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ بنیامین کو اپنے ساتھ لے کر جائیں۔
سب ایک جتھے کی صورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پہنچ گئے اور غلہ خریدنے کے طالب ہوئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوچھا جسے ان بھائیوں نے سب سے پیچھے کھڑا کیا ہوا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بلانے پر اسے سامنے لانا پڑا۔
حضرت یوسف علیہ السلام پر جو گزری سو گزری۔ انہوں نے اپنی کیفیت چھپانے کے لیے منہ دوسری جانب کر لیا اور نوکروں کو حکم دیا کہ ان سب کو شاہی مہمان خانے میں لے جا کر ٹھہراؤ اور ان کی دعوت کا اہتمام کرو۔
نوکر یہ جاننے سے قاصر تھے کہ ان لوگوں میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ انہیں مہمان خانے میں ٹھہرایا جارہا ہے لیکن حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ ان بھائیوں کو مہمان خانے میں پہنچادیا گیا۔
اس صورتِ حال پر برادرانِ یوسف بھی کچھ کم حیران نہیں تھے۔ ان میں سے بعض کا تو یہ خیال تھا کہ انہیں جاسوس سمجھ لیا گیا ہے اور انہیں گرفتار کرلیا جائے گا۔
شمعون کا یہ خیال تھا کہ حاکمِ مصر کے پردے میں خود یوسف ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ حاکمِ مصر نے اپنے چہرے پر نقاب کیوں ڈالی ہوئی تھی۔ ہم صرف اس کی آنکھیں دیکھ سکتے تھے۔
دوسرے بھائیوں نے اس کا مذاق اڑایا۔
''یوسف کا خوف تمہارا پیچھا کررہا ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ یوسف مصر میں ہو اور زندہ ہو لیکن مصر کا حاکم بن کر فرعون کی نیابت کررہا ہے، یہ کوئی پاگل ہی سوچ سکتا ہے۔''
انہیں جلد ہی نوکروں کی زبانی معلوم ہوگیا کہ حاکمِ مصر اکثر نقاب ڈالے رہتا ہے، یہ کوئی اس موقع پر منحصر نہیں۔
''ہوسکتا ہے اس کے چہرے پر کوئی ایسا نشان ہو جسے چھپانے کے لیے وہ نقاب ڈال لیتا ہو۔''
''اس کا چہرہ اگر بگڑا ہوا ہے تو نقاب ہر وقت ڈالنی چاہیے جبکہ نوکر کہتا ہے اکثر ڈال لیتے ہیں یعنی کبھی نہیں بھی ڈالتے۔ یاد ہے، جب پچھلی مرتبہ ہم آئے تھے تو اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔''
''ہاں، یاد تو آرہا ہے۔''
''پھر اس سے ہماری کیا رشتے داری ہے کہ اس نے ہمیں دعوت پر روکا ہے؟''
''شاید ہمیں دعوت کے بہانے قید کرلیا گیا ہے۔''
''ہم نے کیا جرم کیا ہے جو حاکم ہمیں قید کرے گا؟''
''وہ نقدی جو پہلی دفعہ ہمارے بوروں میں رکھ کر واپس کردی گئی تھی اس کے سبب سے ہم کو قید کروادیا ہے تاکہ اسے ہمارے خلاف بہانہ مل جائے اور وہ ہم پر حملہ کر کے ہمیں اپنا غلام بنالے اور ہمارے جانور چھین لے۔''
یہ بات سب کی سمجھ میں آگئی۔ وہ سب مل کر مہمان خانے کے منتظم کے پاس پہنچے اور اس سے اپنی بپتا بیان کی۔

''جناب ! ہم پہلے بھی یہاں اناج مول لینے آئے تھے۔ جب ہم نے گھر جا کر بوروں کو کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم نے جو نقدی قیمت کے طور پر ادا کی تھی، وہ پوری کی پوری ہمارے بوروں میں رکھی ہوئی ہے۔ ہمیں خبر نہیں کہ یہ نقدی کس نے ہمارے بوروں میں رکھ دی تھی۔ ہم وہ نقدی ساتھ لے کر آئے ہیں۔''

''مجھے اس رقم سے کیا سروکار۔'' منتظم نے کہا۔ ''حاکم نے اعلان کیا ہے کہ وہ دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ کھائے گا۔ جب وہ آئے تو یہ رقم اس کو لوٹا دینا۔ وہ چاہے تو رکھ لے چاہے تو پھیر دے۔''

سب بھائی مایوس ہو کر سست گئے اور یوسف علیہ السلام کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر کو ذرا زیادہ وقت گزر گیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام تشریف لائے۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔ ان کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس سے ان کے بھائیوں کو پہچان لینا چاہیے تھا کہ ایسا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا کس کو ملا تھا لیکن قدرت نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ ان کی شناخت ہو۔ بھائیوں میں سے کوئی بھی انہیں نہ پہچان سکا۔

تمام بھائی منتظم کی ہدایت کے مطابق بوروں سے نکلنے والی نقدی ان کے حضور لے گئے اور گھٹنوں کے بل جھک کر ان کے حضور پیش کر دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''حضور ! جب ہم پہلے آئے تھے اور اناج خریدا تھا تو یہ رقم ادا کی تھی لیکن آپ کے کارندوں میں سے شاید کسی نے یہ نقدی غلطی سے ہمارے بوروں میں رکھ دی تھی۔ اگر ہم اسے رکھ لیتے تو یہ بددیانتی ہوتی، سو ہم اسے واپس لے آئے ہیں۔ اسے قبول کیجیے۔''

''مجھے تو تمہاری دی ہوئی نقدی مل چکی۔ اب یہ خدا نے دوبارہ دے دی ہے تو اسے تم ہی رکھو۔''

''جو اناج ہم آج خریدیں گے اس کے لیے بھی رقم لائے ہیں۔''

''جب اناج ملے گا، اس وقت رقم ادا کر دینا۔ اس وقت تو یہ بتاؤ تمہارا بوڑھا باپ جس کا تم نے ذکر کیا تھا اچھا تو ہے۔ کیا وہ اب تک جیتا ہے؟''

''تیرا خادم اور ہمارا باپ خیریت سے ہے اور اب تک جیتا ہے۔'' بھائیوں نے جواب دیا۔

پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ دسترخوان بچھائیں۔

ملازموں کو پہلے ہی تاکید کر دی گئی تھی۔ نشستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ سارے بھائیوں کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پانچ ایسی نشستوں پر دسوں بھائی بیٹھ گئے۔ بنیامین تنہا رہ گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے اجازت لی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ بنیامین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیں۔ بھائیوں نے اجازت دی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔

بھائیوں کے لیے یہ منظر بھی حیران کن بلکہ ناقابلِ یقین تھا۔ مصر کے لوگ عبرانیوں کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور یہاں یہ عالم تھا کہ کوئی عام مصری نہیں بلکہ حاکمِ مصر اپنے کھانے میں بنیامین کو شریک کر رہا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے کھانا نکال کر دے رہا تھا۔

اس وقت تو وہ کچھ نہیں کہہ سکے تھے لیکن بعد میں خلوت میں انہوں نے اس بات پر بہت باتیں بنائی تھیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سب کے رہنے کے لیے الگ الگ مکان دے دیے کہ کچھ دن یہاں رہیں اور سیر و تفریح کے بعد اپنے ملک کو جائیں۔ بنیامین کو یہاں بھی امتیازی درجہ دیا گیا۔ اس کے لیے اپنے محل میں اپنے کمرے سے ملحق کمرے کا انتخاب کیا۔

یہ دوسرا موقع تھا جب بنیامین کے بھائی اس سے بے حد حسد کرنے لگے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اس کے بھائیوں سے جدا کر دیا تو انہیں یہ موقع مل گیا کہ اپنی حقیقت اپنے بھائی پر ظاہر کر دیں اور برسوں سے رکے ہوئے آنسو اپنی آنکھوں سے بہا دیں۔ گھر کے حالات بھی اس سے پوچھیں کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ جو کچھ بھائیوں نے انہیں بتایا ہے، وہی سچ ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کے پاس گئے۔ ''کیا تم ہی ان لوگوں کے چھوٹے بھائی ہو جس کو انہوں نے لانے کا

وعدہ کیا تھا؟''
''ہاں، وہ میں ہی ہوں۔''
''ان لوگوں کا تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہے؟''
''بڑے بھائی ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''
''اور تمہارے والد؟''
''ان کا اپنے بیٹے یوسف کی گمشدگی کے بعد برا حال ہے۔ وہ اس کے غم میں اتنا روئے ہیں کہ ان کی بینائی بھی چلی گئی ہے۔''
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ بالکل نئی اطلاع تھی۔ ان کے بھائیوں نے تو صرف یہ بتایا تھا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ باپ کی حالت کا سن کر آپ کو بے حد صدمہ ہوا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آگے بڑھ کر بنیامین کو گلے سے لگا لیا اور بڑی دیر تک روتے رہے۔
بنیامین کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ ایک غیر آدمی کو اس کے والد کا اتنا دکھ کیوں ہے۔
''بنیامین، کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟''
''آپ حاکم مصر ہیں۔''
''اس کے علاوہ؟''
''مجھے یہ شک ہو رہا ہے کہ سرائے میں میری مدد کے لیے آپ ہی آئے تھے۔''
''اس کے علاوہ کیا جانتا ہے؟''
''مصر کے حاکم، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔''
''کیا یہ بھی نہیں جانتا کہ میں ہی تیرا گمشدہ بھائی یوسف ہوں؟ خدا کا مجھ سے وعدہ تھا۔ اس نے مجھے خزانے دے دیے اور سب کو میرا مطیع بنا دیا۔''
''میرے بھائی تو کہتے ہیں یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تھا پھر تم یوسف کیسے ہو سکتے ہو؟''
''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے بھیڑیا اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ مجھے ان شقی القلب بھائیوں نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا مگر اللہ نے مجھے زندہ رکھا۔''
اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس داستان کا ایک ایک لفظ بنیامین کو سنایا جو اب تک ان پر گزری تھی۔
اب تو عجیب حال تھا۔ بنیامین ان سے لپٹ کر بلک بلک کر رو رہا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام اسے تسلیاں دے رہے تھے۔
''اب تو ایسا کرنا کہ بھائیوں کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ تجھے راستے ہی میں مار ڈالیں گے۔ اس راز کی حفاظت کرنا۔ دیکھو اللہ آگے کیا کرتا ہے۔''
وہ بنیامین کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے لیکن سخت مضطرب تھے۔ انہوں نے ایک ایسا راز بنیامین کے سپرد کر دیا تھا کہ اگر اس کی زبان سے نکل جاتا تو بھائیوں کے ہاتھوں اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ بنیامین نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائیوں کا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں۔ باپ بوڑھے بھی ہیں اور نابینا بھی۔ وہ بنیامین کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ اگر میں اسے یہیں روک لوں اور اپنی حفاظت میں رکھوں تو کتنا اچھا ہو۔ پھر کسی مناسب وقت پر والد کو بھی یہیں بلا لوں گا۔
یہ ان کی خواہش ہو سکتی تھی لیکن مصری قانون کے مطابق کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگے جس کا سہارا لے کر بنیامین کو مصر میں روک لیں۔ پھر وحی کے ذریعے وہ ترکیب انہیں بتا دی گئی۔
''یوں خفیہ تدبیر کر دی ہم نے یوسف کے لیے۔ وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی بنیامین کو اس بادشاہ (مصر) کے طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے۔ ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں... اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔'' (سورۃ یوسف)۔

آپ ایک مرتبہ پھر بنیامین کے پاس گئے اور اس سے بھائیوں کے سلوک کی بابت دریافت کرنے لگے۔ اس مرتبہ بنیامین نے تمام باتیں سچ سچ بتادیں۔

"تمام بھائی مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ آپ کے گم ہوجانے کے بعد میں ہی ان کی آنکھوں کا تارارہ گیا ہوں۔ بھائیوں کو میری یہ قدرو منزلت گوارا نہیں۔ وہ ہر وقت طعن وطنز کے تیر برساتے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ کی طرح میرا بھی براحال نہ کریں۔"

"اگر میں تیری حفاظت کی خاطر تجھے یہیں روک لوں...... بھائیوں کے ساتھ نہ جانے دوں؟"

"ابا جان، میری جدائی برداشت نہیں کرسکیں گے۔"

"تو ان کی فکر مت کر۔ میں انہیں کسی طرح باخبر کردوں گا کہ میں زندہ ہوں اور تُو میرے پاس ہے۔ پھر جو اللہ کو منظور ہو۔"

"میرے لیے تو یہ خوشی کی بات ہوگی کہ میں تمہاری خدمت کروں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خفیہ تدبیر سے اسے آگاہ کردیا جو آپ اسے روکنے کے لیے کرنے والے تھے۔

کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو اپنے پاس بلایا تاکہ انہیں رخصت کریں اور منتظم کو حکم دیا کہ ان آدمیوں کے بوروں میں جتنا اناج وہ لے جاسکیں بھردے۔

جب بورے بھرے جاچکے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خفیہ تدبیر پر عمل کیا اور اپنا چاندی کا پیالہ جس میں وہ پانی پیتے تھے، خاموشی سے بنیامین کے بورے میں رکھ دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی اس وقت محل کے اس حصے میں بیٹھے ہوئے تھے جس کی دیواروں اور چھتوں پر کسی ماہر مصور نے تصویری مناظر کندہ کیے تھے۔ ذرا غور کیا تو کھلا کہ ان مناظر میں خود ان کی کہانی کو واضح کیا گیا ہے۔ کنعان میں برسوں پہلے "دوتین" کے مقام پر جو کچھ پیش آیا تھا، اسی کے خاکے یہاں کھنچے ہوئے تھے۔ چہرے اجنبی تھے لیکن کہانی وہی تھی۔ ان تصویروں کے دس کردار تھے۔ گیارھواں وہ شخص تھا جسے ظلم کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ یہ شخص یقیناً حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔

ایک تصویر میں ان کی قمیص اتاری جارہی تھی۔ دوسری میں انہیں دھکے دے کر کنوئیں کی طرف لے جایا جارہا تھا پھر انہیں کنوئیں میں اتارنے کا منظر تھا۔ اس کے بعد سارے بھائیوں کو جشن مناتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ایک تصویر میں اسمٰعیلی تاجروں کو آتا دکھایا گیا تھا۔ پھر ایک شخص کنوئیں پر آتا ہے اور اس کے ڈول میں بیٹھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کنوئیں سے باہر آتے ہیں۔ غرض تمام مناظر کسی دستاویزی ثبوت کی طرح سامنے تھے۔ بھائیوں کو اپنے مظالم کا ایک ایک لمحہ یاد آتا جارہا تھا۔ ان کے کرتوت ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ ضرورت سے زیادہ غلہ ملنے کی خوشی اچانک کافور ہوگئی۔ ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا۔ دوسرے نے تیسرے کو کہنی ماری۔ سب کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔

"یہ کیا طلسم ہے یہوداہ حاکم مصر کو ان واقعات کا علم کیسے ہوگیا؟"

"خیریت تو یہ ہے کہ ان تصویروں میں چہرے ہمارے نہیں ہیں۔ اگر حاکم مصر کو یہ معلوم ہوجاتا کہ اس کہانی کے تمام کردار اس وقت اس کے مہمان ہیں تو سوچو کیا ہوتا۔" راوبین نے بڑی عقل مندی کی بات کی۔

"حاکم مصر نے یہ تصویر بنوائی کس سے ہے اور مصور کو ان واقعات کا علم کیسے ہوگیا جو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ مصور کا تخیل ہے یا وہ ان واقعات کا عینی شاہد تھا؟"

"ہوسکتا ہے اسمٰعیلی تاجروں کے قافلے میں کوئی مصور بھی ہو اور اس کی رسائی فرعون یا حکام کے دربار تک ہوگئی ہو۔ اس سے محل کی آرائش کے لیے تصویریں بنانے کو کہا گیا ہو اور اس نے اس کہانی کو رنگوں اور برش کے ذریعے بیان کردیا ہو۔ حاکم مصر کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ واقعات حقیقی ہیں۔ اگر مصور نے کچھ بتایا بھی ہوگا تو ہمارے چہرے ان تصویروں میں نہیں ہیں۔"

یہ لوگ بظاہر مطمئن ہوگئے تھے لیکن بنیامین کا کانٹا ان کے دلوں میں شدت سے کھٹکنے لگا۔

"بنیامین تو اسی محل میں ہے۔ اس نے بھی یہ تصویریں دیکھی ہوں گی۔ اگر اس نے گھر پہنچ کر ابا جان کو بتایا تو ہمارا جھوٹ کھل جائے گا۔ ہم تو یہ کہہ چکے ہیں کہ یوسف کو بھیڑیا لے گیا۔"

ایک مرتبہ پھر بنیامین کے خلاف ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔
''بنیامین اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یوسف کی کہانی ایک بار پھر دہرائی جا سکتی ہے۔ بنیامین کو گھر تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔''
''اگر ہم بنیامین کو گھر لے کر نہیں گئے تو ابا جان اس مرتبہ ہمیں قطعی معاف نہیں کریں گے۔''
''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو بنیامین کو ساتھ لو اور گھر کی طرف چلو۔ ہم راستے میں اسے قتل کر کے کہیں پھینک دیں گے اور روتے پیٹتے گھر پہنچ جائیں گے۔''
تمام بھائیوں نے یک زبان ہو کر بنیامین کو قتل کرنے کی منظوری دے دی۔ اس فیصلے میں حسد کا وہ جذبہ بھی شامل تھا جو بنیامین کی پذیرائی سے ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔
جب بوروں میں اناج بھر دیا گیا تو یہ تمام بھائی جن میں بنیامین بھی شامل تھا، کنعان جانے کے لیے رخصت ہوئے۔ سب بھائی نہایت خوش تھے کہ حاکم مصر نے اعزاز بھی بخشا اور اناج بھی اتنی وافر مقدار میں دے دیا کہ شاید تیسری بار نہ آنا پڑے۔ وہ خوشی خوشی اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔ سرگوشیوں میں یہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے کہ بنیامین کو کہاں اور کس وقت ٹھکانے لگانا ہے۔
ابھی وہ شہر کے دروازے کے پاس پہنچے تھے اور دروازہ پار نہیں کیا تھا کہ انہیں آوازیں سنائی دیں۔ کوئی انہیں پکار رہا تھا اور چیخ چیخ کر انہیں رکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔
''کنعان کے قافلے والو رک جاؤ۔ خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔''
ان آوازوں پر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شاہی گھڑسوار سرپٹ دوڑتے آ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر ان سواروں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔
''ہمیں کیوں روکا گیا ہے جبکہ تمام لوگ اس دروازے سے باہر جا رہے ہیں۔''
''سب لوگوں کو اس لیے جانے دیا جا رہا ہے کہ یہ چور نہیں ہیں جبکہ تم نے چوری کی ہے۔ وہ تو بروقت راز کھل گیا ورنہ تم تو چلے ہی گئے تھے۔''
''تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم چور نہیں ہیں۔''
''احسان فراموشو! ہمارے مالک نے تمہیں اپنا مہمان بنایا، شاہی دسترخوان پر بٹھایا، تمہیں عزت دی اور تم نے یہ صلہ دیا کہ قیمتی شاہی پیالہ چوری کر کے لے آئے۔''
''اے بزدل سپاہیو!'' یہوداہ نے آگے بڑھ کر انہیں للکارا۔ ''ہم پر چوری کا الزام مت لگاؤ۔ ہمارا باپ پیغمبر ہے اور ہم بہادر ہیں۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم لوگوں کی چیزیں چراتے پھریں۔''
''شاہی دسترخوان پر تم ہی تھے۔ تمہارے بعد کوئی نہیں آیا۔ پیالہ تم ہی میں سے کسی نے چرایا ہوگا۔''
''ہم یہ بے ہودہ الزام برداشت نہیں کر سکتے۔''
''ہر چور یہی کہتا ہے۔ تمہارے انکار سے کیا ہوتا ہے۔''
''بات تو بے غیرتی کی ہے لیکن ہم پھر بھی تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم ہماری تلاشی لے کر اپنا اطمینان کر لو۔ ہم نے چوری نہیں کی تو پھر ہمیں ڈر کیوں لگے۔''
''تمہیں ہمارے ساتھ شاہی محل واپس جانا ہوگا۔ تلاشی حاکم کے سامنے لی جائے گی تاکہ پیالہ برآمد ہو تو فیصلہ بھی اسی وقت سنایا جا سکے۔''
''جو کچھ کرنا ہے یہیں کر لو۔ جب ہم نے چوری کی ہی نہیں تو وہاں جا کر بھی کیا نکل آئے گا۔''
شاہی کارندے انہیں واپس لے جانے کے لیے تکرار کر رہے تھے جبکہ وہ واپس جانے کو تیار نہیں تھے۔ بالآخر تمام بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا اور واپسی کے لیے تیار ہو گئے۔
یہ سب شاہی محل تک واپس آ گئے۔ حضرت یوسفؑ موجود تھے۔
''ان لوگوں نے قبول کیا؟''
''یہ سب انکار کر رہے ہیں۔''

اس موقع پر یہوداہ آگے بڑھا۔ بڑا تو رادبین تھا لیکن ہر موقع پر یہوداہ ہی ان کی راہنمائی کرتا تھا۔

''حاکم مصر کو معلوم ہو کہ ہم اپنی دیانت داری کا ثبوت کئی مرتبہ دے چکے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ آئے تھے تو غلطی سے نقدی ہمارے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ غلطی آپ کے کارندوں کی تھی۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم جب دوبارہ آئے تو وہ نقدی واپس لے کر آئے اور آپ کو واپس کرنی چاہی۔ کیا یہ ہماری دیانت داری نہیں تھی؟ اسی طرح جب ہم اپنے چھوٹے بھائی کا حصہ بھی آپ سے لے کر گئے تو آپ نے شاید یہ سمجھا کہ ہم آپ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہمارا کوئی چھوٹا بھائی نہیں لیکن ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم سچے ہیں۔ اس مرتبہ آئے تو بنیامین کو ساتھ لے کر آئے۔ اس کے بعد بھی ہم پر چوری کا الزام لگایا جارہا ہے۔ ہم نے اگر پیالہ چرایا ہوتا تو ہم اتنے سچے ہیں کہ خود قبول کر لیتے۔ اگر پھر بھی کسی کو شک ہے تو ہمارے سامان کی تلاشی لے لی جائے۔''

''اگر وہ پیالہ تم میں سے کسی کے سامان سے نکلا تو اپنی سزا خود تجویز کردو۔ اس شخص کو کیا سزا دی جائے؟''

''جناب! اگر ہم میں سے کوئی چور ثابت ہوگیا تو ہمارے قانون کے مطابق وہ ایک سال تک آپ کی غلامی میں رہے گا۔''

''مصری قانون تو یہ ہے کہ چور کا سامان ضبط کر کے اسے جلاوطن کر دیا جائے لیکن ہم وہی سزا دیں گے جو تم نے ابھی بیان کی۔'' حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اور کارندوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے سامان کی تلاشی لی جائے۔

سب سے پہلے یہوداہ کے سامان کی تلاشی لی گئی کیونکہ وہی آگے بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کے سامان سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ پھر شمعون آگے بڑھا۔ وہ بھی چور نہیں نکلا۔

اب تمام بھائی کارندوں کا مذاق اڑاتے جارہے تھے اور اپنے بورے کھلواتے جارہے تھے۔

''ہم پیغمبرزادے ہیں۔ نہ جھوٹ بولتے ہیں نہ چور ہیں۔ اپنے حاکم سے بھی کہہ دو کہ وہ ہمارا وقت برباد کر رہا ہے۔ ہمیں جانے دے، اسی میں بھلائی ہے۔''

دسوں بھائیوں کی تلاشی لی جاچکی تھی۔ اب صرف بنیامین باقی رہ گیا تھا۔ تمام بھائیوں کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی کہ ان کی جان تو چھوٹی۔

بنیامین کے سامان کی تلاشی لی گئی تو خلافِ توقع یہ پیالہ اس کے سامان سے برآمد ہوگیا۔ کارندے زور زور سے چیخنے لگے۔ ''پیالہ مل گیا...... پیالہ مل گیا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے ان بھائیوں سے کہا۔

''تم تو کہتے تھے پیالہ تم لوگوں کے پاس نہیں۔ اب یہ دیکھ لو تمہارے ہی بھائی کے پاس سے نکلا۔ ممکن ہے یہ تمہاری رضامندی سے رکھا گیا ہو۔''

یہ بھائی اس وقت بھی اپنی شقاوت قلبی سے باز نہیں آئے اور بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''بنیامین نے چوری کی تو ہمیں کوئی تعجب نہیں کیونکہ اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔'' حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ سن کر بھی ضبط سے کام لیا اور راز فاش نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ میں ہی یوسف ہوں۔ میں نے تو کبھی کوئی چوری نہیں کی بلکہ ان کو مخاطب کرتے ہوئے کسی اور طرح ان کو سرزنش کی۔

''ابھی تو تم لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ تم لوگ کبھی چوری کے قریب تک نہیں گئے یا اب غیر حاضری میں اپنے بھائی پر چوری کا الزام لگا رہے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری پیشہ ہے۔''

بنیامین کو چونکہ پہلے بتا دیا گیا تھا اس لیے اس پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہیں تھی۔

''اب تم بتاؤ تمہارے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟'' حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ اسے مصری قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ اس کا سامان ضبط کر کے جلاوطن کر دیا جائے۔''

''یہ تو اب ممکن نہیں کیونکہ تم لوگ پہلے ہی سزا تجویز کر چکے ہو۔ اس کا فیصلہ تو کنعانی قانون کے مطابق ہوگا یعنی اسے ایک سال کے لیے ہماری غلامی کرنی ہوگی۔''

''اگر آپ کو یہی کرنا ہے تو ہم میں سے کسی بھائی کو روک لیجیے مگر بنیامین کو ہمارے ساتھ جانے دیجیے۔'' یہوداہ نے تجویز دی۔

"اللہ مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔ میں ظالم نہیں، انصاف کرنے والا ہوں۔ جس نے چوری کی ہے سزا تو اسی کو ملے گی۔ میں یہ ظلم کیسے کرسکتا ہوں کہ اس کے بدلے کسی اور کو روک لوں۔"

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے صاف انکار کردیا تو راوبین آگے بڑھا اور خوشامد کرنے لگا۔

"اے میرے خداوند! ذرا اپنے خادم کو اجازت دے کہ اپنے خداوند کے کان میں ایک بات کہے اور تیرا غضب تیرے خادم پر نہ بھڑکے کیونکہ تو فرعون کے مانند ہے۔"

"تو کیا کہنا چاہتا ہے، کہہ گزر۔"

"میرے خداوند نے اپنے خادموں سے سوال کیا تھا کہ تمہارا باپ یا تمہارا بھائی ہے؟ اور ہم نے اپنے خداوند سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بوڑھا باپ ہے اور اس کے بڑھاپے کا سہارا چھوٹا لڑکا بھی ہے اور اس کا بھائی مرگیا ہے اور وہ اپنی ماں کا ایک ہی رہ گیا ہے، سو اس کا باپ اس پر جان دیتا ہے۔ تب تو نے اپنے خادموں سے کہا کہ اسے میرے پاس لے کر آؤ کہ میں اسے دیکھوں۔ ہم نے اپنے خداوند کو بتایا کہ وہ لڑکا اپنے باپ کو چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اگر وہ اپنے باپ کو چھوڑے تو اس کا باپ مرجائے گا پھر تو نے اپنے خادموں سے کہا کہ جب تک تمہارا چھوٹا بھائی تمہارے ساتھ نہ آئے تو پھر تم میرا منہ نہ دیکھو گے۔

"اور یوں ہوا کہ جب ہم اپنے باپ کے پاس جو تیرا خادم ہے، پہنچے تو ہم نے اپنے خداوند کی باتیں اس سے کہیں۔ ہمارے باپ نے کہا پھر جا کر ہمارے لیے اناج مول لاؤ۔ ہم نے کہا ہم نہیں جاسکتے۔ اگر ہمارا سب سے چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ ہو تو ہم جائیں گے اور تیرے خادم یعنی میرے باپ نے ہم سے کہا تم جانتے ہو کہ میری بیوی کے مجھ سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک تو مجھے چھوڑ ہی گیا اور میں نے خیال کیا کہ وہ ضرور پھاڑ ڈالا گیا ہوگا اور میں نے اسے اس وقت سے پھر نہیں دیکھا۔ اگر تم اس کو بھی میرے پاس سے لے جاؤ اور اس پر کوئی آفت آپڑے تو تم میرے سفید بالوں کو قبر میں اتارو گے۔ اب اگر میں اپنے باپ کے پاس جاؤں اور یہ لڑکا ہمارے ساتھ نہ ہو تو چونکہ اس کی جان اس لڑکے کی جان کے ساتھ وابستہ ہے، یہ دیکھ کر کہ لڑکا نہیں آیا وہ مرجائے گا۔ میں اپنے باپ کے سامنے اس لڑکے کا ضامن بھی ہو چکا ہوں۔ میں نے عہد کیا تھا کہ اگر میں اسے تیرے پاس واپس نہ پہنچادوں تو میں ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کا گناہ گار ٹھہروں گا۔ اس لیے تو مجھے اجازت دے کہ میں اس لڑکے کے بدلے آپ کا غلام ہو کر رہ جاؤں اور یہ لڑکا اپنے بھائیوں کے ساتھ چلا جائے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کو وحی ہو چکی تھی کہ یہ بھائی راستے میں بنیامین کو ضرور نقصان پہنچائیں گے اس لیے راوبین کی ایسی پُراثر تقریر کے بعد بھی آپ نے ان کی دلیل کو قبول نہیں کیا۔

"مجھے یہ قبول نہیں۔ جس نے چوری کی ہے غلامی وہی کرے گا۔ ایک سال بعد بے شک اسے آ کر لے جانا۔"

"افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم بنیامین کو لیے بغیر کنعان واپس نہیں جاسکتے۔"

"مجھے اس سے غرض نہیں۔ تم مصر میں رہو یا کنعان واپس چلے جاؤ۔ بنیامین میرا قیدی ہے، تم اب اس کے متعلق مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس صاف جواب نے سب کو مایوس کردیا۔ ان کے تو سارے منصوبے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ طے کیے بیٹھے تھے کہ بنیامین کو بھی یوسف علیہ السلام کی طرح راستے سے ہٹادیں گے لیکن اب بنیامین کو مصر ہی میں رکنا پڑ رہا تھا۔ اس موقع پر بھائیوں کے درمیان نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ بھائی اس لیے بنیامین کو ساتھ لے جانے پر زور دے رہے تھے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کرکے آئے تھے کہ بنیامین کو واپس لے کر آئیں گے۔ اب ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنیامین کی گمشدگی کا مژدہ سنادیں۔ دوسرے کچھ بھائی اس لیے بضد تھے کہ وہ بنیامین کو راستے سے ہٹانے کے درپے تھے۔ مقاصد جدا جدا تھے لیکن اس پر سب متحد تھے کہ بنیامین کو واپس لے کر جائیں گے۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

انسان سادہ ہو یا شاطر... ہر ایک خوبی کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے اور یہاں تو حسد کی ہی انتہا ہوگئی... جب چوروں کو پڑ گئے مور تو گناہ بے لذت والا محاورہ سچا ثابت ہو گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاطرانہ چال چلنے والوں کا دلچسپ تکون۔

ناحق کوئلے کی دلالی میں کالے ہاتھ کرنے والوں کی بے بسی

شاطر

شاکر لطیف

''ایک اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے شاگرد کو سارے داؤ سکھلائے مگر ایک آخری داؤ ہمیشہ اپنے پاس بچا کر رکھے تاکہ بغاوت کی صورت میں اپنے شاگرد کو شکست دے سکے مگر میں نے تو اس اصول کے برخلاف تمہیں اپنے سارے داؤ سکھا دیے ہیں۔'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بروک سے کہا۔

''شاید آپ کی بات درست ہو۔'' بروک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا آپ سے

بغاوت کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپ مجھے ہمیشہ ایک وفادار شاگرد کے طور پر ہی پائیں گے۔''

میں نے فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کا ماضی اس بات کا گواہ تھا۔ وہ پچھلے دو سال سے میرے ساتھ کام کر رہا تھا مگر اس نے کبھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی، کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ میری نظروں میں ناقابلِ اعتبار ٹھہرتا۔ ویسے میں نے بھی اسے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ کام کے بعد جتنا بھی مال حاصل ہوتا، میں اسے ہمیشہ برابر کا حصہ دیتا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان چند برسوں میں ہم کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کی وفاداری کا اصل امتحان تبھی ہوتا جب ہم کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں کامیاب ہوجاتے۔ بظاہر معصوم اور سادہ نظر آنے والے بروک کو وقت کے تھپیڑوں نے بہت عیار و مکار بنادیا تھا۔

میرا نام راجر ہے، میں ایک پیشہ ور ڈکیت و چور ہوں اور برسوں سے یہی کام کر رہا ہوں۔ شادی کا جھنجٹ بھی نہیں پالا تھا اس لیے سر پر اپنے علاوہ کسی کی ذمے داری بھی نہیں تھی۔ میں طویل عرصے سے اکیلا ہی وارداتیں سرانجام دے رہا تھا مگر پھر دو سال پہلے میری ملاقات بروک سے ہوئی۔ وہ بیس بائیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے ابھی حال ہی میں جرم کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اس میں اپنے مقصد کو پالینے کا جذبہ اور جوش تھا۔ میں ایک منجھا ہوا اور تجربہ کار کرمنل تھا جبکہ بروک میرے مقابلے میں بالکل اناڑی تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ یہ جوشیلا نوجوان جلد ہی یا تو پکڑا جائے گا یا پھر پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا کیونکہ کسی بھی جرم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جوش کی نہیں، ہوش کی اور ٹھوس پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ حد سے زیادہ جوشیلا پن کبھی کبھی انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ یہ نوجوان مجھے پسند آیا تھا، اس میں کچھ کر گزرنے کا جنون تھا۔ یہ دلیر اور بہادر بھی تھا، بس کام کے معاملے میں ابھی اناڑی تھا۔ اسے مجھ جیسے کسی منجھے ہوئے استاد کی ضرورت تھی جو اس کی اچھے طریقے سے تربیت کرسکتا۔ بروک ایک ایسا ہیرا تھا جسے تھوڑی سی تراش خراش کی ضرورت تھی۔

میں نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ میں نے اسے اپنے مدمقابل کو زیر کرنے کے تمام گر سکھائے۔ اسلحے کا استعمال سکھلایا۔ خنجر زنی کی تربیت دی اور ہر قسم کے سیف اور تالے کھولنے کا ماہر بنادیا۔ وہ میرے ساتھ پچھلے دو سال سے کام کر رہا تھا اور اب وہ بھی میری طرح ایک منجھا ہوا جرائم پیشہ بن چکا تھا۔

ہم دونوں امریکا کے شہر میامی کے رہائشی تھے اور علیحدہ علیحدہ فلیٹس میں رہتے تھے۔ عام حالات میں ہماری آپس میں ملاقات بھی کم ہی ہوتی تھی۔ ہم دونوں اب صرف اس وقت اکٹھے ہوتے تھے جب ہمیں کسی واردات کو سرانجام دینے کے متعلق آپس میں صلاح مشورہ کرنا ہوتا تھا اور آج میں نے بروک کو اسی سلسلے میں اپنے فلیٹ پر بلایا تھا۔ ان دنوں حکومت کی جانب سے جرائم کی روک تھام کے لیے انتہائی سخت اقدامات کیے جارہے تھے۔ پورے شہر میں جگہ جگہ پولیس کی نفری تعینات کی گئی تھی۔ کوئی بھی واردات سرانجام دینے سے پہلے ہمیں سو مرتبہ سوچنا پڑتا تھا، ہر پہلو پر غور کرنا پڑتا تھا۔

بروک ابھی جوان تھا، اس کے سامنے ایک لمبی زندگی پڑی تھی مگر میں پچاس سے اوپر کا ہوچکا تھا۔ حال ہی میں شوگر کے مرض میں بھی مبتلا ہوگیا تھا۔ صحت پہلے بھی کوئی خاص قابلِ رشک نہیں تھی، اور شوگر کے اس مرض کے بعد تو تیزی سے گرتی جارہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے متنبہ بھی کررہی تھی کہ میں اب پہلے کی طرح اپنی جسمانی سرگرمیوں کو جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ آنے والے وقتوں میں مجھے کام کی نہیں آرام کی ضرورت تھی۔ اب میرے لیے کوئی ایسا ہاتھ مارنا ناگزیر ہوچکا تھا جس میں میرے پاس اتنی رقم آجاتی کہ مجھے باقی عمر کوئی کام نہ کرنا پڑے۔

میں اس وقت بروک کے سامنے بیٹھا، اس سے اسی سلسلے میں بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے ایک میگزین رکھا ہوا تھا جس میں ایک سابقہ امریکی ماڈل کی کچھ تصاویر اور انٹرویو شائع ہوا تھا۔ مارتھا نامی یہ لڑکی کسی دور میں ایک مشہور ماڈل تھی مگر اب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ کر گمنامیوں کے اندھیروں میں گم ہوچکی تھی اور اب ایک طویل عرصے بعد اس کی تصاویر اور انٹرویو کسی جریدے کی زینت بنے تھے مگر میری توجہ کا اصل مرکز وہ ماڈل نہیں تھی بلکہ اس کے گلے میں موجود ایک بیش قیمت ہیروں کا نیکلس تھا۔ اس نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ یہ نیکلس اسے اس کے مرحوم شوہر نے تحفے میں دیا تھا۔ اس کی موجودہ قیمت کم از کم پانچ لاکھ ڈالر تھی۔ جریدے نے اس نیکلس کی بھی ایک تصویر علیحدہ سے شائع کی تھی۔ یہ سفید رنگ کے ہیروں کا ایک خوبصورت نیکلس تھا اور اس کا ڈیزائن امریکا میں بہت پسند

کیا جاتا تھا۔

یہ انٹرویو چند دن پہلے کا تھا اور میں اس وقت تک مارتھا نامی اس ماڈل کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس کی اولاد نہیں تھی اور وہ اسی شہر میں اپنے ایک وسیع و عریض بنگلے میں صرف ایک سیکیورٹی گارڈ کے ہمراہ رہتی تھی۔ میں نے اس کے وسیع و عریض بنگلے کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس نیکلس کو تھوڑی سی تگ و دو کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ رہ گئی اس کو فروخت کرنے کی بات تو بلیک مارکیٹ میں اس کی فروخت بھی میرے جیسے آدمی کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

میں اس وقت بروک کو اپنے پلان کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو کچھ معترض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بہت مشکل کام ہے اور ہمیں بہت سی دشواریوں سے بھی دو چار کرسکتا ہے۔ مارتھا ایک سابقہ مشہور ماڈل تھی، اس کے گھر سے اتنے قیمتی نیکلس کا گن پوائنٹ پر چھن جانا کوئی معمولی واقعہ تصور نہ ہوگا۔ پولیس مجرموں کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کرے گی۔ ہم دونوں کبھی پولیس کی گرفت میں نہیں آئے تھے اور بروک کا خیال تھا کہ اس بار ہم اپنی اوقات سے بڑا ہاتھ مارنے جارہے ہیں اور کوئی بھی جرائم پیشہ شخص اسی وقت پولیس کی گرفت میں آتا ہے جب وہ اپنی اوقات سے باہر ہوجاتا ہے۔ امریکا جیسے ملک میں کسی کو گن پوائنٹ پر لوٹنا کسی سنگین جرم سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ ایسا کرنا میرے اور بروک کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر بروک کا خیال تھا کہ مارتھا کے کیس کو پولیس عام کیس کی طرح ڈیل نہیں کرے گی۔

"آخر تمہیں میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آرہی؟" میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کام بظاہر جتنا مشکل نظر آرہا ہے، اتنا مشکل ہے نہیں۔"

"اتنا آسان بھی نہیں ہے۔" اس نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ "اور پھر ہم نے ہمیشہ باہر لوٹا ہے، کسی کے گھر میں داخل ہوکر یہ ہماری پہلی واردات ہوگی۔ ہمیں اس کے سیکیورٹی گارڈ سے بھی نمٹنا ہوگا۔"

"میں اس بنگلے کا اچھی طرح جائزہ لے چکا ہوں۔ یہ عام آبادی سے قدرے ہٹ کر واقع ہے اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر آسانی سے اندر داخل ہوسکتے ہیں۔ رہ گئی اس سیکیورٹی گارڈ کی بات تو اس کا زیادہ تر وقت گیٹ کے پاس موجود کیبن میں گزرتا ہے۔ اس پر قابو پانا بھی زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ قسمت نے ہمیں دولت مند بننے کا ایک موقع دیا ہے، اس چانس سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔"

"مارتھا کے بنگلے میں سی سی ٹی وی کیمرے بھی موجود ہوسکتے ہیں۔" بروک نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"مجھے وہاں کیمرے نظر نہیں آئے۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اور پھر کیمرے ہمارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ہم ان سے بچنے کے لیے چہرے پر ماسک کا استعمال کرسکتے ہیں۔ اصل مسئلہ کیمرے کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم اس کام کے بارے میں ذہنی طور پر کچھ کنفیوژ ہو۔"

"شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پارہا۔"

"تو پھر مجھ پر بھروسا رکھو۔" میں نے تفہیمی لہجے میں کہا۔ "یقین کرو اس نیکلس سے حاصل ہونے والی رقم سے ہماری زندگی بہت سہل اور آسان ہوجائے گی اور باقی کی زندگی ہمیں کوئی اور واردات کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی پکڑے جائیں۔ حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ میں تو خیر بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہوں، اپنی زندگی کی جوانی بھی انجوائے کرچکا ہوں مگر تمہاری جوانی جیل میں برباد ہوجائے گی۔ میری بات مان لو، ایک ہی بار میں کوئی بڑا ہاتھ مارنا اب ہمارے لیے ناگزیر ہوچکا ہے۔"

"ٹھیک ہے!" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے رضامندی ظاہر کردی۔ "مگر یہ ہماری آخری واردات ہوگی۔ میں اب اس کام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔ اس کے بعد میں اس شہر کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا، کسی ایسی جگہ جہاں میرے ماضی کا سایہ بھی نہ پھٹکے۔ میں اب شادی کرکے خطرات کی دنیا سے دور ایک پُرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"تم اپنی زندگی کے تمام فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔" میں نے اسے رضامند ہوتے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر پُرسکون زندگی کے لیے بھی پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس نیکلس کو فروخت کرنے کے بعد حاصل شدہ رقم سے تمہیں حسبِ معمول پچاس فیصد دینے کا پابند ہوں۔"

پچاس فیصد حصے کا سن کر بروک نے میرے چہرے کی جانب بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے عجیب سے تاثرات ابھرے جو فوراً ہی معدوم ہوگئے۔ تاہم اس

کے چہرے پر چند ثانیوں کے لیے ابھرنے والے تاثرات بھی مجھے چونکانے کے لیے کافی تھے۔

مجھ میں ایک خوبی تھی اور وہ یہ کہ میں کسی کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگالیتا تھا اور مجھے اپنی چہرہ شناسی پر بڑا ناز تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے تھے جیسے اس بار وہ پچاس فیصد سے کچھ زیادہ کا طالب تھا۔ کہیں وہ پورے کا پورا ایکلس ہڑپ کرنے کے بارے میں تو پلان نہیں بنا رہا تھا؟ میں نے سوچا۔ اگرچہ اس نے ماضی میں کبھی میرے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی مگر میں جانتا تھا کہ جرم کی دنیا میں اعتبار اور بھروسا ہاتھ میں موجود ریت کی طرح ہوتا ہے جسے جتنا مضبوطی سے پکڑو، وہ اتنا ہی ہاتھ سے پھسلتی چلی جاتی ہے۔ بروک کے چہرے سے بھی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کی نیت میں فتور آ گیا ہو۔ شاید اس لیے کہ اس بار معاملہ پانچ لاکھ ڈالرز کا تھا۔ اتنی بڑی رقم کے لیے اس کی تو کیا میری اپنی نیت بھی خراب ہوسکتی تھی۔ بات جو بھی تھی، میں دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس سے محتاط رہوں گا۔

"ٹھیک ہے تو پھر ہم کل رات یہ واردات سرانجام دیں گے۔" میں نے اسے رضامند ہوتے دیکھ کر کہا۔ "میں تمام تیاری کر چکا ہوں صرف تمہاری رضامندی درکار تھی۔ میں کل رات تمہارا انتظار کروں گا۔ تمہارے ذمے اب یہ کام ہے کہ تمہیں کل کوئی گاڑی چوری کرنی ہے اور میرے پاس آنے سے پہلے اس کی نمبر پلیٹ بھی تبدیل کرنی ہے تاکہ فوری طور پر پکڑے جانے کا خطرہ نہ رہے۔ ہم مارتھا کے گھر تک اس گاڑی پر ہی جائیں گے اور واردات کے بعد واپسی میں اسے کہیں چھوڑ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں کار کا بندوبست کرلوں گا۔" بروک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اپنا ریوالور بھی اپنے پاس رکھنا۔" میں نے رسانیت سے کہا۔ "ناگزیر حالات کے بغیر ہم گولی نہیں چلائیں گے۔ ہم نے آج تک جہاں بھی واردات کی ہے، ڈرا دھمکا کر ہی کام نکالا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس آخری واردات میں بھی ہمارا ریکارڈ برقرار رہے۔ سیکیورٹی گارڈ کو بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم سے تر کیا گیا رومال بھی اپنے ساتھ لے لینا۔"

"اوکے! میں سارا بندوبست کرلوں گا مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل مارتھا اپنے گھر پر ہی موجود ہوگی؟" بروک نے استفسار کیا۔

"کل ویک اینڈ ہے اور مارتھا نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ ویک اینڈ وہ ہمیشہ اپنے گھر میں اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں ہی گزارتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔" بروک مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ "تو اس بار ہم اس کی یادوں میں مداخلت کرنے جارہے ہیں۔"

"ہاں!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کل ہم اس کی زندگی سے یہ یکسانیت ختم کردیں گے۔"

"اوکے تو پھر اجازت دیں۔" بروک نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کل رات نو بجے کے قریب آپ کو پک کرلوں گا۔ ابھی مجھے بھی تیاری کرنا ہے۔ سب سے اہم کام تو اس وقت یہ ہے کہ کل کی واردات میں استعمال کرنے کے لیے کوئی گاڑی بھی اڑانی ہے۔"

"ہاں ......" میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "مگر گاڑی چوری کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ عام سے ماڈل کی ہو تاکہ فوری طور پر چیک نہ ہوسکے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" بروک نے جواب دیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کرکے فلیٹ کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا جبکہ میں پُرخیال نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ بروک اس کام کو سرانجام دینے کے لیے رضامند ہوجائے گا۔ اس لیے میں اپنی تیاری پہلے سے ہی کرچکا تھا۔ اب کل اس کام کو منطقی انجام تک پہنچانا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ کل بروک چوری کی کار کے ہمراہ میرے پاس پہنچ جائے گا۔ کسی کار کو اڑانا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

اگلے دن رات تک میں اپنے گھر پر ہی موجود رہا۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے اور بروک کی آمد کا وقت ہورہا تھا۔ اس وقت میں آرام سے کرسی پر براجمان کافی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس منصوبے کے مضمرات پر غور کررہا تھا۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب رہتا تو لاکھوں ڈالرز کا مالک بن جاتا لیکن ناکامی اور پکڑے جانے کی صورت میں بروک اور مجھے کم از کم چھ سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑسکتا تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بھی واردات سرانجام دیتے وقت اگر ٹھوس پلاننگ کی جائے اور ہر پہلو کا جائزہ لیا جائے تو پکڑے جانے کے امکانات معدوم ہوجاتے ہیں۔ میری نظر سے آج تک جتنے افراد کے پکڑے جانے کے واقعات گزرے تھے، ان کے منصوبے میں ٹھوس پلاننگ کا فقدان تھا۔ بس جذباتی انداز میں جلد بازی سے

واردات سرانجام دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں اپنے پلان کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ کہیں کوئی جھول نہیں تھا اس لیے میں کامیابی کے لیے خاصا پُرامید تھا۔

نو بجے مجھے باہر گاڑی کے مخصوص ہارن کی آواز سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ بروک آچکا ہے۔ میں نے اپنا رین کوٹ پہنا اور پھر فلیٹ کو تالا لگا کر باہر نکل آیا۔ بروک نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ایک عام ماڈل کی گاڑی ہی اڑائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک پولیس گاڑی کو باقاعدہ روک کر چیک نہ کرتی، ہمارے پکڑے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ میں نے کار کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ بروک نے کار آگے بڑھا دی۔

”کار کہاں سے چوری کی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کار میں نے اپنے ہمسایوں کے گیراج سے چوری کی ہے۔“ بروک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ پوری فیملی اپنی دوسری گاڑی پر پکنک منانے الاسکا گئی ہوئی ہے۔ اس لیے گاڑی کی فوری چوری سے بھی بے خبر ہے پھر بھی میں نے احتیاط کے طور پر اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دی ہے۔“

”اور ریوالور اور کلوروفارم سے تر کیا گیا رومال؟“ میں نے گاڑی کے بارے میں اس کی وضاحت سے مطمئن ہو کر دوبارہ سوال کیا۔

”میرے کوٹ کی جیب میں ہیں۔“ اس نے بس اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

”ہمیں اب پوری طرح محتاط رہنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم گاڑی مارتھا کے بنگلے سے کچھ دور کھڑی کریں گے اور پھر پیدل چلتے ہوئے بنگلے کے قریب جائیں گے۔ اگر وہ سیکیورٹی گارڈ اپنے کیبن کے اندر موجود ہوا تو اس پر قابو پانے میں آسانی رہے گی اور ہم کسی کی نظروں میں بھی نہیں آئیں گے۔ اسے بے ہوش کرنے کا فریضہ تم سرانجام دو گے جبکہ میں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کراؤں گا۔ وہ سیکیورٹی

گارڈ خاصا جسیم اور تنومند ہے اس لیے بہت احتیاط اور تیزی سے اس پر قابو پانا ہوگا۔ اگر اسے سنبھلنے کا موقع مل گیا تو ہم خاصی مشکل صورتِ حال سے دوچار ہوجائیں گے۔ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اسے قابو کرنا ہمارے کام کا سب سے اہم اور مشکل مرحلہ ہے۔"

"میں یہ تمام باتیں سمجھتا ہوں۔" بروک نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اس سیکیورٹی گارڈ پر آسانی سے قابو پالوں گا۔ کلوروفارم کی وجہ سے مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی ورنہ آپ نے مجھے ایسے داؤ بھی سکھلائے ہیں کہ میں اس سیال کے بغیر بھی اسے بے ہوش کرسکتا ہوں۔"

"اسی لیے تو میں خود کو ایک اچھا استاد نہیں مانتا۔" میں نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔ "کیونکہ اچھا استاد بھی اپنے شاگرد کو اپنے سارے داؤ نہیں سکھلاتا۔"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے بھی اپنے کچھ داؤ بچا کر رکھے ہوں۔"

میں نے اس بار اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ مارتھا کا بنگلا اب خاصا قریب آگیا تھا۔ بروک نے ایک سائڈ پر جگہ دیکھ کر گاڑی روک دی۔ ہمیں اب پیدل آگے بڑھنا تھا۔ میں اور بروک گاڑی سے باہر نکل آئے جہاں سرد اور خون منجمد کردینے والی ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ آج سردی بھی شاید معمول سے زیادہ تھی مگر اس کا ایک فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ آس پاس کسی ذی روح کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور کام کے وقت آس پاس کسی کا نہ ہونا ہمارے لیے اچھا شگون تھا۔

ہم نے مارتھا کے بنگلے کی جانب بڑھنا شروع کردیا۔ اب ہم بنگلے کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔ سیکیورٹی گارڈ نظر نہیں آرہا تھا تاہم اس کے کیبن کی بتی جل رہی تھی۔ شاید سردی کی شدت نے اسے بھی کیبن میں گھسنے پر مجبور کردیا تھا۔

"اب عملی کام کا وقت شروع ہوگیا ہے۔" میں نے بروک سے کہا۔ "تم دبے پاؤں چلتے ہوئے کیبن کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہوجاؤ۔ میں سامنے جاکر اسے آواز دوں گا۔ وہ کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آئے گا تو اس کی پوری توجہ مجھ پر مرکوز ہوگی اور یہی تمہارے لیے بہترین موقع ہوگا۔ مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کلوروفارم والا رومال مضبوطی سے اس کے منہ پر جمانا ہے تاکہ وہ فوری طور پر بے ہوش ہوجائے۔"

"آپ اس معاملے میں تسلی رکھیں۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔" بروک نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"او کے تو پھر کام کا آغاز کرتے ہیں۔" میں نے آخری بار آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ربڑ کے دستانے اور چہرے پر پہننے والا ماسک نکال کر پہننا شروع کردیا۔ بروک نے بھی میری تقلید کی۔

ہاتھوں میں دستانے اور چہرے پر ماسک پہن کر ہم دونوں تیزی سے گارڈ کے کیبن کی جانب بڑھے۔ بروک کیبن کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے رین کوٹ کی جیب سے کلوروفارم سے تر کیا ہوا رومال بھی نکال لیا تھا۔

"کیا اندر کوئی ہے؟" میں نے کیبن کے بالکل سامنے کھڑے ہوکر ہانک لگائی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک کرخت مردانہ آواز سنائی دی اور پھر سیکیورٹی گارڈ کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ میرے ماسک زدہ چہرے کو دیکھ کر اسے فوراً ہی خطرے کا احساس ہوا اور اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے کندھے پر لٹکی گن کی طرف بڑھا مگر اسے دیر ہوچکی تھی کیونکہ دیوار کے ساتھ چپکے بروک نے پھرتی سے اس پر حملہ کردیا تھا۔ اس نے مضبوطی سے رومال والا ہاتھ اس سیکیورٹی گارڈ کے منہ پر رکھ دیا۔ اس ناگہانی افتاد پر سیکیورٹی گارڈ نے جھٹکا دے کر اپنے چہرے سے بروک کا ہاتھ ہٹانا چاہا مگر بروک کی گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ وہ سیکیورٹی گارڈ کچھ ہی دیر میں بے ہوش ہوکر بروک کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ رومال پر وافر مقدار میں کلوروفارم انڈیلا گیا تھا اس لیے اس کا اثر بھی خاصا تیزی سے رونما ہوا تھا۔ بروک اور میں نے سیکیورٹی گارڈ کے دنیا ومافیہا سے بے خبر وجود کو اٹھایا اور کیبن کے اندر لاکر وہاں موجود کرسی پر ایڈجسٹ کردیا۔

میں جانتا تھا کہ اب وہ چھ سے سات گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ ہم اس واردات کا سب سے مشکل مرحلہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر طے کرچکے تھے اور اب دوسرا مشکل مرحلہ طے کرنا تھا۔ ہمیں اب مارتھا کے بنگلے میں داخل ہوکر اسے اتنی تیزی سے قابو کرنا تھا کہ وہ شور مچا کر کسی کو متوجہ نہ کرسکے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اور بروک اس مشکل مرحلے کو بھی بخوبی طے کرلیں گے۔

"میرے خیال میں اب اندر داخل ہونا چاہیے۔" بروک نے رومال اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو۔" میں نے کہا اور پھر کیبن سے باہر نکل آیا۔ بروک بھی میرے ہمراہ تھا تاہم باہر آنے سے پہلے وہ کیبن کی لائٹ آف کرنا نہ بھولا۔ کیبن کا دروازہ بھی اس نے بند کردیا تھا۔ اس وقت ہمارے چہروں پر ماسک موجود تھے، ایسی حالت میں کسی کی نظروں میں آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمیں اب جلد از جلد کام نمٹا کر یہاں سے نکلنا تھا۔ دھند میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا جس کی وجہ سے حدِنگاہ اب خاصی کم ہوتی جارہی تھی۔ گویا یہ دھند ہمیں کسی کی نظروں میں آنے سے تحفظ فراہم کررہی تھی۔

ہم دونوں اب گیٹ کے ساتھ موجود دیوار کے پاس جاکر کھڑے ہوگئے تھے۔ میں اب بڑھاپے میں قدم رکھنے کی وجہ سے خاصا فربہ ہوچکا تھا۔ اس دیوار پر چڑھنا میرے بس سے باہر تھا تاہم بروک ابھی بھرپور جوان اور فٹ تھا۔ اس کے لیے یہ معمولی بات تھی۔ اس نے ایک نظر دیوار کی اونچائی کا جائزہ لیا اور پھر ایک ہی چھلانگ میں اس کے ہاتھ دیوار پر مضبوطی سے جم گئے۔ اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور اس کا جسم تیزی سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اندر کودتے ہی اس نے اندر سے بند مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا تو میں بھی تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ بروک نے دروازہ دوبارہ بند کردیا۔ اب ہم مارتھا نامی اس ماڈل کے وسیع وعریض بنگلے کے صحن میں کھڑے تھے۔ ہم نے صحن عبور کیا تو بنگلے کا اندرونی لکڑی کا بنا ہوا خوب صورت دروازہ بھی مقفل پایا۔ اس پر مخصوص طرز کا لاک لگا ہوا تھا جسے چابی کی مدد سے دونوں اطراف سے بند کیا یا کھولا جاسکتا تھا۔ اس لاک کو چابی کے بغیر بھی کھولنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

نقب زنی میرا پیشہ تھا۔ مختلف قسم کے تالوں کو کھولنا ہمیشہ سے میرا شوق رہا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تار نکالا اور اس لاک کو کھولنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ بروک خاموشی سے میرے پاس کھڑا ہوا تھا۔

آخر کار میری کوشش بارآور ثابت ہوئی اور میں اس لاک کو کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران میں میری یہی کوشش رہی کہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ یہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ بادی النظر میں یوں محسوس ہورہا تھا جیسے یہ گھر نہ ہو کوئی ہوٹل ہو۔ ہم نے دبے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے کمروں کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ کوئی کمرا بھی مقفل نہیں تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ ماڈل ہماری موجودگی سے باخبر ہوتی، ہم اس کے سر پر پہنچ جائیں، ورنہ ہمارا سارا پلان ہی فیل ہوجاتا۔ مجھے اب اس بات کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں مارتھا ہماری موجودگی سے باخبر تو نہیں ہوگئی مگر ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی میرا یہ خدشہ غلط ثابت ہوگیا۔

مارتھا بیڈ پر گردن تک لحاف اوڑھے دنیا و مافیہا سے بےخبر سو رہی تھی۔ کمرے میں الکوحل کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی جبکہ بیڈ کے ایک سائڈ پر مشروب کی آدھی خالی بوتل اور دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔

میں اور بروک اس کے بالکل پاس پہنچ گئے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا کمبل ہٹا دیا مگر شاید وہ ضرورت سے زیادہ نشے میں تھی۔ وہ ذرا سا کسمسائی مگر اس کی نیند میں کوئی فرق رونما نہ ہوا اور چہرے پر بکھرا اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ وہ شاید نشے میں دھت ہو کر ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

بروک نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر مارتھا کو زور زور سے ہلانا جلانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ ہم اب اس کی مزید نیند کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں اب اس سے یہ اگلوانا تھا کہ اس نے اپنا قیمتی نیکلس کہاں رکھا ہوا ہے۔

بروک کے زوردار انداز میں ہلانے پر مارتھا نے کسل مندانہ انداز میں انگڑائی لی اور پھر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میرا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں خمار کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اسے لاشعور سے شعور کی منزلیں طے کرنے میں چند لمحے لگے۔ شعور میں آتے ہی اس نے مجھے اور بروک کو بے یقینی کے عالم میں دیکھا اور پھر خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہمارے ماسک زدہ چہرے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات عود آئے تھے۔

"کون ہو تم اور میرا سیکیورٹی گارڈ کہاں ہے؟" اس نے ہکلاتے ہوئے ہمیں مخاطب کیا۔

"اسے ہم نے گولی مار دی ہے۔" بروک نے سرد اور سپاٹ آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ "اور اب ہم تمہیں بھی گولی مار دیں گے۔"

"نہیں نہیں، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" مارتھا ایک ہی دھمکی میں تھر تھر کانپنے لگی۔ بروک کا گارڈ کو مار دینے کا جھوٹ خاصا موثر ثابت ہوا تھا۔

"ہم تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے۔" اس بار میں بولا۔ "بشرطیکہ تم ہمیں اپنا ہیروں کا نیکلس دے دو۔"

"کون سا نیکلس؟" اس کے معصومانہ جواب پر میرا خون کھول اٹھا جبکہ بروک نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ خاصا زوردار تھا اور بروک نے مارتے وقت یہ خیال بھی نہ کیا تھا کہ مارتھا صنفِ نازک کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا منہ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

"سیدھی طرح بتاتی ہو یا تمہارے سر میں بھی تمہارے گارڈ کی طرز کا ایک سوراخ کر دوں۔" بروک نے اپنا ریوالور نکال کر مارتھا کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

"وہ نیکلس تو میں نے بینک لاکر میں رکھوا دیا تھا۔" تھپڑ نے مارتھا کے اوسان خطا کر دیے تھے مگر وہ اب بھی مزاحمانہ رویّہ اپنائے ہوئے تھی اور نیکلس کی موجودگی سے انکاری تھی۔

"بکواس بند کرو۔" بروک نے غراتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا تھا کہ وہ نیکلس ہمیشہ تمہارے پاس موجود رہتا ہے۔ سیدھی طرح بتا دو ورنہ میں اس پستول کی ضربات سے تمہارا چہرہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔"

مارتھا نامی وہ ماڈل اب بڑھاپے میں قدم رکھ چکی تھی مگر تھی تو بہرحال ایک عورت ہی اور عورت اپنے چہرے کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے۔ چہرہ بگاڑنے کی دھمکی اثر دکھا گئی۔

"بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔" مارتھا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "وہ نیکلس میرے پاس ہی ہے مگر پہلے وعدہ کرو کہ نیکلس لینے کے بعد تم مجھے جان سے نہیں مارو گے۔"

"ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔" اس بار میں نے کہا۔ "ہمیں خوامخواہ کسی کی جان لینے کا کوئی شوق نہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں نیکلس دے دیتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھوں میں ایک جگمگاتا ہوا نیکلس آ گیا۔

بروک نے نیکلس لینا چاہا مگر میں نے پہلے ہی مارتھا کے ہاتھ سے نیکلس جھپٹتے ہوئے اسے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ میری اس حرکت سے بروک کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات نمایاں ہو گئے تاہم وہ خاموش رہا۔

"بروک! ہمیں اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔" میں نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" بروک نے اپنا ریوالور دوبارہ کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور پھر جیب سے کلوروفارم سے تر کیا ہوا رومال نکال کر پھرتی سے مارتھا کے منہ پر جما دیا۔ زود اثر سیال نے فوراً ہی اپنا اثر دکھایا اور مارتھا چکرا کر بیڈ پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ بھی گارڈ کی طرح چھ سے سات گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔

ہم اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے۔ ہیروں کا وہ قیمتی نیکلس میری جیب میں تھا۔ اب وہاں سے نکلنا ہی بہتر تھا۔ میں اور بروک مارتھا کو اسی حالت میں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ مین گیٹ کو کھول کر ہم باہر نکلے تو دھند کی شدت میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم تیزی سے چلتے ہوئے

اس جانب بڑھے جدھر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ مارتھا کے بنگلے سے کچھ دور ہوتے ہی ہم نے اپنے چہرے پر موجود ماسک اور ہاتھوں میں موجود ربڑ کے دستانے اتار کر اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ ابھی تک ہمارا سارا کام منصوبے کے عین مطابق ہی ہوا تھا۔ کچھ دور پیدل مارچ کے بعد ہم اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ غنیمت یہ تھی کہ ہمارا پولیس کی کسی گشتی گاڑی سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ایسی کسی صورت میں پولیس والے اگر ہم سے مشکوک ہوجاتے تو ہمارے لیے خاصے مسائل کھڑے ہوجاتے۔ اس وقت آس پاس کا علاقہ بالکل سنسان و بیابان نظر آرہا تھا۔ شاید سخت سردی نے یہاں کے باسیوں کو گھروں میں مقید ہونے پر مجبور کردیا تھا۔

میں نے جیسے ہی گاڑی کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، ایک خلافِ توقع بات ہوئی۔ بروک نے یک لخت اپنا ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والی سفاکی اور بیگانگی نے مجھے بھی ہاتھ اوپر کرنے پر مجبور کردیا۔

''معاف کرنا دوست! ہمارا مشترکہ سفر یہاں پر تمام ہوا۔ اپنا ریوالور اور نیکلس جیب سے نکال کر آرام سے گاڑی کے بونٹ پر رکھ دو اور خود چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں پرانے تعلق کا احساس کرتے ہوئے آپ کو زندہ چھوڑ رہا ہوں لیکن اگر آپ نے کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں ایک لمحے کے لیے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

بروک کا لہجہ دوٹوک تھا۔ میں اس کی سفاک طبیعت سے بھی بخوبی آگاہ تھا اس لیے میں نے بلاتامل اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا ریوالور اور نیکلس کوٹ کی جیب سے نکال کر گاڑی کے بونٹ پر رکھ دیے اور خود چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بروک نے آگے بڑھ کر دونوں چیزوں کو اپنی جیب میں منتقل کرلیا تاہم ایسا کرتے ہوئے بھی وہ مجھ سے غافل نہ تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ریوالور بدستور مجھ پر تان رکھا تھا۔ وہ میرا ہی شاگرد تھا شاید اسی لیے مجھ سے بہت زیادہ محتاط تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ میرا مزاحمت کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں اب خاصا فربہ ہوچکا تھا۔ اس تیز رفتاری سے ایکشن میں نہیں آسکتا تھا جیسا جوانی کے دنوں میں آتا تھا۔ میرے برعکس بروک نوجوان اور پھرتیلا تھا۔ میری مزاحمت کی کوئی بھی کوشش مجھے کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کرسکتی تھی اور پھر مقابلہ بھی برابری کا نہ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پسٹل تھا جبکہ میں نہتا تھا۔

''یہ تم اچھا نہیں کررہے، بروک!'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم پر بڑا مان تھا مگر آج تم نے میرا مان توڑ دیا ہے۔''

''استادِ محترم!'' اس نے اپنی عادت کے مطابق میرے لیے استادِ محترم کے الفاظ ہی استعمال کیے۔

''یہ جرم کی دنیا ہے اور یہاں بھروسا اور اعتماد محض افسانوی باتیں ہوتی ہیں، بس جس کو جہاں موقع ملا اس نے وہاں فائدہ اٹھالیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جارہا ہوں، اس گاڑی کو بھی میں کچھ آگے جاکر چھوڑ دوں گا۔ اس نیکلس سے حاصل ہونے والی رقم سے میں اپنی ایک نئی زندگی شروع کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے اسے آگے بڑھا لے گیا۔ میں خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی کار میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ دھند کی وجہ سے ویسے بھی زیادہ دور تک دیکھ پانا ممکن نہ تھا۔ بروک جاچکا تھا۔ شاید یہ میری اور اس کی آخری ملاقات تھی۔ وہ ایک نئی منزل کی تلاش میں چلا گیا تھا اور اب مجھے بھی ایک نئی منزل تلاش کرنا تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں موجود ربڑ کے دستانے ایک طرف پھینکے اور پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور پھر فلیٹ کا لاک کھول کر اندر آگیا۔ کم ازکم آج کی رات تو یہاں بسر کی جاسکتی تھی تاہم پھر بھی میں نے اپنا ضروری سامان پیک کرنا شروع کردیا۔

میں جانتا تھا کہ بروک فوری طور پر اس نیکلس کو فروخت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اس معاملے کے ٹھنڈا... ہونے کا انتظار کرے گا کیونکہ مارتھا ایک مشہور ماڈل تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ پولیس پوری تندہی سے ڈاکوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی۔ بہرحال چند دن بعد جب بھی وہ اس نیکلس کو فروخت کرنے کی کوشش کرتا، اسے اندازہ ہوجاتا کہ اس کے استاد نے اپنے شاگرد کو سارے داؤ پیچ سکھلائے تھے مگر ایک آخری داؤ اپنے پاس بھی بچا کر رکھا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ جرم کی دنیا میں بھروسا، اعتبار محض افسانوی باتیں ہوتی ہیں۔

میں اس نیکلس کو پہلے ہی ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ میں اس نیکلس کی تصویر بھی دیکھ چکا تھا، اس کا ڈیزائن بہت مشہور اور عام تھا اس لیے مجھے اس تصویر کی شکل کا نقلی

نیکلس ڈھونڈنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ مارکیٹ میں اس ڈیزائن کے نقلی نیکلس عام دستیاب تھے۔ میں بروک کو ڈاج دینے کا پورا پلان بنا چکا تھا۔ جب ہم مارتھا کے گھر واردات کے لیے گئے تھے تو وہ نقلی نیکلس پہلے سے ہی میرے کوٹ کی جیب میں موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مارتھا نے اپنا نیکلس ہمارے حوالے کیا تو میں نے بروک سے پہلے ہی اسے جھپٹ کر اپنے کوٹ کی جیب میں منتقل کرلیا۔

میرا پلان تو یہ تھا کہ جب بروک مجھے فلیٹ پر ڈراپ کرے گا تو میں نقلی نیکلس اس کے حوالے کرتا اور اس سے کہتا کہ اسے اپنے سیف میں اس معاملے کے ٹھنڈا ہونے تک محفوظ رکھے۔ بروک نیکلس لے کر مطمئن ہو جاتا اور میں اس دوران اصلی نیکلس کے ہمراہ کہیں دور نکل جاتا...... ایسی جگہ جہاں بروک مجھ تک نہ پہنچ سکتا۔

میرے اس پلان میں کچھ تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب بروک نے اچانک مجھ پر ریوالور تان لیا۔ بہرحال میرا پلان اگرچہ کچھ تبدیلی سے دوچار ہوا تھا لیکن کامیاب رہا تھا۔ میں نے انتہائی ہوشیاری اور چالاکی سے بروک کو نقلی نیکلس تھما دیا تھا۔ اسے آخری وقت تک اس تبدیلی کا احساس نہ ہوسکا اور ہوتا بھی کیسے...... آخر اس کے مقابلے پر اس کا استادِ محترم موجود تھا۔ وہ رات میں بڑے پُرسکون انداز میں سویا۔ رات بھر ایک پُرسکون اور آرام دہ زندگی کے خواب دیکھتا رہا۔ صبح میری آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ میں نے کافی بنائی اور پھر بیڈ کے ساتھ صوفے پر پڑے کوٹ میں سے اصلی نیکلس نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت خبروں کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ایک سائڈ پر پڑے ریموٹ سے ٹی وی آن کر دیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت معروف سابقہ ماڈل کے گھر ہونے والی ڈکیتی کی واردات ہی خبروں کی زینت بنی ہوئی تھی۔

ٹی وی چینل کا ایک نمائندہ مارتھا کا انٹرویو کر رہا تھا۔ مارتھا کے منہ کا ایک حصہ ابھی تک سوجا ہوا تھا جسے میک اپ سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

”میڈم مارتھا! آپ کو اتنے قیمتی نیکلس کی چوری کا دکھ تو ہوا ہوگا۔ کیا آپ نے اس کی انشورنس وغیرہ کروا رکھی تھی؟“ چینل کے نمائندے نے مارتھا سے سوال کیا۔

”نہیں، میں نے انشورنس نہیں کروائی ہوئی لیکن مجھے کسی قسم کا افسوس نہیں ہے کیونکہ میرا نیکلس بالکل محفوظ ہے۔ میں پولیس کو بھی اپنا بیان ریکارڈ کروا چکی ہوں۔“

”کیا مطلب میڈم؟ کیا آپ کا نیکلس چوری نہیں ہوا؟ کیا گن پوائنٹ پر ڈاکو آپ سے کچھ نکلوانے میں ناکام رہے تھے؟“ مارتھا کے جواب نے چینل کے نمائندے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میرے بہت سے دوست مجھے مشورہ دے چکے تھے کہ میں اس قیمتی نیکلس کو بینک لاکر میں رکھوا دوں کیونکہ یہ جرائم پیشہ افراد کے لیے باعثِ کشش ہے۔ میرے اپنے ذہن میں بھی اس نیکلس کے چھن جانے کا خطرہ موجود تھا اس لیے میں نے احتیاط کے طور پر ایک نقلی نیکلس بھی تیار کروا رکھا تھا جسے ہمیشہ میں اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی جبکہ اصلی نیکلس میں بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ اگرچہ یہ نقلی نیکلس میں نے اپنے ذہن میں موجود چھپے ہوئے نفسیاتی خوف کی وجہ سے ہی تیار کروایا تھا لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرا یہ خوف ایک دن حقیقت کا روپ دھار جائے گا۔ بہرحال میں نے ڈاکوؤں کے سامنے خوفزدہ ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی اور انہیں ڈاج دینے میں بھی کامیاب رہی۔ وہ نقلی نیکلس لے کر چلتے بنے۔ میں اور میرا سکیورٹی گارڈ خوش قسمت ہیں کہ ہماری جان محفوظ رہی۔“

میں نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ تو گویا میرا نیکلس بھی نقلی تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ شاطر انسان پورے امریکا میں نہیں ہے۔ مجھے اپنی ذہانت پر فخر تھا۔ جب میں نے بروک کو انتہائی چالاکی سے ڈاج دیا تھا تو میرا یہ خیال تھا کہ اسے ابھی بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ عیاری و مکاری میں میرے سامنے طفلِ مکتب تھا مگر مارتھا کا انٹرویو دیکھنے کے بعد مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی مجھے بھی بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ خاص کر اصلی اور نقلی ہیروں کی پہچان کے بارے میں تو ضرور سیکھنا چاہیے۔ میں اپنی ساری ذہانت اور عیاری کے باوجود ایک عورت سے مار کھا گیا تھا۔ مجھے چہرہ شناسی کا بڑا دعویٰ تھا۔ بروک کے چہرے سے مجھے پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی نیت میں فتور آ چکا ہے اور وہ نیکلس حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرے گا مگر مارتھا نے میرے سامنے اس قدر بھرپور اداکاری کی کہ مجھے آخری وقت تک اندازہ نہ ہوسکا کہ اس حرافہ نے ہمیں نقلی نیکلس دے دیا ہے۔ میں خود کو بہت بڑا شاطر سمجھتا تھا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ مارتھا نے مجھے اور بروک دونوں کو ہی شکست دے دی تھی۔ اس کھیل کی فاتح کھلاڑی وہی شاطر تھی۔

گھیراؤ

مہتاب خان

دہرا معیار... دہری شخصیت عارضی طور پر نمایاں مقام تو دے سکتی ہے مگر مستقل سچ کی کسوٹی پر پورا اتر کر ہی انسان پُرسکون ہوپاتا ہے۔ جو لوگ معاشرے میں زہر پھیلانے کا باعث بنتے ہیں جب اپنا پائوں اس دائرے میں آتا ہے تو ذلت و رسوائی کا گھیراؤ انہیں اتنا مہنگا پڑتا ہے کہ دولت کے انبار بھی اس داغ کو مٹا نہیں پاتے۔

معاشرتی ناسوروں کے دلوں پر لگے گھاؤ کا پرفکر قصہ

اسمو کی نائٹس نامی یہ ریسٹورنٹ شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں نوجوان اور شوقین خواتین و حضرات کے لیے شیشا بار بھی موجود تھا۔ گو کہ حکومت کی جانب سے پابندی لگ چکی تھی مگر اس کے باوجود جرائم پیشہ افراد یہ زہر عوام میں پھیلا رہے تھے۔

اس ریسٹورنٹ سے ملحق چند کمرے بھی تھے جہاں بے راہ رو جوڑوں کو تنہائی فراہم کی جاتی تھی۔ اس قسم کے ریسٹورنٹ شہر کے پوش علاقوں میں قائم تھے۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا مگر لائبہ کو بہت خاص لگ رہا تھا، اسی لیے اس نے رات کو ہی اپنی تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ اس نے اپنا سب سے خوب صورت لباس منتخب کیا تھا۔ دوسری جانب تقدیر اس کی تیاریاں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی اس دن کو اس کے لیے خاص بنانے والی تھی۔

''تم آج کالج نہیں گئیں؟'' ناشتے کی ٹیبل پر اس

کے ڈیڈی نے پوچھا۔

"میں آج کچھ لیٹ جاؤں گی۔ کالج میں فنکشن ہے۔" اس نے ڈیڈی سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"اوہ گاڈ! میری کار تو ورکشاپ میں ہے۔ تم کالج کیسے جاؤ گی اور واپس کیسے آؤ گی؟" اس کی ممی نے فکرمندی سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، میرا فنکشن شام تک چلے گا۔ میری کوئی نہ کوئی فرینڈ مجھے واپسی میں ڈراپ کردے گی اور یہاں سے میں ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں، تم میرے ساتھ چلو۔" اس کے ڈیڈی نے حتمی انداز میں کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ہر وقت ایسے ہی جلدی میں رہتے تھے۔ آج کل ان کا بزنس بڑے زوروں پر تھا بلکہ پچھلے دو تین سالوں سے جب سے شہروز کے ڈیڈی ان کے بزنس پارٹنر بنے تھے، یہی حال تھا۔ جیسے وہ مٹی کو چھو کر سونا بنا رہے تھے۔

ڈیڈی اسے کالج کے گیٹ پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ کچھ دیر کالج کے لان میں بیٹھی رہی۔ اسے کس کا انتظار تھا آج کلاسیں اس نے بنک کی تھیں۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد شہروز اسے لینے آ گیا تھا۔

اور جب وہ اسے کسی پارک یا لانگ ڈرائیو پر لے جانے کے بجائے اسموکی ناٹس نامی اس ریسٹورنٹ کے نیم تاریک روم میں لے آیا تو یہ اسے کسی ایڈونچر سے کم نہیں لگا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے جو تھوڑی بہت جھجک اسے محسوس ہو رہی تھی، وہ راستے میں شہروز کی پُرلطف اور بے تکلفانہ گفتگو نے دور کردی تھی۔ ویسے بھی شہروز اس کے لیے اجنبی تو نہیں تھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں شہروز، باہر سب کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھے؟"

"کیونکہ یہاں کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ ماحول بھی پُرسکون ہے۔ ریسٹورنٹ والوں نے ہم جیسوں کے لیے ہی یہ انتظام کیا ہے۔ ہم کچھ دیر یہاں آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے پھر نکل جائیں گے، کیوں تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نہیں ڈر کیسا؟" لائبہ نے شانے اچکائے۔ وہ اپنے وسوسوں کا اظہار کرکے خود کو کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔

انہیں ابھی اس سجے سجائے ویل فرنشڈ ایئرکنڈیشن روم میں آئے بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا تھا۔ ابھی تو وہ شہروز کا آرڈر دیا ہوا مشروب پی رہی تھی اور شہروز اس کے قریب بیٹھا اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ اگلا سپ لینا بھول گئی اور کان باہر کی جانب لگا دیے۔

اچھے بھلے پُرسکون ماحول میں یکایک بہت سے افراد کے تیز تیز چلنے اور دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دروازے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے کے دھماکے ہونے لگے۔

وہ حیران ہوتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ لوگ اندر آ رہے تھے تو ریسٹورنٹ کے باہر اس نے کوئی درجن بھر گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس کے باوجود وہاں خاموشی کا راج تھا۔

ریسٹورنٹ سے ملحق ان رومز کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بند دروازوں کے پیچھے کوئی ذی روح موجود نہیں ہے مگر اب اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے شہروز کو دیکھا تو اس کی حالت دیکھ کر وہ اور بھی سراسیمہ ہوگئی۔ وہ تو صرف حیرت زدہ تھی مگر شہروز تو خوف زدہ تھا۔

وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے بھاگنے کے لیے راہ تلاش کررہا ہو۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر لائبہ مزید گھبرا گئی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے شہروز؟ یہ شور کیسا ہے؟"

"آئی تھنک پولیس کی ریڈ ہوئی ہے۔"

"پولیس ...... مگر وہ یہاں کیوں آئی ہے...... بتاؤ...... پولیس یہاں کیوں ہے؟" ایک پُراعتماد، آزاد خیال اور نئے زمانے کی لائبہ رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہاں ایک عام سی لڑکی کھڑی تھی جو اپنے کپکپاتے وجود کے ساتھ زرد چہرہ لیے... شہروز سے سوال پر سوال کررہی تھی۔

اور جب شہروز کو موبائل فون استعمال کرنے کا خیال آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ابھی اس نے بیڈ پر اپنا بے پروائی سے پھینکا ہوا سیل فون اٹھا کر اپنے ڈیڈی کا نمبر ملانا چاہا تھا کہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا۔

سامنے چھ سات کرخت صورت پولیس اہلکاروں اور کیمروں سمیت تین چار میڈیا رپورٹرز کو دندناتے ہوئے اندر آتا دیکھ کر لائبہ کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔

ایک اہلکار نے لپک کر شہروز کے ہاتھ سے سیل فون چھینا اور دوسرے نے اس کے ہاتھ مروڑ کر پشت سے

باندھ دیے۔

"تم جانتے نہیں میں کون ہوں۔ میرے ڈیڈی تم سب کو دیکھ لیں گے۔ چھوڑ دو مجھے۔"

تابڑ توڑ مکوں کے جواب میں وہ مسلسل گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔

جب اس کی گالیاں نہیں رکیں تو اہلکار نے مکوں پر اکتفا نہ کرتے ہوئے شہروز کے پیٹ میں اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ وہ درد سے کراہتا ہوا دہرا ہو گیا۔

"پتا ہے تو کتنا شریف ہے اور کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے جو اس بدنام جگہ عیاشی کرنے آیا ہے۔ یہ تیرے جیسے امیر زادے کے ہی چونچلے ہیں۔ ورنہ ہزاروں وصول کرنے والی ایسی تتلیاں غریب کے نصیب میں کہاں۔"

اس نے اپنی لال لال آنکھیں دیوار سے لگی کھڑی لائبہ پر گاڑتے ہوئے کہا۔

لائبہ پوری شدت سے چلا کر اس کے اندازوں کی تردید کرنا چاہتی تھی کہ وہ، وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہا ہے۔ وہ تو شہروز کے باپ سے بھی بڑے شخص کی بیٹی ہے مگر اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ شہروز نے مزید مار سے بچنے کے لیے دوبارہ منہ نہیں کھولا تھا۔

پھر وہ کانسٹیبل شہروز کو لاتیں مارتے اور دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے جانے لگے۔ اسی وقت ایک موٹی تازی گرانڈیل لیڈی کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر لائبہ کو بالوں سے پکڑا اور بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب بڑھنے لگی۔

لائبہ بری طرح چیخ چلا رہی تھی مگر وہاں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی قیمتی امپورٹڈ سینڈل اندر کمرے میں رہ گئی تھی اور برائے نام دوپٹا کہیں دروازے کے قریب گر گیا تھا، اس کے سلیولیس گورے گورے بازوؤں پر اس لیڈی پولیس کے ناخنوں کی کھرونچیں لگی تھیں۔ جس میں سے خون رس رہا تھا۔ حالانکہ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی تھی مگر اس لیڈی پولیس کی گرفت ہی ایسی وحشیانہ تھی۔

ان سب کمروں سے مردوں اور عورتوں کو اسی طرح نکالا اور ہانکا جا رہا تھا۔ جو مزاحمت کی کوشش کرتے یا اپنے حوالے دینے کی جسارت کرتے، ان پر مکوں اور لاتوں کا بے دریغ استعمال ہو رہا تھا۔

رپورٹر ہر ہر زاویے سے کھٹا کھٹ ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے پھر پولیس موبائلوں میں انہیں مویشیوں کی طرح ٹھونس دیا گیا تھا۔

☆☆☆

"محکمے کے خاص آرڈر کی بنا پر ہم نے یہ آپریشن شروع کیا ہے۔ شہر کے پوش علاقوں اور دیگر آبادی میں بنے اس قسم کے ریسٹورنٹ ایک طرف ہماری نوجوان نسل کو مختلف نشوں کا عادی بنا رہے ہیں اور دوسری جانب یہ بے راہ روی کا ذریعہ بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہاں جوڑوں کو عیاشی کے لیے چند گھنٹوں کے لیے ہزاروں روپے کے عوض پُرآسائش کمرے مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہ ریسٹورنٹ نہیں بلکہ عیاشی کے اڈے ہیں۔

"شہریوں کے لیے یہ امر باعث تشویش تھا لیکن وہ ان کے مالکان کے خلاف اس لیے آواز نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ اس گھناؤنے بزنس کے پیچھے ایک مافیا کا ہاتھ تھا۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک بھی ایک اہم شخص ہے جس کے اس جیسے سیکڑوں ریسٹورنٹ شہر میں چل رہے ہیں۔ اس کا نام فی الحال پریس میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔"

پولیس کے اس اعلیٰ افسر نے پریس کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"سر ایک سوال اور۔" ایک لیڈی رپورٹر انہیں اٹھتے ہوئے دیکھ کر بولی۔

"وہ افراد جو لاک اپ میں بند ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"دیکھیں برائی کی اصل جڑ تو یہی ہیں۔ اگر گناہ کرنے والے نہیں ہوں گے تو گناہ کی دعوت دینے والے کہاں جائیں گے۔ ہم ان کے خلاف سخت ایکشن لینے والے ہیں اور ان سب پر قانون کے مطابق کیس چلے گا۔"

"ان میں کچھ کم عمر لڑکیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے انہیں دھوکے سے یہاں لایا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے ان کا تعلق باعزت اور شریف گھرانوں سے ہو۔ کیا ان کے ساتھ بھی رعایت نہیں کی جائے گی؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ ان کے والدین کو بلوا کر اور انہیں وارننگ دے کر انہیں ان کے حوالے کر دیا جائے؟"

"دیکھیں بی بی اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم پر رشوت لینے یا سفارش ماننے کا الزام لگانے والے بھی آپ لوگ ہوں گے اور آپ ان کے چہروں پر نہ جائیں۔ یہ ایسی ہی باعزت اور شریف گھرانوں کی ہوتیں تو ایسے اڈوں پر نظر نہ آتیں۔ ان کے خلاف سخت کارروائی ہوگی اور کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے گی۔"

☆☆☆

ان سب کے والٹ اور سیل فون پولیس کے قبضے میں تھے۔ وہ منتظر تھی کہ کب اس کے گھر والوں سے رابطہ کیا جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے ممی اور ڈیڈی کا ری ایکشن کیا ہوگا مگر جو بھی تھا وہ اس صورتِ حال سے زیادہ خطرناک اور ڈراؤنا تو نہیں ہوسکتا تھا۔

صحافیوں کے نکلتے ہی کارروائی کا آغاز کردیا گیا تھا اور یہ کارروائی اس کارروائی سے قطعاً مختلف تھی جس کا دعویٰ پریس کے سامنے کیا گیا تھا۔

گرفتار ہونے والے آٹھ مردوں میں سے سب سے تگڑی اسامی کو پہلے آگے لایا گیا تھا اور اب اس سے معاملات نمٹائے جارہے تھے۔ باقی اپنی باری کے منتظر تھے کہ کب انہیں ان کی بدنامی کی قیمت بتائی جائے گی۔ ان میں شہروز بھی شامل تھا۔

لائبہ ٹھنڈے فرش پر باقی عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ عورتیں جو اس جیسی نہیں تھیں اور نہ وہ ان جیسی تھی۔ ان کے لیے شاید یہ لاک اپ اور چھاپا سب معمول کی بات تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی اپنے پچھلے تجربات بیان کررہی تھیں کہ پچھلی بار کتنے گھنٹوں بعد لاک اپ سے چھوٹی تھیں اور کس کی سفارش پر۔

وہ گناہ گار نہیں تھی پھر یہاں کیوں تھی؟ ہاں اس سے ایک غلطی ہوئی تھی مگر اس قسم کی غلطیاں روز درجنوں لڑکیاں دہراتی ہوں گی۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ اس کے اس سوال کا جواب دور کہیں موجود تھا۔

☆☆☆

سترہ سالہ لائبہ شہر کے ٹاپ کلاس کو ایجوکیشن کالج کی فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ یہاں زیادہ تر برگر کلاس کے نوجوان ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں اس کی سہیلیاں ہفتے میں ایک دو بار کلاسز بنک کرکے اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزاری کے لیے نکلا کرتی تھیں۔

وقت گزاری...... ہاں ان کے نزدیک یہ وقت گزاری ہی تھی جسے اس کی ہم عمر ٹین ایجر لڑکیاں، پیار، محبت یا رومان کے دلفریب نام دیا کرتی تھیں۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھیں، وہاں بچپن بہت جلد رخصت ہوجاتا ہے۔

کم عمری میں ملنے والی غیر ضروری آسائشیں اس کی وجہ تھیں۔ یہ ٹین ایجر بچے الگ بیڈرومز میں مہیا کردہ کیبل، نیٹ، موبائل فونز کی بدولت بھرپور بلوغت کے شب و روز جی رہے تھے۔ اس کی سہیلیاں جب اپنے اپنے دوستوں کا ذکر کرتیں تو اس کا بھی دل چاہتا کہ کوئی اس کا بھی دوست ہو جسے وہ فخریہ انداز میں اپنی سہیلیوں سے ملوائے۔

وہ ایک خوب صورت اور پُراعتماد لڑکی تھی مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ اب تک کسی نوجوان سے اس کی دوستی نہیں ہوسکی تھی اور یونہی اس کا سولہواں سال گزر گیا تھا۔

یہ اس کی سترہویں سالگرہ تھی جو اس نے اپنی فرینڈز کے اصرار پر ایک ریسٹورنٹ میں سیلیبریٹ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کپلز کی صورت میں پارٹی میں آنے کا آئیڈیا اس کی فرینڈ رمشا کا تھا اور چونکہ تمام فرینڈز اپنے بوائے فرینڈز کے معاملے میں خودکفیل تھیں اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا لیکن وہ پریشان تھی۔ ایسے موقع پر وہ خود کو گاؤدی محسوس کررہی تھی۔ کیونکہ پوری پارٹی میں وہ اکیلی تھی۔

اس سے پہلے اس نے اس بات کو بھی اہمیت نہیں دی تھی مگر اس دن پہلی بار اسے کسی دوست کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ پارٹی کے دوران وہ اندر ہی اندر خجالت محسوس کررہی تھی۔

☆☆☆

اس دن اس کے ڈیڈی نے اپنے دوست اور بزنس پارٹنر شیخ صاحب اور ان کی فیملی کو اپنے گھر ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ ان کا بیٹا شہروز بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ عمر میں لائبہ سے چار پانچ سال بڑا تھا اور پانچ سال اسٹڈیز کے لیے لندن میں مقیم رہنے کے بعد حال ہی میں پاکستان واپس آیا تھا۔

وہ شہروز کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ان پانچ سالوں میں اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ شہروز نے بھی بڑی لگاوٹ بھری نظروں سے لائبہ کو دیکھا تھا۔ اس کی توجہ اور لائبہ کی خوب صورتی کو سراہتی ہوئی نظروں نے اسے یہ احساس دلادیا تھا کہ شہروز اس سے راہ و رسم بڑھانا چاہتا ہے۔ شہروز کی وجاہت نے اسے بھی متاثر کیا تھا۔ اس کی پیش قدمی سے وہ دل ہی دل خوش ہورہی تھی۔ اس کے وجود پر چھائی سرد مہری کی چادر آہستہ آہستہ سرکنے لگی تھی۔ شہروز چور نظروں سے مسلسل اسے دیکھ رہا تھا اور اس کا یوں دیکھنا اسے مسرور کررہا تھا۔

☆☆☆

اس کی سہیلیاں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھیں۔ اسی وقت اس کی نظریں کچھ دور ایک ٹیبل پر تنہا بیٹھے شہروز پر پڑیں۔ وہ سہیلیوں کی نظر بچا کر ٹیبل سے اٹھی۔ یوں بھی سب اپنے آپ میں مگن تھیں۔

وہ اس کے قریب چلی آئی پھر رسمی سلام دعا کے بعد بولی۔

”آج میری برتھ ڈے ہے۔ میں یہاں اپنی سہیلیوں

کے ساتھ سلیبریٹ کررہی ہوں۔ کیا تم ہمیں جوائن کرو گے؟''
لائبہ نے بغیر کسی تمہید کے اسے انوائٹ کیا۔
شہروز نے ایک نظر لمبی سی ٹیبل کے گرد بیٹھے درجن بھر لڑکے لڑکیوں پر ڈالی اور سارا معاملہ بھانپ گیا۔
''کیا تم اپنی فرینڈز کو یہ بتاؤ گی کہ میں اچانک مدعو کیا جانے والا مہمان ہوں یا میرا تعارف کچھ خاص انداز میں کرواؤ گی؟'' اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو لائبہ خفیف سی ہوگئی۔
وہ چاہتی تو یہی تھی کہ شہروز جیسی شاندار شخصیت رکھنے والے لڑکے کا تعارف اپنے خاص الخاص دوست کی حیثیت سے کروائے لیکن وہ اس سے کہہ نہیں سکی۔
''ٹھیک ہے تم اتنے پیار سے انوائٹ کررہی ہو تو میں چلتا ہوں۔ ویسے تم نے مجھے بلایا ہے نا؟''
''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں سرپرائز گیسٹ کے طور پر انٹروڈیوس کرواؤں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔
وہ شام کئی حوالوں سے یادگار تھی۔ وہ اپنی دوستوں کی رشک آمیز نظریں بہ خوبی دیکھ رہی تھی۔ ان کے شہروز کے لیے کہے گئے توصیفی جملے اسے اپنے لیے ستائش محسوس ہورہے تھے۔ وہ چند گھنٹوں کی اس ملاقات میں شہروز کے بہت قریب آ گئی تھی۔ اس رات سونے سے قبل وہ گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔
اگلے تین دن وہ بلاناغہ کئی گھنٹے فون پر باتیں کرتے رہے۔ تیسرے دن شہروز نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور وہ ذرا ہچکچائی تھی۔ یہ یقیناً اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ اس سے ملنے سے کترا بھی رہی تھی اور اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟'' بالآخر شہروز نے پرانا حربہ آزمایا۔ اعتماد کی کسوٹی لے کر وہ اسے شرمسار کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی شرمندہ سی ہوگئی۔
''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں، فون پر ہم بات کرتو لیتے ہیں۔''
''صرف بات کرنے سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' شہروز کی آواز سرگوشیوں میں ڈھلی تو لائبہ کے نوعمر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔
''ملنا چاہتے ہو تو گھر آجاؤ۔'' وہ بولی۔
''میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں لائبہ۔'' اکیلے میں اس نے زور دے کر کہا تھا۔ ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے

برسرروزگار

باپ: ''میرے چار بچے ہیں۔
''ایک نے PHD کیا ہے، دوسرے نے MBA کیا ہے تیسرے نے MA کیا ہے اور چوتھا چور ہے ؟''
دوست ...... ''تو چور کو اپنے گھر سے نکالتے کیوں نہیں؟''
باپ: ''وہی تو کماتا ہے۔
''باقی سب بیروزگار ہیں......''

عقلمندی

ایک آدمی نے چڑیا گھر بنایا اور اس کا ٹکٹ 50 روپے رکھا۔ مگر کوئی نہیں آیا۔ پھر اس آدمی نے ٹکٹ کے 10 روپے فیس کردی...... تو پھر بھی کوئی نہیں آیا...... پھر اس نے ٹکٹ فری کردیا...... اور چڑیا گھر لوگوں سے بھر گیا......
آدمی نے شیر کا پنجرہ کھول دیا اور باہر نکلنے کا ٹکٹ 200 روپے کا کردیا۔
(مرسلہ: محمد شفیق حسین۔ نیو کراچی)

وہاں سب کے سامنے میں کہہ نہیں پاؤں گا۔'' اس کے اس جملے نے لائبہ کو بے بس کردیا۔ یہ اس کی جانب سے پہلا واضح اظہار تھا۔ وہ چاروں شانے چت ہوگئی۔
''ٹھیک ہے میں آؤں گی۔'' بالآخر وہ بولی۔
''کل صبح گیارہ بجے میں تمہیں تمہارے کالج کے گیٹ سے پک کرلوں گا۔''
نہ لائبہ نے پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جائے گا اور نہ شہروز نے بتانا ضروری سمجھا۔ کسی لڑکے سے دوستی کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ پہلی بار یوں کسی سے چھپ کر ملنے جارہی تھی۔ یہ سب اسے ایڈونچر لگ رہا تھا۔ اس سے ملنے کے تصور سے اس کے جذبات میں ایک ہیجان برپا تھا۔

☆☆☆

آج اس کے لیے دن کا آغاز بہت برا ہوا تھا۔ اس شہر میں اس کے کئی ریسٹورنٹ اور شیشا بار تھے جن میں سے ایک پر چھاپے کی اطلاع اسے صبح ہی مل گئی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ریسٹورنٹس میں رابطہ کرکے انہیں فوراً بند کروادیا تھا۔

"پورے اسٹاف کو چھٹی دے دو کم از کم ایک ہفتے کی اور سارا ریکارڈ غائب کر دو...... اور خود بھی جلد از جلد نکل جاؤ اور جب تک میں آرڈر نہ دوں ریسٹورنٹ دوبارہ نہیں کھولنا۔" اس نے اپنے مینیجرز کو ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔ پھر اس نے دوسرے شہروں میں واقع اسی قسم کے دیگر ریسٹورنٹس میں بھی فون کر کے صورتِ حال کا جائزہ لیا مگر وہاں حالات قابو میں تھے۔ پھر بھی اس نے مینیجرز کو محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔

وہ دیر تک اپنے اثر و رسوخ رکھنے والے دوستوں سے رابطے میں رہا۔ پولیس نے یہ کارروائی عوام کے مفاد میں نہیں کی تھی بلکہ ان کا مقصد دولت کا حصول تھا، یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے سر کھپانے کے بعد یہ ہوا کہ پولیس کے اس اعلیٰ افسر نے جو دباؤ اس پر ڈالا تھا وہ معاملہ پچاس لاکھ میں نمٹ گیا تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس کا نام ریکارڈ میں نہیں آئے گا۔

"ان کے آگے جب تک ہڈی نہ پھینکو یہ ٹلتے نہیں ہیں...... سارا دن برباد کر کے رکھ دیا۔ پچاس لاکھ کا چونا الگ لگا دیا۔ یونہی مانگ لیتے، دے دیتا۔ اس سب ڈرامے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ اپنے بزنس پارٹنر فہیم صاحب سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

"میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ یہ افسر نیا آیا ہے۔ اس سے معاملہ نمٹالو مگر تم نے دیر کر دی۔"

کئی گھنٹوں کی بھاگ دوڑ میں نہ انہیں کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ معاملہ کنٹرول میں ہونے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہوئے تھے۔ وہ اس وقت گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور فہیم اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

"ہاں یار خوامخواہ کی پریشانی ہو گئی۔ مجھے پہلے ہی پیش بندی کر لینی چاہیے تھی۔ چھاپے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ہمارے تمام ریسٹورنٹس اور اسموکنگ بارز میں یہ بات کنفرم ہوئی ہے کہ یہاں کوئی مائی کا لعل ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اسی وجہ سے بڑی پارٹیاں بھی بغیر کھٹکے کے یہاں آتی ہیں۔ ہمارا ریکارڈ خراب کر کے رکھ دیا اس پولیس افسر نے۔ میرے ریگولر کسٹمرز کیا سوچتے ہوں گے؟"

"ویسے دیکھا جائے تو یہ کام ہے بڑا منافع بخش۔ ان چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹس سے ہی ہمارے وارے نیارے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے ایک چھوٹے سے روم کا کرایہ فائیو اسٹار ہوٹل کے روم کے برابر ہے۔" فہیم نے اسے داد دی۔

"کیا کریں یار! اولاد کو ایک خوشحال زندگی دینے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔"

"ویسے وہاں پریس کے نمائندے بھی موجود تھے۔ انہیں تم نہیں جانتے۔ وہ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ کہیں ہم تک نہ پہنچ جائیں۔" فہیم نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اتنا کچا کام نہیں کیا میں نے......" ٹریفک سگنل پر اس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "پچاس لاکھ کم رقم نہیں ہے اور جو مرغے انہوں نے بند کمروں سے نکالے ہیں وہ بھی موٹی اسامی ہیں۔ ان کی بھی وہ خوب کھال اتاریں گے۔ ایک ایک سے لاکھوں وصول کریں گے۔"

اسی وقت ایک بچہ شام کا اخبار لیے اس کی سمت کھڑکی پر آیا۔ پہلے اس نے سوچا اسے دھتکار دے پھر نہ جانے کیا خیال آیا اس نے اس بچے سے اخبار خرید لیا۔

شام کا وہ اخبار جو سارے دن میں ہونے والی ہنگامہ خیز خبروں کو اپنے چٹ پٹے انداز کے ساتھ چھاپ کر مزید سنسنی خیز بنا دیتا تھا۔

فرنٹ پیج پر ان کے ریسٹورنٹ کی خبر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔ سرخی پڑھ کر اس نے اخبار فہیم کی جانب بڑھا دیا، سگنل کی بتی سبز ہو چکی تھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

"یہ دیکھو صاف لکھا ہے۔ ریسٹورنٹ کسی نامعلوم شخص کی ملکیت تھا اس کے مالک کا سراغ لگانے میں پولیس ناکام رہی ہے۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اور ہمیشہ ناکام رہے گی۔" وہ نشاندہی کے لیے اسے خبر پر انگلی رکھ کر دکھانے لگا۔

ایسا کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر سرخی کے نیچے چھپی تصویر پر جم کر رہ گئی۔ تصویر میں ایک گیم شیم لیڈی کانسٹیبل ایک نوعمر لڑکی کو بالوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ لڑکی کے قریب ہی شہروز سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان دونوں کے چہرے تصویر میں بے حد واضح تھے۔ نیچے درج تھا ہوٹل کی آڑ میں کھلے بدکاری کے اڈے سے گرفتار کی جانے والی ایک "فاحشہ" اور اس کا "ساتھی" پولیس کی تحویل میں۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی لائبہ تھی۔

ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، یہ تصویر ان کے بچوں کی تھی۔

دیو قامت

محمد یاسر اعوان

معاشرہ چاہے مشرقی ہو یا مغربی... دوستی، دشمنی، لالچ اور مفاد کے فارمولے تقریباً ایک ہی جیسے ہوتے ہیں... اس ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی اسے حرص و طمع نے ایک ایسا تماشا کرنے پر مجبور کردیا کہ دیو قامت جسامت اور منفرد شخصیت ہونے کے باوجود وہ دنیا کی نظر میں مردہ بن کر رہ گیا کیونکہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

وراثت کے اصولوں پر پورا اترنے کے لیے
ایک بے اصول انسان کا قصہ

وہ نرم اور شوخ رنگ کے دیوان پر لیٹا بڑے مزے سے اخبار میں چھپے ہوئے لطیفے پڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہنس پڑتا اور اس کی گہری نیلی آنکھیں کچھ زیادہ چمکنے لگتیں لیکن پھر اچانک ہی پیٹرسن کو ایسا لگا، جیسے وہ کسی ڈیپ فریزر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اخبار کا صفحہ پلٹ دیا۔ کرسی کو لات مار کر ایک طرف پھینکا اور اخبار اتنی قوت سے پکڑ لیا کہ اس کی انگلیوں سے اخبار میں سوراخ بن گئے۔

کیلی فورنیا میں چمکتے ہوئے سورج کی وجہ سے اس کا

کر ا اگرچہ اب بھی گرم تھا لیکن وہ خود بالکل سرد ہو چکا تھا۔

اخبار میں بظاہر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مختلف رنگوں کی روشنائی سے کئی خبریں اور تصویریں اخبار میں شائع کی گئی تھیں اور ایک تصویر کسی مرسیڈیز کار کی بھی تھی جو کنکریٹ کے آہنی پل سے ٹکرا کر تباہ ہو چکی تھی۔ کار کی حالت عجیب...... تھی۔

پچکا پچکا پل کے ایک جنگلے میں جھول رہا تھا اور خود کار ریلنگ کے سہارے کھڑی تھی، جیسے ہوا کے کسی زوردار جھونکے کے بعد دریا میں گر جائے گی۔

پیٹرسن کے لیے کار کی تباہی میں کوئی خاص بات نہیں تھی، اس کے لیے سب سے اہم بات وہ ڈرائیور تھا جو کار کے ساتھ ہی مر چکا تھا۔ مرسیڈیز کا ایک دروازہ اپنے اکھڑے ہوئے قلابوں سمیت ڈرائیور کی نشست میں دھنس گیا تھا اور ڈرائیور ٹوٹے ہوئے اسٹیئرنگ وہیل پر اوندھا پڑا تھا۔

تصویر میں پیٹرسن کو ڈرائیور کا چہرہ صاف نظر نہیں آ سکا لیکن اس کے غیر معمولی بڑے کان اور اس کے جبڑے صرف ایک بات بتاتے تھے کہ مرنے والا کوئی غیر نہیں بلکہ پیٹرسن کا بھائی ٹمسن ہے۔ پیٹرسن نے تصویر کا کیپشن پڑھا تو الجھن کچھ اور بڑھ گئی۔ اخبار میں مرنے والے کا نام جیک لکھا تھا...... پیٹرسن بہت دیر تک گم صم کھڑا رہا۔ ایک منٹ بعد وہ اضطراری کیفیت میں اپنے ڈارک براؤن بالوں کو انگلیوں سے کھینچنے لگا اور پھر اس نے یک لخت ہی اپنا ہاتھ نیچے کر لیا۔ اس نے مرنے والے کی تصویر پھر دیکھی۔

مُردہ شخص کے جھولتے ہوئے بائیں بازو پر ایک نشان تھا، جو آستین پھٹ جانے کی وجہ سے نظر آ رہا تھا۔ کلائی کی چوڑی ہڈی پر بھی ایک نشان تھا جیسے کسی نے قینچی سے کلائی پر کچھ بنا دیا ہو۔ پیٹرسن نے اخبار آہستہ سے ایک طرف رکھ دیا۔ اسے ثبوت مل چکا تھا کہ مرنے والا ٹمسن ہی ہے۔ اس کی کلائی پر پیدائشی نشان موجود تھا، شاید پولیس نے اس کی شناخت میں کوئی غلطی کی تھی۔

پیٹرسن خود فراموشی کے عالم میں اپنے سوٹ کیس کی طرف بڑھ رہا تھا...... ایک سو اسّی میل کا فاصلہ پیٹرسن نے صرف چار گھنٹے میں طے کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ جمی لیو کے مُردہ خانے میں داخل ہوا۔ یہ مُردہ خانہ کیلی فورنیا، میکسیکو کی سرحد کے نزدیک واقع تھا۔ مردہ خانے کی عمارت میں تازہ اسپرے کی وجہ سے بھینی بھینی مہک تھی۔ پیٹرسن کو دیکھتے ہی ایک شخص آگے بڑھا۔

"میں مسٹر جمی لیو ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو......"

"میں...... میں......" پیٹرسن کی آواز بھرا گئی۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے جو شخص کل پل کے حادثے میں فوت ہوا، وہ میرا بھائی تھا۔"

"مسٹر جیک؟" مسٹر جمی نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔ اس کا نام ٹمسن ہے۔" پیٹرسن نے وضاحت کی...... جمی لیو چالیس بیالیس سال کا موٹا تازہ شخص تھا اور شکل صورت سے وہ مردہ خانے کا انچارج نہیں لگتا تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بھی سنجیدہ تھیں لیکن ہونٹ کچھ اس طرح الگ الگ تھے، جیسے وہ ہنس رہا ہو۔

"میں معذرت خواہ ہوں جناب۔" جمی نے کہا۔ "یہاں ٹمسن نامی کسی کی......"

"میں جانتا ہوں۔" پیٹرسن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن اگر تم مجھے ایک نظر لاش دیکھنے دو تو......" پیٹرسن نے جان بوجھ کر اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

جمی لیو نے اپنا گنجا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں آنجہانی جیک کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جناب! اور میں نے ہی ان کی لاش شناخت کی تھی۔"

"لیکن میں خود لاش دیکھنا چاہتا ہوں...... صرف ایک نظر۔"

"ناممکن۔" جمی نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے اور پھر لاش بری طرح مسخ ہو چکی ہے۔"

پیٹرسن کھول کر رہ گیا۔ "سنو مسٹر جمی۔" اس کے لہجے میں آگ بھری ہوئی تھی۔ "مجھے پتا نہیں کہ وہ میرا بھائی ہے بھی یا نہیں۔ میری دعا ہے کہ لاش ٹمسن کی نہ ہو لیکن تم اب شرافت سے مجھے وہاں لے چلو۔ میں لاش خود دیکھوں گا تا کہ مجھے اطمینان ہو سکے۔"

جمی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اسے گھورا اور جواب دیے بغیر ہال کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ پیٹرسن بھی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ دونوں ایک یخ بستہ کمرے میں داخل ہوئے جہاں چار پہیوں والا ایک اسٹریچر ایک میز پر رکھا ہوا تھا جس کے اوپر شیشے کی چھت تھی۔ لاش پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود پیٹرسن نے ایک ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ مرنے والا ٹمسن ہی کی طرح طویل القامت ہے۔ لاش کے پاؤں اسٹریچر سے کافی باہر تھے۔

جمی لیو کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ اس نے بڑی

مہارت سے چادر پیروں سے ہٹاتے ہوئے سینے پر رکھ دی مگر لاش کا چہرہ اب بھی ڈھکا ہوا تھا۔ پیٹرسن نے ننگے بدن اور سفید پیروں کو بغور دیکھا جو اسٹریچر سے باہر تھے۔ مرنے والا یقیناً چھ فٹ آٹھ انچ لمبا ہوگا اور یہی ٹکسن کی بھی قامت تھی۔

''میں اس کا......'' پیٹرسن کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ وہ خود کو بہت کمزور اور بیمار محسوس کر رہا تھا۔ ''میں باقی جسم بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کو بڑا صدمہ ہوگا مسٹر۔'' جمی نے بڑی بے رحمی سے کہا اور لاش کے چہرے سے بھی چادر ہٹادی۔ پیٹرسن نے جو کچھ دیکھا وہ واقعی کربناک تھا۔ چہرہ اس بری طرح سے مسخ ہو چکا تھا کہ اس کی شناخت ناممکن تھی۔ لاش کے بال ٹکسن کے سر کے بالوں کی طرح دراز اور سیاہ تھے۔ چہرے کے عمومی خدوخال بھی ٹکسن کی طرح تھے۔ پیٹرسن اسٹریچر کی دوسری طرف چلا گیا۔ لاش کا بایاں ہاتھ ران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر کلائی دیکھی اور دم بخود رہ گیا۔ کلائی پر موجود پیدائشی نشان اب غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ دس بارہ ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ پیٹرسن نے سر اٹھا کر جمی کو گھورا۔

''یہاں یقیناً کسی نے پاگل پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی کلائی کا نشان کس طرح غائب ہوگیا؟'' جمی کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ پیٹرسن نے اپنی جیب سے اخبار کا تراشا نکالا اور جمی کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ ''ذرا اس تصویر کو غور سے دیکھو...... یہ حادثے کے فوراً بعد لی گئی ہے اور اس میں کلائی پر پیدائشی نشان بھی موجود ہے۔'' مردہ خانے کے انچارج نے اخبار کا تراشا اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔

''ممکن ہے یہ پیدائشی نشان ہو لیکن میری رائے میں تصویر کی طباعت کے وقت اس پر سیاہی کا دھبا آ گیا ہے۔'' اس نے تراشا واپس پیٹرسن کو دیا اور پھر سفید چادر لاش پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کچھ اور کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''ہاں...... اس کا کوٹ اور پرس کہاں ہیں؟'' پیٹرسن نے پوچھا۔ جمی نے فوراً ہی ایک بینچ کی طرف اشارہ کر دیا جہاں پتلونوں اور کوٹوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

''اس میں تلاش کرلو۔''

پیٹرسن بینچ کی طرف بڑھا اور اسی وقت چھت پر لگی ہوئی سبز بتی روشن ہوگئی۔ جمی نے جلتی ہوئی بتی دیکھ کر کہا۔ ''آپ آرام سے کپڑوں کا جائزہ لیں جناب...... میں اوپر

انمول موتی

☆ کنجوس شخص کتنا بدنصیب ہے دنیا میں فقیروں جیسی زندگی جیے گا اور قیامت میں امیروں جیسا حساب دے گا۔

☆ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل نیکی کا زمانہ نہیں رہا، اصل میں وہ لوگ انسان سے نیکی کا بدلہ چاہتے ہیں لیکن جو لوگ جانتے ہیں کہ نیکی کا بدلہ اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا، ان کے لیے ہر زمانہ نیکی کا ہے۔

☆ وہ شخص زندگی کی کوئی جنگ نہیں ہار سکتا جو برداشت کرنے کا فن جانتا ہو۔

☆ وقت گہرے سمندر میں گرا ہوا موتی ہے جس کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔

☆ خوب صورت لوگ لازمی نہیں کہ اچھے ہوں لیکن اچھے لوگ ہمیشہ خوب صورت ہوتے ہیں۔

(مرسلہ: محمد شفیق حسین۔ نیو کراچی)

سنہری باتیں

☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلہ نہیں لیتا۔

☆ کسی پر اعتماد نہ کرو جب تک کہ اسے غصے میں نہ دیکھ لو۔

☆ موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔

☆ انسان پریشان اس وقت ہوتا ہے جب وہ وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ مانگتا ہے

☆ انسان ایک دکان کی طرح ہے اور زبان اس کا تالا ہے جب تالا کھلتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ دکان کوئلے کی ہے یا سونے کی۔

☆ ماضی کی غلطیوں پر رونا اور پچھتانا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے۔

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی)

محبت اور دوستی

یہ دو چیزیں ہر طوفان کا مقابلہ کرسکتی ہیں مگر ایک چیز ان دونوں کے ٹکڑے کرسکتی ہے اور وہ چیز ہے غلط فہمی۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

جارہا ہوں۔ شاید کوئی اور آیا ہے۔"

پیٹرسن نے کپڑوں کا جائزہ لیا لیکن پہلی ہی نظر میں اس نے اندازہ کرلیا کہ ان کپڑوں میں سے کوئی بھی کمسن کا لباس نہیں کیونکہ کوئی بھی قمیص کمسن کے پسندیدہ سائز کی نہیں تھی۔ وہ عام طور پر پندرہ نمبر کی قمیص پہنتا تھا۔ ایک کونے میں شوخ سرخ رنگ کا پرس بھی پڑا تھا اور پیٹرسن کو معلوم تھا کہ اس کا بھائی ایسے شوخ رنگوں کا کبھی انتخاب نہیں کرتا۔ ڈرائیونگ لائسنس پر لکھا تھا۔

"جیک ٹیگر۔ 315۔ آر ویلی۔ کیلی فورنیا۔ قد چھ فٹ آٹھ انچ۔ وزن 220 پونڈ۔ عمر 32 سال۔"

پرس میں پچاس ڈالر کے نوٹ موجود تھے۔ کنٹری کلب کے مختلف کارڈ اور ایک پرانا سا شناختی کارڈ بھی موجود تھا جس کے مطابق جیک ٹیگر تیاگو پلانٹ میں ملازمت کرچکا تھا۔ کارڈ پر موجود تصویر کا چہرہ لمبا اور دبلا تھا، بال کالے چمکدار تھے، شاید یہ اسی شخص کا چہرہ تھا جس کی لاش اسٹریچر پر پڑی تھی۔ پیٹرسن نے آر ویلی کا ایڈریس ازبر کرکے پرس بینچ پر ڈال دیا اور اسٹریچر کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اور وہ اول فول باتیں سوچ رہا تھا۔ کیا یہ لاش کمسن کی تھی؟ اسے اب بھی یقین تھا کہ مرنے والا اس کا اپنا بھائی ہے لیکن پیدائشی نشان کہاں گیا؟ یہ نشان تصویر میں بہت واضح تھا۔ یقیناً کسی نے جان بوجھ کر نشان مٹانے کی کوشش میں وہاں ٹانکے لگادیے ہیں...... اوپر مردہ خانے کے دفتر میں ایک سیاہ رنگ کی مجل پرجی لیو کام میں مصروف تھا اور جب پیٹرسن اس کے قریب سے گزرا تو وہ سوگوار انداز سے سر ہلانے لگا...... سڑک پر سناٹا تھا تاہم صنوبر کے درختوں کی ہلکی ہلکی مہک ماحول میں رچی بسی تھی۔ وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا اپنی سفید رنگ کی کار کی طرف بڑھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں کسی دوسرے انجن کی گونج سنائی دی۔ اس نے برق رفتاری سے مڑ کر دیکھا۔ ایک سرخ اسپورٹس کار اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کار کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک سیکنڈ تک وہیں کھڑا رہا۔ کار پوری رفتار کے ساتھ اس کی طرف آرہی تھی، اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور اپنی کار کے بونٹ پر گرا۔ اسی کے ساتھ ایک ایسی زوردار آواز سنائی دی جیسے ٹین کے ہزاروں ڈبے یکبارگی... بج اٹھے ہوں۔ اس کی کار بری طرح ڈولی۔ بونٹ کھل گیا اور وہ کار کی دوسری جانب گر پڑا۔

پیٹرسن نے اپنے ہوش وحواس برقرار رکھے اور فوراً ہی کیچڑ آمیز گھاس سے اٹھ گیا۔ وہ دور ہوتی ہوئی اسپورٹس کار کا نمبر دیکھنا چاہتا تھا لیکن تاریکی نے اس کی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھا اور اسپورٹس کار کے سائے کا تعاقب کرنے لگا۔ اسے علم تھا کہ وہ اسپورٹس کار کی گرد کو بھی نہ پاسکے گا لیکن اس نے کوشش کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس کی کار کے اگلے حصے سے زوردار آواز بلند ہوئی اور جھٹکے کی وجہ سے اسٹیئرنگ وہیل اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ کار موڑ پر ہی رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کار کا اگلا حصہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ وہ کار سے نکل کر سڑک پر ہی کھڑا ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اسے بخوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ یہ محض حادثہ نہیں تھا۔ اسپورٹس کار میں جو کوئی بھی تھا، اس نے جان بوجھ کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جو کچھ بھی ہوا، وہ اچانک ہی رونما نہیں ہوا بلکہ یقینی طور پر کوئی اسپورٹس کار میں مردہ خانے کے باہر اس کی گھات میں تھا۔ سازش کا یہی ثبوت کافی تھا کہ اسپورٹس کار والے نے اپنی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں۔ بات واضح تھی، کسی نے اسے قتل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

پیٹرسن نے اپنی پیشانی کا پسینا پونچھا، یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔ اس کی جان کا دشمن کون تھا؟ پیٹرسن نے سوچا...... کیا اس سازش کا آغاز مردہ خانے کے تہ خانے ہی سے ہوا تھا...... مگر کیوں؟ جھنجلا کر پیٹرسن نے آنکھیں رگڑیں۔ اس پر حملے کا تعلق یقینی طور سے لاش کی شناخت کے معاملے سے تھا۔ اسے اب پکا یقین ہوگیا کہ مرنے والا کمسن ہی ہے اور کوئی جان بوجھ کر اس کی شناخت میں غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی نے لاش کی کلائی سے پیدائشی نشان مٹانے کی کوشش کی تھی۔

پیٹرسن کو اسی وقت سازش کا اندازہ ہوگیا تھا جب اس نے کمسن کی لاش دیکھی تھی لیکن اس وقت تک وہ خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ لاش اس کے بھائی کی نہیں۔ تاہم اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مرنے والا کمسن کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اب کمسن کبھی واپس نہیں آئے گا۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور گردن جھکائے پیٹرسن اپنی کار... کی جانب بڑھنے لگا۔ اس نے ایک راہ گیر سے پولیس اسٹیشن کا پتا پوچھا اور پھر کچھ سوچ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے کار چلا رہا تھا تاکہ کمزور ٹائر جواب نہ دے جائیں۔ کار کا مڈگارڈ بری طرح ہل رہا تھا مگر پیٹرسن

سوچ رہا تھا کہ وہ پولیس والوں کو کیا بتائے گا......

کلسن ایک ہفتہ قبل ہی اپنے گاؤں سے جنوبی علاقوں کے کاروباری دورے پر گیا تھا۔ پانچ دن تک وہ پیٹرسن کو مختلف سروس اسٹیشنوں کے لیے پالش فراہم کرنے کے آرڈر بھیجتا رہا۔ پیٹرسن نے کلسن کے ساتھ مل کر چند ماہ پہلے ہی کار پالش کا کاروبار شروع کیا تھا۔ انہیں جلد ہی کاروبار میں کامیابی ہونے لگی۔ کلسن نے سیلز کا شعبہ سنبھال لیا تھا جبکہ سائنس گریجویٹ ہونے کی وجہ سے پیٹرسن پالش کی تیاری کا نگراں تھا۔

گزشتہ دو دن سے کلسن نے نہ تو کوئی آرڈر بھیجا اور نہ ہی اپنی خیریت سے مطلع کیا تھا لیکن کلسن ایسا انسان نہیں تھا جو مصائب کا شکار ہو جائے۔ وہ پینے کا شوقین ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ بھائی اور کاروبار کو فراموش کر دے۔

وہ بڑی احتیاط سے کار چلاتا تھا لیکن ہائی وے چوکی کے عملے نے اخبار والوں کو بتایا تھا کہ مرسیڈیز اسّی، نوّے میل کی رفتار سے دوڑتی ہوئی پل میں گھس گئی تھی جبکہ کلسن نے پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے زندگی میں کبھی تجاوز نہیں کیا تھا۔ ایک معمایہ بھی تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والی کار بھی جیک فیکر کی ملکیت تھی۔

رات ساڑھے نو بجے کا عمل تھا جب پیٹرسن نے پولیس اسٹیشن کے سامنے اپنی کار پارک کی۔ یہ عمارت کیلی فورنیا کے قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ تھی۔ ڈیوٹی سارجنٹ نوجوان تھا اس لیے اس نے پیٹرسن کی ہر بات پر مکمل توجہ دی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا کہ اس وقت اس کے پاس عملے کی کمی ہے۔ وہ اب صبح ہی پیٹرسن کی شکایت پر کوئی کارروائی کر سکے گا۔ ”ٹھیک ہے۔“ پیٹرسن نے تلخی سے کہا۔ اس کے کوٹ کی آستین غالباً اسپورٹس کار سے بچنے کی کوشش میں بغل کے پاس سے پھٹ گئی تھی جس میں ریت بھری ہوئی تھی پیٹرسن نے ریت جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ ”315۔ آر ویلی کس طرف ہے؟“

”سامنے والے دروازے سے نکلو گے تو وہی سڑک آر ویلی ہے۔“ سارجنٹ نے کہا۔

پیٹرسن اس کا شکریہ ادا کر کے پولیس اسٹیشن سے نکل آیا اور سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے مکانات پر 315 نمبر ڈھونڈنے لگا۔ یہ نمبر اسے لاش کے پرس سے ملا تھا۔ وہ جیک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہی ایک صورت تھی جس سے کلسن کی موت پر روشنی پڑنے کا امکان تھا۔

315 ایک بلاک چھوڑ کر کونے کا گھر تھا۔ سفید رنگ کے باعث یہ مکان دور ہی سے چمک رہا تھا۔ پورچ میں رنگ برنگے پھول اور خوشبودار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ صحن میں چیری کے درخت قطار کی شکل میں اردگرد اُگے ہوئے تھے۔ یہاں پیٹرسن کو احساس ہوا کہ فنِ تعمیر میں درختوں اور عمارت کا توازن کتنا اہم ہوتا ہے۔ دروازے پر ایک بڑا گول کنڈا لگا ہوا تھا اور خود دروازہ بھی غیر معمولی حد تک بلند تھا، شاید آٹھ فٹ بلند...... پیٹرسن نے ڈور بیل کا بٹن دبایا۔ ایک لمحے بعد ہی اندر سے کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازے پر جو شخص نمودار ہوا وہ اتنا طویل القامت تھا کہ دروازہ اس کے جسم سے بھر گیا۔ یہ شخص کلسن سے بھی طویل القامت نکلا۔ وہ پیٹرسن کے ستے ہوئے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”کیا تم جیک فیکر سے واقف ہو؟“ پیٹرسن نے پوچھا۔

”میں اس کا بھائی نک فیکر ہوں۔ کیا بات ہے؟“

”میں تم سے حادثے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ پیٹرسن نے کہا۔

نک کچھ ہچکچایا مگر ایک لمحے بعد ہی اس کے بڑے بڑے جبڑے جارحانہ انداز میں ہلے۔ ”مگر کیوں...... تم کون ہو؟“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ مرنے والا تمہارا بھائی تھا؟“ پیٹرسن نے سوال کیا۔ ”میں صرف یہی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے شک ہے کہ جمی لیو کے مردہ خانے میں موجود لاش میرے بھائی کی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اس پورے معاملے میں کوئی گھپلا ہوا ہو۔“

طویل القامت شخص ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کے لہجے اور رویے کی جارحیت اب ہوا ہو چکی تھی۔ ”اوہ...... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اندر آ جاؤ، میں بھی مسلسل اسی نکتے پر غور کر رہا ہوں مگر دوسروں کا خیال ہے کہ لاش جیک ہی کی ہے۔“ وہ باتیں کرتا ہوا پیٹرسن کو ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے اتنی بے رخی سے پیش آیا۔ دراصل آج دن بھر انشورنس کمپنی اور پولیس کا عملہ مجھے تنگ کرتا رہا ہے۔ ان لوگوں کو صرف سوال کرنے کا شوق ہے اور میرا خیال تھا کہ تم بھی کوئی سرکاری اہلکار ہو گے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ پیٹرسن نے فراخ دلی سے کہا۔ اس نے نک فیکر کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ بمشکل تیس بتیس سال کا ہو گا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور سفید قمیص کی ایک

آستین پر سیاہ رنگ کا ماتمی بیج لگا ہوا تھا۔ وہ پیٹرسن کو تھکا تھکا سا لگا۔ نک ایک صوفے میں دھنس گیا اور اس نے دوسرے صوفے پر پیٹرسن کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ پیٹرسن کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ یہ صوفہ کتنا بڑا ہے۔ وہ عام انداز میں اس پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے پاؤں زمین سے چند انچ اوپر اٹھ گئے۔ اس نے حیرت سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز غیر معمولی حد تک بڑی اور چوڑی تھی۔ دیوان کسی بس کی طرح لگ رہا تھا اور کونے پر ناشتے کی میز اتنی بلند تھی کہ عام آدمی کے شانے تک اس میں چھپ سکتے تھے۔

نک فیکر نے پیٹرسن کی حیرت کا اندازہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ جیک کے سپنوں کا محل ہے، میرا بھائی میری ہی طرح چوڑا چکلا تھا۔ اسے عام گھروں میں رہنے سے نفرت تھی۔ اس کے گھٹنے میز سے ٹکراتے رہتے تھے اور سر دروازے سے ٹکرا جاتا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ ایک دن وہ اپنی پسند کا گھر بنائے گا۔'' نک نے اپنے بازو لہراتے ہوئے پیٹرسن کو بتایا۔ ''اور یہ مکان اس نے اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق تعمیر کرایا۔ ہمارے چچا رابرٹ کا انتقال ہوا تو ساری جائداد اور دولت ہم دو بھائیوں کو مل گئی۔ جیک نے اپنے حصے کی رقم یہ مکان تعمیر کرانے میں صرف کر ڈالی۔'' نک نے بات ختم کر کے طویل سانس لی اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''تم مجھے یہ بتاؤ...... مسٹر......''

''پیٹرسن۔''

''شکریہ...... ہاں تو مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں مُردہ شخص پر اپنے بھائی ہونے کا شبہ کیوں ہے؟''

''قد و قامت کے اندازے کی وجہ سے۔'' پیٹرسن نے آگے جھک کر کہا۔ ''اور پھر کسی نے لاش کی کلائی سے پیدائشی نشان مٹا کر وہاں ٹانکے لگانے کی بھی زحمت کی ہے۔ یہ کام اس کی موت کے بعد کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب میں مردہ خانے سے باہر آیا تو کسی نے مجھے کچل کر ہلاک کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔''

''ہاں...... میں نے بھی پولیس کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا تھا۔'' نک فیکر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''لاش بظاہر تو جیک ہی کی لگتی ہے لیکن میرے بھائی کے کان اتنے بڑے نہیں تھے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک شیلف کی طرف گیا جہاں سے اس نے بڑی سی ٹرے نکالی۔ ٹرے میں مشروب کی ایک نئی بوتل اور غیر معمولی طور پر بڑے گلاس رکھے ہوئے تھے۔

''سوڈا استعمال کرو گے؟'' اس نے پیٹرسن سے پوچھا۔

''نہیں۔'' پیٹرسن نے جواب دیتے ہوئے نک فیکر کو ایک بار پھر غور سے دیکھا جو بوتل کا کارک نکالنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا لیکن کارک اندر پھنس گیا تھا۔ وہ ایک بڑی ڈیسک کی دراز کھول کر اسکرو ڈرائیور تلاش کرنے لگا اور پھر اس نے اسکرو ڈرائیور کی مدد سے کارک نکال کر مشروب دودھیا گلاسوں میں انڈیل دیا تھا۔ پہلے ہی گھونٹ میں پیٹرسن کو اپنا سینہ جلتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس نے پروا نہ کی اور نک سے پوچھا۔

''کیا تم لوگ یہاں بہت عرصے سے رہتے ہو؟''

''نہیں۔'' بلند قامت نک نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''مونٹانا میں میری جاگیر ہے، میں وہیں تھا کہ اخبار میں جیک کی تصویر دیکھی۔ میں آج ہی یہاں آیا ہوں۔'' اس نے اپنے گلاس میں ایک بار پھر مشروب انڈیل لیا۔ ''مجھے بہت دکھ ہوا، یہ قصبہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ میں صرف لاش لینے آیا لیکن اب رک گیا ہوں کیونکہ وہ لاش مجھے جیک کی ہرگز نہیں لگتی۔''

''میں بھی اخبار میں تصویر دیکھ کر یہاں آیا ہوں۔'' پیٹرسن نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں سارجنٹ......!''

''اوہ...... وقت ہو گیا ہے۔'' نک فیکر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں معذرت خواہ ہوں لیکن گیارہ بجے سے پہلے مجھے انشورنس کمپنی کے منیجر کو فون کرنا تھا۔ یہاں کا فون خراب ہے لہٰذا مجھے سڑک پار پبلک فون تک جانا ہو گا لیکن تم یہیں ٹھہرو، مجھے تم سے مزید کچھ باتیں کرنی ہیں۔ تم انتظار کر سکتے ہو؟'' اس نے پیٹرسن سے پوچھا۔ پیٹرسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''شکریہ...... میں بس ابھی آیا۔ تم مشروب سے دل بہلاتے رہو۔''

پیٹرسن گلاس میں مشروب ڈال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ نک کی واپسی کا منتظر تھا۔ بیس منٹ گزر گئے اس کو گئے ہوئے پھر آدھا گھنٹا ہو گیا مگر وہ واپس نہیں آیا۔ پیٹرسن نے یہاں سے چل دینے کا ارادہ کیا لیکن کوئی نادیدہ بات اسے رکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ اس مکان اور دیو قامت بھائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ وقت گزارنے کے لیے اس نے مختلف کمروں کا جائزہ لیا۔ ہر چیز غیر معمولی حد تک بڑی اور طویل تھی۔ بستر، چھری، کانٹے، حتیٰ کہ ٹوتھ برش تک سب ہی بڑے تھے...... وہ باورچی خانے میں گیا۔ یہاں گوشت مارکیٹ

میں استعمال ہونے والے دو ریفریجریٹر رکھے ہوئے تھے اور ایک بڑا دروازہ دوسری سمت کھلتا تھا۔ وہ اس دروازے سے باہر آیا جہاں پر گیسولین کی بدبو تھی۔ ایک ہی قدم کے فاصلے پر گیراج نظر آیا۔ اس نے گیراج کی بتی جلائی تو اچانک ہی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے پورے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے دیکھا کہ گیراج میں ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی اور یہ وہی کار تھی جس سے اسے کچلنے کی کوشش کی گئی تھی......

پیٹرسن کار کی ہیڈ لائٹ کو بغور دیکھنے لگا۔ کار کے سامنے والے حصے پر ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ وہی گاڑی تھی جو اسے کچلنے کی کوشش میں اس کی گاڑی سے ٹکرائی تھی...... وہ بڑی پھرتی سے ہر خانے کی تلاشی لینے لگا لیکن ان میں سے کچھ نہیں ملا۔ پھر وہ ڈکی کی طرف لپکا جس میں اسے دو رسالے اور اسکیٹنگ کے جوتے ملے۔ ایک کونے میں کوئی پارسل بھی پڑا تھا۔ پیٹرسن نے تیزی سے پارسل کھولا۔ اس میں جوتوں کا جوڑا رکھا ہوا تھا۔ بڑے سائز کے جوتے جن پر پندرہ نمبر صاف لکھا تھا۔ اسی نمبر کے جوتے نکسن بھی استعمال کرتا تھا۔ مزید تلاشی پر اسے آکسفورڈ کی ایک قمیص ملی اور پھر پیٹرسن کو یقین ہوگیا کہ مرنے والا نکسن ہی تھا کیونکہ اسے یہ قمیص بہت پسند تھی۔ پیٹرسن نے کئی مرتبہ اپنے بھائی کو اس قمیص میں دیکھا تھا......

پھر اچانک ہی پیٹرسن اچھل پڑا کیونکہ اس کے عقب میں کوئی طیش بھری سرگوشی کر رہا تھا۔ ”تم یہاں کیسے چلے آئے؟“

پیٹرسن نے پلٹ کر دیکھا۔ باورچی خانے کے دروازے پر نک ٹیگر اور مردہ خانے کا انچارج جمی لیو کھڑے تھے۔ نک کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔

”تو تم نے اپنے بھائی کے جوتے تلاش کر ہی لیے۔“ نک پھنکارا لیکن اس کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ”کوئی بات نہیں ...... چلو اب اندر آجاؤ...... زیادہ ڈرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن کو بھی غیر ضروری تکلیف نہ دو...... چلو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ لاش تمہارے بھائی کی ہے اور تمہیں میں نے ہی کچل کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

کئی سیکنڈ تک پیٹرسن کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس نے جمی کو گھور کر دیکھا اور جب بولا تو اس کی آواز انتہائی مضبوط تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اعصاب لوہے کے بنے ہوں۔

قابل غور

”ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا...... ابو آپ آفس ہر روز نہ جایا کریں، بس میرے ساتھ کھیلا کریں۔“

باپ نے پیار سے کہا۔ ”بیٹا اگر آفس ہر روز نہیں جاؤں گا تو آپ کے لیے چیزیں کون لائے گا؟“

”تو روز مت جایا کریں بس جمعے کے جمعے چلے جایا کریں۔“ بچے نے کہا۔

باپ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا اگر میں صرف جمعے کے جمعے جاؤں گا تو وہ مجھے آفس سے نکال دیں گے۔“

بچے نے معصومیت سے کہا۔ ”ابو آپ مسجد بھی تو جمعے کے جمعے جاتے ہیں مگر اللہ پاک نے تو آپ کو کبھی اپنے گھر سے نہیں نکالا۔“

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بفہ ہزارہ)

”میں تم جیسوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔“ اور پھر اس نے جمی لیو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم نے مردہ خانے سے نک ٹیگر کو فون کر کے میرے بارے میں بتایا تھا اور پھر اس نے مجھے قتل کرنے کی بھی کوشش کی۔“

”شٹ اپ۔“ نک نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اتنا چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس والوں تک تمہاری آواز نہیں پہنچ سکے گی۔ اب ذرا سا بھی شور مچایا تو ابھی اور اسی جگہ تمہارا بھی کام کر دوں گا۔“

پیٹرسن نے اپنی آواز ذرا دھیمی کر لی مگر وہ انتہائی تلخی اور غصے کے عالم میں باتیں کرتا رہا۔ ”تم نے میرے بھائی کو قتل کیا تاکہ وہ تمہارے بھائی جیک کی جگہ لے سکے۔ اسی طرح تم نے پل پر حادثے کا ڈراما رچایا۔ نک ٹیگر! شاید تم نے اپنے بھائی کو بھی قتل کیا ہے لیکن تم اسے حادثاتی موت اس لیے قرار نہیں دے سکے کہ جیک کی لاش گولیوں سے چھلنی تھی اور تمہیں کسی ایسے متبادل کی ضرورت تھی جسے ہلاک کر کے تم حادثے کا ڈراما رچا سکو اور ...... اور وہ متبادل نکسن ...... میرا بھائی تھا۔“ پیٹرسن نے ایک طویل سانس لے کر اس مرتبہ سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔ ”تمہارے بھائی کی لاش کہاں ہے نک! شاید تم نے تہ خانے میں دبا دی ہوگی۔“

نک ٹیگر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”ہاں، تم ذہین آدمی ہو...... تہ خانے میں ہی تم بھی دفن کر دیے

جاؤ گے اور اس کام کے لیے تہ خانہ ہی مناسب جگہ ہے۔ مجھے اس بات کا قلق ہے کہ تم نے مکسن کے جوتے اور قمیص تلاش کر لیں۔"

"قلق ...... مگر مجھے خوشی ہے کہ تم انہیں ضائع نہیں کر سکے۔" پیٹرسن نے زہر خند سے کہا۔

"شاید تم جیسے بلند قامت شخص کو اندازہ تھا کہ غیر معمولی سائز کے جوتے دکانوں پر بہ مشکل ہی ملتے ہیں۔ شاید تم انہیں خود استعمال کرنا چاہتے تھے۔"

"ممکن ہے۔" نک ہنس پڑا۔" مگر تم باتیں بہت کر رہے ہو۔ باورچی خانے میں آ جاؤ اور اب بالکل خاموش رہو۔" نک تیکر کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی انگلی پستول کی لبلبی پر تھی۔ پیٹرسن نے سوچا کہ یہ وقت نک کو دبوچ لینے کا نہیں۔ پیٹرسن بھاری قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانے میں آ گیا۔ نک نے گیراج کا دروازہ بند کیا تو پیٹرسن نے پوچھا۔"تم نے اپنے بھائی جیک کو قتل کیوں کیا؟"

"دولت کے لیے دوست۔" نک نے پستول ہلاتے ہوئے کہا۔"اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اب مجھے وہ ساری دولت مل جائے گی جو چچا اس کے نام کر گئے تھے۔" نک اب ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔"ادھر چلو...... میں کچھ پینا چاہتا ہوں۔"

کمرے میں سب سے پہلے پیٹرسن داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نک اور پھر جمی تھا۔ نک نے اپنے گلاس میں مشروب انڈیلا اور جمی غیر یقینی کیفیت میں میز کے پاس کھڑا رہا۔ اس کے سرخ گالوں پر اب زردی تھی اور اس کی انگلیاں اضطراری انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔" مجھے یہ سب پسند نہیں۔ اسے یہاں مارنا مناسب نہیں ہے کیونکہ پولیس اسٹیشن بہت نزدیک واقع ہے۔"

"تم خاموش رہو، پاگل بڈھے۔" نک نے اسے جھڑک دیا۔" سب سے اچھی بات یہی ہے پولیس اسٹیشن بالکل قریب ہے۔ پولیس والے یہ سب کچھ اپنی ناک کے نیچے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" پھر اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم بھی بہت بڑے پاگل ہو۔ ہر معاملے کو پیچیدہ بنا کر رکھ دیا۔ میرا خیال تھا صرف دو افراد ہی کو قتل کرنا پڑے گا لیکن نہ جانے تم کہاں سے ٹپک پڑے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ کسی سیلزمین کا بھائی بھی ہو سکتا ہے۔" اور پھر اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔" چلو تمہیں بھی تہ خانے کا راستہ دکھا دیں۔"

پیٹرسن ایک قدم پیچھے ہٹا تو اس کے شانے سے ٹکرا کر ایک بڑا فرشی لیمپ نیچے گرنے لگا۔ پیٹرسن کو اچانک احساس ہوا کہ اس کی طاقت واپس آ رہی ہے۔ اس کا خون کھول رہا ہے...... وہ اچھلا اور اس نے فرشی لیمپ کو دبوچ لیا۔

اس کے اعصاب جھنجھنانے لگے۔ اسے یقین تھا کہ ایک ہی گولی اس کا خاتمہ کر دے گی لیکن جب وہ پلٹا تو نک اپنا پستول اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا۔ پیٹرسن نے کسی دیوانے کی طرح .... لیمپ کو گھمایا۔ لیمپ کافی بھاری تھا لیکن پیٹرسن کو صرف یہ احساس تھا کہ کوئی نادیدہ طاقت اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ نک کے چہرے پر بھی تعجب کے تاثرات تھے۔ پیٹرسن نے جیسے ہی لیمپ گھمایا پستول سے دھواں نکلنے لگا لیکن لیمپ کا ایک حصہ بروقت ہی نک کے ہاتھ پر پڑا تھا۔ پیٹرسن کو یوں لگا جیسے پستول کے پر نکل آئے ہوں۔ ہتھیار فرش پر گر گیا اور پھسلتا ہوا میز کے نیچے چلا گیا...... جمی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا لیکن وہ پیٹرسن کی جانب بڑھنے لگا۔ پیٹرسن دونوں ہاتھوں سے بھاری بھرکم لیمپ کو مسلسل گھما رہا تھا۔ جمی کچھ اور آگے بڑھا تو پیٹرسن کا عجیب و غریب ہتھیار اس کے پیٹ پر ضرب لگاتا ہوا گزر گیا۔ جمی کا سانس رکنے لگا۔ وہ پیٹ پکڑے اوندھے منہ فرش پر گر پڑا...... لیمپ اب بھی چکر کھا رہا تھا۔ مشروب کی بوتل، گلاس، ٹرے، شیلف پر سجے ہوئے کھلونے، سب ہی اس کی زد میں آ کر ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔

نک ایک بار پھر پیٹرسن کی طرف بڑھنے لگا۔ پیٹرسن نے اس مرتبہ اس دیو قامت شخص کے چہرے کا نشانہ لیا اور لیمپ کو آخری چکر دے کر ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ اس کا نشانہ اتنا صحیح ثابت نہیں ہوا کیونکہ نک کے چہرے پر پوری چوٹ نہیں لگی تھی مگر پھر بھی نک گال پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا تھا۔ پیٹرسن نے ایک بار پھر لیمپ اٹھالیا اور نک پر آخری ضرب لگانے کا ارادہ ترک کر کے لیمپ کو دیوان پر پھینک دیا کیونکہ نک انتہائی تکلیف میں تھا۔ وہ کسی پرانی موٹر کے انجن کی طرح کھانس رہا تھا۔ سرخ قالین پر تڑپتے ہوئے اس نے خون تھوکا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ بتدریج زرد ہونے لگا تھا......

پیٹرسن نے دوڑ کر پستول اٹھالیا اور نک کی طرف بڑھنے لگا۔ اب نک اپنے حلق میں انگلیاں ڈال کر کچھ نکالنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ پیٹرسن نے اس کے حلق کو دبایا اور چند لمحوں کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ نک کس مصیبت میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنے دونوں گالوں میں روئی ٹھونسی ہوئی

تھی جو لیمپ کی ضرب سے حلق میں چلی گئی تھی۔ پیٹرسن نے روئی کا ایک چھوٹا سا گولا اس کے حلق سے کھینچ لیا...... وہ نک سے چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ طویل القامت شخص نے حلق سے روئی نکل جانے کے بعد جلدی جلدی سانس لی اور پھر روئی کا ایک اور گولا خود ہی حلق سے نکال کر پھینک دیا۔

اب اس کا چہرہ بہت دبلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے چہرے کو بھاری بھر کم بنانے کے لیے گالوں کے اندر روئی کے پھائے رکھے تھے۔ پیٹرسن نے اسے بغور دیکھا اور فوراً ہی پہچان گیا۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کی تصویر اس نے مردہ خانے میں پڑے ہوئے شناختی کارڈ پر دیکھی تھی۔

"تو تم اپنے بھائی کے بھیس میں تھے۔" پیٹرسن نے بڑی حیرت سے کہا۔ "تم ہی نے یہ عجیب و غریب مکان بنایا ہوگا اور تم نے خود ہی اپنی موت کا بھی ناٹک رچایا۔" نک اپنا سر پکڑے خاموش بیٹھا رہا لیکن قریب ہی جمی لیو پیٹ میں لگی ہوئی چوٹ سے کراہتے ہوئے بولا۔

"میں...... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "م...... میں اس کے ساتھ شریک ضرور تھا لیکن میں نے کسی کو خراش تک نہیں پہنچائی۔ میں پھانسی پر لٹکنا نہیں چاہتا، میں سب کچھ بتادوں گا۔" جمی اب اٹھنے کی کوشش کرتا ہوا پیٹرسن کو دیکھ رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ "مجھ سے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ میں نے تمہارے بھائی کو جیک کی حیثیت سے شناخت کرانے کی کوشش کی۔ یہ جیک فیکر ہی تھا جس نے ٹکسن کے سر پر وزنی چیز ماری تھی اور پھر اسے اپنی مرسیڈیز میں ڈال کر کار اسٹارٹ کر دی اور پل سے دے ماری۔ اس نے مجھے پچیس فیصد رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔" جمی بڑی آسانی کے ساتھ سب کچھ اگل رہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔

"اس نے مجھے لالچ دیا تھا کہ اپنے چچا کی جائداد کا ایک چوتھائی حصہ میرے نام کر دے گا۔ اس کے چچا نے یہ وصیت کی تھی کہ جیک کو جائداد سے سو ڈالر ہفتہ ملے گا لیکن یہ زیادہ رقم چاہتا تھا۔ اس کا چچا اسے پسند نہیں کرتا تھا لہٰذا اس نے اسے یکمشت دو لاکھ ڈالرز نہیں دیے بلکہ اس کے بھائی نک......!"

"ایک منٹ صبر کرو۔" پیٹرسن نے اسے ٹوک دیا۔ "تمہارے کہنے کا مقصد یہ تو نہیں کہ نک فیکر کا کوئی وجود تھا؟"

"بالکل تھا۔" جمی نے کہا۔ "چچا کی وصیت میں لکھا تھا کہ اگر جیک مر جائے تو نک کو اس کے بھی دو لاکھ ڈالرز یکمشت دے دیے جائیں لیکن وصیت کی رو سے اگر نک مرتا تو جیک کو اپنے بھائی کا حصہ نہیں ملتا۔ اس لیے گزشتہ ہفتے جیک نے موقع پا کر نک کو قتل کر دیا اور اس کی لاش چھپا دی پھر یہ نک کا بھیس بدل کر واپس آیا۔ دونوں بھائیوں میں کوئی فرق نہیں تھا، بس نک کے گال بھرے بھرے تھے۔ جیک کی ٹکسن سے ملاقات حال ہی میں ہوئی تھی۔ جب دو غیر معمولی طویل القامت افراد مل جائیں تو ان میں دوستی ہو ہی جاتی ہے پھر اس نے ٹکسن کو ہلاک کر دیا۔ یقین کرو کہ جیک اپنے گالوں میں روئی کے پھائے رکھ کر بالکل نک لگتا ہے۔ اس نے وکیل تک کو اپنے نک فیکر ہونے کا یقین دلا دیا ہے۔" جمی لیو نے اپنی بات ختم کر دی تو جیک فیکر اسے خونی نظروں سے گھورنے لگا۔

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔" پیٹرسن نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ......!"

پیٹرسن کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی پورچ میں کسی کے بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ باہر نوجوان سارجنٹ کھڑا تھا۔

"تم لوگوں نے کیا شور و غل مچا رکھا ہے؟" اس نے غرا کر پوچھا۔

اور پھر اس کی نظر پیٹرسن کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول پر پڑی۔ "اوہ......" اس نے سیٹی سی بجائی۔ "تم یہ ہتھیار پھینک دو، ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں۔" جمی چلّایا۔ "میں پولیس کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"یہ تمہیں ایک سچی کہانی سنائے گا۔ اس وقت بظاہر خوفزدہ ہے۔ تم اس کی بات پر توجہ دو سارجنٹ۔" پیٹرسن نے پولیس آفیسر سے کہا اور پھر جیک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اور اس کا خاص خیال رکھو۔" جیک فیکر اب بھی فرش پر بیٹھے بیٹھے کھانس رہا تھا...... پیٹرسن مسکراتے ہوئے مزید بولا۔

"یہ طویل القامت شخص اپنے چچا کا ترکہ حاصل کرنے کے لیے دنیا کی نظروں میں خود کو ہلاک کر چکا ہے۔"

"کیا بک رہے ہو؟" پولیس افسر نے حیرت سے کہا۔

"کیا مذاق کرنے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔"

"نہیں جناب۔" پیٹرسن نے بڑے تحمل سے کہا۔ "آپ کو تفصیل سننے میں کچھ دیر لگے گی لہٰذا کرسی پر تشریف رکھیں۔" پیٹرسن خود بھی صوفے میں دھنس گیا۔

اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر حلق صاف کرتے بولا۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی رئیس چچا کے دو بھتیجے تھے، دونوں ہی...... دیو قامت......"

قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح..... ٹوٹے ہوئے
دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حسینہ کی پر فکر داستان

شکست کی فتح

طاہر جاوید مغل

زندگی کی بساط پر ایک ایسا اسرار چھپا ہے جسے کوئی چاہے یا نہ چاہے... کھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اناڑی بازی مات کرلیتے ہیں... یہ بھی ایک ایسی اسرار بھری گرہ ہے جسے شاید کھولنا آسان نہیں۔ جو جتنا بڑا بے ایمان ... اتنا ہی بڑا فنکار۔ وہ بھی اپنے پرائیوں کے درمیان دوڑتے دوڑتے ہار گئی... اگرچہ انسان کے تصورات اور بلند خیالات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر... معاشرے میں رہنے اور ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے کچھ حدود و قیود کا نفاذ از حد ضروری ہوتا ہے البتہ ... حدود اور قید میں کچھ فرق بھی ہونا ضروری ہے ورنہ انسان پنجرے میں قید طائر کے مانند بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی جسارت کر ڈالی اور بلند پرواز کی خواہش میں اپنے مسکن سے جدا ہوگئی... لیکن یہ عارضی جدائی نہ صرف اسے بلکہ اس کے خون کے رشتوں کو بھی زندگی کی باریکیاں سمجھا گئی کہ ہر ایک کی زندگی کا مقصد جدا اور انفرادی ہوتا ہے جسے ہر حال میں اسے پورا کرنا ہوتا ہے... چاہے کوئی مانے نہ مانے اسے حق دینا پڑتا ہے اور جب کوئی نہ دے تو چھین لینے کی جسارت بھی ضروری ہے کیونکہ حق کے لیے اڑ جانا بغاوت نہیں سعادت ہے۔
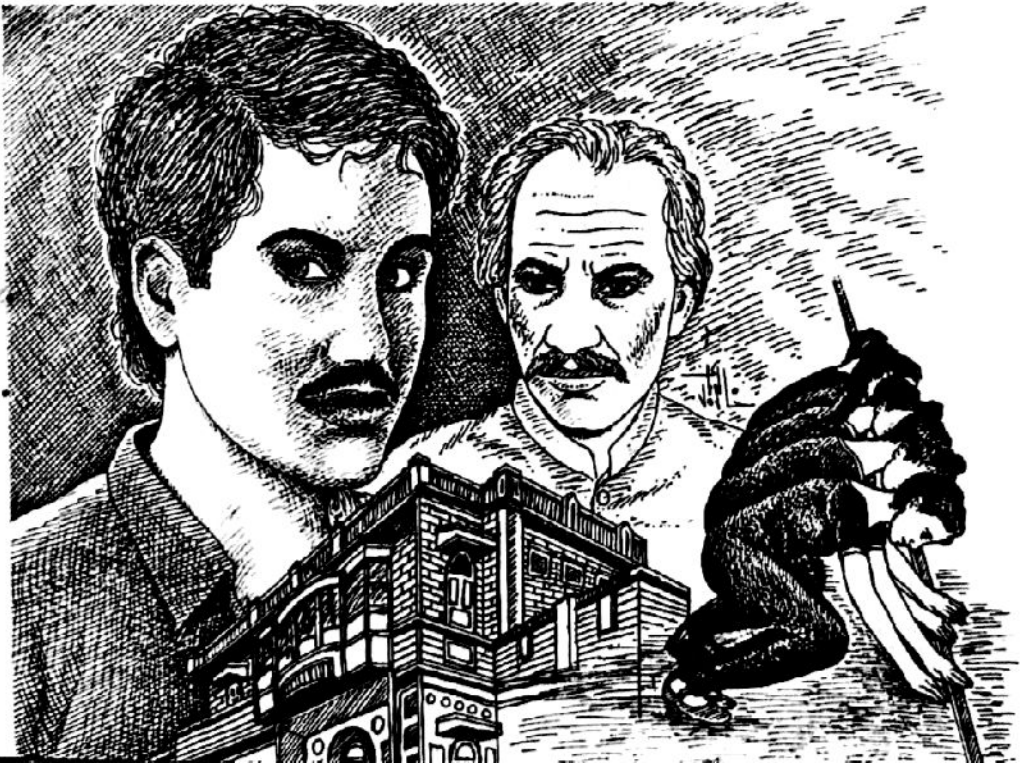
وہ دسمبر کے چوتھے ہفتے کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ بے حد تاریک، بے حد سرد اور بارش میں بھیگی ہوئی۔ کبھی کبھی بجلی زور سے چمکتی تھی اور کچھ ہی دیر بعد بادل دھاڑنے لگتے تھے لیکن بادلوں کی دھاڑوں کے علاوہ بھی کچھ دھاڑیں تھیں جو در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ نور، جس کا پورا نام مین النور تھا۔ ان دھاڑوں کو سنتی تھی تو سرتاپا لرز جاتی تھی۔ یہ انسانوں کی دھاڑیں تھیں، وحشی انسانوں کی دھاڑیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقص کررہے تھے اور انہوں نے اس قدیم حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار حویلی کے مضبوط چوبی پھاٹک پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ کی کوشش تھی کہ وہ دیواروں پر بانس کی لمبی سیڑھیاں لگا کر اندر گھس جائیں اور کچھ ایک دوسرے کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر بیرونی دیوار کے بالائی کنارے تک اپنے ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حویلی میں موجود لوگ اندر سے ان پر خشت باری کرتے تھے، یا پھر طویل لاٹھیوں کے ذریعے انہیں بیرونی دیوار پر سے دھکیل کر نیچے گرا دیتے تھے۔

حویلی میں موجود تمام عورتیں ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس کمرے سے باہر مسلح پہرے دار موجود تھے تاہم ان کے چہرے بھی حالات کی سنگینی کے سبب تاریک دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ ان میں چھ سات نوجوان لڑکیاں تھیں، باقی درمیانی عمر کی یا بڑی عمر کی خواتین تھیں۔ تیس سالہ نور بے دم سی ہوگئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ایک قیامت ان کے سر پر ہے اور کسی بھی وقت ان پر ٹوٹ سکتی ہے۔

باہر سے کسی شرابی شخص کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔

"اوئے مولوی مہرا! ہم منڈے کو سہرا باندھ کر لائے ہیں۔ تیری دھی کو ہمارے ساتھ جانا ہی جانا ہے۔ زندہ یا پھر مردہ۔ اب بھی وقت ہے سوچ لے..... تیرے حق میں چنگا یہی ہے کہ اس کو تیار کردے۔"

نور نے دیکھا، اس کے والد مولوی اشفاق مہرا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ، جیسے کمرے کی پرانی دیوار پر لرز رہا تھا۔ اسی اثنا میں ان کا بوڑھا ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ تھا جس میں سرخ رنگ کا کوئی کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ بوڑھے ملازم خدا بخش نے نور کے والد سے مخاطب ہوکر کہا۔ "مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔" خدا بخش کی آواز لرز رہی تھی۔

نور کے والد نے لفافہ لے کر سرخ جوڑے کو ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔ مخمل پر چمکیلا کام تھا اور یہ واضح طور پر دلہن کا لباس نظر آتا تھا۔ اشفاق مہرا نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا اور بے دم سے ہوکر قالین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی نور ہی کی طرح دیوار سے ٹیک لگالی۔ پاس ہی نور کی بڑی بہن بسمہ بھی بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا۔ اس نے باپ کے بازو کو یوں تھام رکھا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا کنارے کو تھامتا ہے۔

اسی دوران میں نور کی والدہ زلفت بیگم اندر داخل ہوئیں۔ وہ نور اور بسمہ کی سگی والدہ تو نہیں تھیں مگر آفت کی اس بھیانک گھڑی میں ان کا چہرہ بھی درد کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فرش پر گرا ہوا سرخ جوڑا اٹھالیا اور پھر بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آ بیٹھیں۔ انہوں نے بڑی نرمی سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بوڑھے ملازم خدا بخش کی طرف دیکھا۔ وہ مالکن کا اشارہ سمجھ کر باہر نکل گیا۔ زلفت بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "مہرا صاحب! یہاں کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔"

"تو کس طرح کروں میں اپنی مدد آپ؟" مولوی اشفاق مہرا نے زخمی آواز میں کہا۔ "اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے...... ان ڈاکوؤں کے حوالے کردوں؟ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے...... اپنے کلیجے ٹھنڈے کرلو۔"

"نہیں مہرا صاحب! لیکن ...... جو کچھ بھی ہورہا ہے...... اور جو کچھ ہونے والا ہے...... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی......"

"اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟" اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"مہرا صاحب! کچھ بھی ہے...... وہ لوگ ...... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اگر ان سے صلح کی بات ہوجاتی ہے تو پھر وہ پورے طریقے سے اور عزت کے ساتھ اپنی بسمہ کو لے کر جائیں گے...... ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں بلکہ ابھی ان سے ہر طرح کی لکھت پڑھت بھی ہوسکتی ہے لیکن......"

زلفت بیگم کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔

بادل ایک بار پھر زور سے گرجا اور اس کی آواز، باہر سے بلند ہونے والے للکاروں اور دھاڑوں میں گڈمڈ ہونے لگی۔

زلفت بیگم نے ہمت جمع کرکے اپنی بات مکمل کی۔ ''لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ...... یہ لوگ اندر گھس آئے اور......دو چار اموات ہو گئیں......تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

بسمہ نے سہمی ہرنی کی طرح نور کی طرف دیکھا اور اس کی گرفت اپنے باپ کے بازو پر کچھ اور سخت ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن زرد دکھائی دینے لگے تھے اور ایسی ہی زردی اس کے ریشمی رخساروں پر بھی کھنڈی تھی۔ وہ خوش شکل تھی۔ اس کے جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ کنگھی کیے ہوئے لمبے بال چوٹی کی صورت میں کمر کی طرف گئے ہوئے تھے مگر ابتلا کے ان لمحوں میں وہ بالکل بے ترتیب اور ہراساں تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح محفوظ پناہ گاہ میں گھس جانا چاہتی تھی جس پر نکیلے پنجوں والا عقاب جھپٹ رہا ہو۔

مولوی اشفاق مہرا کی خاموشی دیکھ کر زلفت بیگم کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے بوڑھے ملازم خدا بخش کو آواز دی۔ وہ مؤدب انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ زلفت بیگم نے کہا۔ ''خدا بخش اتم برآنڈے والی بیٹھک خالی کرواؤ...... اور بھائی جی سے کہو کہ ان لوگوں سے گل بات کرنے کے لیے، ان میں سے تین چار بندوں کو اندر بلالیں۔ پر کسی کے پاس کوئی ہتھیار شتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

اس موقع پر اشفاق مہرا نے کچھ کہنا چاہا مگر بس، ان کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے تین چار گھنٹے کی جان لیوا کشمکش نے انہیں اندر سے بالکل توڑ ڈالا ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔

یہی وقت تھا جب انگریزوں کے زمانے کی اس دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔ یوں لگا کہ نانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی کوئی بڑی دیوار مسمار ہو کر گری ہے۔ اس دھماکے نے کمرے میں موجود خواتین کو چلّانے پر مجبور کر دیا۔ بسمہ بھی دہشت زدہ ہو کر باپ سے چمٹ گئی۔ مولوی مہرا خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ ملازم خدا بخش ان کے ساتھ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواروں کے قریب شوروغل میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ لکڑی اور لوہے کے مضبوط پھاٹک کو توڑنے کی کوششیں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ چھت پر سے کی جانے والی خشت باری میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

سہمی ہوئی خواتین رو رہی تھیں اور ان میں سے کئی ایک کے ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلتے چلے جا رہے تھے۔ زلفت بیگم نے بسمہ کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کا منہ سر چومنے لگیں۔ وہ بے چاری سرتاپا کانپ رہی تھی۔ نور کی خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے اسے بانہوں میں لے کر لکڑی کی ایک چوکی پر بٹھایا۔ خالہ عریفہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''نہ میری دھی، اتھرو پونچھ لے...... بیٹیاں ہمیشہ اپنے ماں پیو کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔ دیکھنا رب سوہنا تیری مدد کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اج کے دیری کل تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے...... ساری مصیبتیں دفع دور ہو جائیں گی۔''

زلفت بیگم نے ایک ملازمہ لڑکی کو خفیف اشارہ کیا۔ وہ دھیمے قدموں سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پیلا دوپٹا تھا اور مٹی کا ایک بڑا سا روغنی پیالہ تھا۔ پیالے میں گھلی ہوئی مہندی تھی۔ خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے دوپٹا بسمہ کے جھکے ہوئے سر پر ڈال دیا۔ وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

نور نے اپنی بڑی بہن کی حالت دیکھی اور سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ شاذونادر ہی روتی تھی۔ رونا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا لیکن آج جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو گرم آنسوؤں کی دھاریں سی اس کے سرور خساروں پر بہہ نکلیں۔ وہ جیسے اندر سے چکنا چور ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا، اس سے تھوڑی دور فرش پر تانبے کی ایک گول طشتری پڑی تھی۔ اس طشتری میں مٹی کے قریباً ایک درجن دیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی روشن نہیں تھا۔ کچھ دیے اوندھے اور کچھ سیدھے تھے۔ نور کی دادی ان کے قریب افسردہ بیٹھی تھی۔ اس تنہا حویلی سے باہر درختوں اور جھاڑیوں پر اور اونچے نیچے ٹیلوں پر اور بارشی نالے کے کناروں پر بجلی چمک رہی تھی اور بادل دھاڑ رہے تھے...... مگر حویلی کی بیرونی دیوار کے قریب سے بلند ہونے والی دھاڑیں اب ماند پڑ گئی تھیں۔ خشت باری کی آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ...... حویلی کی چھوٹی بیٹھک میں بات چیت شروع ہو گئی ہے۔ نور سوچنے لگی۔

کیا یہ بات چیت کامیاب ہو سکے گی؟

کیا وہ قیامت ٹل جائے گی جو دسمبر کی اس طویل رات میں اس حویلی کی دیواروں کے باہر منڈلا رہی تھی؟

کیا مہرا خاندان کی عزتیں بچ جائیں گی؟
کیا اپنی عزت و آبرو کا دفاع کرتے ہوئے اس کے ابا، اس کے تایا، اس کے دونوں ماموؤں اور بہنوں بھائیوں کو اپنی جانیں نہیں گنوانا پڑیں گی؟
سوال تو بہت تھے لیکن جواب کوئی نہیں تھا۔
مین النور نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور خود کو اردگرد کے ماحول سے کاٹنے کی کوشش کرنے لگی...... اور وہ اکثر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ سب سے الگ تھلگ ...... کم گو...... اپنی ہی سوچوں میں گم رہنے والی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے ......نور کو نیند تو نہیں آئی مگر ایک تھکن سی اس پر طاری ہونے لگی۔ اس تھکن نے اس کی شدید ترین تشویش اور گھبراہٹ کو کسی حد تک کم کر دیا تھا...... ویسے بھی وہ نسبتاً مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسے حالات سے لڑنا آتا تھا...... یہ اور بات ہے کہ ایسی لڑائیوں میں وہ بہت مرتبہ ہاری بھی تھی۔
...... وہ سوچنے لگی...... وہ اس ہولناک رات تک کیسے پہنچی ہے؟ کس طرح کے واقعات نے کس طرح کا رخ اختیار کیا کہ آج وہ اور اس کے خاندان والے اس قیامت کے دہانے پر ہیں۔ اس کا ذہن بڑی تیزی لیکن بڑی تفصیل سے واقعات کی پرتیں کھولنے لگا۔ وہ عارضی طور پر ہی سہی لیکن اپنے اردگرد کے دہشت ناک ماحول سے تھوڑے فاصلے پر چلی گئی۔ بارش، گرج، للکاریں، دھاڑیں، ڈری ہوئی سرگوشیاں، چلتے پھرتے بے تاب قدموں کی آوازیں ...... سب کچھ سماعت میں دھندلا سا گیا۔ ماضیِ دور اور ماضیِ قریب کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگے۔

☆☆☆

مین النور نے گجرات سے آگے تحصیل پھالیہ کی طرف موراں والی نام کے گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ اب تو وہاں پکی سڑک پہنچ چکی تھی مگر نور کے بچپن میں وہاں صرف کچا راستہ تھا۔ پکی سڑک تک جانے کے لیے ان لوگوں کو تانگوں وغیرہ پر کوئی دس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ نور نے ایک بھرے پُرے آسودہ گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والد مولوی اشفاق اور تایا خلیل مہرا علاقے کے خوشحال زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ نور سے بڑی دو بہنیں بتول اور بسمہ تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ تینوں بہنوں کا بچپن اسی گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں اور سرسبز ٹیلوں پر کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ تایا خلیل بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی مہرین جو تقریباً نور ہی کی ہم عمر تھی۔ اس کے کزن شرجیل اور عثمان تھوڑے سے پڑھاکو تھے لیکن کھیل کود میں وہ بھی سب کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔
نور کے بچپن اور لڑکپن کی یادیں بڑی سہانی تھیں۔ ماموں اور تایا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر بھر کے بچوں میں سب سے چھوٹی وہی تھی۔ اسے خصوصی پروٹوکول ملتا تھا...... برسات کے موسم میں آموں کے باغوں میں جھولے، سردیوں کی سنہری دھوپوں میں وسیع لان کے اندر کھیل کود اور گیندے کے پودوں میں تتلیوں کا تعاقب...... گرمیوں میں چاندنی راتیں اور کشادہ چھت پر بچھی ہوئی بہت سی چارپائیاں...... کہانیاں، چٹکلے اور شریر سرگوشیاں...... اور بہار...... بہار کا موسم تو جیسے نور کے دل میں کھب جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں ایک وسیع پھلواری تھی جو ان کی اپنی ہی ملکیت تھی۔ اس پھلواری میں ایک جانب پھل دار درختوں کا باغ تھا۔ نور کی والدہ، دادی جان، پھوپیاں دو ممانیاں اور ان کے بچے اکٹھے ہوتے تو اس باغ میں بہار پر بہار آ جاتی۔ ایک بہت بڑی دری بچھائی جاتی۔ اس پر ایک درخت کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر دادی جان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی۔ ایک جانب ڈھولک رکھ کر گانے گائے جاتے، وہیں پر کھلے میں پکوان بنائے جاتے اور کھیل کود ہوتا۔ ایسی محفلوں میں خاندان کا کوئی مرد شریک نہیں ہوتا تھا اور اونچی دیواروں والے باغ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔
گاؤں کی خوشگوار زندگی میں خوشی کی ایک تازہ لہر اس وقت آتی تھی جب سردیوں کے گلابی موسم میں بڑے پیر جی کا میلا آتا تھا۔ اسے عرفِ عام میں امنالے کا عرس کہا جاتا تھا۔ قرب و جوار میں اس میلے کی دھوم تھی۔ لوگ دو ماہ پہلے سے ہی اس موقع کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ چوڑیاں، پراندے اور جوتے وغیرہ خریدے جاتے تھے۔ چڑھاوے کی چادریں تیار ہوتی تھیں۔ بچوں کی تیاری کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ میلا پورا ہفتہ جاری رہتا تھا...... اور ہر بار اہلِ علاقہ کو بہت سی سنہری یادیں دے کر رخصت ہوتا تھا۔
بچپن میں نور بھی اس میلے کو بڑی روانی سے امنالے کا میلا کہا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ لفظ ''امنالا'' نہیں بلکہ امناں والا ہے۔ یعنی امن اور محبت والا۔ بڑے پیر صاحب کا مکمل نام پیر برکات امناں والا تھا۔ وہ زندگی بھر پیار اور محبت کا درس دیتے رہے تھے۔ کہا

جاتا تھا کہ وہ جانی دشمنوں کو جانثار دوستوں میں بدل دیتے تھے۔ان کی بابرکت ذات کی وجہ سے بہت سے خاندانوں اور برادریوں کے چھوٹے بڑے جھگڑے جڑ سے ختم ہو گئے تھے۔ انہی کی نسبت سے میلے کا نام اماناں والے کا میلا پڑ گیا تھا۔

نور نے ساتویں کا امتحان ''موراں والی'' کے ہائی اسکول سے ہی پاس کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر قریباً تیرہ سال تھی...... منجھلی بہن بسمہ کوئی پندرہ سال کی اور بڑی بہن بتول انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دو ڈھائی سال پہلے میٹرک کر چکی تھی۔ اسکول کے بعد اب وہ کالج جانا چاہتی تھی اور کالج جانے کے لیے اس کا گجرات جانا ضروری تھا۔ وہاں وہ اپنے کچھ ننھیالی عزیزوں کے پاس رہ سکتی تھی۔ نور کے والد مولوی اشفاق بالکل اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کافی ہو گئی ہے، بتول اب سلائی کڑھائی سیکھ لے...... اور اگر زیادہ بات ہے تو پھر آرٹس کے مضامین لے کر پرائیویٹ ایف اے کر لے۔ بتول بڑوں کی ہر بات پر سر جھکانے والی لڑکی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے والدین چاہتے تھے۔ بڑی بہن بتول سے نور کو بڑا لگاؤ تھا۔ جب آپی بتول کے بارے میں نور کو پتا چلا کہ وہ کالج نہیں جائے گی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی کہ اب اسے آپی کی مزیدار کمپنی میسر رہے گی۔

ہاں، وہ بڑے اچھے دن تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر پھر ایکا ایکی نور کو محسوس ہونے لگا کہ گھر میں سب اچھا نہیں ہے۔ بڑے کچھ پریشان تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے صلاح مشورے کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی تھیں پھر ایک دن نور کو بسمہ سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اپنے بڑے بیٹے ابدال احمد کے لیے آپی بتول کا رشتہ مانگ رہا ہے...... اور یہ رشتہ آپی سمیت گھر میں کسی کو بھی قبول نہیں۔

یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کھاپری برادری کے چودھری طغرل کے دونوں بیٹے انتہا کے بگڑے تگڑے تھے۔ لڑائی جھگڑا، زمینوں پر قبضے، نشے بازی...... کون سی ایسی لت تھی جو ان میں موجود نہیں تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں چودھری طغرل بھی کچھ کم نہیں رہا تھا۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ وہ کچھ دھیما پڑ گیا تھا مگر فطرت تو وہی تھی۔

بڑی بہن بسمہ نے سراسیمہ لہجے میں نور کو بتایا تھا۔

''یہ کھاپری برادری والے بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے بہت آگے تک جاتے ہیں۔ پہلے تو پیار محبت اور پالیسی سے کام لیتے رہے ہیں، پر اب دھمکیوں پر اتر آئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟'' نور نے بھولپن سے پوچھا تھا۔

''کہتے ہیں کہ ہمارے اباجی زبان دے کر مکر رہے ہیں، حالانکہ اباجی نے کوئی زبان دی ہی نہیں تھی۔ وہ سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور طاقت کے زور پر اس کو سچ بنانا چاہتے ہیں۔''

نور نے کہا۔'' تو اباجی...... پولیس والوں کو کیوں نہیں بتاتے۔ وہ جو مونچھوں والے لمبے سے انکل آیا کرتے ہیں، وہ اباجی کے دوست ہیں۔ اباجی نے کہا تھا کہ وہ تھانیدار ہیں۔''

''وہ چھوٹے تھانیدار ہیں نور۔ یہ جو چودھری طغرل ہے اس کے تعلقات تو بڑے بڑے تھانیداروں سے ہیں۔ ویسے بھی اس طرح کی باتیں پولیس وغیرہ تک نہیں پہنچائی جاتیں۔ بڑے بوڑھے خود ہی بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔''

''تو پھر کیوں نہیں کرتے فیصلہ؟ ہم اپنی پیاری آپی کی شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔ کسی اور کی مرضی سے نہیں۔''

وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسے پریشان کن باتوں سے دور رکھا جاتا تھا پھر بھی اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ابا اور تایا کے چہرے ستے رہتے تھے۔ دونوں ماموں جواں سال تھے۔ وہ کسی وقت بہت طیش میں نظر آتے تھے۔ ایک دن اس نے چھوٹے ماموں کو چھت پر بیٹھ کر بڑے غصے میں مسواک چباتے اور اپنی رائفل بھی صاف کرتے دیکھا تھا۔ گھر میں پنچایت وغیرہ کا ذکر بھی چل رہا تھا۔

پھر ایک دن سب کچھ ٹھیک ہوتا محسوس ہوا۔ نور کو پتا چلا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے اباجی کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور ان پر سے بلا ٹل گئی ہے۔

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آپی بتول کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اپنے خاندان میں ہی ایک دور کے رشتے داروں میں آپی کی بات ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ملتان میں رہتے تھے۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی لیکن نور ان دنوں کچھ اداس بھی رہا کرتی تھی۔ اس کی آپی بیاہ کر اس سے دور جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا اور اس کی آپی شادی کے بعد اپنے پیا کے شہر چلی گئی۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا...... اور یہ کچھ عرصے تک ٹھیک بھی رہا مگر پھر آہستہ آہستہ گھر کے ماحول میں دوبارہ بے چینی پائی جانے لگی۔ معاملہ وہی کھاپری برادری والوں کا تھا۔ انہوں نے بات اپنے دل سے نکالی

نہیں تھی۔ ایک روز ماں نے اسے بتایا۔ ''تمہارے ابا باغ والی اپنی زمین بیچ رہے ہیں۔''

'' پر کیوں امی؟ وہاں تو ہم جھولے ڈالتے ہیں، اتنا مزہ کرتے ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔

'' وہ زمین کھاپرا والوں کی زمین کے ساتھ لگتی ہے اور وہاں آئے روز جھگڑا ہوتا ہے۔''

'' جھگڑا ہو تو زمین بیچ دی جاتی ہے؟ اور جھگڑا ہوتا کیوں ہے امی؟''

'' جنہوں نے جھگڑنا ہوتا ہے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور تمہارے ابا اور تایا خوامخواہ کی دشمنی سے بچنا چاہتے ہیں۔''

'' تو دشمنی سے بچنے کے لیے ہم اپنی زمین کیوں بیچیں۔ وہ لوگ بیچ دیں نا۔''

'' جس کا زیادہ زور چلتا ہے اس کی بات بھی چلتی ہے۔'' ماں نے آہ بھر کر کہا تھا۔

وہ زمین بک گئی جہاں نور کے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ نہ صرف زمین بک گئی بلکہ چند ماہ کے اندر اندر حالات اتنے خراب ہوئے کہ ابا اور تایا نے اپنی باقی زمین بھی فروخت کر دی...... اور آبائی گاؤں موراں والی کو اور گجرات کو چھوڑ کر خاموشی سے لاہور آ گئے۔ نور ان دنوں آٹھویں کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔

لاہور کی ایک نئی رہائشی کالونی میں ان لوگوں نے دس دس مرلے کے دو بنے بنائے گھر خریدے تھے۔ دونوں گھروں میں مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ایک گھر تایا کے لیے اور دوسرا ان کے لیے تھا۔ نور کو یہاں ایک اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ تایا کے بچوں کو بھی مناسب جگہوں پر داخلے مل گئے۔ بسمہ اب میٹرک پاس کر چکی تھی اور یہاں مسئلہ پھر وہی کالج میں داخلے کا تھا۔ نور کے اباجی تذبذب میں تھے۔ بہرحال تایا جان کی کوشش سے یہ مسئلہ حل ہوا اور اباجی ایک قریبی کالج میں بسمہ کا داخلہ کرانے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں تو نور کے والد کی طرح اس کے تایا بھی مذہبی ذہن رکھتے تھے اور انہی کی طرح باریش بھی تھے مگر مولوی جی کا سابقہ صرف نور کے اباجی کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں بہت سلوک اور یگانگت کے باوجود تھوڑا سا فرق بھی موجود تھا۔ تایا جان کے گھر میں ٹی وی، ٹیلی فون وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے پینٹ شرٹ اور دیگر جدید لباس پہنتے تھے اور گھر میں کچھ آزادی دکھائی دیتی تھی مگر نور کے گھر میں چونکہ صرف بیٹیوں نے ہی پرورش پائی تھی، اس لیے یہاں ماحول قدرے سخت تھا۔ پردے اور نماز روزے کی پابندی تایا جان کے گھر سے تھوڑی زیادہ تھی۔ موبائل فون تو ان دنوں موجود ہی نہیں تھا...... مگر عام فون بھی ان کے گھر میں کبھی نہیں لگوایا گیا۔ یوں تو تائی جان بھی پردہ کرتی تھیں لیکن نور کی امی باقاعدہ برقع پہنتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے گھر میں اکثر ایک طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ اباجی مخلوط تقریبات میں شرکت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شادی کے موقع پر اضافی رسموں سے بھی انہیں اختلاف تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے شہر میں آ جانے کے بعد نور کے لیے چند ماہ تک تو روز و شب بڑے اجنبی سے رہے۔ یہاں کی تیز رفتار زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں سب کو دشواری پیش آئی لیکن پھر جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اسکول میں نور کی ایک دو سہیلیاں بھی بن گئیں۔ وہ پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ انہی دنوں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ نور نے سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لیا اور پہلے نمبر پر آئی۔ اسے ایک چھوٹا سا کپ بھی ملا۔ وہ اسکول سے گھر واپس آئی تو امی جان، تائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بسمہ کالج سے واپس آ چکی تھی۔ اس نے نور کا پھولا ہوا بستہ دیکھا تو پوچھا۔ ''اوئے، یہ کیا گھسایا ہوا ہے اس میں؟''

'' تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟'' نور نے الٹا اس سے سوال کیا۔

بسمہ نے بستے کے اندر ہی کپ کو ٹٹول کر دیکھا اور بولی۔ ''کوئی سخت سی چیز لگ رہی ہے۔''

'' سخت سی چیز ہے اور سخت محنت کر کے جیتی ہے بھئی۔'' نور نے کہا اور بستے سے کپ نکال کر بسمہ کو دکھایا۔

بسمہ خوش ہوئی۔ ''کس چکر میں ملا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

'' تمہاری بہن دوڑ میں پہلے نمبر پر آئی ہے...... سو میٹر کی دوڑ۔''

بسمہ تھوڑا سا چونکی پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''اوئے تیرا بیڑا اترے۔ تُو نے دوڑ میں حصہ لیا ہے؟''

'' بتا تو رہی ہوں۔''

بسمہ نے کہا۔ ''اباجی کو پتا چل گیا نا... تو ٹھیک ٹھاک جھاڑیں پڑیں گی۔ ان کو یہ کبھی اچھا نہیں لگے گا۔''

'' مگر بسمہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے کوئی تیراکی ... میں تو حصہ نہیں لیا۔ دوڑ میں ہی لیا ہے نا...... اور وہ بھی حجاب پہن کر۔''

"مگر تو دوڑی تو ہے نا پھرتیلی بیگم۔ دڑنگے تو مارے ہیں نا تو نے؟"

"میری کسی بات پر یہاں تو کوئی خوش ہی نہیں ہوتا۔" نور نے منہ بنایا۔ "آپی یا تمہاری ہر بات کی تعریف ہوتی ہے۔ مجھے تو جیسے ایک کونے میں ڈالا ہوا ہے۔ اباجی تو رحم کی نظر ہی نہیں ڈالتے۔ لگتا ہے ان کی سگی بیٹی ہی نہیں ہوں۔"

"خبیث کہیں کی۔" بسمہ نے اس کا کان مروڑا۔ "بہت محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے۔ بس یہ جو تیری دکھری رگ ہے نا اس کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کبھی کبھی۔"

"کیا دکھری رگ ہے میری؟"

"یہ جو ہر وقت رسالے پڑھتی ہے..... کسی کونے میں گھسی رہتی ہے.....اور نمازیں بھی قضا کر دیتی ہے۔"

"کب نمازیں قضا کرتی ہوں میں؟" نور نے لڑاکی مرغی کی طرح پر پھیلائے۔ "کب کونے میں گھسی رہتی ہوں ...... اور رسالے کو تو ہاتھ لگائے، آج مجھے پورا ایک مہینا ہو گیا ہے۔"

"توبہ توبہ...... پورا ایک مہینا۔ ابھی پرسوں اتوار کو چھت پر بیٹھی کیا پڑھ رہی تھیں؟"

"وہ رسالہ نہیں تھا، اسکول کا میگزین تھا۔ اسپورٹس کے صفحے دیکھ رہی تھی۔" نور تنک کر بولی۔

شاید یہ بحث مزید آگے چلتی مگر اسی دوران میں بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بسمہ نے نور کا چھوٹا سا کپ جلدی سے اس کے اسکول بیگ میں گھسا دیا اور بیگ کو بیڈ کے نیچے کر دیا۔ اندر آنے والے اباجی ہی تھے۔ وہ آج کل لاہور کے مضافات میں کچھ زمین خرید کر وہاں چھوٹے چھوٹے رہائشی پورشن وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے...... اور اس سلسلے میں بڑے ماموں مراد کے ساتھ مل کر کافی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو بازار میں ایک دکان بھی خریدی تھی جہاں وہ اسلامی کتب کی ہول سیل کا ارادہ رکھتے تھے۔

اپنی کامیابی اور کپ کے حصول کی خوشی نور کو کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اگلے روز اس نے والدہ کو بھی اپنا جیتا ہوا کپ دکھایا۔ والدہ خوش ہوئیں لیکن انہوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو اس سے پہلے بسمہ کہہ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "نور! بس اپنی پڑھائی کی طرف توجہ رکھو۔ اب تم نے میٹرک کا امتحان دینا ہے اور یہ کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں پاس کر لوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولی اور الھڑ انداز میں چارپائی پھلانگتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

اس سے اگلے روز جب وہ اسکول پہنچی تو اسکول میں اسپورٹس کی ٹیچر مسز نبیلہ وجدان نے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فزیکل ٹریننگ میں باقاعدگی سے حصہ لے اور خاص طور سے رننگ میں۔ اس کی رننگ اچھی ہے اور وہ محنت کرے تو مقابلے جیت سکتی ہے۔

نور نے کہا۔ "ٹیچر! شاید میرے گھر والے بھی مجھے اس کی اجازت نہ دیں۔"

"ہائیں۔" مسز وجدان نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ تم ایک صحت مند سرگرمی میں حصہ لے رہی ہو اور وہ بھی چار دیواری کے اندر۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "ٹیچر! دراصل ...... میرے ابا جان...... اس معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ شاید وہ منع کر دیں۔"

"کبھی بھی نہیں کریں گے۔ تم کسی دن مجھے ان سے ملواؤ۔ میں خود بات کروں گی۔" مسز وجدان نے پورے یقین سے کہا۔

نور نے یہ بات بڑی بہن بسمہ کو بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں اسے اباجی سے اجازت لے کر دے۔ نور کی نسبت بسمہ اور بتول کی بات اشفاق صاحب ذرا نرمی سے سن لیتے مگر یہ موضوع ایسا تھا کہ بسمہ کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دو تین دن کوشش کرتی رہی کہ اس حوالے سے تھوڑا بہت ابا جان کو بتا دے...... تاکہ اگر انہیں بعد میں پتا چلے تو وہ بہت زیادہ ناراض نہ ہو جائیں مگر نور اور بسمہ میں سے کوئی بھی یہ بات اباجی کے سامنے زبان پر نہ لا سکیں۔ رہیں والدہ تو ان کی والد صاحب کے سامنے سٹی ہی گم ہو جاتی تھی۔ اشفاق صاحب آج کل ویسے بھی ذرا ناخوشگوار موڈ میں تھے۔ تعمیری کام کے سلسلے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ آتے اور ان کی پیشانی کا بل دیکھ کر ہی نور سمجھ جاتی کہ بسمہ آج بھی کوئی بات نہیں کر سکے گی۔

تین چار روز بعد دونوں بہنوں نے یہ کوشش ویسے ہی ترک کر دی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ ایک دن اسپورٹس ٹیچر مسز وجدان نے پھر نور کو اسٹاف روم میں بلایا۔ انہوں نے کہا۔ "نور! تم نے اپنے والد صاحب سے بات نہیں کرائی؟"

وہ جواب پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ "ٹیچر! آج کل وہ کنسٹرکشن کرا رہے ہیں۔ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ اب بھی

لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"
"ٹھیک ہے، جب بھی موقع ملے مجھے ان سے ضرور ملواؤ......اور دیکھو اگلے مہینے ایک اچھا ایونٹ ہے۔ ہمارے اسکول کی لاہور کی تمام برانچز کے مشترکہ کھیل ہو رہے ہیں۔ تم ان میں حصہ لو۔ تھوڑی محنت کرو تو پہلی، دوسری پوزیشن حاصل کر سکتی ہو۔"
"مجھے کرنا کیا ہوگا ٹیچر؟"
"کچھ بھی نہیں۔ فزیکل ٹریننگ کا پریڈ تو ہوتا ہی ہے، اس میں باقاعدگی سے حصہ لو۔ پھر ہفتے میں دو روز ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رننگ کی ٹریننگ ہوتی ہے، جو گر تو ہوں گے تمہارے پاس؟"
"نہیں ٹیچر! لیکن میں لے لوں گی۔" وہ بولی۔
"شاباش۔ تم ضرور آگے بڑھوگی۔ ایک اچھی "اسپرنٹر" بنوگی۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔
نور خاموشی سے ٹریننگ میں حصہ لیتی رہی۔ مسز وجدان اس پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ پریکٹیکل کے ساتھ ساتھ وہ اسے تھیوری بھی سمجھا رہی تھیں۔ "دیکھو نور! چھوٹے فاصلوں کی دوڑوں میں اسٹارٹنگ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایتھلیٹ اسٹارٹ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر کرتا ہے تو یہ دسواں حصہ آگے جا کر ایک یا دو سیکنڈ میں بدل جاتا ہے......"
ایک دن انہوں نے کہا۔ "نور! دوسری لڑکیوں کی نسبت تمہارے reflexes بہت اچھے ہیں...... کبھی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم نیچرل ونر ہو۔ کیا تمہاری فیملی میں پہلے بھی کوئی ایتھلیٹ رہا ہے؟"
"نہیں ٹیچر۔" نور نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اگر آپ بھاگ دوڑ کو ایتھلیٹکس کہیں تو پھر بھاگ دوڑ تو ہم نے خوب کی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم پہلے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر کے ساتھ بہت بڑا باغ تھا۔ ہم بہن بھائی سارا سارا دن اس میں دوڑیں لگاتے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کزنز نے میرا نام "اڑن چھو" ڈال رکھا تھا۔"
"تم واقعی اڑن چھو بن سکتی ہو نور۔ بس تھوڑی سی محنت اور مستقل مزاجی چاہیے۔"
اسکول کی "برانچز" کے مقابلے ہوئے۔ ان میں سو میٹر کی ریس بھی تھی۔ نور نے یہ فائنل مقابلہ بآسانی جیت لیا۔ وہ دوسرے نمبر پر آنے والی کھلاڑی سے کم از کم دو سیکنڈ آگے رہی تھی۔ ٹیچرز کے علاوہ ڈائریکٹر صاحب نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ اسے ٹرافی ملی اور تعریفی سرٹیفکیٹ بھی۔
اس مرتبہ اس کی یہ کامیابی چھپی نہیں رہ سکی۔ تایا کے گھر میں بھی سب کو پتا چل گیا تھا لہٰذا بسمہ نے ضروری سمجھا کہ ابا جان کو بھی یہ بات خود بتا دی جائے۔ اس روز ان کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا نماز مغرب کے بعد بسمہ نے اوڑھنی سختی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹی اور ابا جان کے پاس چلی گئی۔ اس نے ٹرافی ابا جان کو دکھائی۔ "یہ کس کی ہے؟" وہ حیران ہو کر بولے۔
"نور کی......اسکول سے ملی ہے۔"
"مگر اس کے نمبر تو اتنے اچھے نہیں تھے؟"
"ابا جی! اس نے دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ یہ دیکھیں یہ سرٹیفکیٹ بھی ہے۔" مولوی اشفاق مہر کی پیشانی پر بے ساختہ ایک بل نمودار ہو گیا۔ سرٹیفکیٹ اور ٹرافی دیکھنے کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں آہستہ سے ایک طرف رکھ دیں اور بولے "وہ خود کہاں ہے؟"
"ڈ......ڈر رہی تھی کہ آپ کو برا نہ لگے۔"
"ڈر تو اللہ کا ہونا چاہیے۔ ہم نے یہاں کون سا بیٹھے رہنا ہے تم لوگوں پر پابندیاں لگانے کے لیے۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر آواز دی۔ "عین النور! کہاں ہو عین النور!" وہ اسے ہمیشہ پورے نام سے پکارتے تھے۔
نور ڈری ڈری سی باپ کے بستر پر پائنتی کی طرف آ بیٹھی۔ وہ نسبتاً دھیمے لہجے میں بولے۔ "دیکھو بیٹی، ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کی رائے اور مشورے میں بھلائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کھیل کود، اچھل پھاند لڑکوں کے کام ہیں۔ لڑکیاں پڑھائی اور گھر گرہستی کے کاموں میں ہی اچھی لگتی ہیں......"
"بس ابا جی! ٹیچر نے ہی زور دیا تھا کہ تھوڑا بہت......" آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔
"کیا تھوڑا بہت؟" وہ عینک درست کر کے بولے۔
"یہی کہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ بھی تھوڑا بہت......ہونا چاہیے۔"
"تو بھئی، نصابی سرگرمیوں کے علاوہ تم اور بھی تو کچھ کر سکتی ہو۔ تمہاری آواز اچھی ہے۔ قرأت اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لے سکتی ہو۔ پھر تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ سلائی کڑھائی کے کمپٹیشن ہوتے ہیں......"
"ٹھیک ہے...... ابا جان...... میں کوشش کروں گی۔" اس نے کہا۔

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ”دیکھو میں النورا ہم ایک دیندار گھرانے سے ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں، کچھ اصول ضابطے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے دوسرے بچوں کی بہ نسبت تم ان اصول و ضابطوں سے کچھ دور ہو۔ یہ چیز مجھے کبھی کبھی رنج بھی دیتی ہے...... اپنے ان معاملات پر غور کرو اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں، والدین کبھی بھی اپنے بچوں کا برا نہیں سوچتے۔“

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی اوڑھنی سر سے سرکنے نہ پائے۔ کل اس نے اپنے بالوں کی کچھ کمزور لٹیں کاٹی تھیں۔ یہ کٹنگ اس موقع پر اباجی کے سامنے آجاتی تو ان کی خفگی ایک دم غصے میں بدل سکتی تھی۔

نور پڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی۔ تاہم وہ ان طالب علموں میں سے تھی جو تھوڑی کوشش کے ساتھ امتحان بہ آسانی پاس کر لیتے ہیں۔ پڑھائی جاری رہی اور اس کے ساتھ تھوڑا تھوڑا شوق بھی ہوتا رہا۔ اسے اب خود بھی رننگ میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسپورٹس ٹیچر کی ہدایت کے مطابق اسے اسکول میں آدھی چھٹی کے بعد ایک پریڈ کی اضافی چھٹی مل جاتی تھی۔ وہ اور اس کی کلاس فیلو شاہینہ اس دوران میں رننگ کرتی تھیں۔ اسکول کا گراؤنڈ خاصا وسیع تھا۔ ایک چکر تقریباً نصف کلومیٹر کا بن جاتا تھا۔ وہ دونوں روزانہ قریباً چار چکر لگاتیں۔ اس کے بعد گھنے درختوں کے نیچے ایک پاتھ پر ”اسپرنٹس“ یعنی سو میٹر کی تیز رفتار دوڑیں لگائی جاتیں۔ اکثر اوقات مسز وجدان بھی موقع پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کو سو میٹر کے اسرار و رموز سمجھاتیں۔ اسٹاپ واچ ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی...... اور نگاہیں فنش لائن پر۔ وہ اس بات پر خوش تھیں کہ دونوں لڑکیوں کا ٹائم روز بروز بہتر ہو رہا تھا۔ خاص طور سے نور کا۔

کمائی والے واقعے کے بعد ابا جان اور نور میں دوڑ وغیرہ کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح تعمیراتی کام میں الجھے ہوئے تھے۔ ابا جان کو نور سے جو دو چار شکایتیں تھیں، وہ اس نے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ صبح جلدی اٹھتی تھی۔ نماز میں بے قاعدگی ختم کر دی تھی۔ کزنز کی موجودگی میں دوپٹا اپنے سر سے سرکنے نہیں دیتی تھی، اس کے علاوہ پڑھائی پر بھی توجہ دے رہی تھی۔

ایک دن نور اسکول سے گھر آئی تو بسمہ کو روتے ہوئے پایا۔ وہ بھی ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی اور اپنے سفید براق یونیفارم میں پیاری لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا بسمہ؟“ نور نے بڑی بہن کو بے تکلفی سے بانہوں میں لیتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ پہلے تو ٹالتی رہی پھر اس نے بتایا کہ آج گاؤں سے دو بندے آئے تھے۔ وہ اباجی اور تایا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک دو باتیں بسمہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھیں۔

”کیا کہا انہوں نے؟“ نور نے پوچھا۔

بسمہ ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالتے ہوئے بولی۔ ”نورا ہم حیران ہوتے تھے نا کہ آپی بتول والا معاملہ تو ختم ہو گیا...... پھر تایا اور ابا جان گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر میں کیوں آ گئے۔“

”ہاں، یہ حیرانی تو تھی۔“

”اس کی وجہ امی اور دادی کو بھی معلوم تھی۔ پر انہوں نے کبھی ہم سے ذکر نہیں کیا۔“

”کیا وجہ تھی؟“

”وہ لوگ ابھی تک اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹے نور...... خاص طور سے چودھری کا بیٹا ابدال۔ وہ ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم ہے، چودھری اب کہتے ہیں کہ اگر بڑی کا رشتہ نہیں ہوسکا تو چھوٹی کا ...... یعنی میرا رشتہ انہیں دیا جائے۔ اب پنچایت والے بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ ایک ہی بات کہتے ہیں کہ ہمارے گھر والے زبان دے کر انکاری ہوئے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک لڑکی کا رشتہ تو دینا ہوگا۔“

”اوہ گاڈ۔“ نور نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ”یہ ضد اور ہٹ دھرمی بھی کیا بلا ہوتی ہے ان چودھریوں وڈیروں میں...... خدا کے بندو! شادی تو زندگی بھر کا ساتھ ہے اور اس میں لڑکے لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی کو گائے بکری کی طرح کان سے پکڑا اور کسی کھونٹے سے باندھ دیا۔“ نور کے لہجے میں تپش تھی۔

”یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔“ بسمہ بولی۔

”اب کیا ہوگا؟“

”ابا جان اور تایا جان کل گجرات جا رہے ہیں۔ کسی ایم پی اے سے بات کرنی ہے انہوں نے تاکہ یہ جھگڑا زیادہ نہ بڑھے۔“

امی بڑے کمزور دل کی تھیں۔ وہ تو جیسے بستر سے لگ گئیں۔ ان کی بیماری کی ایک نہیں دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہی بسمہ والا معاملہ۔ وہ کئی بار بے حد دکھی لہجے میں کہہ چکی تھیں، یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں...... ان

کی پریشانی کی دوسری وجہ بڑی بیٹی بتول کے گھریلو حالات بھی تھے۔ وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ ملتان میں وہ اپنے سسرال میں زیادہ خوش نہیں تھی۔ شوہر غیاث سخت مزاج کا تھا اور کسی وقت مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ دو تین دفعہ وہ ناراض ہو کر میکے آگئی تھی مگر پھر صلح ہو جاتی تھی اور شوہر اسے لے جاتا تھا۔

ابا اور تایا جان بار بار گجرات جا رہے تھے۔ کسی وقت ان کے ساتھ بڑے ماموں بھی ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میں نور کے ابا جان کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف بھی ہوئی اور وہ گھر آنے کے بجائے اسپتال پہنچے۔ اس دن نور کی امی بڑی آزردہ تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”ہمارے بڑے کہا کرتے تھے کمہاریوں سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہ رکھنا۔ یہ کھوٹے اور خطرناک لوگ ہیں۔ پر تیری دادی......“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

نور نے ماں کو ذرا کریدا تو انہوں نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ”یہ سب تیری دادی کا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ ان کی کمہاریوں کی وڈی ماں سے اتنی دوستی ہوتی اور نہ یہ مصیبت ہمارے گلے پڑتی۔“

نور اب قدرے سیانی ہو چکی تھی۔ اب اسے بات کو کریدنا اور اس کی تہ تک پہنچنا آگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”امی! اگر چودھری طغرل کی ماں کے ساتھ ہماری دادی کا اٹھنا بیٹھنا تھا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ ہم نے کمہاریوں کو آپی بتول کے رشتے کے لیے زبان دے دی تھی؟“

”یہ بات کافی پیچھے تک گئی ہوئی ہے نور۔“ والدہ نے کہا۔ ”یہ دونوں عورتیں سہیلیوں کی طرح تھیں۔ اس وقت تیری آپی بتول کی عمر چار پانچ سال کی ہو گی۔ کمہاریوں کی ماں نے بتول کو کھیلتے دیکھا اور کہا کہ اسے تو میں اپنے پوترے ابدال کی ووہٹی بناؤں گی۔ بس اتنی سی بات تھی جو بنتے بنتے جھگڑا بن گئی۔ کمہاریوں کے ساتھ تمہارے ابا اور تایا کا کوئی زمین کا جھگڑا بھی تھا لیکن یہ جھگڑا دونوں عورتوں کی دوستی اور میل جول کے نیچے دبا رہا۔ کمہاریوں کو اس بات کا لالچ تھا کہ جب بتول کا رشتہ مل جائے گا تو وہ زمین بھی خود بخود ان کے پاس چلی جائے گی جس کا جھگڑا تھا۔ بتول ویسے بھی شکل صورت کی اچھی تھی۔“

نور نے کہا۔ ”ابا جی اور تایا جی کو ان ساری باتوں کا پتا نہیں تھا؟“

”پتا تھا لیکن اس وقت یہ تو پتا نہیں تھا کہ طغرل کے پتر بڑے ہو کر اسے طرح کے نکلیں گے۔ بہرحال تمہارے ابا نے کبھی بھی منہ سے اس رشتے کے لیے اقرار نہیں کیا تھا۔ ہاں کمہاریوں کی وڈی ماں زورا زوری کرتی رہی۔ کبھی بتول کے کپڑے لے آتی، کبھی عید شب برات شروع کر دی۔“

اب بات کافی حد تک نور کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد باغ والی زمین کا جو جھگڑا شروع ہوا، اس کی وجہ آپی بتول کی شادی ہی تھی اور اب بات وہیں تک نہیں رکی تھی۔ وہ لوگ ان کے ابا جی کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ ان کو دیں، اسے یہ بھی پتا چلا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد ایک اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابدال کا بڑا چاچا ایم پی اے بن گیا تھا۔ انہیں سیاسی اثر رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب آپی کے بعد وہ بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع ہو گئے تھے۔

تین چار ہفتے کافی تناؤ میں گزرے پھر یہ معاملہ کچھ سدھر گیا۔ ابا جی بھی اب بہتر تھے لیکن اس سارے قضیے نے ایک نقصان کر دیا تھا اور یہ کافی بڑا نقصان تھا۔ نور نے اپنی والدہ کو کھو دیا تھا۔ تناؤ بھرے دنوں میں ایک دن ایسا آیا جب ان کا ایک پہلو بے جان ہو گیا۔ ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئیں۔

ان کی وفات نے نور اور بسمہ کو جیسے بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ والد نے تو ہمیشہ ان سے تھوڑا فاصلہ رکھا تھا، یہ والدہ ہی تھیں جو ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک رہتی تھیں اور تینوں بیٹیوں کے ہر طرح کے مسائل کا حتی المقدور سامنا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ نور ہر وقت غم اور اداسی کے ایک نادیدہ حصار میں رہنے لگی۔ میٹرک کا فائنل امتحان سر پر تھا مگر وہ پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اسپورٹس والی سرگرمی بھی ایک دم ماند پڑ چکی تھی۔ ویسے بھی وہ امتحان کے لیے اسکول سے فارغ ہو چکی تھی۔

ایک روز اسپورٹس کی ٹیچر مسز وجدان بالکل غیر متوقع طور پر ان کے گھر آن پہنچیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس وقت نور کے ابا جان گھر میں موجود نہیں تھے ورنہ جونہی مسز وجدان نے اپنا تعارف کرانا تھا ابا جان کا پارہ چڑھنا شروع ہو جانا تھا۔ مسز وجدان نے نور کے ساتھ دیر تک دلجوئی کی باتیں کیں۔ پھر اس کے بڑے ماموں مراد کو بھی بلا لیا۔ مسز وجدان نے نور کے ماموں مراد اور بہن بسمہ کو بتایا کہ نور میں ایتھلیٹکس کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے بڑا افسوس ہو گا اگر کسی وجہ سے نور کا ٹیلنٹ ضائع ہو جائے۔ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں

کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگر نور کے والد صاحب کے ذہن میں کچھ تحفظات ہیں تو آپ لوگ ان سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں۔"

ماموں مراد بولے۔ "ٹیچر! ہم نور کے حوالے سے آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہیں مگر ہر گھر کے اپنے معاملات اور مسائل ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بھائی جان سے بات کرنے کا کچھ فائدہ ہوگا۔ یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی...... اس حوالے سے خاموشی ہی بہتر ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ نور خاموشی سے رننگ میں حصہ لیتی رہے؟"

"جی ہاں۔ اگر اسے شوق ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ یہ اس کے لیے اچھا شوق ہے تو پھر یہ شوق خاموشی سے بھی پورا ہوسکتا ہے۔"

مسز وجدان نے نور کو مجبور کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی ان سے رابطہ کرے اور فراغت کے ڈھائی تین ماہ میں اپنی ٹریننگ کو آگے بڑھائے۔

نور مناسب قد اور چھریرے جسم کی مالک تھی۔ رنگ بچپن میں گندمی تھا لیکن اب کافی کھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نقوش بھی جاذب تھے۔ گو بسمہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی مگر اس کی کمی نور کے نہایت متناسب جسم اور الہڑپن نے پوری کردی تھی۔ یہ نوخیز شباب کے دن تھے، اس کے جسم سے جیسے توانائی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ڈٹ کر کھاتی تھی مگر بھاگ دوڑ کے سبب یہ خوش خوراکی اس کے "فگر" کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔

امتحانات کے بعد نور خاموشی سے مسز وجدان کے پاس ان کی ٹریننگ اکیڈمی میں جاتی رہی۔ مسز وجدان چند سال پہلے تک خود بھی نیشنل لیول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی تھیں اور انہوں نے ریس کے کئی اہم ایونٹس جیت رکھے تھے۔ انہیں نور میں ایسا اسپارک نظر آرہا تھا جو اس کو آگے لے جاسکتا تھا۔ نور نے بسمہ سے مشورے کے بعد ابا جان اور دادی کو یہی بتایا تھا کہ وہ کوکنگ کا ایک کورس اٹینڈ کررہی ہے اور یہ سفید جھوٹ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ایک کوکنگ کے اسکول میں جاتی تھی مگر وہاں سے فوراً مسز وجدان کی اکیڈمی میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے جوتے اور ٹریک سوٹ وغیرہ بھی وہیں پڑے رہتے تھے۔ وہ بڑی لگن سے سیکھ رہی تھی۔

میٹرک کا امتحان نور نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ تاہم اس دوران میں اسے رننگ میں کئی چھوٹی چھوٹی کامیابیاں ملیں۔ اس کا اعتماد بڑھنے لگا۔ کھیل کے حوالے سے اس پر ایک جنون سا سوار ہونے لگا۔ اس نے ان بڑے ملکی اور غیر ملکی رنرز کے بارے میں پڑھا جنہوں نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا اور کامرانیاں سمیٹیں۔ اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہونے لگی۔ وہ جب جب آپی کی تلخ گھریلو زندگی کو دیکھتی تھی اور اپنی مرحومہ ماں کے گھٹن زدہ روز و شب کو یاد کرتی تھی، اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا شوق فزوں تر ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے یہی لگا تھا کہ وہ ایک چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مختلف تھی اور بات فقط دونوں بہنوں کی ہی نہیں تھی، وہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں سے بھی مختلف تھی۔ گڑیوں سے کھیلنا اسے بچپن اور لڑکپن میں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کپڑوں کا بھی بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ خوامخواہ شرمانا، چلمنوں کے پیچھے چھپنا، لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر خود کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کرنا، بات بات پر اوئی اللہ...... ہائے اللہ مرگئی...... جیسے جملوں کا استعمال اور ناز و نزاکت کے سارے انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ اس نادیدہ حصار کو توڑنا چاہتی تھی جو موراں والی گاؤں کی اکثر لڑکیوں کے اردگرد موجود تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے پر دیے گئے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی اس کی ماں اور آپی کی زندگی سے بہت مختلف ہوسکتی ہے۔

پچھلے پانچ چھ ماہ میں اس نے کئی چھوٹے بڑے میڈل اور کپ جیتے تھے۔ وہ یہ سارے انعامات گھر کے بیسمنٹ میں موجود امی جان کی ایک پرانی جستی پیٹی میں لحافوں کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ بسمہ کے علاوہ کسی کو اس کلیکشن کا پتا نہیں تھا۔

دو سال پہلے بسمہ کو تو کالج میں داخلہ مل گیا تھا مگر جب نور کی باری آئی تو ابا جان نے برملا کہہ دیا کہ وہ کالج نہیں جائے گی۔ ان کے سخت رویے کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر وقت نور کی طرف سے چونکے رہتے تھے۔ ایک روز جب نور... کوکنگ اسکول سے (اور دراصل مسز وجدان کی اکیڈمی) واپس گھر آئی تو دادی اور ابا جان میں بات چیت ہورہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے کچھ اڑتے اڑتے فقرے نور کے کانوں میں بھی پڑے۔ دادی نے کہا۔ "توبہ یا اللہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا ہم نے۔ لڑکیاں اکیلی گھومنے نکلتی ہیں اور جب دل چاہے واپس آتی ہیں۔ کوئی پوچھنے بتانے والا نہیں۔ میں تمہیں صاف بتادیتی ہوں اشفاق! تیری اس چھوٹی کے چھن ٹھیک نہیں۔ اس کو ذرا سنبھال کر رکھ۔ لڑکوں

کی طرح کداڑے مارتی پھرتی ہے۔ لڑکیوں بالیوں والی کوئی شرم کوئی نزاکت ہی نہیں اس میں۔"

"اماں جی! آپ جانتی ہیں، شروع سے ہی ایسی ہے وہ۔ اب بڑی ہو رہی ہے، طور طریقے بھی آ جائیں گے۔"

"آئے ہائے...... اور کتنی بڑی ہوگی۔ کوٹھے جتنی ہوگئی ہے۔ کل سیڑھیوں پر یوں چڑھ رہی تھی، جیسے کوئی گھوڑی دولتیاں مارتی ہوئی جا رہی ہو۔ نہ سر پر دوپٹا نہ پاؤں میں جوتی۔ میں تو کہتی ہوں بتول کی طرح اسے بھی گھر میں ہی بارھویں کروادے۔"

"سوچ تو یہی رہا ہوں اماں جی! پر اب بسمہ کالج جا رہی ہے۔ بھائی خلیل کے سارے بچے جا رہے ہیں...... وہ کہے گی، مجھ پر ہی پابندی کیوں؟"

"خلیل کی بات تو چھوڑ دو۔ وہ تو ویسے ہی اپنی آخرت کو بھلا کے بیٹھا ہوا ہے۔ حج کر کے بندہ دنیاداری سے دور ہو جاتا ہے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیسے کے پیچھے جو دوڑ پہلے تھی، وہ اب بھی ہے۔ راحت کو دیکھ لے، اسی طرح تکی سی چادر لے کر بازار چلی جاتی ہے۔ کہتی ہے اب بوڑھی ہوگئی ہوں۔ پر شادی بیاہ پر اس کی تیاریاں دیکھو تو کہیں بڑھاپا نظر نہیں آتا۔"

نور برا سا منہ بنا کر وہاں سے ہٹ آئی تھی۔

کالج میں داخلے کا معاملہ بہ دستور اٹکا ہوا تھا۔ اس مرتبہ پھر تایا خلیل کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ کچھ کردار بسمہ اور بڑے ماموں مراد نے بھی ادا کیا۔ نور کو اس شرط پر بمشکل اجازت ملی کہ بڑے ماموں اسے خود کالج چھوڑ کر آیا کریں گے اور لایا بھی کریں گے۔ کالج ان کے شوروم کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔

☆☆☆

کالج میں پہنچنے سے پہلے ہی نور کی تھوڑی بہت شہرت کالج میں بھی پہنچ چکی تھی۔ کئی ایک اسٹوڈنٹس جانتے تھے کہ وہ ایک اچھی ایتھلیٹ ہے۔ اس کی اسپورٹ ٹیچر بھی اس کے نام سے شناسا تھیں۔ ایک فائدہ نور کو یہ ہوا کہ نئی ٹیچر فرحانہ بیگ ذاتی طور پر مسز وجدان کی دوست بھی تھیں۔ فرحانہ بیگ نے شروع میں ہی نور پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ اسے ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور وہ مراعات بھی دی گئیں جو ایک ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کے لیے ضروری تھیں۔ مسز وجدان اور فرحانہ بیگ کی ہدایت کے مطابق نور مختلف ٹرائلز میں بھی شرکت کر رہی تھی۔ فرحانہ بیگ بہت اچھی کوچ بھی تھیں۔ ایک روز فرحانہ بیگ اور ٹیچر الیاس صاحب نے اسے خوشخبری سنائی۔ انہوں نے کہا۔ "تمہارے لیے ڈیپارٹمنٹل ٹیم میں شامل ہونے کا زبردست چانس بن رہا ہے۔"

"ڈیپارٹمنٹل ٹیم؟" نور نے ذرا حیرت سے کہا۔

"بھئی اکثر سرکاری اور غیر سرکاری محکمے اچھے کھلاڑیوں کو ملازمت دیتے ہیں اور انہیں "گروم" کرتے ہیں۔ تمہیں واپڈا کی سروس کا موقع مل رہا ہے۔" فرحانہ بیگ نے ایک لیٹر نور کے سامنے رکھ دیا۔

اس لیٹر کے مطابق لاہور سے پانچ چھ ایتھلیٹ لڑکیوں کو ٹرائل اور انٹرویو وغیرہ کے لیے اسلام آباد بلایا گیا تھا۔ ان میں نور کا نام بھی تھا۔

نور نے لیٹر پڑھنے کے بعد کہا۔ "لیکن میڈم! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے......"

"اوہو، چھوڑو اس بات کو۔ ابھی انہیں کچھ نہ بتاؤ، تم ٹرائل وغیرہ تو دو۔ یہ کوئی معمولی موقع نہیں ہے۔ کامیاب ہوگئیں تو ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ پھر دیکھ لینا جس طرح بھی کرنا ہوگا۔"

"مگر میڈم! یہ بات چھپی تو نہیں رہے گی بلکہ...... میرا تو اسلام آباد جانا ہی ممکن نہیں ہوگا۔"

"صرف دو دن کی بات ہوگی۔ بہن اور ماموں کو بتا دو۔ والد صاحب کو ابھی نہ بتاؤ۔ انہیں کالج کے تفریحی ٹور وغیرہ کا کہہ دو۔ خدانخواستہ تم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی صلاحیت دے رکھی ہو تو اسے استعمال نہ کرنا بھی بہت بڑی ناشکری ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے والد بھی جلد یا بدیر اس بات کو سمجھ جائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اور پرنسپل صاحب کسی دن اکٹھے ان سے ملاقات کریں اور انہیں تمہارے حوالے سے قائل کریں۔"

"مگر میڈم......"

"دیکھو نور!" میڈم فرحانہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کہتے ہیں کہ بچے کا ایک باپ وہ ہوتا ہے جو اسے آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور دوسرا باپ استاد ہوتا ہے جو اسے زمین سے اٹھاتا ہے اور بلندی پر پہنچاتا ہے۔ کیا تم اپنے اساتذہ کو یہ درجہ نہیں دیتی ہو؟"

اس روز میڈم فرحانہ نے اسے نوے فیصد قائل کر لیا۔ وہ خیالوں میں الجھی اور ایک چمکیلے مستقبل کا سوچتی ہوئی سہ پہر کے بعد پہنچی۔ تاہم گھر پہنچ کر اسے ایک نئی طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ دادی اماں اور پھپھو حاجرہ اسے مختلف

نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ابا جان بھی گھر میں ہی موجود تھے۔ کچن سے بریانی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آج نور نے ذرا لمبی ٹریننگ کی تھی۔ اس کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اس نے بسمہ سے پوچھا۔ ''کھانا تیار ہے؟''

بسمہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کھانا تو دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جائے گا لیکن مہمان ابھی نہیں آئے۔''

''کون سے مہمان؟'' نور نے سلاد پر منہ مارتے ہوئے کہا۔

''تیرے مہمان۔''

''میرے مہمان؟ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون آ رہا ہے بھئی؟''

بسمہ کی مسکراہٹ جو پہلے ہی پھیکی سی تھی کچھ اور بھی پھیکی ہو گئی۔ وہ شاید بولنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی جب پھپھو حاجرہ اندر آ گئیں۔ نور کو گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ بسمہ کنی کترا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ نور حیرت زدہ تھی۔ ساتھ والے کمرے سے ابا جان کے کھنکھارنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھپھو حاجرہ نے بڑے دلار سے کہا۔ ''نور! اچھے رشتے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک رشتہ مل جانا، اللہ کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اب دیکھ لے تیری خالہ کی تینوں بیٹیاں ستائیس اٹھائیس سال سے اوپر کی ہیں اور اسی طرح بیٹھی ہیں۔''

''پھپھو! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' کم سن نور کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔ پھپھو بولیں۔

''اچھا رشتہ آیا ہے۔ تیرے ابا جی کے جاننے والے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ عالم دین ہیں، ان کا بڑا بیٹا ذوالقرنین۔ تیرے ابا جی کی شاپ کے ساتھ ہی اس کی شاپ بھی ہے۔ اسلامی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کا کام کرتا ہے۔ اچھی آمدن ہے۔ اپنا گھر ہے۔ صرف ایک جڑواں بہن ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔ بالکل چھوٹی سی فیملی ہے۔ یہ دیکھو۔''

پھپھو نے ایک کارڈ سائز تصویر نور کے سامنے کر دی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ تیس چوبیس سال کا نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ کہنے کو قبول صورت کہا جا سکتا تھا مگر چہرے پر عجیب طرح کی سنجیدگی اور سختی تھی۔ جیسے ہر چیز سے بیزار بیٹھا ہو۔

نور نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ تصویر میز پر رکھ دی اور اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ اس کے جسم کا سارا خون جیسے اس کے سر کی طرف یلغار کر رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' پھپھو نے پوچھا۔

نور نے اشک بار نظروں سے پھپھو کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یہ...... یہ آپ لوگ کس طرح کا مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا...... شادی بیاہ کی بات ...... اس طرح کی جاتی ہے۔ نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا، نہ کچھ بتایا۔ میں نے ......'' اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھپھو نے گھبرا کر اسے کندھوں سے تھاما اور دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔ ''نور پتر! تیرے ابا جی گھر میں ہیں۔ ان کے کانوں تک آواز نہ چلی جائے۔ میری بات سن، ذرا ٹھنڈے دل سے......''

''نہیں پھپھو...... نہیں ...... میں نے کچھ نہیں سننا۔ میں نے یہ شادی نہیں کرنی۔'' وہ باقاعدہ رونا شروع ہو گئی۔ حالانکہ وہ بہت کم روتی تھی مگر آنسو جیسے بھرّا مار کر اس کی آنکھوں تک آئے تھے اور آنکھوں میں ہی نہیں پورے جسم میں رواں ہو گئے تھے۔

اب بسمہ بھی اندر آ گئی تھی۔ شاید وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے نور کو اپنے ساتھ لگایا اور ہراساں لہجے میں بولی۔ ''نوری...... نوری! چپ ہو جا ابا جی نے سن لیا تو مصیبت آ جائے گی۔'' شاید بسمہ کے اشارے پر ہی پھپھو نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

بریانی کی خوشبو اب بھی نتھنوں تک پہنچ رہی تھی مگر اب یہ گندھک کی بو کی طرح نور کی ناک اور اس کے گلے کو چھیل رہی تھی۔ وہ بسمہ کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے بسمہ! تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... کیا تم بھی اس سارے کھیل میں شریک ہو...... کیا تم بھی یہی چاہ رہی ہو؟''

بسمہ بولی۔ ''نہیں نور! مم...... مجھے بھی ابا جان نے کل دوپہر ہی بتایا تھا...... اور تمہیں سمجھانے کے لیے کہا تھا لیکن سچی بات ہے میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی تم سے بات کرنے کی...... اور پھر رات کو وہ مجھے بازار لے گئے۔ میں واپس آئی تو تم سو رہی تھیں۔''

پھپھو بولی۔ ''ان باتوں کو چھوڑو۔ تم سب کو پتا ہے کہ ہونا تو اس گھر میں وہی ہے جو تمہارے ابا جی چاہتے ہیں اور ماں پیو کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ لڑکے کی ماں اور بہن نے پچھلے مہینے تمہارے حفیظ انکل کی شادی پر تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ بات چیت چل رہی تھی۔''

''کیوں چل رہی تھی بات چیت...... ہاں کیوں چل رہی تھی؟'' نور تڑخ کر بولی۔ ''کس نے پوچھا تھا مجھ سے؟

کس نے بات کی تھی؟ اباجی خود کہتے ہیں، اسلام میں بیٹیوں کو حق دیے گئے ہیں۔ میرا حق کہاں تھا؟ میرا حق کہاں ہے؟ اور یہ کیا بات ہے کہ کالج سے گھر آؤ تو آگے آپ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور ابھی تو مجھ سے آگے بسمہ ہے۔ اباجی کے جاننے والوں کو وہ کیوں نظر نہیں آتی؟ انہوں نے مجھ پر ہی کیوں نشانہ لے لیا ہے؟"

"ناشکری کی باتیں نہ کر۔" پھپھو پہلی بار غصے میں بولی۔ "ہر ایک کا مقدر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بسمہ بھی... خدانخواستہ کوئی لولی لنگڑی نہیں ہے۔ دیکھنا دو چار ماہ میں اس کا بھی بڑا چنگا بر مل جائے گا۔ بھائی اشفاق تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔"

"فرض سے نہیں بوجھ سے۔ شاید ہم بوجھ ہیں ان کے لیے۔ وہ ہمیں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔" نہ چاہنے کے باوجود نور کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب دروازے پر دستک ہوئی اور تینوں عورتیں ٹھٹک گئیں۔ بسمہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ باہر سے اباجی کی بھاری آواز سنائی دی۔

"بسمہ! تیار ہو گئی ہے عین النور؟"

"ہاں اباجی ہو رہی ہے۔"

"جلدی کرو بھئی! وہ لوگ آنے والے ہیں۔" اباجی نے ملائمت سے کہا۔

ان کے قدموں کی مدھم چاپ ابھری۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نور ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے اتنا حوصلہ، اتنی ہمت اور جرأت اچانک اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اندر تھی اور ابا جان باہر۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جالی دار کھڑکی تک پہنچی اور کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

"ابا جان۔"

وہ ٹھٹک کر رک گئے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

"نور! کیا بات ہے؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

چند لمحوں کے نہایت بوجھل وقفے کے بعد نور نے کہا۔

"ابا جان! آپ...... ابھی...... میری کوئی بات نہ کریں۔"

مولوی اشفاق مہرا کے چہرے پر جیسے حیرت اور طیش کا دریا بہہ گیا۔ وہ بولے۔ "م...... میں سمجھا نہیں...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"ابا جان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے مگر میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ میری بات نہ کریں۔" اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ نور کو خود یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کھڑکی کی اوٹ سے یہ الفاظ اپنے والد سے کہہ چکی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے لمحے تھے جنہوں نے اس طرح کی جرأت اسے عطا کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں اس کی والدہ مرحومہ کی ساری گھٹن زدہ زندگی سمٹ آئی ہے اور اپنی آپی بتول کی ازدواجی زندگی کی ساری تلخیاں بھی اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ہاں، یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ مولوی اشفاق مہرا تیزی سے دروازے کی طرف پلٹے۔ اگلے ہی لمحے دروازے کے تختے اس طرح دھڑ دھڑائے جیسے پورا دروازہ دیواروں سے نکل کر کمرے میں آ گرے گا۔ "دروازہ کھولو، بسمہ دروازہ کھولو۔" وہ خوفناک آواز میں دہاڑے۔

بسمہ نے سہمی ہوئی نظروں سے پھپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "بھائی جان! ہم اسے سمجھا رہے ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"میں کہتا ہوں دروازہ کھولو، ورنہ میں توڑ دوں گا۔"

مولوی اشفاق کی آواز پورے گھر میں گونجی۔ وہ جیسے پھٹ پڑے تھے، شاید ان کا "بی پی" بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے دروازہ نہ کھولا تو مولوی جی کا طیش مزید بڑھے گا اور نتائج مزید برے نکلیں گے۔ پھپھو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

مولوی اشفاق کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ہاکی کا دستہ تھا۔ اندر آتے ساتھ ہی وہ جیسے نور پر پل پڑے۔ وہ چلاتی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔ دستے کی ضربیں اس کے جسم پر تواتر سے لگ رہی تھیں۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ مولوی اشفاق دہاڑ رہے تھے۔ "بدبخت! زبان چلاتی ہے...... میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔"

بسمہ تڑپ کر باپ کے سامنے آ گئی۔ "اباجی نہیں...... پلیز اباجی......"

اس نے کئی چوٹیں اپنے ہاتھوں پر سہیں۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ناخنوں سے خون بہہ نکلا۔ پھپھو بھی اپنے طور پر انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی سمیت گھر میں موجود دیگر افراد بھی ہانپتے کانپتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ مولوی اشفاق غم و غصے کے عالم میں گرج رہے تھے۔ "تیری یہ جرأت...... تیری یہ ہمت...... بے شرم بے حیا...... اپنے باپ کے منہ پر کالک مل رہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے مجھے۔ اپنے

ہاتھوں سے ذبح کر ڈال مجھے۔"

وہ پھر نور کی طرف جھپٹے۔ بڑے ماموں نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

دادی نوحہ کرنے والے انداز میں پکاریں۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا، اس کلموہی نے ایک نہ ایک دن کوئی چاند چڑھانا ہے۔ یہ ہماری جانیں لے کر رہے گی۔ میں پہلے ہی کہتی تھی، اس بے شرم کو کالجوں کی ہوا نہ لگواؤ۔ دس دس گھنٹے غائب رہتی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا کرتی پھر رہی ہے۔ اس گھر میں کوئی میری بات سنتا ہو تو پھر ہے نا۔ ہائے اللہ، یہ مجھے کیا دیکھنا پڑ رہا ہے......"

نور ایک کونے میں گٹھڑی بن کر سہمی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کالج کی سفید یونیفارم پر خون کے داغ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ وہی خون تھا جو اس کا سر پھٹنے سے بہا تھا۔ اس کی گھٹی گھٹی آواز ایک دردناک فریاد بن کر کمرے میں گونج رہی تھی۔

ماموں مراد نے نور کے اباجی کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور انہیں بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ان کی ٹوپی گر گئی تھی اور عینک ناک کے آخری سرے تک سرک آئی تھی۔ وہ دہاڑے۔ "شام تک اس خبیث کو سمجھا لو اگر سمجھتی ہے تو...... ورنہ پھر وہ ہوگا جو اس خاندان میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ میں مر جاؤں گا یا اس کو مار ڈالوں گا۔"

پورا گھر ایک طوفان کی زد میں تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ نور کے اباجان نے کسی ایمرجنسی کا بہانہ کر کے مہمانوں کو فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع سن کر تائی جان اور مہرین وغیرہ بھی بھاگے آئے تھے۔ نور کو گھر میں ہی طبی امداد دی گئی اور اس کے سر سے مسلسل بہنے والا خون روکا گیا۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ تایا خلیل لاہور میں موجود نہیں تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر بات کو سنبھال لیا کرتے تھے۔

بسمہ نے گلوگیر آواز میں تائی جان راحت سے کہا۔ "بڑی امی! آپ بڑے ابا کو فون کریں۔ انہیں کہیں وہ آج ہی واپس آ جائیں۔"

"پتا نہیں کہ رابطہ ہوتا ہے یا نہیں۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ انہیں بتائیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر جا کر خود انہیں فون کر لیتی مگر میں چاہتی ہوں کہ یہاں نور کے پاس رہوں۔"

تائی جان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ نور اور بسمہ کو تسلی دیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئیں تاکہ شوہر کو فون کر سکیں۔ پھپھو مسلسل نور کو سمجھانے بجھانے میں لگی ہوئی تھیں۔ گاہے بگاہے دادی بھی کوئی کڑوا کسیلا لقمہ دے دیتی تھیں۔ دادی پرانے خیال کی عورت تھیں اور ان کی سوچ یہی تھی کہ لڑکیوں کو سات آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر گرہستی سیکھ لینی چاہیے اور ان کی شادی جلدی کر دینی چاہیے۔ دادی کی اپنی شادی فقط پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور وہ پردے کی اتنی پابند تھیں کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہوں نے ساری عمر اپنے سسر اور جیٹھوں کو اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔

وہ بار بار کہہ رہی تھیں۔ "نوری! تیرے پیو کا غصہ بڑا بھیڑا ہے۔ اگر تو نے اس کی بات نہ مانی تو اس نے جان سے مار دینا ہے تجھے۔ پھر اس راحت بی بی (تائی) نے تجھے بچانے کے لیے نہیں آنا۔"

پھپھو ساجدہ بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہہ رہی تھیں مگر پتا نہیں کہ نور کو کیا ہوا تھا۔ مار کھانے کے بعد اور باپ کی ٹھوکریں سہنے کے بعد نور کے اندر کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک باغی سر اٹھا رہا تھا۔ اپنے والد اور اپنی دادی کا باغی، اپنے اردگرد کے حالات کا باغی، اس باغی سے آج سے پہلے نور کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔

دوسرے کمرے سے ابھرنے والی دادی کی آواز مسلسل نور کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ اب اس کی مرحومہ ماں کو مجرم ٹھہرا رہی تھیں۔ ان کی تربیت کو ناقص گردان کر نور کو ان کا پرتو قرار دے رہی تھیں۔

پھپھو انہیں ایسی تلخ باتیں کرنے سے روک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی ہمنوائی بھی کر رہی تھیں۔ اباجان نے شام تک کا الٹی میٹم دیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ شام کے فوراً بعد ہی تایا جان گجرات سے لاہور پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ان کے گھر ہی آئے تھے...... انہوں نے ہمیشہ نور سے بہت پیار کیا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا سر، زخمی کلائیاں اور سوجی ہوئی آنکھ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے سرخ و سپید چہرے پر بس سرخ رنگ ہی باقی رہ گیا۔ نور کا خیال تھا کہ شاید تایا کو دیکھ کر وہ رو پڑے گی لیکن آنسو جو بہت کم ہی اس کی آنکھوں تک آتے تھے، اب بالکل روٹھے ہوئے تھے۔ بس آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے اور ایک انگارہ سا تھا جو سینے میں دھرا ہوا تھا۔

نور کے سر پر پیار دے کر تایا جان دوسرے کمرے

میں ابا جان سے ملنے چلے گئے۔ بسمہ نے جلدی سے کوریڈور اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کردیا تاکہ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے اتنی بلند ہوگئی کہ دونوں دروازے بھی اس کی گونج کو نہ روک سکے۔ نور کے ابا جان بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتے تھے مگر آج تو وہ بھی ان کے سامنے بول رہے تھے۔ تایا کی آواز زیادہ بلند تھی اور پھر وہ بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اڑتے اڑتے کچھ الفاظ بسمہ اور نور کے کانوں تک بھی پہنچے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”بہت افسوس ہے اشفاق! بہت افسوس ہے۔ تم اپنی ہی بچی کے بارے میں ایسی غلط سوچ رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کے گلے میں پھندا ڈال کر ماردو اسے یا زندہ گاڑدو زمین میں۔“

”خدا کے لیے بھائی جان! مجھے بولنے پر مجبور نہ کریں۔ یہ آپ لوگوں کا لاڈ پیار ہے جس نے اس کو اس حال تک پہنچایا ہے۔“

”کس حال تک پہنچایا ہے؟ کیا کردیا ہے اس نے؟ مجھے بتاؤ کون سی قیامت توڑ دی ہے اس نے؟ تم سے جینے کا حق ہی مانگ رہی ہے نا۔ یہی کہہ رہی ہے نا کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر شادی اور بال بچے کی ذمے داری نہ ڈالو اور کیا کہہ رہی ہے وہ؟“

”بھائی جان! آپ کو کچھ معلوم نہیں۔“ نور کے ابا جان نے قدرے دبی آواز میں کہا۔ ”اس کے طور طریقے بہت بدل گئے ہیں۔ یہ دیکھیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ یہ دیکھیں ...... یہ ہے اس کا سامان جو نیچے پرانی پیٹی سے نکلا ہے...... یہ بھی دیکھیں......“

دھاتی اشیا کے گرنے اور پٹخے جانے کی آوازیں آئیں۔ ایک لمحے میں نور کو اندازہ ہوگیا کہ بیسمنٹ میں موجود اس کے کپ اور ٹرافیاں وغیرہ ابا جان کی نظر میں آچکے ہیں ...... اور آج دوپہر سے یہاں جو کچھ ہورہا ہے، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہاتھ ان چیزوں کی برآمدگی کا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ چکر کتنے دنوں سے چل رہا تھا۔

”تو کیا ہے اشفاق؟“ تایا جان کی بلند آواز دروازوں سے گزر کر نور اور بسمہ کے کانوں تک پہنچی۔ ”کون سا گناہ کردیا ہے اس نے۔ کون سی ایسی حرکت کی ہے جس سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟ میں پھر کہتا ہوں اشفاق! اس طرح کا کٹرپن تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم اللہ کے احکام کو مانتے مانتے اللہ کے احکام سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”بھائی جان! میں اس بارے میں آپ سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔“

”مگر میں کرنا چاہتا ہوں۔“ تایا خلیل گرجے۔ ”مجھے بتاؤ، اپنی روتی سسکتی بچی کو مارکوٹ کر کسی کی ڈولی میں دھکیلنے کا حق کس نے دیا ہے تمہیں؟“

آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ شاید درمیان میں موجود کوئی اور دروازہ بھی بند کردیا گیا تھا لیکن یہ اندازہ تو ضرور ہورہا تھا کہ ابا اور تایا میں زوردار تکرار چل رہی ہے۔ چار پانچ منٹ مزید گزرے پھر تایا جان غصے سے بھرے ہوئے ......تندبگولے کی طرح اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کونے میں دبکی نور کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ”چل میری بچی! یہ گھر تیرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اندھا بہرا ہوگیا ہے اس گھر کا سربراہ۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“

پھپھو نے تایا خلیل کو روکنا چاہا پر انہیں بھی زور کی ڈانٹ کھانا پڑی۔ تایا بولے۔ ”بس، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ میرے پاس رہے گی جب تک تم لوگوں کے دماغ ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں رکھوں گا اسے۔“

قریبی کمرے سے نور کے ابا جان کی دبی دبی مگر تلخ آواز ابھری۔ ”لے جائیں...... لے جائیں اس تحفے کو۔ میں بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھوں گا یہ مرگئی ہے میرے لیے۔“

☆☆☆

اس دن کے بعد نور کے سارے روز و شب ایک دم بدل گئے۔ تایا ابا اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔ تایا کی طرح تائی راحت نے بھی ہمیشہ اس سے بہت پیار کیا تھا۔ پھر تایا کے تینوں بچے، نور کے لیے بالکل بھائی بہنوں کی طرح تھے۔ وہ شرجیل، عثمان اور مہرین کے ساتھ ایک ہی گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ مہرین اس سے صرف ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی اور فزیوتھراپسٹ بن رہی تھی۔

تایا خلیل کافی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی کے لیے بھی ان کی بات کو رد کرنا یا ان سے طویل بحث مباحثہ کرنا ممکن نہیں تھا...... اور نور کے ابا جان سے تو ان کا رشتہ بڑے بھائی کا بھی تھا۔ نور کے ابا جان مولوی اشفاق کے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ ایک حد سے زیادہ تناؤ پیدا کرسکیں۔ انہوں نے جیسے ایک دم نور

سے لاتعلقی سی اختیار کرلی۔ چار پانچ روز بعد ایک شام تایا ابا گھر آئے تو ملازم خدا بخش نے کینوس کا ایک بڑا سا بیگ کندھے پر لاد رکھا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ''لو بھئی نورا یہ میں تمہارے کپ اور ایوارڈ وغیرہ اس نامعقول کے قبضے سے نکال کر لایا ہوں۔'' نامعقول سے ان کی مراد یقیناً چھوٹا بھائی ہی تھا۔

تایا ابا نے بیگ کی زپ کھولی...... اور اس میں سے ایک بڑا کپ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ کپ ٹیوب لائٹ میں چمک رہا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ''آج میری ملاقات تمہاری ٹیچر میڈم فرحانہ بیگ سے بھی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ نورا اسلام آباد جائے گی اور میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ وہ بڑی خوش ہوئی ہے۔ اسے تم سے بہت زیادہ امیدیں ہیں اور بات صرف میڈم فرحانہ کی ہی نہیں، تمہارے اکثر ٹیچرز تمہیں ایک کامیاب ایتھلیٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔''

''پر تایا ابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے ابا جی کو بہت ناراض کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان سے معافی مانگ لوں۔''

''جب معافی کا وقت آئے گا تو وہ بھی مانگ لینا لیکن یہ وقت معافی کا نہیں ہے۔ اس معافی کی کم از کم قیمت یہی ہوگی کہ وہ تمہیں کمرے میں بند ہونے پر مجبور کردے گا اور پھر چند روز میں تمہارا نکاح پڑھوا کر تمہیں کسی قاری ذوالقرنین کے حوالے کردے گا۔''

''لیکن تایا ابا......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' انہوں نے نور کی بات کاٹی۔ ''میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرتی جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تائی راحت نے بھی اس کا شانہ سہلایا۔ مہرین دلچسپی اور حیرت سے نور کے درجنوں کپ اور ٹرافیاں دیکھ رہی تھی۔

دو روز بعد نورا اپنے تایا جان کے ساتھ بذریعہ کوچ اسلام آباد گئی۔ اس نے ٹرائل میں حصہ لیا۔ اس کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔ اسے فوری طور پر ملازمت تو نہیں ملی تاہم اسے شارٹ لسٹ کرلیا گیا اور پوری امید دلائی گئی کہ وہ جلد ہی محکمے کی طرف سے کھیلتی ہوئی نظر آئے گی۔

اسلام آباد کے وزٹ سے نور کے اعتماد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ اسے سینئر ایتھلیٹس سے ملنے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس کے اندر زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ لاہور واپس آنے کے بعد نور نے باقاعدگی سے فرحانہ کے کوچنگ سینٹر جانا شروع کردیا۔ یہ سینٹر کئی برس پہلے فرحانہ بیگ نے کھیل سے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع کیا تھا۔ اس کا اصل نام ''فرحانہ ایتھلیٹکس اسکول تھا۔'' اسے عام طور پر ایف اے ایس کہا جاتا تھا اور ایتھلیٹکس کے حلقوں میں اس کا نام تھا۔

میڈم فرحانہ بیگ اس ادارے کی روح رواں تھیں...... اور بڑی محنت سے لڑکیوں کو رننگ کی تربیت دے رہی تھیں۔ اپنے اسکول کی دوست شاہینہ سے بھی نور کا مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ شاہینہ کا تعلق ایک ایلیٹ کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے والد ایک کامیاب صنعت کار تھے۔ اس نے ایک ہائی فائی کالج میں داخلہ لیا تھا اور اسپورٹس میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ اکثر سو میٹر کی دوڑ میں دونوں سہیلیوں کا آمنا سامنا بھی ہوجاتا تھا۔ ان دونوں کی ٹائمنگ میں بس انیس بیس کا فرق ہی تھا۔ کسی وقت نور اور کسی وقت شاہینہ کی ٹائمنگ بہتر رہتی تھی۔

دونوں فرصت کے لمحات میں بے تکلف گفتگو بھی کرتی تھیں۔ شاہینہ بھی نور ہی کی طرح دراز قد اور اسمارٹ جسم کی مالک تھی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی دونوں شاید ہم پلہ ہی تھیں تاہم شاہینہ کے نسبتاً زیادہ خوش حال لائف اسٹائل نے اس میں اضافی نکھار پیدا کردیا تھا۔ کسی بھی ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کی طرح شاہینہ بھی مستقبل کے خوب صورت سپنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی اس کی پوری سپورٹ کررہے تھے......

ایک روز نورا اپنے تایا ابا کے ساتھ ان کی سوزوکی کار میں ڈیفنس کی طرف شاہینہ سے ملنے جارہی تھی۔ تایا ابو ڈرائیو کررہے تھے۔ انہیں چار بجے تک شاہینہ کے گھر پہنچنا تھا اس لیے وہ گاڑی تھوڑی تیز چلارہے تھے۔ ایک چوراہے سے وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ حالانکہ انہوں نے اشارہ دے رکھا تھا پھر بھی غلط سمت سے اوور ٹیک کرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے آ ٹکرایا۔ تایا نے بمشکل موڑ کاٹا اور گاڑی کو کنارے پر لگایا۔ موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں گرے اور تھوڑی بہت چوٹیں بھی آئیں۔ دوسری طرف گاڑی کے دونوں دروازوں پر بھی ٹھیک ٹھاک رگڑیں آئیں۔ تایا جان باہر نکلے تو لڑکوں نے ان سے بدتمیزی شروع کردی۔

تایا نے ایک کو دھکا دیا، وہ تایا سے کھینچا تانی کرنے لگے۔ نور بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے لڑکوں کو تایا

سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی' اسے بھی ایک زوردار دھکا کھانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب نور نے ایک دراز قد لڑکے کو دیکھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھوٹے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور حملہ آور لڑکوں کی طرف جھپٹا۔ ''اوئے کیا کرتے ہو۔ بزرگ آدمی ہیں۔'' وہ پکارا۔

''بزرگ ہے تو ساری سڑک کا ماماں بن گیا ہے یہ۔'' سرخ ٹی شرٹ والا لڑکا چلایا۔

اگلے ہی لمحے دونوں لڑکے دراز قد نوجوان سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دراز قد نوجوان ورزشی جسم کا مالک تھا اور لگتا تھا کہ لڑائی بھڑائی سے بھی واقف ہے۔ اس نے سرخ شرٹ والے کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی تو وہ کراہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کے اوپر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے چند کے چلائے مگر پھر دراز قد نوجوان نے اسے اڑنگا لگا کر سڑک پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی۔ موقع پر جمع ہو جانے والے لوگوں نے سرخ شرٹ والے کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اب بھی اچھل اچھل کر نور کے تایا جان اور دراز قد نوجوان کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کوشش میں اب زیادہ دم خم نہیں تھا۔ چند تماشائیوں نے سڑک پر گرے ہوئے دوسرے لڑکے کو دراز قد نوجوان کی گرفت سے چھڑایا اور اسے لعنت ملامت کی۔ اس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

دراز قد نوجوان کی قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا اور اس میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ جھانک رہا تھا۔ وہ نور کے پاس آیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔ ''آپ گاڑی میں بیٹھیں اور انکل آپ بھی بیٹھیں۔ آپ نکلیں یہاں سے، میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔''

''نہیں نہیں بیٹا! لڑائی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس ان کو سبق مل گیا ہے۔ تم بھی جاؤ یہاں سے۔''

اسی دوران میں دور سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی سفید موٹر سائیکل کی جھلک دکھائی دینے لگی...... تایا جان نے دراز قد نوجوان سے کہا۔ ''ابھی ٹریفک والے آ جائیں گے۔ تم جاؤ یہاں سے بیٹا۔ وہ دیکھو، وہ خبیث بھی نکل رہے ہیں۔''

''میں بھی چلا جاؤں گا لیکن آپ گاڑی میں بیٹھیں۔'' نوجوان نے بڑے اطمینان سے کہا۔

تایا ابا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ نور پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کافی آگے جا کر نور نے مڑ کر دیکھا۔ ان کا مددگار...... ٹریفک سارجنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں زبردست اعتماد تھا۔

چند روز بعد انٹر کالجیٹ مقابلے شروع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا ایونٹ تھا۔ ٹریننگ سینٹر میں میڈم فرحانہ نور کو بھرپور پریکٹس کروا رہی تھیں۔ کافی سخت شیڈول تھا۔ ہفتے میں پانچ دن، کم از کم تین گھنٹے تک وہ سخت مشقیں کر رہی تھی۔ پہلے وارم اپ ہوتا پھر جسم اور پٹھوں کو لچک دار بنانے والی ورزشیں ہوتیں۔ ان کو عرف عام میں اسٹریچنگ کی ایکسرسائز کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد رننگ کا سیشن ہوتا۔ اس تربیتی دورانیے کے علاوہ بھی نور بس دوڑ اور مقابلے کے بارے میں ہی سوچتی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی پریشان کن سوچوں کی طرف اس کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ ہاں، رات کو جب وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹتی تو اباجان کی صورت نگاہوں کے سامنے آ جاتی۔ ان کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکراتی۔ انہوں نے تایا جان سے کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے لے جائیں اس تحفے کو یہاں سے...... میں سمجھوں گا یہ مر گئی ہے میرے لیے۔''

پچھلے دو تین ہفتوں میں بس ایک بار بسمہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چوری چھپے کالج سے سیدھی تایا کے گھر آئی تھی اور نور سے ملی تھی۔ نور کو گلے لگا کر اس نے خوب آنسو بہائے تھے اور دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اباجان نے انہیں نور کے ساتھ ملنے سے منع کر دیا ہے۔

ایک دن اس کے لیے پھپھو حاجرہ کا فون آیا۔ وہ کسی پی سی او سے بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''نورا تیرے اباجی بہت پریشان ہیں، تم نے بہت دکھ دیا ہے انہیں۔ یاد رکھنا انہیں ناراض کر کے تو کبھی خوش نہیں رہ سکے گی، کسی بھی کام میں کامیابی نہیں ملے گی تجھے۔''

''میں کیا کروں پھپھو؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''وہ جس شرط پر مجھے معاف کریں گے، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ...... اور اپنی من مرضی سے۔ بالکل جس طرح انہوں نے آپی بتول کی شادی کی۔ اسے ایک ایسے سنگ دل بندے کے حوالے کر دیا جو انہیں ہم سے ملنے تک نہیں دیتا...... جس نے آپی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے...... مجھے شادی کے نام سے ہی خوف آنے لگا ہے پھپھو۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟ شادی تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہو گی تو کیوں نا اس میں اپنے باپ کی خوشنودی شامل کر لو۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہو گی شادی لیکن ابھی نہیں پھپھو۔ ابھی...... میں کچھ کرنا چاہتی

ہوں...... کچھ بن کے دکھانا چاہتی ہوں......''

''بن کے دکھانا چاہتی ہو۔'' پھپھو نے تلخ لہجے میں اس کی نقل اتاری۔ ''ڈاکٹر بن رہی ہونا...... انجینئر بن رہی ہونا؟ کچھ شرم کرو نور، کبڈی کھیلنے والوں کی طرح دوڑتی پھر رہی ہو۔ ہمارے خاندان میں کس نے کیا ہے اس طرح کا کام؟ اس سے کیا حاصل ہونا ہے تم کو......؟''

''ہوسکتا ہے پھپھو کچھ ہو ہی جائے۔'' نور نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

''کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔'' پھپھو نے بھنا کر کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

وہ وہیں پر کافی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ممرین نے اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

یہ پنجاب بھر کے کالجوں کے مقابلے تھے۔ نور اپنے کالج کی تمام برانچز کی طرف سے اس کیمپی ٹیشن میں سو میٹر ریس کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس کی دوست شاہینہ نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لینا تھا مگر مقابلوں سے صرف ایک ہفتہ پہلے شاہینہ فوڈ پوائزننگ کا شکار ہوگئی تھی اور ڈاکٹرز نے اسے تین ہفتے آرام کا مشورہ دے دیا تھا۔

یہ مقابلے نور کے لیے بڑے سود مند رہے۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی ہونہار ایتھلیٹ کے طور پر سامنے آئی۔ ان مقابلوں کے دوران میں ایک اور اہم بات ہوئی۔ اس کی ملاقات اسی دراز قد نوجوان سے بھی ہوگئی جس نے چند ہفتے پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی مدد کی تھی اور بدتمیزی کرنے والے اوباش لڑکوں کو سبق سکھایا تھا۔ وہ بڑا فلمی سا سین تھا اور اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ ابھی تک نور کے ذہن پر نقش تھا۔

مقابلوں کے دوران میں اپنی ''ہیٹ'' میں پہلا نمبر حاصل کرنے کے بعد نور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہانپ رہی تھی۔ میدان میں تالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ویل ڈن۔ مبارک ہو۔'' ایک آواز سن کر وہ چونکی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے وہی کھڑا تھا۔ دراز قد، مضبوط شانے، چمکتی ہوئی پیشانی۔

''اوہ آپ یہاں؟'' نور کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی ہاں...... میرا نام فرہاد ہے۔ میں ڈیلی سپر اسٹار میں اسپورٹس کے شعبے کا انچارج ہوں۔ یہ میرا کیمرا مین تنویر ہے۔''

''آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' نور نے رسمی انداز میں کہا۔

''کیا ہم آپ کی ایک تصویر لے سکتے ہیں؟''

''نو...... آئی ایم سوری...... مجھے تصویر بنوانا پسند نہیں ہے۔'' نور نے اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے...... کوئی بات نہیں۔'' فرہاد نے خوشدلی سے کہا اور کیمرا مین کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گیا۔

''آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں مس نور؟'' فرہاد نے کہا۔

''جی پوچھیے۔''

''یہاں کافی لڑکیاں حصہ لے رہی ہیں مگر آپ اپنے لباس اور رویے کے حوالے سے سب سے مختلف نظر آرہی ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ایک لڑکی مناسب اور باوقار لباس کے ساتھ بھی اکثر کھیلوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کرسکتی ہے۔''

فرہاد نے کہا۔ ''بہت اچھی بات کہی ہے آپ نے ...... لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کرے آپ آگے جائیں اور بڑے مقابلوں میں حصہ لیں۔ جب آپ اپر لیول پر پہنچتے ہیں تو پھر یہ لباس وغیرہ کے معاملے آڑے آتے ہیں۔''

''میں ان شاء اللہ ایسے کسی معاملے کو آڑے نہیں آنے دوں گی۔ ثابت کروں گی کہ اگر ایک عورت میں صلاحیت ہے تو پھر اس طرح کی مجبوریاں اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔'' وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنا اسکارف بھی درست کر رہی تھی۔ اس کا یہ انداز جیسے فرہاد کے دل کو بھا رہا تھا۔

اسی دوران میں نور کی استاد اور کوچ فرحانہ بیگ موقع پر پہنچ گئیں۔ نور کے تایا اور تایا زاد بھائی شرجیل بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے نور کو ''ہیٹ'' جیتنے پر مبارک باد دی اور اگلی ہیٹ کے لیے وش کیا۔ نور اپنی کوچ فرحانہ بیگ سے باتیں کرنے لگی۔ نور کے تایا خلیل بھی اب فرہاد رازی کو دیکھ چکے تھے۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملے اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ نور کی طرح تایا خلیل بھی فرہاد کے بہت شکر گزار تھے۔

فرہاد رازی بہت جلد بے تکلف ہوجانے والا نوجوان تھا۔ اس کی خوش گفتاری سے اخلاص اور انسیت جھلکتی تھی۔ فرہاد اور خلیل صاحب تماشائیوں کے درمیان آ بیٹھے۔ فرہاد نے خلیل صاحب کو بتایا کہ ایک والدہ کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ وہ بڑے بھائی مستقل طور پر فرانس میں

شفٹ ہو چکے ہیں۔ وہ سیلف میڈ شخص تھا۔ اپنی کوشش سے ایک ہائی فائی میگزین میں ایک اچھی جاب تک پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ اسے فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے ایک چچا ماضی میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل چکے تھے۔ شاید وہ مزید آگے جاتے لیکن چوٹ لگنے کے باعث اس فیلڈ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی کسمپرسی دیکھ کر فرہاد کو یہ خیال آیا تھا کہ ماضی کے ایسے باصلاحیت کھلاڑی جو اب گمنامی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے۔ آج کل وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست فیضان علی کے ساتھ مل کر اس پلان پر کام کر رہا تھا۔

جواب میں خلیل صاحب نے کہا۔ ''بھئی پھر تو ہم دونوں میں ایک قدر مشترک موجود ہے۔ میں نے بھی اپنے علاقے میں ایک فری کلینک قائم کیا ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں مستحق مریضوں کا حتی المقدور مفت علاج کیا جائے۔''

''اس سلسلے میں آپ کو کسی بھی طرح میرا تعاون درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔'' فرہاد نے کہا۔

خلیل صاحب نے کہا۔ ''تعاون کی صورت تو بالکل موجود ہے بھئی۔ تم نے اپنے ڈاکٹر دوست کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے دو ڈاکٹرز کا انتظام کر رکھا ہے لیکن کم از کم ایک ڈاکٹر کی ضرورت اور ہے۔ اگر تمہارے دوست اپنی سہولت کے مطابق کچھ وقت دے سکیں تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اگر وہ مناسب معاوضہ چاہیں گے تو وہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔''

''آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں انکل۔'' فرہاد نے محبت سے کہا۔ ''کسی نیک کام میں حصہ ڈالنے کا موقع ملنا تو ایک سعادت کی طرح ہوتا ہے۔''

کوئی دو گھنٹے بعد نور کی دوسری ہیٹ ہوئی۔ یہ ہیٹ بھی اس نے ایک سخت مقابلے کے بعد جیت لی۔ یہ بڑی اہم کامیابی تھی، سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ تماشائیوں میں صرف فیملیز کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ بڑا اچھا ماحول تھا، نور کی کلاس فیلوز نے نور کی اس کامیابی کو بڑی اچھی طرح ''سیلیبریٹ'' کیا۔ اب فائنل ہیٹ تھی، اس میں پنجاب کے انٹر کالجیٹ مقابلوں کی تیز رفتار ترین لڑکی کا انتخاب ہونا تھا...... نور کے اچھے چانسز موجود تھے۔

دوسری ہیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد جب نور انکلوژر میں پہنچی تو تایا خلیل اور فرہاد پرانے شناساؤں کی طرح بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ تایا خلیل، فرہاد کو مدعو کر چکے تھے کہ وہ ان کے گھر آئے اور گھر کے بالکل پاس ہی واقع ان کے فری کلینک اور ڈسپنسری کا معائنہ کرے۔

اگلے روز کا فائنل مقابلہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ نور یہ مقابلہ جیت تو نہیں سکی مگر اس نے تیسری پوزیشن حاصل کر لی اور وکٹری اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ اس نے کانسی کا تمغا جیتا۔ یہ کامیابی بھی معمولی نہیں تھی۔ تایا خلیل نے اسے گلے سے لگایا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ ''مجھے اپنے اللہ سے پوری امید ہے، ایک دن تم کوئی بڑی کامیابی حاصل کر کے اس نامعقول کا منہ بند کر دو گی۔''

نامعقول کا لفظ وہ اکثر و بیشتر اپنے چھوٹے بھائی اشفاق کے لیے ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ اشفاق جن کو عام لوگ مولوی اشفاق مہرا کہتے تھے اور جن کا کتابوں کا کاروبار آہستہ آہستہ جم رہا تھا۔

انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد نور کا اکثر فرہاد سے آمنا سامنا ہونے لگا۔ فرہاد اور اس کا دوست ڈاکٹر فیضان، تایا جان کے فری کلینک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ فرہاد اکثر گھر بھی آ جاتا تھا۔ شرجیل اور عثمان سے بھی اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں نور کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دل کی گہرائی میں کسی گوشے کے اندر فرہاد کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کیفیت شاید یک طرفہ نہیں تھی۔ اس نے بھی اکثر فرہاد کی گہری آنکھوں میں اپنے لیے ایک بے نام سا عکس لرزاں دیکھا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی، اس کے دور شباب کے کچھ تقاضے تھے مگر وہ ان معاملوں سے کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے مہربان اور محسن تایا کے لیے کسی بھی درجے کی معمولی سے معمولی پریشانی کا باعث بنے۔ وہ اپنے حوالے سے انہیں ہمیشہ سر بلند اور سرخرو دیکھنے کی خواہش مند تھی...... اور اس کے لیے اپنے جسم اور جان پر ہزار ہا صدمے سہنے کے لیے تیار تھی۔

ایک روز بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ تایا ابا گھر میں ہی تھے۔ فرہاد بھی آیا ہوا تھا اور ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ نور کو ٹریننگ سینٹر جانا تھا۔ بڑے تایازاد بھائی شرجیل کو کوئی کام تھا اور وہ گاڑی لے کر گیا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر تایا ابا یا عثمان اسے موٹر بائیک پر لے جاتے تھے۔ آج بھی یہی پروگرام تھا مگر پھر بارش شروع ہو گئی۔

''تایا ابا! مجھے دیر ہو جائے گی۔ آج میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' نور نے ڈرائنگ روم میں جا کر اور ذرا ٹھنک کر کہا۔

بادل گرج رہے تھے اور بارش برسنا شروع ہو گئی تھی۔ تایا ابا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ''ایسا کرو تم فرہاد

بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ یہ تمہیں چھوڑتا ہوا نکل جائے گا، واپسی پر شرجیل لے آئے گا۔"

"لیکن تایا ابا......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا جی! میں کہہ رہا ہوں نا کہ چلی جاؤ۔" تایا ابا نے اعتماد سے کہا۔ فرہاد کے پاس چھوٹی سوزوکی مہران تھی۔ وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ہلکی بارش ہو رہی تھی لیکن پھر سہ پہر میں ہی اندھیرا چھا گیا اور تابڑتوڑ مینہ برسنے لگا۔ یہ جولائی کا وسط تھا اور مون سون کی دوسری بارش تھی۔ انہیں ریواز گارڈن سے قذافی اسٹیڈیم کی طرف جانا تھا۔ ابھی وہ نہر والی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں شدید ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑا ہورڈنگ سڑک پر گر گیا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہے اور گاڑیاں آمنے سامنے سر جوڑے کھڑی ہیں۔ ایسے شدید موسم میں عام طور پر ٹریفک پولیس بھی دائیں بائیں ہو جاتی ہے اور پھنسی ہوئی سیکڑوں گاڑیاں قدرت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ گاڑی موڑ لی جائے۔" فرہاد نے کہا۔

"ہاں، وہ دیکھیں اور لوگ بھی مڑ رہے ہیں۔" نور نے تائید کی۔

فرہاد نے پھرتی سے گاڑی موڑ لی۔ اب انہیں ایک لمبا چکر کاٹ کر کینال روڈ پر پہنچنا تھا مگر وہ دو تین سو میٹر دور ہی گئے ہوں گے کہ یہاں بھی ٹریفک جام ملا۔ فرہاد نے بہتر سمجھا کہ گاڑی ریس کورس پارک کی پارکنگ میں لے جائے۔

انہوں نے گاڑی پارکنگ میں روک دی اور سڑک کی صورتِ حال بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش اتنی تابڑتوڑ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اردگرد کے راستوں پر کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ اب اگر ٹریفک کھل بھی جاتا تو وہ اتنی جلدی یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔" نور بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "میڈم فرحانہ سینٹر میں پریشان ہوں گی۔ ادھر تایا جان کو گھر میں فکر ہو گی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں نور، وہ سامنے پی سی او نظر آ رہا ہے۔ میں انکل شکیل کو فون کر دیتا ہوں۔"

"ابھی ٹھہر جائیں، بارش تیز ہے۔" نور نے کہا۔

آدھا پون گھنٹا مزید گزر گیا۔ بارش کچھ دیر کے لیے ہلکی ہو کر پھر تیز ہو جاتی تھی۔ سیوریج کے نظام میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے اردگرد کی سڑکوں پر پانی کی سطح بلند ہوتی جا رہی تھی۔ آخر نور کے منع کرنے کے باوجود فرہاد نے اپنی جینز گھٹنوں تک اڑسی اور فون کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی اور نور کو تشویش لاحق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی مگر تھی تو لڑکی ہی۔ آخر فرہاد واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جو اس نے شاپر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

"ہو گیا فون؟" نور نے پوچھا۔

"بالکل ہو گیا۔ انکل نے ہی اٹھایا تھا، پریشان تھے۔ انہوں نے سینٹر میں فون کیا تو وہاں سے میڈم فرحانہ نے انہیں بتایا کہ نور نہیں پہنچی۔"

"مجھے یہی پریشانی تھی۔"

"نہیں۔ میں نے انہیں پوری تسلی دے دی ہے اور کہا ہے کہ وہ میڈم کو بھی آگاہ کر دیں۔"

اس طرف سے پریشانی ختم ہوئی تو نور نے شاید پہلی بار اردگرد کے موسم کی نیرنگی پر دھیان دیا۔ دور تک ریس کورس پارک کے خوب صورت سبزہ زار نظر آ رہے تھے۔ ان میں درخت تھے اور پھولوں کے تختے تھے ...... اور روشیں تھیں۔ یہ سب کچھ تسلسل کے ساتھ مون سون کی اس دھواں دھار بارش میں بھیگ رہا تھا۔

"یہ لیں جی! کے ایف سی کے برگر۔ مجھے پتا تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔" فرہاد نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے؟"

"اگر میں کہہ بھی دوں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔ آپ ہر وقت جسمانی مشقت کی صورتِ حال میں رہتی ہیں۔ عام لوگوں کی نسبت آپ کو انرجی کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"تو پھر عام لوگ اپنے لیے برگر کیوں لے آئے ہیں؟" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔" وہ اپنے بھیگے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔

اس نے ایک برگر نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور نے ابھی دو بائٹ ہی لیے تھے کہ وہ پکارا۔ "ٹھہریے ٹھہریے محترمہ! آپ کا زنگر تو یہ رہا۔ یہ میرا ویلیو برگر ہے۔" اس نے نور والا برگر اس سے لے کر دوسرا تھما دیا۔

زنگر واقعی نور کو پسند تھا مگر فرہاد کی اس حرکت میں تھوڑی سی شوخی اور چالاکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ

کر" برگر" نور کو تھما دیا تھا۔ اب وہ اس کے چھوٹے برگر کو بڑے اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا۔ یہ ایک معنی خیز اشارہ تھا۔ نور کے سارے جسم میں جیسے سنسنی اور انبساط کی ایک لہری دوڑی۔

اس نے بائٹ لیتے ہوئے کن انکھیوں سے فرہاد کی طرف دیکھا۔ وہ یوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ دلکش شخصیت کا مالک تھا اور یہ دلکش شخصیت دن بدن اس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔

کولڈ ڈرنک کا سپ لے کر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ "یہ راستے بھی کیا چیز ہوتے ہیں نور! اپنوں کو غیر اور غیروں کو اپنا بنا دیتے ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر اس روز میں خلافِ معمول اس سڑک سے گزر کر آفس نہ جا رہا ہوتا تو آپ سے اور انکل سے بھی ملاقات نہ ہو پاتی۔"

"ہاں، راستے کیا چیز ہوتے ہیں اور یہ بارش بھی کیا چیز ہوتی ہے...... دو اچھے بھلے بندوں کو ایک گاڑی میں بند کر کے، فلسفیوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔" وہ بولی۔

"تو میں آپ کو فلسفی لگ رہا ہوں؟"

"باتیں تو ایسی ہی کر رہے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"آپ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔"

"ویسے برا نہ مانیے گا۔ یہ بڑا گھسا پٹا فقرہ ہے۔"

"الفاظ اہم نہیں ہوتے محترمہ، ان کا مفہوم اور ان کی تاثیر اہم ہوتی ہے۔"

اچانک سامنے آسمان پر بجلی کا نہایت زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ نور نے بے ساختہ فرہاد کا بازو تھام لیا۔ اس کی انگلیاں جیسے اس کے سڈول بازو میں کھب سی گئی تھیں۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ ہٹا بھی لیا۔ بارش کی بوچھاڑیں تیز ہو گئیں۔

فرہاد نے کہا۔ "آپ بہادر لڑکی ہیں۔ چھوٹی موٹی لڑکیوں سے بہت مختلف لیکن ہیں تو لڑکی۔" اس کا اشارہ یقیناً اس گرفت کی جانب تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نور نے اس کے بازو پر بنائی تھی۔

وہ اپنے نیلے اسکارف کو درست کرتے ہوئے بولی۔ "شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر آپ تھوڑی سی "مزید لڑکی" ہوتیں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"فلموں ڈراموں میں تو لڑکیاں ایسے موقعوں پر ڈر کر قریبی مرد حضرات کے اوپر ہی گر جاتی ہیں۔"

"آپ کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہے۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"سس...... سوری۔"

وہ ذرا توقف سے گویا ہوئی۔ "میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر پانی کافی کم ہو گیا ہے۔"

فرہاد نے ٹھنڈی سانس لی۔ پانی واقعی ایک دم کم ہونا شروع ہو گیا تھا حالانکہ بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فرہاد کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اتنے خوب صورت موقع کو یونہی بغیر "پیش رفت" کے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ کبھی سڑک کو دیکھ رہا تھا، کبھی آسمان کو۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" نور نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا...... اس کی خوب صورت آنکھوں میں پھر ہلکی سی شوخی عود کر آئی۔ "او کے۔" اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ تین چار بار سیلف لگایا لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ "ہو جا...... ہو جا۔ میری جان کی دشمن ہو جا......" وہ بڑبڑایا۔

پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے نور صاحبہ! گاڑی ہم سے متفق نہیں۔ وہ اس موسم سے تھوڑا سا اور لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔"

"کچھ لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ سمجھ دار سمجھتے ہیں...... مثلاً، ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس وہی جانتے ہیں کہ گاڑیوں میں چور سوئچ بھی ہوتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ہے میں نے چور سوئچ دبایا ہے؟"

"میرا خیال بھی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ حرکت فرمائی ہے۔"

"او گاڈ...... تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں۔"

فرہاد نے بے بسی کی اداکاری کی اور تھکے ہوئے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی پھر ذرا توقف سے بولا۔ "ویسے برا نہ مانیے گا۔ کیا آپ کا بھی کوئی چور سوئچ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے؟"

"یہ کیا سوال ہوا۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"دراصل، مجھے لگتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے جس کے سبب آپ نے اپنی خاص قسم کی دھڑکنوں کو بند کیا ہوا ہے...... پلیز، اس سوئچ کو آف کریں۔ دل کو دھڑکنے دیں، آزادی سے...... جب وہ دھڑکے گا تو زندگی کی رگوں میں خون خود ہی اپنے راستے تلاش کرنا شروع کر دے گا۔"

"مجھے شاید نئے راستوں کی ضرورت نہیں۔ میں جس راستے پر چل رہی ہوں، وہی میرے لیے کافی ہے۔"

"دیکھا نا۔ ہے چور سوچ۔ بالکل ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

اس کے انداز نے نور کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ "اچھا اب چلیں۔ ابھی اندھیرا ہو جائے گا۔"

"لیکن...... آپ نے یہ سوئچ آف کرنے والا کام ضرور کرنا ہے۔ پلیز...... پلیز۔"

وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی پھر اسے لگا کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی طرح ہے۔ اس نے گھبرا کر کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

"تھینک یو...... تھینک یو۔" فرہاد نے کہا اور نیچے جھک کر گاڑی کا چور سوئچ دبا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ پارکنگ سے باہر نکلتے ہی وہ چوراہے پر پہنچ گئے۔ ٹریفک سگنل بند تھا، انہیں رکنا پڑا۔ دفعتاً نور کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر بائیں جانب کھڑی ایک ایف ایکس گاڑی پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا کرخت شکل اور چھوٹی ڈاڑھی والا جو نوجوان بیٹھا تھا، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اسے پہچان سکتی تھی، یہ وہی تھا...... ہاں، یہ وہی تھا۔ پھپھو اور بسمہ نے اس کا نام... ذوالقرنین بتایا تھا۔ یہی تھا جسے اباجی نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ بھی بڑے دھیان سے نور ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نور نے گھبرا کر اسکارف کو اپنی ٹھوڑی سے اوپر کھینچ لیا اور اپنا ایک تہائی چہرہ چھپا لیا۔ فرہاد نے اس وقت کوئی مزاحیہ بات کی تھی اور ہنس رہا تھا۔ نور کو اس کی بات کی سمجھ آئی تھی اور نہ اس کی ہنسی کی، اس کے اندر تو جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے ایف ایکس پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً وہ مولانا حبیب کا بیٹا قاری ذوالقرنین تھا اور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران میں فرہاد نے بھی نور کی بے چینی کو نوٹ کر لیا۔ وہ بولا۔ "کیا بات ہے نور...... آپ کچھ پریشان ہو گئی ہیں؟"

"نہیں، پریشان تو نہیں۔" اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

اسی دوران میں سگنل سبز ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ فرہاد آگے نکل گیا۔ ذوالقرنین غالباً آخر تک نور کو دیکھتا رہا تھا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جا کر نور نے سائڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نیلے رنگ کی ایف ایکس اب بھی ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ نور کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔

اب ایف اے ایس کا ٹائم تو گزر چکا تھا، اس لیے نور واپس گھر ہی جا رہی تھی۔ مزنگ چونگی کے چوراہے پر نور نے ایک بار پھر عقب نما میں جھانکا، نیلی گاڑی عقب میں موجود تھی مگر پھر آگے جا کر وہ نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

رات کو نور دیر تک جاگتی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ ذوالقرنین نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، وہ شکوک و شبہات سے اٹی ہوئی تھیں۔ کیا وہ اس بارے میں کسی کو آگاہ کرے گا؟ کہیں وہ یہ بات نور کے گھر اور اس کے اباجی تک تو نہیں پہنچا دے گا؟ اور اگر ایسا ہوا تو اباجی جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، ان کا ردعمل کیا ہوگا؟

اس نے سوچا کہ کیا وہ اس حوالے سے پیش بندی کرے اور پہلے ہی تایا جی اور تائی جی کو بتا دے؟

اگلے روز وہ قریبی مارکیٹ میں گئی اور وہاں سے بسمہ کی ایک دوست کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ بسمہ پی سی او سے تایا کے فون پر رابطہ کرے یا خود گھر آ کر اس سے ملے۔ شام سے کچھ دیر پہلے گھر کے فون پر بسمہ کی کال آ گئی۔ نور نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "بسمہ! گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟"

"بس اسی طرح کی خیریت ہے جس طرح کی چل رہی تھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نن...... نہیں...... مگر مجھے پریشانی تھی۔ انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد میری ایک تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی۔ اباجی کی نظر سے تو نہیں گزری؟" نور نے بات بنائی۔

"گزری بھی ہوگی تو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ آج کل بالکل گم صم سے ہیں نور! آپی بتول کی طرف سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔ بھائی غیاث کا رویہ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اتوار کو بڑے ماموں مراد ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپی سیڑھیوں سے گری ہے۔ ماتھے اور کلائی پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ گری ہیں یا کچھ اور ہوا ہے۔"

نور کے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔ اپنے بہنوئی غیاث کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور شاید اچھا ہی کرتا تھا کیونکہ اس کے منہ سے اکثر پتھر ہی جھڑتے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب بھی اس کے

تصور میں اپنے بہنوئی غیاث کی سخت گیری یا اپنی مرحومہ ماں کی بے بسی آتی تھی، اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے پاؤں جیسے بے ساختہ حرکت کرنے لگتے تھے۔ اس کے سینے میں ترنگ سی جاگنے لگتی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن، کچھ کر دکھانے کی تڑپ، مرد کے تسلط سے آزادی کی آرزو۔

پانچ چھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس روز والے واقعے کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ نور اب سوچنے لگی کہ شاید وہ ذوالقرنین تھا ہی نہیں۔ اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے یا شاید اسکارف کی وجہ سے وہ اسے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نور کو پہچان تو لیا ہو مگر فرہاد کو اس کا تایازاد بھائی یا ماموں سمجھا ہو۔

☆☆☆

ذوالقرنین نماز روزے کا پابند ایک پرہیزگار نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ والد مولانا حبیب اللہ ایک جانے پہچانے عالم دین تھے لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو بچوں کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔ زندگی کے ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اسی طرح شباب کے بھی۔

ذوالقرنین ان نوجوانوں میں سے تھا جو کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اسے بالغ ہوئے سات برس ہونے والے تھے اور اس کے جسمانی تقاضے شاید اس سے بھی پہلے کے تھے پھر ایک روز اس نے ماں سے کہہ ہی دیا تھا......

”امی! میرے لیے کوئی ڈھونڈیں......“

اس واقعے کے کوئی دو ماہ بعد اس نے ایک شادی میں پہلی بار مولوی اشفاق صاحب کی دختر مبین النور کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی مکمل عبایا میں تھی۔ ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ نے اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا۔

”ذوالقرنین! وہ کریم کلر عبایا والی ہے جس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔“

اس کے بعد شادی کی پوری تقریب میں ذوالقرنین کی نگاہوں میں اس کا من موہنا چہرہ گھومتا رہا تھا۔ بعد ازاں اسے ایک دن مبین النور کی ایک تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ اس کے دل کو یہ لڑکی ہر طرح سے بھائی تھی۔ اس نے کئی شب و روز اس کی سوچ میں گم گزار دیے تھے۔ اس نے آنے والے خوشگوار دنوں کی چاپیں سنی تھیں اور دھڑکنوں کو بے ترتیب محسوس کیا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آیا تھا جب یہ معاملہ فائنل ہونے جا رہا تھا...... اور تب سب کچھ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات جہاں تک پہنچی تھی وہیں پر ختم ہو گئی تھی......

اور کچھ دنوں بعد یہ اڑتی اڑتی سی بات دل گرفتہ ذوالقرنین کے کانوں تک پہنچی تھی کہ لڑکی اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر تایا کے گھر میں رہنے لگی ہے اور کھیلوں وغیرہ میں حصہ لے رہی ہے...... چار دن پہلے ذوالقرنین نے مولوی اشفاق کی بیٹی مبین النور کو پھر دیکھا تھا اور اس مرتبہ کسی شادی کی تقریب میں نہیں بلکہ بارش کی رم جھم میں ریس کورس پارک کے سامنے ایک گاڑی کے اندر۔ وہ ایک خوبرو نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور ذوالقرنین کی طرف دیکھ کر بے طرح ٹھٹک گئی تھی۔ تب سے ذوالقرنین کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکی کچھ غلط سلط چکروں میں پھنس چکی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ اپنی بہن خدیجہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرے...... لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ ایک بار خود اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے یہ کھوج بھی لگا لیا تھا کہ نور اس روز جس خوبرو لڑکے کے ساتھ دیکھی گئی تھی، اس کا نام فرہاد رازی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کے ہفت روزہ میگزین میں کام کرتا ہے اور آج کل نور کے تایا خلیل مہرا صاحب کے گھر میں اس کا بہت آنا جانا ہے۔ یہ معلومات اس نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے حاصل کی تھیں۔ یہ دونوں دوست ایک مقامی تنظیم اصلاحِ معاشرہ کے کارکن تھے۔ کچھ عرصے سے ذوالقرنین بھی اسی تنظیم کا رکن تھا۔

☆☆☆

نور ٹریننگ سینٹر ایف اے ایس میں موجود تھی اور اسٹریچنگ کی ورزشیں کر رہی تھی۔ کوچ میڈم فرحانہ کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں دیگر لڑکیوں کو انسٹرکشن وغیرہ دینا بھی نور کی ذمے داری تھی۔ اتنے میں چوکیدار زمان خان نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ ”بی بی صیب! ایک بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت دیر سے ضد کر رہا ہے۔ اپنا نام ذوالقرنین بتا رہا ہے۔“

نور کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ اس نے پونی ٹیل کس کر باندھی۔ اپر پہنا پھر اسکارف لیا اور باہر پہنچی۔ وہ میڈم فرحانہ کے آفس میں بیٹھا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ”السلام علیکم“ کہا۔

”جی فرمائیے۔“ نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"اہم بات ہے۔ کیا آپ مجھے بیٹھنے کا نہیں کہیں گی؟"

پہلے تو نور کے جی میں آئی کہ نفی میں جواب دے پھر اس نے خود کو سنبھالا اور میڈم کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی کہنا ہے چند لفظوں میں کہہ دیں۔"

"چند لفظوں میں کہنے والی بات ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔" وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "آپ کو تسلی سے سننا ہوگا۔ ورنہ میں کسی اور وقت آ جاؤں گا۔"

"آپ کوئی بہت بڑا انکشاف نہیں فرمانے والے، آپ نے مجھے گاڑی میں تایا جان کے دوست کے ساتھ دیکھا ہے اور اب اسی سلسلے میں کوئی بے کار بات ارشاد کرنے والے ہیں۔"

"میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ آپ گمراہی کی طرف جا رہی ہیں۔ آپ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کے والد مولوی اشفاق ایک عزت دار آدمی ہیں۔ آپ کیوں ان کو رسوا کرنا چاہ رہی ہو؟" وہ نور کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔

"دیکھو مسٹر! تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم خوامخواہ ٹھیکیدار بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"اگر تمہیں اپنے اچھے برے کی تمیز ہوتی تو اپنے محسن اور اپنے بدخواہ کو پہچانتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔"

"بلیک میل کر رہے ہو؟ ٹھیک ہے بتاؤ جس کو بتانا ہے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے......"

"اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم ایک نہیں کئی غلط کام کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ نہ بھی ہو تو انسانیت کے طور پر میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ یہ پتلونیں کس کے چھلانگیں مارنا، فٹ بال اور جوڈو کراٹے کھیلنا، کیا یہ لڑکیوں اور عورتوں کے کام ہیں؟ قدرت نے عورت کو صنفِ نازک بنایا ہے، اس کی کچھ اور ذمے داریاں ہیں، اس کی محنت مشقت کے کچھ اور میدان ہیں۔"

"ہاں کچن میں برتن دھونا، ڈھیروں کپڑے استری کرنا، سستے بازاروں میں جا کر بچوں کے لیے شاپنگ کرنا...... یہ ہیں اس کے میدان...... تم جیسے لوگ ہیں مسٹر ذوالقرنین! جنہوں نے اسلامی دنیا کی نصف آبادی کو مُردار بنا کر رکھ دیا ہے، اپنی یہ تقریر تم اپنے پاس رکھو تو بہت بہتر ہے۔"

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

ذوالقرنین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

وہ واپس ہال کمرے میں جا کر بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بندہ جا چکا ہے۔

تین چار دن پھر تناؤ میں گزرے۔ نور کو اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ردعمل ظاہر ہو۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ اب کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔ کسی اور سے، اس کی مراد نور کے ابا جان کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟

بہرطور خیریت ہی گزری۔ نور اب فرہاد کے سلسلے میں زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ وہ دو تین بار گھر بھی آیا مگر نور نے اس کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ حسبِ معمول اسے کالج چھوڑنے اور واپس لانے کے لیے ماموں مراد کی ڈیوٹی تھی۔ ایف اے ایس کی آمدورفت تایا ابا کے ذمے تھی۔ تایا اب اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے تھے اور شب و روز اس کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے۔ وہ تہجد بھی پڑھتے تھے۔ ایک رات نور کھانسی کی دوا لینے کے لیے اٹھی تو اس نے چار بجے کے لگ بھگ تایا ابا کو مصلے پر بیٹھے اور اشک بار آنکھوں سے دعا مانگتے دیکھا۔ نور کو دیکھ کر انہوں نے دعا ختم کی اور اس سے اٹھنے کی وجہ پوچھی تو نور نے بتایا کہ یونہی رات کے کھانے میں دہی پکوڑیاں کھالی تھیں جس کی وجہ سے کھانسی ہو رہی ہے۔

وہ مضطرب ہو گئے۔ "اگر زیادہ مسئلہ ہے نور تو ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ تمہیں اس طرح کی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے۔ سالانہ ایونٹ میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہیں ہر طرح فٹ ہونا چاہیے۔"

اس نے تایا ابا کو تسلی دی اور بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

وہ بالکل ٹھیک تھی...... لیکن شاید بالکل ٹھیک نہیں بھی تھی۔ وہ فرہاد سے مکمل گریز کر رہی تھی مگر اس گریز میں شاید اس کا دل اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک دن دور سے فرہاد کا ستا ہوا چہرہ دیکھا تھا اور اس کے سینے میں ایک درد سا لہریں لینے لگا تھا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں خود ہی سے پوچھا...... "کیا تم فرہاد کو چاہنے لگی ہو؟"

جواب نفی میں نہیں تھا۔ اسے ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ ان راستوں پر چلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے کھیل پر مرکوز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے ایسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی لغزش بھی نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے تایا ابا کو ابا جان کے سامنے یا دیگر لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے اندر ایک

چنگ سی رہنے لگی۔ وہ ٹریننگ میں بھرپور حصہ لے رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت اس کے تصور میں فرہاد کا ستاہوا اداس چہرہ بھی آجاتا تھا۔

ایک دوپہر جب گھر میں سب سو رہے تھے، فون کی بیل ہوئی۔ نور نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فرہاد تھا۔ نور کی آواز پہچان کر وہ فوراً بولا۔ ''پلیز نور! فون بند نہ کرنا۔ میں آپ سے بس ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ ٹھنڈی سی سانس لے کر رہ گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کہیے میں سن رہی ہوں۔''

''نور! مجھے لگتا ہے کہ اس روز میں نے گاڑی میں آپ سے جو بے تکلف باتیں کیں، وہ آپ کو بری لگی ہیں۔''

''بری نہیں لگیں تو اچھی بھی نہیں لگیں۔'' اس نے مبہم جواب دیا۔

''میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں...... اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''چلیں، آپ وعدہ کرتے ہیں تو اچھی بات ہے۔''

''لیکن صرف ایک درخواست ہے میری۔''

''فرمائیں۔''

''صرف ایک بار...... آپ سے دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن فون پر نہیں آپ کے سامنے بیٹھ کر۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے ابھی جو وعدہ کیا ہے وہ آغاز ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔''

''نہیں نور! یقین کریں میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے۔ اپنی وجہ سے میں آپ کے ماتھے پر ایک چھوٹی سی شکن دیکھنا بھی نہیں چاہوں گا۔ مجھے آپ کے صرف دس پندرہ منٹ درکار ہیں، جہاں بھی آپ کہیں۔''

نور صاف انکار کر دینا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں کیوں نہ کر سکی۔ کچھ فرہاد کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ وہ اسے سخت جواب نہ دے سکی۔

تایا جان فرنیچر کا کام کر رہے تھے۔ وہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں چنیوٹ جاتے تھے اور پھر گجرات کا چکر لگاتے ہوئے اگلے روز واپس آتے تھے۔ دو روز بعد وہ جانے والے تھے، ان کی غیر موجودگی میں گاڑی بھی ان کے پاس ہی ہوتی تھی، ایک دن کے لیے نور کو رکشا پر ایف اے ایس جانا پڑتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ رکشا پر گئی اور گلبرگ مارکیٹ کی ایک کیفے شاپ میں اس نے آدھ پون گھنٹے کے لیے فرہاد سے بات چیت کی۔ اس نے چادر کا نقاب کیا ہوا تھا اور آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ فرہاد نے بڑے سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں نور کی سماعت تک اپنے دل کی بات پہنچائی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا اس کے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ نور کا جواب بھی حوصلہ شکنی والا نہیں تھا۔ تاہم اس نے دو باتیں فرہاد پر بالکل واضح کر دیں۔ اس نے کہا کہ اس کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ اس کے بڑوں نے کرنا ہے اور وہ ان کے اس حق میں ایک ذرا سی کمی بیشی کی بھی متحمل نہیں ہے...... کیونکہ وہ پہلے ہی اس حق کے حوالے سے بہت شرمندہ ہے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ فی الحال اس کی ساری کی ساری توجہ اپنے گیم کی طرف ہے، اس کے تایا ابا نے جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا ہے، وہ اسے پورا کرنا چاہتی ہے...... جب وہ اس مرحلے سے نکل جائے گی تو پھر شادی وغیرہ کا معاملہ زیرِ غور آئے گا۔ تب تک وہ فرہاد سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ہاں ان کے دلوں میں جو کچھ موجود ہے، وہ موجود رہے گا اور وہ اس حوالے سے دعا گو رہیں گے۔

یہ دوسری شرط کافی کڑی تھی۔ فرہاد نے بصد منت و سماجت نور سے اتنی سی رعایت لے لی کہ مہینے میں فقط ایک بار وہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے بات کر لیا کریں گے اور وہ بھی فون پر۔

وہ بے حد خوش گفتار تھا۔ اس کی باتوں میں محبت اور لطافت کی ایسی چاشنی تھی کہ نور اس کے پاس سے اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''نور! میں نے آپ کو پہلی بار شادی کے فنکشن میں دیکھا تھا، آپ نے بڑے کلرفل کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ آپ کو بالکل سادہ لباس میں دیکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو ایک بار پھر رنگین لباس میں دیکھوں۔ لگتا ہے کہ اگلے ہفتے شاید میری یہ مراد پوری ہو جائے۔''

''کیا مطلب؟'' نور نے اپنی لمبی پلکیں جھپکیں۔

''آپ کے کالج میں گیٹ ٹوگیدر ہے، چھوٹے موٹے کھیل بھی ہوں گے۔ مجھے رسالے کی طرف سے کوریج کے لیے آنا ہے......''

بننا سنورنا نور کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ لڑکپن میں جب وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتی تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔ ایسا عموماً شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی ہوتا تھا...... اور اس وقت تو نور کی باقاعدہ ہنسی چھوٹ جاتی تھی جب وہ دیکھتی کہ ابا جان کے ڈر سے ان کا سارا بناؤ

سنگھار بھاری اوڑھنیوں کے نیچے چھپ گیا ہے اور وہ زرق برق کپڑے پہن کر جس طرح لپٹی لپٹائی ہوئی، تقریب میں گئی تھیں اسی طرح واپس آ گئی ہیں۔

لیکن آج وہ خود کو بناؤ سنگھار کے لیے تھوڑا سا مجبور پا رہی تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط سے ہی کام لیا۔ ہلکی سی لپ اسٹک، تھوڑا سا فیس پاؤڈر اور بائیں کلائی میں چند چوڑیاں، لباس بھی زیادہ شوخ نہیں تھا۔ کالج کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں میلے کا سماں تھا، بے شمار اسٹالز اور تفریح کے لوازمات تھے۔ اس کی کولیگ شاہینہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی آج کل پوری تندہی سے صوبائی سطح کے مقابلوں کی تیاری کر رہی تھی۔

فرہاد اور چند دیگر اخباری نمائندے اس تقریب میں چکرا رہے تھے۔ فرہاد کے ساتھ ایک خاتون فوٹو گرافر تھی۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا نور تک آ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد بولا۔ ”آپ کو رنگین لباس میں دیکھنے کی خواہش تو کسی حد تک پوری ہوئی...... مگر...... یہ جو چلمن ہے دشمن ہے ہماری۔“

”اور یہ ہمیشہ دشمن ہی رہے گی۔“ نور نے مستحکم لہجے میں کہا۔ (چلمن سے فرہاد کی مراد، نور کا اسکارف تھا)۔

”چلیں، کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی شکر کا مقام ہے۔“ فرہاد نے نور کے سراپا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

نور کو اپنے رخساروں پر شرم کی تمتماہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔ ”اب اگر آپ کسی اور طرف تشریف لے جائیں تو بہتر نہیں؟“

”اور کہاں جائیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

”جی ہاں، الو کو بھی اجالے میں کچھ نظر نہیں آتا۔“ نور نے کہا اور ایک دوست کو پکارتی ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شاہینہ بھی وہاں آ گئی۔ وہاں مٹکا ریس اور بوری ریس ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکیوں نے نور اور شاہینہ سے کہا کہ وہ بھی ان ریسوں میں حصہ لیں۔

میڈم فرحانہ نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”بھئی یہ دونوں تو اب اپر لیول کی رنرز ہیں۔ یہ ان دوڑوں میں حصہ لیں گی، تو دوسری لڑکیوں کا حق مارا جائے گا۔“

وہ دونوں ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور یہ مقابلے دیکھنے لگیں۔ شاہینہ ذرا چبھتی ہوئی سی نگاہوں سے نور کو دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ”یہ لڑکا تمہارے ارد گرد کیوں گھوم رہا تھا؟“ اس کا اشارہ فرہاد کی طرف ہی تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں...... یونہی انٹرویو کا ماحول بنا رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔“

شاہینہ اب بھی تیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ”دیکھو نور! ہمارا آپس میں کمپٹیشن ہے لیکن ہم دوست بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بھلائی چاہتی ہیں۔ ہمیں اس طرح کے معاملوں سے دور رہنا چاہیے۔“

”کس طرح کے معاملوں سے؟“ نور نے گڑبڑا کر پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ یہ سب لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں کھینچ کر سیڑھی سے گرا دینے والے، ہمیں اس وقت سارا دھیان اپنے گیم پر رکھنا چاہیے۔ گوجرانوالہ کی نشو کی ٹائمنگ بڑی اچھی جا رہی ہے۔ ویسے بھی ایک کھلاڑی خاندان سے ہے وہ۔ فزیکلی بڑی فٹ ہے۔ ہم ذرا ڈھیلی پڑیں گی تو وہ ”لیڈ“ لے جائے گی۔“

”پتا نہیں تم نے اپنے ذہن میں کیا بنا لیا ہے۔ وہ تو بس بات کر رہا تھا مجھ سے......“

”ساری بات...... بات کرنے سے ہی شروع ہوتی ہے پھر بات گلے پڑ جاتی ہے۔ ذرا سنبھل کر رہو۔ ویسے بھی تم نے ایک بہت بڑا چیلنج قبول کیا ہوا ہے۔ والد کو ناراض کر رکھا ہے اور انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ ایسا ہو جائے جو ان کو مزید خفا کر دے۔“

شاہینہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ اندر سے کانپ سی گئی۔ بہرحال اس نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”اس بارے میں تم بے فکر رہو ڈیئر! باقی جہاں تک نشو کی بات ہے۔ اس کا غرور تو ہم دونوں میں سے کسی ایک نے توڑ ہی دینا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کافی منہ پھٹ بھی ہے، میڈم کے بارے میں کچھ الٹی سیدھی باتیں بھی کی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایف اے ایس کی آڑ میں مال بنا رہی ہے......“

ابھی نور اور شاہینہ میں بات ہو ہی رہی تھی کہ ان کے عقب میں کچھ لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ وہ گوجرانوالہ سے آئی تھیں اور نشو عرف نشو بکلی کی سپورٹر تھیں۔ ان میں سے دو تین نے نشو کی تصویر والے پوسٹر بھی اٹھا رکھے تھے اور سالانہ مقابلوں میں نشو کو فیورٹ قرار دے رہی تھیں۔ انہوں نے شاہینہ اور نور پر آوازے کسے۔ خاص طور سے نور کو نشانہ بنایا اور اسے نور پینڈو قرار دیا۔

نور کی حمایت کرنے والی لڑکیوں کے ایک گروہ نے اس ہوٹنگ کا بھرپور جواب دیا۔ جھگڑے کی صورتِ حال

پیدا ہوگئی۔ منتظمین نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔
نور نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ٹریننگ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سالانہ صوبائی مقابلے جیتنے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کے پیچھے اپنے ابا جان کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ سو میٹر کا ٹائٹل جیت گئی تو یہ اتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ ابا جان کا دل موم ہوجائے گا۔ ایک بار وہ خود کو ثابت کردے پھر ابا جان کی بات مانتے ہوئے وہ کھیل کا میدان چھوڑ دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی انہونی ہوجاتی اور ابا جان کچھ شرائط کے ساتھ اسے ایتھلیٹکس کے ساتھ جڑے رہنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ کسی وقت اس کی ٹائمنگ 12.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی اور یہ نشو بکلی کی عمومی ٹائمنگ سے بہتر تھی۔

ذوالقرنین والا معاملہ بھی بظاہر سرد خانے میں چلا گیا تھا۔ تین چار ہفتے گزر چکے تھے، اس کی طرف سے مزید کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس "ایڈونچر" میں اس کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ نور ڈرنے اور دبنے والی لڑکی نہیں تھی۔

فرہاد والی صورتِ حال بھی جوں کی توں تھی۔ اس نے نور سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر کاربند تھا۔ کسی وقت آمنا سامنا ہوجاتا تو اس کا رویہ اتنا نارمل ہوتا کہ کسی کے لیے کسی طرح کے شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مہینے کے آخر میں طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف ایک بار چند منٹ کے لیے دونوں میں ٹیلیفونک رابطہ ہوا۔ یہ مختصر سا بے ضرر رابطہ نور کو بڑا اچھا لگا۔ اس کے اندر جیسے ایک خلا سا پورا ہوگیا۔ ایک بے نام خوشی اس کے اندر پیدا ہوئی...... ہاں کوئی تھا جو دل کی گہرائی سے اسے چاہتا تھا...... اس کے لیے دعا کرتا تھا...... اسے سوچتا تھا اور اس کی آس رکھتا تھا۔ یہ احساس بڑا حوصلہ افزا اور توانائی بخش تھا۔

دوسری طرف شاہینہ کے پندونصائح بھی جاری تھے۔ وہ بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔

اس روز نور نے اقرار نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ جان چکی تھی کہ نور اور اسپورٹس ایڈیٹر فرہاد رازی کے درمیان کوئی "راز" موجود ہے۔ وہ اکثر اسے فون کردیتی اور محتاط رہنے کی یاددہانی کراتی۔

ایک دن نور نے مذاق میں کہہ ہی دیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں شاہینہ کہ تم خود...... اس میں دلچسپی محسوس کرنے لگی ہو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم رہو گی پینڈو کی پینڈو ہی۔ تمہارے بھلے کا کہتی ہوں۔ ان ماڈرن شہری لڑکوں کے داؤ پیچ بتا رہی ہوں تمہیں۔ ٹھیک ہے، نہیں تو نہ سہی۔" اس نے فون بند کردیا۔

نور اپنی جگہ بیٹھی کچھ دیر مسکراتی رہی پھر اس نے شاہینہ کو رنگ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں اس نے کال ریسیو کی۔ سوری کرنے کے بعد نور بولی۔ "یار! مذاق کررہی تھی۔ تمہاری ہمدردی اور محبت ہر شبہے سے بالاتر ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میری حدیں اور میری ذمے داریاں کیا ہیں اور یہ بھی پتا ہے کہ نشو ہم دونوں کی مشترکہ حریف ہے۔ ہمیں اسے ہرانا ہے اور ہر صورت ہرانا ہے......"

"اور مجھے پتا ہے کہ اسے تم ہی نے ہرانا ہے۔ کل میڈم فرحانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کوچ سرمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ان دونوں کو یقین ہے کہ اگلے دو تین ہفتوں میں تمہاری ٹائمنگ میں کم از کم...... کم از کم ایک سیکنڈ کی بہتری اور آئے گی۔"

"یہ تو اللہ کو پتا ہے اور اصل فیصلہ تو اس دن اور اس وقت ہونا ہے جب فائنل اسپرنٹ لگائی جائے گی اور مجھے تو لگتا ہے کہ بہت معمولی مارجن ہوگا۔"

"کبھی تو ہوتا ہے کانٹے دار مقابلہ۔" شاہینہ نے کہا۔

سالانہ ایونٹ میں اب بس بیس روز باقی تھے۔ تناؤ میں دن بدن اضافہ ہورہا تھا۔ تایا ابا اور ماموں مراد اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ اس کی ڈائٹ کا مکمل خیال رکھا جارہا تھا اور ٹریننگ سیشن بھی باقاعدگی سے اٹینڈ کرائے جارہے تھے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت پھپھو حاجرہ کے کہے ہوئے الفاظ نور کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ انہوں نے ایک روز کہا تھا۔ "کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا نور! یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔"

ایسے وقت میں وہ کانپ جاتی۔ نماز پڑھنے کے بعد دیر تک دعا مانگتی رہتی...... "اے ربِ کریم! مجھ پر رحم فرما۔ اپنے ابا جان کے حوالے سے مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، مجھے اس کا ازالہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دل میں میرے لیے رحم ڈال دے میرے مالک۔ میں اندھی ہوگئی ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے راستہ سجھا دے۔"

ایک بار اس کے دل میں آئی کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر گھر چلی جائے اور ابا جان کے قدموں میں سر رکھ دے۔ اسے معلوم تھا کہ آپی بتول بھی ملتان سے آئی ہوئی ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ سب مل جل کر اسے ابا جی سے

معافی دلا دیتے لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر پائی ...... اور اس نے تایا ابا کی ہدایت کے مطابق سب کچھ سالانہ ایونٹ کے بعد پر چھوڑ دیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس ایونٹ میں نور کی کامیابی کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ شاہینہ کے حوالے سے بھی توقعات بہت بلند تھیں۔ مقابلے سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ نور نے آخری پہر کو اٹھ کر دیکھا۔ تایا ابا حسب معمول تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی میں وضو کا یا شاید...... آنسوؤں کا پانی چمک رہا تھا۔ انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور جینز کی پتلون پنڈلیوں کے وسط تک اڑسی ہوئی تھی۔

وہ انہیں دیکھتی رہی۔ ابا جان کی نسبت تایا ابا زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ وہ ہر معاملے کو معروضی انداز میں دیکھنے کے عادی تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے نور کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قالین پر ان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور کوئی آیت پڑھ کر اس پر پھونکی ...... پھر عجیب وجدانی سے لہجے میں بولے۔ ''نور بیٹا! تم بہت محنت کر رہی ہو اور یاد رکھو، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس حوالے سے دیر تو ہو سکتی ہے لیکن اندھیر کبھی نہیں ہوتی۔ ہمارے قائد نے یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم کی جو بات کی تھی، وہ اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جب مشکلات کے باوجود عملِ پیہم رہتا ہے تو پھر وہ مقام آ جاتا ہے جب خدا بندے سے خود پوچھتا ہے...... بندے تو بتا تو کیا چاہتا ہے۔''

اس نے تایا ابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی تایا ابا۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ سوچا ہے، اسے عملی شکل دینے کے لیے ہر حد تک جاؤں گی۔''

''مجھے یقین ہے، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ہم نے اس نامعقول کو دکھانا ہے کہ بیٹے نہ ہوں تو بیٹیاں بھی بیٹوں جیسے کام کر کے اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کر سکتی ہیں۔''

نور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ تایا ابا نے اس کا سر چوما۔ ''مجھے بیٹی کی بڑی خواہش تھی۔ شرجیل اور عثمان پیدا ہو چکے تھے۔ مہرین کی پیدائش ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر جیسے ایک بڑا خلا سا تھا۔ وہی دن تھے جب اشفاق کے ہاں تم نے جنم لیا۔ تم سارے گھر کی اور خاص طور سے میری لاڈلی بن گئی تھیں۔ میں تمہیں سارا سارا دن گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ تم نے صرف سات ماہ کی عمر میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ سب دنگ رہ گئے تھے۔ ایک سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تم باقاعدہ بھاگنے لگی تھیں۔ میں تمہیں مشکل سے پکڑتا تھا اور تمہیں لان کی گھاس پر لٹا کر تمہاری ٹانگیں دبایا کرتا تھا...... تمہیں وہ باتیں تو یاد نہیں ہوں گی؟''

''کچھ کچھ...... دھندلے دھندلے سے منظر یاد ہیں تایا ابا۔''

''تم تین چار سال کی تھیں، جب میلے کے موقع پر تم سب بچوں نے حویلی کے سامنے والے باغ میں دوڑیں لگائی تھیں۔ تم نے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو ہرا دیا تھا۔ میں نے اس وقت پتا ہے تمہاری تائی سے کیا کہا تھا؟''

وہ سوالیہ نظروں سے تایا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولے۔ ''میں نے کہا تھا یہ نور ہے...... اور نور کی رفتار 299274 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔''

نور مسکرا دی۔ مصلے پر بیٹھے ہوئے تایا ابا بھی مسکرا دیے۔ نور کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولے۔ ''آج میں پھر کہتا ہوں۔ تم نور ہو......''

تایا ابا کی باتوں نے نور میں ایک نئی امنگ، ترنگ پیدا کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس موقع پر اس کا یہ دل بھی چاہا کہ وہ تایا ابا کو فرہاد کے حوالے سے تھوڑا بہت بتا دے۔ اشارتاً ہی ذکر کر دے لیکن پھر اس نے یہ کام بھی ایونٹ کے بعد تک اٹھا رکھا۔

☆☆☆

سو میٹر کی دوڑ کا ٹریک تھا اور کالج کے گراؤنڈ میں یہ ایک طرح کی فائنل ریہرسل تھی۔ کوچ میڈیم فرحانہ نے کہا۔ ''نور! تم سمجھو کہ مقابلہ کل نہیں آج ہے اور یہ تمہاری فائنل ہیٹ ہے۔ اس میں تم نے اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ گھٹنوں پر جھک جاؤ، اپنے پاؤں کو فٹ بلاکس پر پوری طرح ایڈجسٹ کرو۔ نظر ٹارگٹ پر...... اور یہ بات یاد رکھو اسٹارٹ کی بے حد اہمیت ہے۔ او کے...... تم تیار ہو؟''

''یس میڈم!'' نور نے جھکے جھکے اپنا سر اٹھایا اور ٹارگٹ پر نگاہیں جما دیں۔

''ایک بار پھر کہہ رہی ہوں۔ تم نے ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ کانوں کو پسٹل کی آواز پر مرکوز رکھو...... ریڈی......''

نور نے سانس اندر کی طرف کھینچی۔ اس کی تمام تر توانائی جیسے اس کے جسم کے نچلے حصے اور خاص طور سے اس کے پاؤں میں جمع ہو چکی تھی۔ اس کے ارد گرد تین چار اسپرنٹرز اور بھی تھیں...... ہاں یہ فائنل ریہرسل تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی نور گولی کی رفتار سے اپنے

ٹارگٹ کی طرف بڑھی۔ اب تک اس کا سب سے اچھا ٹائم 12.90 تھا۔ آج وہ اس کو بیٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی توانائی کے ساتھ...... اور جب اس نے فنش لائن کراس کی، میڈم فرحانہ اور مسز وجدان کا مشترکہ نعرہ نور کے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ اپنے مومنٹم میں بیس تیس میٹر تک بھاگتی چلی گئی پھر اس نے مڑ کر اپنی کوچ اور ٹیچر کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں اسٹاپ واچز تھیں اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ نور نے 12.50 کا ٹائم حاصل کرلیا تھا اور یہ رزلٹ اس امر کی نہایت روشن امید تھا کہ وہ کل پہلی پوزیشن حاصل کرلے گی۔ بہرحال حتمی فیصلہ تو کل میدان میں ہونا تھا۔

نور کی فرینڈز نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر آج اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کرلیا تو وہ انہیں ٹریٹ دے گی۔ اب وہ اس کے درپے ہوگئی تھیں۔ نور نے سینٹر کے فون سے تایا کو کال کی اور انہیں بتایا کہ آج وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کی گاڑی پر آجائے گی۔

دراصل وہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ کر رہی تھی۔ چار دن بعد عید کا تہوار بھی تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ تو اسے فرہاد کو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ واپسی پر وہ چند منٹ کے لیے بازار میں بھی رک جائے گی اور فرہاد کے لیے کوئی گفٹ پیک خرید لے گی۔

تین فرینڈز فوکسی کار پر ایک قریبی آئس کریم پارلر میں چلی گئیں۔ نور بالکل پرہیزی ڈائٹ لے رہی تھی، ایک کپ آئس کریم کی گنجائش تو یقیناً نکل ہی سکتی تھی۔ وہ پارلر کی گیلری میں جا بیٹھیں اور آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر بعد اچانک نور کی نگاہ نیچے ہال میں ایک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بری طرح چونکی، وہاں فرہاد موجود تھا۔ اس کے دو دوست بھی تھے۔ تینوں بے تکلفی سے باتیں کررہے تھے۔ نور نے ذرا دھیان سے دیکھا اور اسے دوسری بار چونکنا پڑا۔ فرہاد سے گپیں ہانکتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک کی صورت نور کو شناسا لگ رہی تھی۔ یہ وہی سرخ شرٹ والا لڑکا تھا جس نے ان کی گاڑی سے موٹر سائیکل ٹکرائی تھی اور پھر تایا ابا سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔

یقیناً یہ وہی تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے فرہاد کے ساتھ اٹکھیلیاں کررہا تھا...... نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور ذرا، ایک ستون کی اوٹ میں ہوگئی۔ اس شخص سے فرہاد کی دوستی کب اور کیسے ہوئی؟ فرہاد نے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں کھدبدی ہونے لگی۔ آرڈر آچکا تھا۔ وہ بے دلی سے آئس کریم کھانے لگی۔ نیچے ہال کمرے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ تینوں دوستوں میں کسی بات پر تکرار چل رہی تھی۔ پھر یہ باقاعدہ جھگڑے کی شکل اختیار کرنے لگی...... دوستوں میں تفریح کے دوران میں اکثر تُو تُو مَیں مَیں کی صورتِ حال بھی پیدا ہوجاتی ہے مگر یہ کچھ زیادہ تھی۔ غالباً ان کے درمیان کسی کیمرے اور ادھار رقم کی بات ہورہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکا جس کا حوالہ سرخ شرٹ تھا، فرہاد کا گریبان دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تیسرا دوست ان دونوں کے درمیان آگیا۔ ہیڈ ویٹر اور ایک دوسرے شخص نے بھی مداخلت کی اور بہ مشکل بیچ بچاؤ کرایا۔ سرخ شرٹ والا جو آج نیلی دھاری دار قمیص میں نظر آرہا تھا، بکتا جھکتا باہر چلا گیا۔

پتا نہیں کہ اچانک نور کے دل میں کیا آئی۔ اس نے دونوں فرینڈز سے کہا۔ ”پلیز، تم دونوں ادھر ہی میرا انتظار کرو...... میں ابھی آتی ہوں۔“

ان دونوں کو حیران چھوڑ کر وہ بائیں جانب والی سیڑھیاں اتری اور اس جانب بڑھی جدھر نیلی قمیص والا گیا تھا۔

وہ لڑکا اسے پارلر سے کچھ فاصلے پر اپنی موٹر بائیک کو جھلاہٹ میں کک مارتا مل گیا۔ نور نے اپنا اسکارف ٹھوڑی سے اوپر ہونٹوں تک کھسکایا اور اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

”ایکسکیوزمی، میں آپ سے دو منٹ بات کرسکتی ہوں؟“

ایک اسمارٹ لڑکی کو اپنے روبرو دیکھ کر لڑکے کے چہرے سے جھلاہٹ رفوچکر ہوگئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”آپ کون؟“

لڑکا چند منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنی موٹر بائیک کو پھر سے لاک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ نور اس کے ساتھ چند سیڑھیاں اتر کر پارک میں پہنچ گئی۔ یہاں سایہ دار درخت تھے اور پھولوں کے پودے بھی تھے۔ وہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان جو ابتدائی گفتگو ہوئی، اس میں لڑکے کا نام پرویز معلوم ہوا اور نور پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ دو ڈھائی سال سے فرہاد کا دوست ہے۔ وہ وی سی آر اور کیمروں وغیرہ کی ریپئرنگ کا کام کرتا تھا، اس کی اپنی دکان تھی۔

گفتگو کے دوران میں پرویز نے اچانک چونک کر نور کی طرف دیکھا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

”معاف کریں۔ کہیں آپ کا نام نور تو نہیں؟ وہی جو اسپرنٹ میں حصہ لیتی ہیں؟“

نور نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''آپ کا بہت تذکرہ ہوتا رہتا ہے نور صاحبہ، وہ ...... جو کچھ آپ کے ساتھ کررہا ہے...... ہم کو پتا ہے۔''

''مم...... میں کچھ بھی نہیں؟ کون وہ؟''

''آپ سمجھ سکتیں...... تو اب تک ...... اس کے چکر سے نکل چکی ہوتیں...... خیر چھوڑیں...... اب آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ نے خود ہی اس ''الو بنو'' چکر سے نکل جانا ہے۔''

''الو بنو؟'' نور کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''جی ہاں...... الو بنایا جاتا رہا ہے آپ کو۔ سیڑھی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کسی اور تک پہنچنے کے لیے۔''

نور کے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ جیسے روہانسی ہو کر بولی۔ ''کیا...... تم یہ سب کچھ فرہاد کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''تو اور کس ذات شریف کا ذکر ہو رہا ہے۔''

پتا نہیں کیوں نور کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ پرویز نامی لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے، بے بنیاد نہیں ہے۔

اس نے اس سے درخواست کی کہ اگر اس نے یہ بات چھیڑ دی ہے تو پھر اسے ادھورا نہ رکھے۔

پرویز تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے نور سے کہا کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کل کسی جگہ مل کر یہ بات کرسکتے ہیں۔ نور کل تک کا انتظار کیسے کرسکتی تھی۔ اس نے پرویز کو مجبور کیا۔ وہ پارک سے اٹھ کر مارکیٹ کی عقبی سمت ایک کیفے میں آن بیٹھے۔ راز داری کی شرط پر پرویز نے جو کچھ بتایا، وہ شاید پرویز کے لیے تو بہت زیادہ اہم نہ ہو لیکن نور کے لیے تہلکہ خیز تھا۔ اس نے کہا۔ ''نور صاحبہ یقیناً تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ فرہاد تم سے نہیں تمہاری دوست شاہینہ سے محبت کرتا ہے اور یہ چکر تمہارے والے چکر سے بھی پہلے کا ہے۔ فرہاد اور شاہینہ کے درمیان کچھ دوری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ٹیم میں بہت زیادہ مگن ہو کر اس کو Avoid کرنے لگی تھی۔ شاہینہ میں حسد پیدا کرنے کے لیے ہی فرہاد نے تم سے راہ و رسم بڑھائی اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے۔''

''میں...... یہ نہیں مانتی۔''

''سوری مس! تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ دونوں پرکی پھر ایک ہو چکے ہیں۔ اب بہت جلد تمہیں اپنے مقام کا بھی پتا چل جائے گا۔''

نور کی نگاہوں کے سامنے ماضی قریب کے مناظر گھومنے لگے۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو شاہینہ وقتاً فوقتاً اس سے کہتی رہی تھی۔ اس نے شروع میں ڈھکے چھپے انداز میں اسے فرہاد سے دور رہنے کے مشورے دیے تھے۔ نور سے کہا تھا کہ وہ کہیں اس سے فلرٹ نہ کررہا ہو...... اور اس طرح کی کئی اور باتیں لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ نور سے فرہاد کا تعارف ایک ایکسیڈنٹ کے بعد اتفاقیہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اتفاقیہ نہیں تھا۔

پرویز نے بھی اس کی تصدیق کی۔ نور سے ایک بار پھر راز داری کا وعدہ لینے کے بعد اس نے بتایا۔ وہ سب فرہاد کی پلاننگ تھی۔ وہ دن رات شاہینہ کے لیے تڑپ رہا تھا اور اسے واپس اپنے پاس لانے کے منصوبے سوچتا تھا۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا پلاننگ کے ساتھ ہوا۔

''تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے؟'' نور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''شاید تم کوئی گواہ مانگ رہی ہو یا کوئی تصویر وغیرہ دیکھنا چاہتی ہو لیکن میں تمہیں اس کا ''لائیو'' ثبوت دے دیتا ہوں اور وہ بھی آج ہی بلکہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو پرویز صاحب؟''

''دونوں پرکی آج کل ڈیفنس کے ''اوڈی کافی ہاؤس'' میں مل رہے ہیں۔ آج بھی ملیں گے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔''

نور کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز گردش کررہی تھی۔ اس کا ذہن دھندلایا ہوا تھا۔ پرویز سے رخصت ہو کر وہ سیدھی آئس کریم پارلر پہنچی۔ اس کی دونوں دوست بے حد پریشان تھیں اور اب وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہی تھیں۔ نور نے ان سے معذرت کی۔ وہ دونوں شدید الجھن میں تھیں اور اسی الجھن میں وہاں سے رخصت ہو گئیں کیونکہ نور نے انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد نور نے گھر فون کیا اور تائی جان کو بتایا کہ اسے تھوڑی سی مزید دیر ہو جائے گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

اس کام کے بعد اس نے ایک آٹو رکشا لیا اور اس ایریا میں جا پہنچی جہاں معروف اوڈی کافی ہاؤس واقع تھا۔ وہ بڑی نکھری ہوئی روشن شام تھی مگر نور کے لیے اس میں

تاریکی اور نوحے کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... اور پھر وہ جان لیوا گھڑی بھی آئی جب اس نے کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں شاہینہ اور فرہاد کو ہنستے اور باتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرہاد فیشن کے طور پر شیشا پی رہا تھا اور شاہینہ ایک کپ سے چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ پونی ٹیل باندھے ہوئے تھی۔ شاید رننگ کرنے کے بعد سیدھی یہاں آ گئی تھی۔ کل اس نے بھی اہم ترین مقابلے میں حصہ لینا تھا۔

وہ شام اور وہ رات نور کے لیے بڑی عذاب ناک تھی۔ تایا ابا نے صدقے کے طور پر بکرے کی قربانی دی تھی۔ گھر میں سب نور کے لیے دعائیں کر رہے تھے، منتیں مان رہے تھے اور وہ جیسے اندوہ و ناتوانی کے اتھاہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ذرا سستانے کے بہانے وہ بند کمرے میں چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے فرہاد کو چاہا تھا اور دل و جان سے چاہا تھا۔ اس حوالے سے اس کی کنواری آنکھوں میں ان گنت سپنوں نے جگہ بنائی تھی۔ وہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا...... اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ندامت اور شرمندگی کے گہرے غار میں جا گری تھی۔ اس شخص نے شاہینہ کی محبت پانے کے لیے بڑی بے رحمی سے نور کا استعمال کیا تھا اور وہ بڑی سادگی سے استعمال ہوئی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی۔ ان لڑکیوں کو نادان سمجھتی تھی جو تکیے بھگوتی ہیں لیکن آج اسے خود رونا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک آنسو بہانے کے بعد اسے اپنے دل کا بوجھ قدرے کم محسوس ہوا...... مگر جو غم تھا وہ تو ہر رگِ جاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ واش روم میں جا کر بہت دیر تک منہ دھونے اور چہرے پر لوشن وغیرہ لگانے کے باوجود وہ اپنے رونے کے آثار چھپا نہیں سکی اور اس روز اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جب غم آنکھوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے چھپانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بند کمرے سے باہر سب چہک رہے تھے۔ ان کی امیدیں جوان تھیں اور وہ کل کا انتظار کر رہے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ کل جس لڑکی نے سالانہ کھیلوں میں حصہ لینا ہے وہ اندر سے مر گئی ہے۔

حوصلے کیسے ٹوٹتے ہیں، توانائی، ناتوانی میں کیسے بدلتی ہے، منزلیں نگاہوں کے سامنے کیسے دھندلاتی ہیں، یہ نور کو اس روز پتا چلا...... اور ہزاروں لوگوں کے سامنے چلا۔ وہ سو میٹر کی فائنل ''ہیٹ'' تک تو پہنچ گئی ...... مگر وہ پہلا نمبر حاصل نہیں کر سکی۔ دوسرا اور تیسرا بھی نہیں کر سکی۔ وہ چوتھے نمبر پر آئی۔ یہ بہت بڑا اپ سیٹ تھا۔ نور کے سپورٹرز کے لیے بڑا بھی اور غم ناک بھی۔ وہ تو 12.50 کی ٹائمنگ حاصل کر چکی تھی، پھر اتنا پیچھے کیسے رہ گئی۔ جو اس پر گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے۔

ریس ہارنے کے بعد نور کی نگاہ سب سے پہلے اپنے تایا ابا پر ہی پڑی۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے آنسو بہ مشکل روکے ہوئے ہیں پھر اس نے اپنی محبوب ٹیچر اور کوچ میڈم فرحانہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور تھکے تھکے انداز میں چلتی، تماشائیوں کے اسٹینڈز کی طرف آ گئی۔

تایا ابا نے آگے بڑھ کر نور کو گلے لگایا اور پیٹھ تھپکی۔ ''کوئی بات نہیں...... ہار جیت کھیل کا حصہ ہے، ہمارا کام کوشش کرنا ہے ...... اور ہمت برقرار رکھنا ہے۔'' ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

بسمہ بھی چوری چھپے یہ ریس دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے کزنوں مہرین، شرجیل اور عثمان وغیرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آدھے نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا لیکن بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے نور کو تسلی دی۔ ''کوئی بات نہیں۔ پورے پنجاب میں چوتھا نمبر ہے تمہارا۔ آگے اور چانس ملیں گے۔''

یہ ریس نشو بجلی نے جیت لی تھی۔ لاہور کی شاہینہ کا دوسرا نمبر آیا تھا۔ نشو اپنی ایسوسی ایشن کے بینر کے ساتھ پورے گراؤنڈ میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کی سپورٹر لڑکیاں ساتھ تھیں۔ نشو خاص طور پر اس جگہ رکی جہاں نور اپنے کوچز اور ساتھیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ یہاں ان سب نے خوب نعرے لگائے اور فقرے اچھالے۔ اسپیکر پر کمنٹری کرنے والے صاحب نشو کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پیشین گوئی کر ڈالی کہ نشو اسپرنٹ کے میدان کا سب سے تابناک ...... ابھرتا ہوا ستارہ ہے اور وہ نیشنل گیمز میں بھی میدان مار لے گی۔

''کوئی بات نہیں نور صاحبہ! ایسے اپ ڈاؤن آتے ہی ہیں۔'' یہ آواز نور کے عقب سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں فرہاد کھڑا تھا۔ میگزین ''سپر اسٹار'' کا وجیہہ اسپورٹ ایڈیٹر۔ اس کے خوبصورت بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ کتنا معصوم اور سادہ نظر آتا تھا۔ ہاں، یہی شخص تھا جس نے آج ایک نہایت اہم سنگِ میل نور سے چھینا تھا...... ہاں یہی تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ایونٹ کے بعد نور بیمار ہو گئی۔ اسے بخار ہوا، بعد میں پتا چلا کہ ملیریا ہے۔ وہ اس کے لیے بڑے مایوس کن دن تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو ہاری اور دھتکاری ہوئی محسوس کرتی تھی حالانکہ تایا اور تائی اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ تینوں کزن شرجیل، عثمان اور مہرین بھی ہر طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ ایک روز پھپھو حاجرہ آئیں۔ تائی راحت اس وقت مہرین کو لینے کالج گئی ہوئی تھیں۔

پھپھو نے کہا۔ "بتا کیا ملا تجھے اپنے باپ کا دل دکھا کر۔ کون سا میدان مار لیا ہے تو نے جس کی وجہ سے تیرے پالنے والوں کا سر اونچا ہو گیا ہے؟ بڑے لمبے چوڑے دعدے کر رہے تھے بڑے بھائی جان بھی......"

"آپ تایا جان کو کچھ نہ کہیں پلیز۔" نور نے کہا۔

"انہی کے بے جا لاڈ نے تیری بیڑیوں میں وٹے ڈالے ہیں۔ بھائی جان اور بھابی راحت دونوں قصوروار ہیں۔"

"پلیز پھپھو...... پلیز...... چپ ہو جائیں۔"

وہ عینک کے پیچھے سے دکھ آمیز غصے سے نور کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ "دیکھ نور! اب بھی وقت ہے سنبھل جا۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑا میڈل اور کوئی نہیں ہوتا کہ اس کے پالنے والے اس سے راضی ہوں اور اس کا گھر بس جائے۔ اپنے ابا جی سے معافی مانگ لے۔"

"آپ، معافی کہتی ہیں۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہوں مگر وہ مجھ پر کچھ رحم تو کریں۔ مجھے اس طرح تو گھر سے دھکا دے کر نہ نکالیں۔ میں نہیں کرنا چاہتی ابھی شادی۔"

"تو اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ تیرے دماغ میں کیڑا ہے...... اور وہ کیڑا یہی ہے کہ تو شاید کوئی بہت بڑی کھلاڑی بننے والی ہے۔ نہیں بنے گی تو۔ کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ جو بچے اپنے والدین کی بددعا لیتے ہیں وہ کسی جگہ بھی کامیاب نہیں ہوتے......"

پھپھو اشارتاً اس ناکامی کا ذکر کر رہی تھیں جو چند دن پہلے اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ اس ناکامی کے پیچھے کیا سنگین حالات تھے۔ کس طرح کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے کیے تھے اور اسے مٹی کا ڈھیر کر ڈالا تھا۔

وہ خود سے ہرگز ناامید نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ کر سکتی ہے۔ اپنے تایا ابا اور اپنے دیگر چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکتی ہے۔ اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کیا ہوا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

پھپھو اسے جلی کٹی سنا کر چلی گئی تھیں۔ نور ان سے گھر کے حالات پوچھنا چاہتی تھی، خاص طور سے بسمہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی کہ چودھری طغرل کے بیٹے سے اس کا پیچھا چھوٹا ہے یا نہیں...... لیکن پھپھو اسے کوئی موقع دیے بغیر بھناتی ہوئی باہر چلی گئی تھیں۔ (ویسے نور کو اتنا پتا چل چکا تھا کہ جو مقامی ایم پی اے یہ مسئلہ حل کروا رہا تھا، اسے کامیابی ملی ہے اور وہ کھاپری برادری کے لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اب ابا جان اور پھپھو وغیرہ کہیں بسمہ کی منگنی کا سوچ رہے ہیں)۔

چند دن بعد نور کا بخار اتر گیا...... اور وہ ایک بار پھر ٹریک پر آ گئی۔ اس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اس نے فرہاد کے تصور کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی کوشش کی تھی اور بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اسے تھوڑا سا شکوہ شاہینہ سے بھی تھا کہ ایک بے تکلف دوست ہوتے ہوئے بھی اس نے اسے شروع میں ہی اصل صورت حال سے آگاہ کیوں نہ کر دیا۔ اسے فرہاد سے دور رکھنے کی کوشش تو کرتی رہی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ شاید اس کی بھی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ اس سے اب بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ فرہاد سے بھی دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اور اس کے دوست ڈاکٹر ذیشان نے تایا جان کے فری کلینک میں بھی شکل نہیں دکھائی تھی۔ تایا ابا اس سلسلے میں فرہاد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا...... انہوں نے ایک اور ڈاکٹر ہائر کر لیا تھا۔ یہ بات اب پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ یہ سب فرہاد کا ڈراما تھا۔ مہرین کو بھی اس ڈرامے کا شک ہو چکا تھا۔

سب کچھ بھول بھال کر نور نے ایک بار پھر ایف اے ایس جانا شروع کر دیا۔ اب وہ نیشنل گیمز کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے کوچز اس کی طرف سے پُرامید تھے۔ وہ چھوٹے بڑے مقابلوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ اس کی ہیڈ کوچ فرحانہ بیگ نے اس کی ایک خامی نوٹ کی...... وہ کسی وقت فالس اسٹارٹ (غلط شروعات) کر جاتی تھی۔ اہم مقابلوں میں فالس اسٹارٹ کی وجہ سے بڑے بڑے ایتھلیٹ ڈس کوالیفائی ہو جاتے ہیں اور ان کے کیریئر داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ فرحانہ بیگ نے دن رات محنت کی اور نور کی اس کمی کو پچانوے فیصد تک درست کر دیا۔ وہ تکنیک کے ہر پہلو پر توجہ دے رہی تھیں۔ ٹریک پر پوزیشن کیسے لینی ہے...... فٹ بلاکس کا بہترین استعمال کیسے ممکن ہے؟ کس طرح جھک کر اپنے ہاتھوں کو اسٹارٹنگ لائن سے ٹچ کرنا ہے۔ فنش لائن پر پہنچتے ہوئے خود کو کس طرح آگے جھکانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف نور کی اہم ترین حریف نشو بجلی کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ اس کے والد اور چچا نہ صرف اسپورٹس مین تھے بلکہ سیاسی اثر رسوخ بھی رکھتے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ نشو کے اہل خانہ نے اسے پرائیویٹ طور پر انگلینڈ کا دورہ کرایا ہے۔ وہاں اس نے غیر ملکی کوچز سے بھی "ٹپس" لیے ہیں اور ممکن ہے کہ انگلینڈ سے کوئی کوچ اس کی ٹریننگ کے لیے پاکستان بھی آئے۔

شاہینہ کے حوالے سے اطلاعات تھیں کہ وہ سرگرمی سے تربیت میں حصہ نہیں لے رہی پھر ایک روز نور کی تایازاد مہرین نے اسے رازداری کے انداز میں خبر سنائی۔ "تمہیں پتا ہے کہ شاہینہ کی شادی ہو رہی ہے؟"

"کیا؟" نور حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہاں جی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا ہے اور لڑکا پتا ہے کون ہے؟"

"کون؟"

"وہی ذات شریف جس نے ہمارے روبرو رفاہ عامہ کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور ابا جان کے فری کلینک میں کردار ادا کر رہا تھا...... فرہاد رازی۔ سنا ہے کہ اس چٹ منگنی پٹ بیاہ کے پیچھے فرہاد رازی کا کوئی راز ہے۔" مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"دونوں نے تعلقات بنا رکھے تھے۔ ایک دن شاہینہ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے گر گئی۔ پتا چلا کہ وہ "پریگننٹ" ہے۔ شاہینہ کے والدین نے فرہاد کو جا دبوچا۔ وہ کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں۔ انہوں نے فرہاد کے سامنے دو آپشن رکھے۔ شادی کر دیا پھر بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ شادی بھگتنے کو تیار ہو گیا۔"

نور نے یہ سب کچھ سناٹے میں سنا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس کی دوست اور کولیگ کے "رننگ کیریئر" کا اختتام اس طرح ہوگا۔ شاہینہ اور فرہاد کی اس کہانی میں ایک کردار نور کا بھی تھا اور یہ کردار اس سے زبردستی کروایا گیا تھا۔ وہ اس کردار اور اس سے وابستہ ساری تلخ یادوں کو اب ہمیشہ کے لیے ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی۔

چند روز بعد واقعی شاہینہ کی شادی ہو گئی۔ اس شادی کی خبر نور کو ایک مشترکہ فرینڈ کے ذریعے ہی ملی تھی۔

نور پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن تھی۔ یہ بڑا کٹھن راستہ تھا۔ وہ تایا جان یا پھر ماموں مراد کے ساتھ صبح منہ اندھیرے ایف اے ایس پہنچ جاتی تھی۔ وارم اپ ہوتی، اسٹریچنگ کرتی، تب کئی کلومیٹر کی دوڑ اور پھر سو میٹر کے ڈیش لگاتی۔ وہ تھک کر چور ہو جاتی، کئی مرتبہ اسے لگتا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے خون بہہ نکلے گا۔ جب وہ جان توڑ محنت کر رہی ہوتی اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال ہوتا۔ وہ اپنے تایا جان کو سرخرو دیکھے، تایا جان بھی ہر دستیاب سہولت اس کے لیے فراہم کر رہے تھے۔

تایازاد بہن مہرین فزیوتھراپسٹ بھی تھی۔ یہ سہولت نور کو گھر میں ہی مل گئی تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہوتا تو مہرین فوراً اس کی مدد کو آ جاتی۔ ایک روز نور کو گھٹنے میں ہلکا سا کھچاؤ محسوس ہوا۔ تایا کی ہدایت پر مہرین نے فوراً فون پر اپنی سینئر پروفیسر سے مشورہ کیا اور نور کے مساج میں لگ گئی۔

نور جلد ہی بہتر محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

"مہرین! کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔"

"اسی منہ سے کر دیا کرو۔ کافی پیارا ہے، جب کس کر پونی ٹیل باندھتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ شاید فلورنس بھی ایسے ہی باندھتی ہوگی دوڑتے وقت۔"

فلورنس ایک طرح سے نور کا آئیڈیل تھی۔ ہر کھلاڑی کا کوئی نامور کھلاڑی آئیڈیل ہوتا ہے۔ نور کے بھی اسی طرح کچھ آئیڈیل تھے۔ سو میٹر کی امریکن ریکارڈ ہولڈر فلورنس...... جس کی ٹائمنگ 10.49 سیکنڈ تھی۔ یہ ٹائمنگ ہر اسپرنٹر کے دل و دماغ میں ایک روشن سنگ میل کی طرح جگمگاتی تھی...... اور پھر انڈین پی ٹی اوشا، جس نے جکارتہ میں 11.39 کی ٹائمنگ حاصل کی تھی اور پاکستان کی ایتھلیٹکس کا جگمگاتا ستارہ عبدالخالق جو مردوں کی کیٹگری میں 10.04 کی ٹائمنگ کے ساتھ ایشیا کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔

وہ بھی خود کو ایسے ہی چمکتے دمکتے ستاروں کے درمیان یا ان کے آس پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ ایک عورت کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے کی آرزو رکھتی تھی...... تاکہ آپی بتول کے شوہر جیسے مرد...... اور ذوالقرنین جیسے مرد...... اور فرہاد جیسے مرد...... اس کی حیثیت کو تسلیم کریں۔

مہرین کے جادوئی لمس نے نور کے گھٹنے کا کھچاؤ یوں چن لیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

مہرین بولی۔ "تمہیں پتا ہے نور جب میں نے فزیو تھراپسٹ بننے کا سوچا تھا تو چچا جان (نور کے ابا جی) نے بڑی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ مالشیا بننے جا رہی ہے۔ لڑکیوں کو یہ کام زیب نہیں دیتے۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے اور ایسی ہی باتیں ہیں جو ہمیں

سوچنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر تم فزیو تھراپسٹ نہ بنو...... اور دیگر ہزاروں لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں نہ آئیں تو پھر اس تھراپی کے حوالے سے ایک فیمیل دوسری فیمیل کی مدد کیسے کرسکتی ہے۔ ہمیں ایسی تنگ نظریوں سے نکلنا پڑے گا۔"

وہ بہت ہی کٹھن اور مشقت والے دن تھے۔ نور کو ایف ایس سی کا امتحان بھی دینا تھا۔ ٹیچرز کے ساتھ مشورے سے اس نے اس امتحان کو اگلے سال تک ملتوی کر دیا اور تمام تر توجہ رننگ پر مرکوز رکھی۔ پرنٹ میڈیا کے کئی لوگ اسے اپنے صفحات پر ہائی لائٹ کرنا چاہتے تھے مگر وہ جیسے...... ایک خوف کی وجہ سے ...... پورے میڈیا سے ہی الرجک ہوگئی تھی۔ وہ شدید ضرورت کے وقت ہی تصویر اترواتی تھی اور وہ بھی اسکارف کے ساتھ۔ رننگ کے وقت بھی اس کا لباس سب سے علیحدہ اور باوقار ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایتھلیٹ کا ظاہری حلیہ اور لباس وغیرہ اس کی راہ میں بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی، اسے لگا کہ اس کے پاؤں پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا تایا ابا اس کے پاؤں کی طرف موجود تھے، ان کے ہاتھ میں ایک آئنٹمنٹ کی ٹیوب تھی۔ وہ اس کے ایک زخمی پاؤں پر دوا لگا رہے تھے۔

"تایا ابا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"اپنی بیٹی کے زخم پر مرہم رکھ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟"

"تایا ابا۔" وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ "زخم کہاں ہے۔ زیادہ رننگ کی وجہ سے تھوڑی سی سرخی آ گئی ہے۔"

"میری بچی۔ ایتھلیٹ کے پاؤں کی تھوڑی سی سرخی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ اس معاملے میں غفلت نہ کیا کرو اور کل کا دن ریسٹ کرو۔ یہ میرا حکم ہے۔"

وہ تایا ابا کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے اس کا سر چوما۔ اس کے پاؤں کو سہلاتے ہوئے بولے۔ "جب تم چھوٹی سی تھیں، میں تمہیں دبوچ کر تمہارے پاؤں پر گدگدی کیا کرتا تھا۔ تم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھیں۔ بہت گدگدی ہوتی تھی تمہیں تلوؤں پر...... یاد ہے نا؟"

"ہاں تایا ابا...... اور آپ کو میرے گندے پاؤں بہت برے لگتے تھے۔ آپ مجھے جوتے یا چپل کے بغیر چلنے نہیں دیتے تھے۔"

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ "شاید یہ تمہاری محبت ہی تھی جس کے صلے میں اللہ نے پھر مجھے اپنی بیٹی بھی عطا کر دی لیکن مہرین کی پیدائش کے بعد بھی تمہاری محبت کبھی کم نہیں ہوئی......"

"آپ کی محبت اور آپ کی توجہ میرے لیے بے حد قیمتی ہیں تایا ابا۔ شاید اسی محبت اور توجہ کی بدولت میں خود کو ثابت کرسکوں اور کسی دن میرے ابا جی بھی مجھے واپس مل جائیں۔"

"کیوں نہیں ملے گا وہ...... ضرور ملے گا۔ بس محنت شرط ہے اور مستقل مزاجی شرط ہے۔ میرا ایمان ہے نور، محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ وہ رائگاں جا ہی نہیں سکتی۔"

"آپ کا ایمان، میرا ایمان بھی بن چکا ہے تایا ابا۔"

"تم دیکھنا...... اس مرتبہ اللہ تعالیٰ تمہیں محنت کا پھل ضرور دے گا۔ کل میری بات تمہاری سینئر کوچ سے بھی ہوئی ہے۔ وہ بہت پُرامید ہیں۔"

اسلام آباد میں ہونے والے قومی کھیلوں کے لیے نور نے بہ آسانی کوالیفائی کر لیا تھا۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب ابتدائی دوڑوں (یعنی Preliminary Heats) کے بعد نور کو فائنل ہیٹ میں حصہ لینا تھا۔ اس ہیٹ میں جو دو تین اہم مدمقابل موجود تھیں، ان میں ایچی سن کالج کی ایک لڑکی کے علاوہ نشو بجلی بھی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں میں نور کی ٹائمنگ میں قریباً 0.30 سیکنڈ کی بہتری آئی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ بہتری اسے گولڈ میڈل دلانے میں اہم ثابت ہوگی۔

آخر وہ گھڑی آ گئی۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ نور میدان میں پہنچی۔ وارم اپ کے دوران میں نشو بجلی اسے کڑی نظروں سے گھورتی رہی۔ جیسے نور کو دیکھ دیکھ کر خود کو تاؤ دلا رہی ہو اور اس تاؤ کو اپنی انرجی بنا رہی ہو۔ نور نے بھی اس کی گرم نگاہوں کا جواب گرم نگاہوں سے ہی دیا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے نشو نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پھونک مار کر اپنی پیشانی سے ہٹایا اور سرگوشی کرتے ہوئے آگے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ آج پینڈو واپس پنڈ چلی جائے گی۔

گولڈ میڈل ہیٹ اسٹارٹ ہوئی ...... پوزیشن لی گئی...... پسٹل کی آواز کے ساتھ ہی ایتھلیٹس کے رگ پٹھوں نے بجلی کی طرح رسپانس کیا اور وہ اپنے پاؤں سے فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے ٹارگٹ کی طرف جھپٹیں۔

پسٹل کی آواز کے فوراً بعد ہی نور کو محسوس ہوا کہ آج اس کا اسٹارٹ بہت اچھا نہیں تھا۔ بہرحال وہ بھاگنے میں اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے رہی تھی۔ یہ سارا قریباً 50 قدم کا کھیل تھا، شاید ایک دو قدم زیادہ۔ قریباً پندرہ قدم کے بعد نور نے اسٹارٹ کی کمی کو دور کرنے کے لیے اضافی توانائی

لگائی۔ اس وقت نشو اس سے قریباً چار پانچ فٹ پیچھے تھی۔ ایچی سن والی لڑکی کا فاصلہ زیادہ تھا مگر پھر نور کو لگا کہ نشو سے اس کا فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی دائیں آنکھ کے گوشے سے دیکھا، نشو کی آگے بڑھتی ہوئی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کے برابر آنے کے بعد چند انچ آگے نکل گئی ہے۔ ریس دیکھنے والوں کا شور فلک شگاف تھا۔ آخری مرحلہ بے حد جاں گسل تھا۔ آخری چودہ پندرہ قدموں میں نور نے جسم و جاں کی پوری توانائی صرف کی اور فنش لائن پار کر لی۔

وہ ایک بار پھر ہار چکی تھی۔ نشو نے یہ ریس جیت لی تھی۔ نور کا خیال تھا کہ وہ دوسرے نمبر پر آگئی ہے مگر جب فوٹو فنش کا رزلٹ سامنے آیا تو وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ ایچی سن کالج کی ارم نے نہایت تھوڑے مارجن سے اس سے دوسری پوزیشن بھی چھین لی تھی۔ ان دونوں کا فرق صرف 0.08 سیکنڈ رہا تھا۔

نور بے دم سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کی سانس ابھی تک نارمل نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی ہار کے موقع پر اس نے اپنے ساتھیوں اور اپنے تایا جان کی طرف دیکھا تھا مگر اس مرتبہ اسے یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ آخر اسے اپنی کمر پر تایا جان کے مشفق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ نور کے آنسو اکثر اس سے روٹھ جایا کرتے تھے۔

لیکن اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ سینے میں ایک ہچکی سی تھی جو آزاد ہونا چاہتی تھی، وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔ تایا جان اس کے کانوں میں تسلی آمیز سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں پر ڈھول کی تھاپ حاوی ہو رہی تھی...... اور وہ نعرے حاوی ہو رہے تھے جو نشو بگی کے سپورٹرز بلند کر رہے تھے۔ ان لمحوں میں نور کے دل میں خیال آیا۔ کہیں واقعی یہ اباجی کی بددعا تو نہیں جو جان توڑ کوشش کے باوجود اسے کامیابی سے دور رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆

وہ کمرے میں بند تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو شکل ہی دکھانا نہیں چاہتی۔ اس نے رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ تایا جان تو اپنے ماہانہ دورے پر گجرات چلے گئے تھے لیکن تائی راحت اور تینوں کزنز تو گھر میں ہی تھے۔ پہلے مہرین دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ اب شرجیل بار بار دستک دے رہا تھا، گاہے بگاہے تائی راحت کی آواز بھی آ رہی تھی، اس آواز میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ نور نے مایوسی کے عالم میں کوئی ایسی ویسی چیز نہ کھالی ہو مگر ایسی بات نہیں تھی۔

آخر وہ دروازے کے پاس پہنچی اور کراہ کر بولی۔ "میں ٹھیک ہوں لیکن پلیز...... مجھے ابھی آرام کرنے دیں۔"

"مگر چند نوالے تو لے لو بیٹی۔" تائی نے دلار سے کہا۔

"ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ آپ سو جائیں، میں خود ہی لے لوں گی۔"

تائی کے بڑبڑانے کی مدھم آواز آئی۔ بہرطور اس کے بعد دستک وغیرہ نہیں ہوئی۔ نور نے کاغذ قلم سنبھالا اور اپنے ابا جان کو ایک خط لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ کافی طویل خط تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"اباجی! میں آپ کی فرمانبردار بیٹی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو، آپ سے جدا ہو کر میں نے ہر پل آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ کی محبت کو ترسی ہوں، امی کے بعد ہم بہنوں کے لیے آپ ہی تو سب کچھ ہیں۔ وہ واقعہ ایسا اچانک تھا کہ اس نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں تایا ابا کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ مجھے پتا ہے اباجی، میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔ پلیز...... آپ اپنی اس ناسمجھ اور کمزور بیٹی کو معاف کر دیں۔ پلیز اباجی پلیز۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے تو میں خود کو دنیا کی بدقسمت ترین ہستی سمجھتی رہوں گی اور کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔"

اگلے روز اس نے یہ خط مہرین کے ہی ذریعے ابا جان تک پہنچایا تھا۔ دو روز بعد بڑی عید تھی اور اڑتی اڑتی سی یہ خبر بھی آ رہی تھی کہ شاید بسمہ کی کہیں بات پکی ہونے والی ہے۔ یہی دو وجوہات تھیں جن کی بنا پر نور کو ایک بار پھر اپنے گھر میں قدم رکھنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن، شام کے وقت پھپھو اس کے پاس آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آگئیں۔ اباجی اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ آپی بتول بھی اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ آپی اور پھپھو "لرزتی کانپتی نور" کو اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں گئیں۔

اباجی صوفے پر بیٹھے تھے۔ رخ دوسری طرف تھا، پہلے سے کمزور نظر آ رہے تھے۔ پھپھو نے لجاجت سے کہا۔ "بھائی جان، یہ...... نور آئی ہے۔"

اباجی نے مڑ کر دیکھا۔ نور کو کچھ اور تو نہیں سوجھا، وہ جلدی سے آگے بڑھی اور بیٹھ کر اباجی کا گھٹنا تھام لیا۔ ان کے گھٹنے پر پیشانی رکھ کر اشک بار لہجے میں بولی۔ "پلیز

اباجی! مجھے معاف کردیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے، میں خوش نہیں ہوں...... میں بہت دکھی ہوں......" وہ بولتی چلی گئی۔

انہوں نے اپنا گھٹنا چھڑانے کی کوشش کی مگر نور کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ برہمی سے بولے۔ "یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ پیچھے ہٹو۔"

مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ پھپھو نے ڈرے لہجے میں کہا۔ "چلیں معاف کردیں بھائی جان ...... بڑے معاف ہی کیا کرتے ہیں، اپنی غلطی پر شرمندہ ہے یہ......"

انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ "پیچھے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے جانا ہے۔"

"پہلے آپ مجھے معاف کریں اباجی۔" اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "اچھا ٹھیک ہے...... پیچھے ہٹو۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور واش روم کی جانب بڑھ گئے۔

اگلے روز عید تھی۔ دونوں گھروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا تھا کہ عید اکٹھے ہی مناتے تھے بلکہ اس میں پھپھو کا گھرانا بھی شریک ہوتا تھا۔ پھپھو کے شوہر عرصہ پہلے انتقال کرچکے تھے۔ عید کی گہما گہمی میں تھوڑا سا حزن بھی شامل تھا۔ نور کی والدہ کی وفات کے بعد یہ پہلی بڑی عید تھی۔ عید کی رات نور نے اپنے گھر میں ہی گزاری۔ اگلے روز پھپھو اور آپی بتول نے نور کو سمجھایا۔ پھپھو نے کہا۔ "دیکھو نور! تمہارے اباجی نے تمہیں گھر آنے کی اجازت تو دے دی ہے لیکن ان کی اصل ناراضگی اسی طرح دور ہوسکتی ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ شادی پر رضامند ہوجاؤ۔ وہ تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔"

"پھپھو! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرے لیے آپ سب کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیوں مجھے کچھ دیر کے لیے مزید اپنی محبت کے سائے میں نہیں رکھ سکتے؟"

"یہ محبت ہی تو ہے نور۔" آپی بتول نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اباجی، تمہیں اپنے گھر کی ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"انہوں نے آپ کو اپنے گھر کی، دیکھ ہی لیا ہے نا...... اس سے ان کو کچھ تسلی ہوجانا چاہیے۔" نور کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ہر ایک کی اپنی قسمت ہوتی ہے نور۔" پھپھو نے کہا۔ "اور تیرے لیے تو بہت اچھا رشتہ آیا تھا...... تیری وجہ

سے وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا۔ دین دار، کماؤ اور بڑوں کے سامنے سر جھکا کر رکھنے والا۔ آج کل ایک مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا ہے اور بالکل فی سبیل اللہ۔ اس عمر میں اتنی خدا خوفی کم کم ہی ہوتی ہے۔''

نور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی...... اور دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں بسمہ، مہرین اور دیگر کزنز موجود تھے۔

رات کو ایک بار پھر پھپھو کا فقرہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا...... ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا......

''ہوں۔'' اس نے سر کو بیزاری سے حرکت دی اور کروٹ بدل لی۔

بے شک ذوالقرنین کی ایک بات نور کو اچھی لگی تھی کہ اس نے ایک موقع پر فرہاد کو نور کے ساتھ کار میں دیکھنے کے باوجود، یہ بات اپنے تک محدود رکھی تھی۔ اس نے بعد میں بھی اپنے گھر میں یا نور کے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا (حالانکہ ایک موقع پر نور کو ڈر پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسے بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرے) لیکن جہاں تک ذوالقرنین کے لیے پسندیدگی کا تعلق تھا، یہ سوال خارج از نصاب تھا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے نور کے دل و دماغ میں جو آئیڈیل تھا، وہ بالکل اور طرح کا تھا۔ نرم مزاج، خوش گفتار، خوش لباس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوی پر بے جا پابندیاں عائد نہ کرنے والا۔ اس کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے والا۔ بے شک مذہبی لیکن روشن خیال۔

وہ سوچنے لگی، کہیں نہ کہیں تو کوئی ہوگا جو اس کے لیے ہوگا۔ جو اس کے مطابق ہوگا۔ اسے اس کی ساری بشری خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ چاہے گا۔

☆☆☆

عید گزر چکی تھی۔ ذوالقرنین کی روزمرہ مصروفیات پھر شروع ہو چکی تھیں۔ عصر تک اپنی کتابوں کی دکان پر رہنے کے بعد وہ قریبی مسجد میں چلا جاتا تھا اور بچوں کو تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کے لیے پھر دکان پر جانا ہوتا تھا لیکن آج چونکہ بارش ہو رہی تھی، اس لیے وہ جلدی گھر آ گیا۔ شیروانی اتار کر ہینگر پر لٹکائی۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی، اپنی چھوٹی ہموار داڑھی سے بارش کے قطرے جھاڑے اور تھکا تھکا سا بستر پر دراز ہوگیا۔

سہانا موسم ہر کسی پر اثر کرتا ہے۔ دل میں کچھ شگوفے سے پھوٹتے ہیں، چاہے وہ دل کسی کا بھی ہو۔ مولانا حبیب اللہ کے بیٹے قاری ذوالقرنین کا بھی ہو۔ ہاں اپنی تمام تر شرافت، نجابت اور حیاداری کے باوجود اس کا دل دھڑکتا تھا، اس کی رگوں میں خون کی یورش ہوتی تھی۔ اس نے بارہا خود کو سمجھایا تھا...... وہ اسے بھول کیوں نہیں پاتا۔ وہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نہیں ہے، وہ کیوں اپنی زندگی کو ایک مسلسل ناہمواری کے حوالے کرنا چاہتا ہے لیکن وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے اسے پہلی بار شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ عورتوں والے پورشن میں تھی اور اپنا اسکارف کھول کر باندھ رہی تھی۔ بس ایک جھلک ہی تھی، دلکش چہرے کی، لمبے شہد رنگ بالوں کی اور شربتی آنکھوں کی۔ وہ جھلک قاری ذوالقرنین کے اندر گہرائی تک پیوست ہوگئی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ ''بھائی! آج تم جلدی آ گئے؟''

''بس، بارش ہو رہی تھی، ایسے موسم میں گاہک وغیرہ کہاں آتا ہے۔''

''امی آج بھی کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکی دیکھنے جانا ہے......''

''خدیجہ! کہا بھی ہے کہ ابھی تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔''

''ایسا کیوں ہے بھائی، تم تو خود امی سے کہا کرتے تھے کہ...... شادی بیاہ میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے اور اب دیر پر دیر کیے جا رہے ہو۔''

''دراصل ...... میں اپنے دل کو ذرا ٹھکانے پر لانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے، وہ ٹھکانے پر کیوں نہیں ہے۔'' خدیجہ نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

شروع میں ذوالقرنین نے نور کے حوالے سے اپنے سارے احساسات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے تھے۔ یہ کوئی ناجائز احساسات نہیں تھے مگر ذوالقرنین نے خود کو جس خول میں چھپا رکھا تھا، وہ اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ایک نہایت دین دار نوجوان کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ اصلاح معاشرہ نامی تنظیم کا ایک سرگرم رکن تھا۔ لوگ اس کی شرافت کی مثالیں دیتے تھے۔ اب عالم دین مولانا حبیب اللہ کا یہ بیٹا کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ذوالقرنین کے نزدیک یہ بہت معیوب صورت حال تھی۔ اس نے اپنی سوچوں کو سات پردوں میں لپیٹ کر سات تہ خانوں کی گہرائی میں دھکیل دیا تھا۔ صرف ...... اور صرف خدیجہ ایسی تھی جو ان تہ خانوں کی گہرائی میں سے کچھ ڈھونڈ لائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کسی شدید ذہنی کوفت کا

شکار ہے۔ وہ نور کے حوالے سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی تھی کیونکہ وہ بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھی (اب کچھ عرصے سے اس نے بھائی کے اصرار پر کالج میں اصلاح معاشرہ تنظیم کی داغ بیل بھی ڈالی تھی) اسے کالج میں نور کے بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی تو بھائی سے شیئر کرتی۔

خدیجہ بولی۔ ''ذوالقرنین! مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی ڈگر سے ہٹنے والی ہے۔ عید کے موقع پر وہ واپس اپنے والد اشفاق صاحب کے گھر چلی گئی تھی۔ معافی وغیرہ بھی مانگی ہوگی اس نے...... مگر اب پھر تایا کے گھر میں ہے...... اور وہ بھاگ دوڑ والی روٹین بھی جاری ہے۔ پتا نہیں وہ کیا نکالنا چاہتی ہے اس میں سے......؟''

''اپنے والد سے صلح ہوئی اس کی؟'' ذوالقرنین نے پوچھا۔

''مکمل صلح تو نہیں ہوئی، ورنہ وہ واپس تایا کے پاس کیوں جاتی شاید اتنا ہوا ہے کہ اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ شاید اس نے کچھ مہلت وغیرہ مانگی ہو۔ کسی وقت مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔''

''مہلت کس لیے چاہتی ہے۔ وہی بھاگ دوڑ ہی ہے نا اور اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی ہے۔''

''یہ جو کھلاڑی اور فن کار وغیرہ ہوتے ہیں ذوالقرنین! ان کے ذہن میں ایک بار جو کیڑا گھس جائے وہ آسانی سے نہیں نکلتا۔ خود کو خراب کر رہی ہے۔ اتنی پیاری ہے، اتنے اچھے گھر سے ہے مگر خود کو مصیبتوں میں پھنسا رہی ہے۔ مولوی اشفاق کے لیے یہ کتنی شرمندگی کی بات ہوگی کہ ان کی بیٹی اس طرح کے کاموں میں پڑی ہوئی ہے۔''

''ایسے بندے کو اللہ ہی ہدایت دیتا ہے۔''

''لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے کے بعد ہدایت پائے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے کالج میں سنا تھا کہ گوجرانوالہ کی ''چیمپئن ایتھلیٹ'' نشو بجلی کے ساتھ نور کا زبردست ٹاکرا چل رہا ہے۔ وہ لوگ کسی صورت نور کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ جہاں کہیں کوئی ایونٹ ہوتا ہے اور یہ دونوں اکٹھی ہوتی ہیں، جھگڑا ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔''

''بس یہی معاملے ہیں نا خدیجہ جن کی وجہ سے عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے کو احسن سمجھا جاتا ہے۔ باہر کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو بنایا ہے اور وہی اس کے لیے بہتر ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تم خود بھی تو اس سے ملتی ہونا؟''

''ہاں۔ کبھی کبھی، عام سے انداز میں۔''

''اسے شک تو نہیں ہوا کہ تم کون ہو؟''

''نہیں۔ اس نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کہیں دیکھا بھی ہوگا تو بھول چکی ہے۔''

بہن سے گفتگو کے بعد بھی ذوالقرنین دیر تک جاگتا رہا۔ کھڑکیوں سے بارش کی پھواریں ٹکرا رہی تھیں اور دل میں جلترنگ کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ نور کی آواز، اس کی آنکھوں کے رنگ، اس کا دلنشیں لب و لہجہ اور پھر خفگی کے عالم میں پیشانی کی ایک چھوٹی سی سلوٹ...... سب کچھ اس کے تصور میں گھوم رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کا دل چاہا کہ وہ کم از کم ایک بار نور سے پھر ملاقات کرے اور اسے اس ''سعئی لاحاصل'' سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اسے سمجھائے کہ اس کی جدوجہد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔

☆☆☆

نور آہستہ آہستہ شکست کے بعد صدمے سے نکل رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی ''ایف اے ایس'' سے واپس آئی تھی اور تھکی ہاری سی بستر پر دراز تھی۔ ذرا سستانے کے بعد وہ مغرب کی نماز پڑھنا چاہ رہی تھی۔ اسی دوران میں تایا ابا اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''گاؤں چلنا ہے؟''

''گاؤں؟''

''بھئی، بھول گئی ہو تم۔ امنالے کا میلا آ گیا ہے۔ تمہاری دادی تو ایک مہینے سے تیاریوں میں لگی ہیں۔ پچھلی دفعہ وہ لوگ اکیلے چلے گئے تھے مگر میرا خیال ہے اس دفعہ ہمیں ضرور جانا چاہیے۔''

امنالے کا میلا یعنی پیر امناں والے کا میلا...... اس میلے کا ذکر ہی اپنے ساتھ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادیں لے آتا تھا۔ دل میں ایک ترنگ سی جاگتی تھی لیکن آج کل نور کا ٹریننگ شیڈول بھی ٹائٹ چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کتنے دن رکنا ہوگا تایا ابا؟''

''کم از کم پانچ دن لیکن تم ضرور جاؤ۔ ایک تو تمہارا موڈ بہتر ہوگا۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس نامعقول کے آس پاس رہنے کا موقع ملے اور اس کے دل میں مزید نرمی پیدا ہو۔'' نامعقول سے تایا ابا کی مراد ہمیشہ کی طرح نور کے ابا جی ہی تھے۔

وہ بچنا چاہتی تھی مگر دل بھی چاہ رہا تھا۔ آخر وہ آمادہ ہوگئی۔ ٹریننگ سینٹر یعنی ''ایف اے ایس'' سے پانچ چھ دن کی چھٹی اس شرط پر مل گئی کہ وہ اسٹریچنگ وغیرہ کی ورزشیں

جاری رکھے گی اور ڈائٹ کے حوالے سے بھی پوری پابندی کرے گی۔ بسمہ اور نور دوسرے دن بازار گئیں تا کہ روانگی کے حوالے سے کچھ شاپنگ کر سکیں۔ شاپنگ کرتے ہوئے بسمہ ذرا تھک گئی تو وہ دونوں ایک جوس کارنر میں داخل ہو گئیں۔ ابھی انہیں میز پر بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ نور نے دیکھا کسی شخص نے بسمہ کو مخاطب کیا ہے۔ ''بسمہ بہن! کیا میں دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

بسمہ اور نور نے ایک ساتھ اس شخص کی طرف دیکھا۔ نور بے طرح چونک گئی۔ وہ ذوالقرنین تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ سر پر چمکیلے حاشیے والی گول ٹوپی تھی۔

بسمہ اور نور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نور نے غصے سے کہا۔

''پلیز ...... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف......صرف دو چار منٹ۔''

نور کا دل چاہا کہ وہ اپنی کرسی کو پیچھے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہو مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنا حجاب درست کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ ہمارا پیچھا کر رہے تھے؟''

''میں شرمندہ ہوں لیکن خدا گواہ ہے، میں کسی بری نیت سے یہاں موجود نہیں ہوں۔ صرف آپ کی بھلائی کی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ حسب عادت نظریں جھکائے جھکائے بولا۔ پچھلی ملاقات کی نسبت آج اس کا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

''معاف کیجیے۔ ہم نابالغ نہیں ہیں۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہیں۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ آپ سب کچھ سمجھنے کے باوجود سمجھ نہیں پا رہیں۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ ایک ایسے راستے پر چل رہی ہیں جہاں آپ اور آپ کے نہایت نیک نام والد صاحب کے لیے بہت سی پریشانیاں ہیں۔''

''آپ کس حوالے سے مجھے لیکچر دے رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی ناسمجھ جاہل ہوں؟''

''ایسا ہوتا تو پھر اتنے دکھ کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا نہیں ہے اور اس کے باوجود آپ گمراہی کی طرف جا رہی ہیں۔''

''جسے آپ گمراہی فرما رہے ہیں، وہ ہمارے نزدیک نہیں ہے اور یہ بحث اتنی طویل ہے کہ...... آپ کے بال سفید ہو جائیں گے۔'' نور نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بسمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ذوالقرنین کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا مگر وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔

نور اور بسمہ نے باقی شاپنگ ادھوری چھوڑ دی۔ موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ نور بڑبڑا رہی تھی۔ ''پتا نہیں کہاں سے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اب اگر یہ سامنے آیا تو منہ توڑ جواب ملے گا اسے۔''

اگلے روز دادی اور پھپھو کی فیملی کے ساتھ ساتھ دونوں بھائیوں کی فیملیاں، تین گاڑیوں پر سوار گاؤں روانہ ہو رہی تھیں۔ ماموؤں کو ایک روز بعد آنا تھا۔ بہت عرصے بعد نور کو لاہور سے باہر نکلنے اور اپنی مصروفیات کو بریک لگانے کا ایک موقع مل رہا تھا۔ وہ تایا جان والی گاڑی میں سوار ہوتی لیکن وہاں دادی بیٹھی ہوئی تھیں اور نور کو معلوم تھا کہ وہ پورے راستے میں اس کی والدہ مرحومہ کو نشانے پر لیے رکھیں گی اور نور کو مادر پدر آزاد قرار دے کر اس کے لتے لیں گی۔ وہ اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں پھپھو اور کزن موجود تھے۔

گجرات سے آگے تنگ سڑک پر ایک گھنٹے کا سفر تھا اور کچے پکے راستے پر قریباً دو گھنٹے کا نہایت دشوار سفر طے کرنے کے بعد وہ بالآخر موراں والی گاؤں پہنچ گئے۔ (بسمہ کے رشتے والا معاملہ حل ہو چکا تھا۔ ایک ایم این اے ضامن تھا۔ اب اس حوالے سے انہیں کھاریری برادری کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ چودھری طغرل کی والدہ وڈی اماں آج کل بیمار تھی اور نور کی دادی اس کی خبر گیری بھی کرنا چاہتی تھیں۔)

موراں والی میں وہ بڑے پُرلطف دن ثابت ہوئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میلے کی قدیم روایت کے مطابق تین دن پہلے علاقے کے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر ہر طرح کا آتشیں اسلحہ تھانے میں جمع کرا دیا تھا لیکن یہ اسلحہ تھانے میں جمع نہیں ہوتا تھا۔ رسم کے مطابق بلند و بالا مزار کے سامنے سات آٹھ بڑی چارپائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ ان پر سفید چادریں بچھائی جاتی تھیں اور لوگ اپنے اپنے ہتھیار لا کر یہاں رکھتے جاتے تھے اور تھانے کے محرر سے ٹوکن لیتے جاتے تھے۔ ایک ٹوکن ہتھیار یا ہتھیاروں کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس میں ناجائز اسلحہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس اسلحے کے لیے بالکل علیحدہ طریقہ کار تھا...... یہ اسلحہ لوگ رات کی تاریکی میں جمع کراتے تھے۔ جو ضروری سمجھتے، وہ اپنا منہ سر بھی ڈھانپ لیتے تھے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں مستطیل شکل کی ایک طویل کوٹھڑی تھی۔ تا نک

چھری اینٹوں کی بنی ہوئی اس قدیم کوٹھڑی کی موٹی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے بہت سے خانے بنائے گئے تھے۔ ان خانوں پر لوہے کے تقریباً ایک مربع فٹ کے ڈھکنے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ ہر خانے کا نمبر تھا۔ اپنے غیر لائسنسی ہتھیار لوگ ان خانوں میں رکھتے اور چابی اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ میلے کے اختتام پر رات کے وقت یہ لوگ اپنے ہتھیار نکال کر لے جاتے تھے۔ مدتوں گزرنے کے باوجود اس معاملے میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے ہی ہتھیار لے کر جاتا تھا اور اگر پولیس کو ناجائز اسلحے کے مالک کی کچھ خبر ہو بھی جاتی تھی تو مطلق باز پرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہ سب اس میلے کی بے مثال اور انوکھی روایات تھیں یعنی غیر قانونی کام بھی بے حد ایمانداری کے ساتھ۔ اس حوالے سے لوگوں کے عقیدے اتنے پختہ تھے کہ کوئی انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میلے کے سات روز میں علاقے میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ چوری، رسّہ گیری اور جیب تراشی کی چھوٹی موٹی وارداتیں بھی ناپید ہو جاتی تھیں۔ یہ تھا امناں والے کا میلا۔

نور اور فیملی کے دیگر بچوں بڑوں نے اپنی ساری سنہری یادیں تازہ کیں۔ آبائی مکان کا بڑا حصہ اور ملحقہ باغ تو بک چکے تھے مگر دریا کی طرف پرانی حویلی اب بھی دونوں فیملیز کی ملکیت تھی اور وہ یہاں بھرپور تفریح کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی بڑی اچھی کھلاڑی نکلی ہے اور اخباروں وغیرہ میں اس کا ذکر آتا ہے کئی عورتیں اور لڑکیاں اس سے ملنے کے لیے آئیں۔ کچھ آنکھوں میں واقعی ستائش تھی مگر کچھ کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اور بیگانگی کی جھلک تھی، جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں...... تم ہمارے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکیوں کو کیا راستہ دکھا رہی ہو۔ مولوی اشفاق کی بیٹی ہو کر تم کس راستے پر چل رہی ہو۔ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جوانی سنبھالو، اپنا گھر سنبھالو، بال بچے دار بنو، کڑیوں کے یہ کام نہیں ہوتے۔

میلے میں ایک دن صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز نور، بسمہ، مہرین اور فیملی کی دیگر لڑکیاں بھی گئیں اور خوب تفریح کی۔ ہاں نور کو کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ صرف دو ہفتے بعد اسے ایک اہم ایونٹ میں حصہ لینا تھا اور اس میں نشو بھی آ رہی تھی۔

گاؤں میں قیام کے دوران نور نے اباجی کی دلجوئی کی کافی کوشش کی۔ ان کی خدمت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی مگر ان کا رویہ بدستور کھچاؤ کا رہا۔ تایا جان کے سامنے وہ بول تو نہیں سکتے تھے مگر دونوں بھائیوں میں پہلی والی گرمجوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نور خود کو اس کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

گاؤں سے واپس آ کر نور پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں لگ گئی۔ پانچ چھ روز کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے اضافی محنت کی۔ ایتھلیٹکس کا یہ ایونٹ دراصل واپڈا میں ملازمت کے حوالے سے تھا۔ صوبے کی چار پانچ ٹاپ رنرز بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ نور نے سو میٹر کے ٹرائلز میں سخت جدوجہد کی۔ فائنل ہیٹ میں اس نے اپنی اہم ترین حریف نشو بٹلی کو 0.75 سیکنڈ کے ساتھ شکست دی (حالانکہ مبینہ طور پر نشو کو ایک غیر ملکی کوچ کی خدمات بھی حاصل تھیں اور وہ نیشنل گیمز میں ٹائٹل مقابلہ بھی جیت چکی تھی)۔

اس فتح کے بعد نور کو قوی امید ہوئی کہ وہ اگلے قومی مقابلوں میں بھی نشو کو پچھاڑ سکے گی۔ اس ایونٹ کی فتح سے نور کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایک مناسب جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ تایا جان پر اس کے اخراجات کا جو اضافی بوجھ پڑ رہا تھا وہ کم ہو گیا۔ مثلاً اگر پہلے اس پر 30 ہزار ماہانہ خرچ ہو رہا تھا تو اب یہ شرح چودہ پندرہ ہزار رہ گئی۔ تنخواہ کے علاوہ نور کو کچھ مراعات بھی مل رہی تھیں۔

نور کو خدشہ تھا کہ شاید ذوالقرنین پھر اس کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری دل جمعی سے میگا ایونٹ یعنی نیشنل گیمز کی تیاری میں لگی رہی۔ اس نے تایا جان کے کہے کو اپنا "موٹو" بنا لیا تھا۔ محنت اور مسلسل محنت، اس یقین کے ساتھ کہ صلہ مل کر رہے گا۔ سخت تربیت اور رننگ کے دوران میں بھی وہ کئی بار یہ جملہ زیرِ لب دہرانے لگی تھی...... "مسلسل محنت کا صلہ مل کر رہتا ہے۔"

اس کی ٹائمنگ اب کسی وقت 11.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی۔ اس کا اور اس کے کوچ کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ گولڈ میڈل یا کم از کم سلور میڈل تک پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

میگا ایونٹ نیشنل گیمز میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ نور کا اوڑھنا بچھونا اس کی ٹریننگ بنی ہوئی تھی۔ وہ کہیں آنے جانے میں بھی بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی تایا یا ماموں کے ساتھ کہیں موٹر بائیک پر بھی چلی جاتی تھی مگر اب تایا ابا کا حکم تھا کہ وہ صرف گاڑی استعمال کرے گی۔ ایسے موقعوں پر چوٹ لگ جانا یا کسی طرح اَن فٹ ہو جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

وزارت کھیل کی طرف سے صوبائی سطح پر کوئی ٹیلنٹ ہنٹ اسکیم ہو رہی تھی۔ انڈر 16 کی لڑکیوں میں سے قابل جوہر تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ ٹرائلز نور کے کالج کے وسیع و عریض میدان میں ہونا تھے۔ انتظامیہ نے نور کو بھی سینئر ایتھلیٹ کی حیثیت سے دعوت نامہ جاری کیا ہوا تھا۔

وہ ایونٹ کے روز کالج پہنچی تو وہاں رش لگا ہوا تھا۔ شامیانوں کے نیچے مختلف شہروں سے آنے والی بے شمار چھوٹی لڑکیاں موجود تھیں۔ نور پر انکشاف ہوا کہ نشو بخاری بھی آئی ہوئی ہے۔ نشو کی موجودگی اسے ہمیشہ ناگوار ہی گزرتی تھی اگر اسے پتا ہوتا کہ اس نے بھی آنا ہے تو شاید وہ نہ آتی۔

نور کے ساتھ بسمہ اور مہرین بھی آئی ہوئی تھیں۔ بسمہ حسب معمول برقعے میں تھی۔ تقریب میں ایک موقع پر وہی ہوا جس کا نور کو خدشہ تھا۔ نشو کی سپورٹرز نے ہلڑ بازی شروع کر دی۔ بسمہ کو "ڈاکو" کہا گیا۔ (کیونکہ اس نے برقع پہن رکھا تھا) نور کو دیکھ کر "پینڈو...... پینڈو" کے نعرے لگائے گئے...... اور بات صرف ہوٹنگ تک ہی نہیں رہی۔ ہجوم میں سے کسی لڑکی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور نور کا اسکارف کھینچ کر اتار دیا۔ یہ بدتمیزی مہرین سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا اور اس کے بال کھینچے۔ ان لوگوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا۔ ایک دم لڑائی شروع ہو گئی۔ کئی لڑکیاں مہرین اور بسمہ پر پل پڑیں۔ بسمہ کا برقع پھٹ گیا، وہ گر گئی۔ بسمہ اپنی چھوٹی بہن کے برعکس بالکل دھیمے مزاج اور دبلے جسم کی تھی، ٹھیک سے دفاع بھی نہ کر سکی۔ اپنی بڑی بہن کو یوں بے بس دیکھ کر نور تماشائی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں سے بھڑ گئی۔ نشو چلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ نور نے اسے گھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ اسی دوران میں ایک ہٹی کٹی لڑکی کے ہاتھ میں کسی ٹوٹی ہوئی کرسی کا پایہ آ گیا تھا۔ وہ نور پر جھپٹی اور تاک کر اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ مضبوط لکڑی کے پائے کی دو تین شدید ضربیں نور کو لگیں۔ نشو کی حامیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ صاف محسوس ہوا کہ انہوں نے یہ سب پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔

یہی موقع تھا جب نور نے خدیجہ کو دیکھا۔ اس کا گلابی اسکارف تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ وہ اصلاح معاشرہ کے تکمیل ونگ کی جنرل سیکریٹری تھی۔ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ وہ حملہ آور لڑکیوں پر جھپٹی۔ ایک دو منٹ کے لیے ٹھیک ٹھاک مارا ماری ہوئی۔ کئی لڑکیوں کو چوٹیں آئیں پھر نشو کی سپورٹرز پسپا ہو گئیں۔ کالج کی انتظامیہ اور گارڈز وغیرہ بھی آ گئے اور دونوں گروپوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔

نور کو سب سے پہلے اپنی ٹانگ کی فکر ہوئی۔ اس نے ٹانگ پر وزن ڈالا اور پھر چل پھر کر دیکھا۔ چوٹ ابھی گرم تھی...... اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ بہرحال گھٹنے کے پاس ایک بڑا نیل نمودار ہو چکا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا خون بھی رسا تھا۔ اس نیل کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ ہنگامے میں جان بوجھ کر نور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس واقعے پر میڈم فرحانہ اور ڈیپارٹمنٹ کے اسپورٹس ہیڈ نے شدید ردعمل ظاہر کیا...... نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی پوائنٹ آؤٹ ہو گئی تھی۔ نور کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نشو اور اس لڑکی کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائی جائے مگر پھر فونز کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ گوجرانوالہ سے دو تین بااثر افراد کی کالیں بھی آ گئیں۔ مختلف ذریعوں سے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو بھی اپروچ کر لیا گیا۔ اندازہ ہوا کہ معاملہ صلح صفائی پر ختم ہو گا۔ ویسے بھی نور کسی شدید چوٹ سے بچ گئی تھی۔ میڈم فرحانہ اسے اپنے ساتھ لے کر آرتھوپیڈک اسپتال پہنچیں۔ اس کی ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ کیے گئے اور تسلی ہونے کے بعد اسے ضروری ٹریٹ منٹ بھی دی گئی۔ ڈاکٹرز نے اسے تین چار روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا مگر چار پانچ روز آرام کے بعد جب نور ٹریک پر پہنچی اور اس نے باقاعدہ رننگ شروع کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا اب تک نظر آیا ہے۔ اس کا متاثرہ گھٹنا پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ یہ وہی گھٹنا تھا جس پر شروع شروع میں کھچاؤ محسوس ہوا کرتا تھا مگر بہترین فزیکل ٹریننگ سے یہ کھچاؤ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس سخت چوٹ نے اس کھچاؤ کو دوبارہ نمودار کر دیا تھا۔

یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ چار پانچ روز تک تو نور نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ امید پالی تھی کہ شاید دوڑنے سے اور روٹین میں آنے سے گھٹنے کی حالت بھی معمول پر آ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ تکلیف میں کمی کے بجائے اضافے کا احساس ہوا...... وہ اس صورت حال کو مزید راز نہ رکھ سکی۔ ڈیپارٹمنٹ کی کوچ اور نیجر وغیرہ بھی آگاہ ہو گئے۔ ایک بار پھر اس کی چوٹ اور "ٹریٹ منٹ" کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر کا اندیشہ تو "سی ٹی اسکین" وغیرہ سے دور ہو گیا مگر ایک دو مسل متاثر تھے...... تفصیلی معائنے کے بعد تھکے تھکے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"مس نور! آپ کو کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرنا پڑے گا۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن ڈاکٹر! دو ہفتے آرام کے بعد تو صرف تین ہفتے بچیں گے۔ میں اتنی جلدی فارم کیسے حاصل کر پاؤں گی؟''

''تو پھر آپ...... میرا مشورہ مانیں۔ ان مقابلوں سے دستبردار ہو جائیں۔ جلد بازی کر کے آپ اپنے کیریئر کو خطرے میں ڈال دیں گی۔''

یہ الفاظ برق کی طرح نور کے حواس پر گرے۔ ''نہیں...... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ دل ہی دل میں پکار کر بولی۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے...... ''مس نور! ابھی آپ کی عمر بائیس سال ہے۔ آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آئندہ سال قومی ایونٹ میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ بہتر کارکردگی دکھا سکیں۔''

''اوہ نو۔'' اس نے کرب کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ وہ تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب ایک سال کی بات کر رہے تھے۔

میڈم فرحانہ بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اس کی باڈی میں ریکوری کی زبردست صلاحیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس بارہ روز کے مزید آرام سے یہ فٹ ہو جائے گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے امکان نظر نہیں آ رہا۔ ویسے میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو اس لڑکی کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ نور کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔''

''وہ بڑے بااثر لوگ ہیں۔'' فرحانہ بیگ نے کہا۔ ''کیس ہوا تو پھر کیسوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آپ کا ڈیپارٹمنٹ بھی اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ''میں نے اس واقعے کی ویڈیو دیکھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر وہ دوسرے گروپ کی لڑکیاں مدد کو نہ آ جاتیں تو نور اور اس کی چار پانچ ساتھیوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔''

''جی ہاں۔ وہ ہمارے کالج کی ہی ایک آرگنائزیشن کی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے بڑا بروقت قدم اٹھایا۔''

نور نے ابھی تک تایا جان اور بسمہ وغیرہ کو اپنی ہولناک افتاد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تاہم مہرین کو کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گھٹنے کی اندرونی سائڈ پر لگنے والی چوٹ کتنی مضر ہوتی ہے۔ وہ بہت فکرمند تھی۔ اس روز ڈاکٹر سے مل کر جب نور گھر پہنچی تو کافی افسردہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تایا جان کو اس خبر سے کیسے آگاہ کرے۔ دوسری طرف اسے یہ امید بھی تھی کہ وہ چند روز کے آرام کے بعد دوبارہ ٹریک پر آ جائے گی۔

گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ دراصل اسے نور نے ہی بے حد ''ریکوئسٹ'' کر کے بلایا تھا۔ یہ وہی لڑکی خدیجہ تھی جس نے ہنگامے کے روز ڈٹ کر نور اور اس کی فرینڈز کی مدد کی تھی۔ وہ ''عبایا'' میں تھی اور تائی جان اور مہرین کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

نور اسے دیکھ کر گرمجوشی سے گلے ملی۔ ''سوری خدیجہ! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ وہاں ٹریننگ سینٹر میں ایک لیکچر سننا پڑ گیا تھا۔'' نور نے ڈاکٹر اور اسپتال والی بات گول کی۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ کی تائی جان اور مہرین سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں آپ کی بہن سے بھی ملنا چاہتی تھی مگر وہ شاید دوسرے گھر میں ہیں۔'' نور نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''ان کو بھی تو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ سارا برقع بھی پھٹ گیا تھا ان کا۔''

''ہاں، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''اور آپ؟''

''آپ کی مہربانی سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ سے ملاقات تو پہلے بھی ہوتی رہتی تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ ایک دن آپ اس طرح ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوں گی۔''

''نہیں بھئی نور! آپ تو ہمارے کالج کا بلکہ پورے شہر کا ایک روشن نام ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید ترقی دے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ اب پھر روٹین کی ٹریننگ کر رہی ہیں۔''

نور کو سینے میں غم کی لہر سی محسوس ہوئی۔ خدیجہ اور نور کے درمیان بیس تیس منٹ تک گفتگو کا دور چلا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں ہی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں۔ جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ خدیجہ، نور سے قریباً دو سال سینئر تھی۔ وہ اب نور کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور نور کو یہ اچھا لگ رہا تھا۔

خدیجہ نے کہا۔ ''اب ہم اس گروپ کی طرف سے پوری طرح الرٹ ہو گئے ہیں۔ ان ''پرکٹی'' شتونگڑیوں نے کسی بھی موقع پر گڑبڑ کی تو منہ توڑ جواب ملے گا۔ انشاءاللہ۔''

اچانک نور کو خیال آیا۔ "خدیجہ! آپ آئی کیسے ہیں؟"
"بھائی ساتھ ہے۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔"
"ارے یہ کیا بات ہوئی۔ انہیں باہر بٹھادیا ہے۔"
تائی جان بولیں۔ "کہا بھی تھا اسے اندر لے آؤ لیکن مانی نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ وہ ذرا...... تنہائی پسند ہے۔"
خدیجہ ہنسی۔ "تنہائی پسند بھی...... اور آج اس کا روزہ بھی ہے، کچھ کھائے پیے گا نہیں۔"
"لیکن خدیجہ! انہیں ڈرائنگ روم میں تو بٹھادیتیں۔" نور نے کہا۔
"چلیں، پھر سہی...... اس وقت تو کافی دیر ہوگئی ہے۔" وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب آپ لوگ اجازت دیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔" وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
نور اور مہرین اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔
ان کی ایف ایکس گاڑی پندرہ بیس قدم دور کھڑی تھی۔ گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ نجانے کیوں یہ نیلی گاڑی نور کو جانی پہچانی سی لگی...... جب خدیجہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو نور کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔
وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھارہی تھی۔ وہ ذوالقرنین تھا قاری ذوالقرنین۔ تو کیا خدیجہ، ذوالقرنین کی بہن تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے نور کے رشتے کی بات چلی تھی؟ وہ کافی دیر تک اس غیر متوقع اتفاق کے حوالے سے سوچتی رہی۔ کہیں خدیجہ کی یہاں آمد کے پیچھے بھی تو کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی؟
اپنی چوٹ کے بارے میں نور کے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا مگر وہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر امید کو روشن رکھے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ چند دن کے مکمل آرام سے وہ نارمل ہوجائے گی۔ گاہے بگاہے تشویش اور اس کے گروپ کے حوالے سے بھی اس کے اندر شدید غم و غصہ نمودار ہوتا تھا مگر اسے اچھی طرح معلوم ہوچکا تھا کہ ان لوگوں سے لڑائی مول لینا آسان نہیں ہے۔
اس نے بند کمرے میں ہلکی پھلکی ورزش کرکے اپنی چوٹ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ اسے گھٹنے میں تیز درد شروع ہوگیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ تایا ابا تھے۔ انہیں ابھی تک نور کی فٹنس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ یہ اوریجنل ایتھلیٹ شوز تھے جو انہوں نے یو ایس اے سے منگوائے تھے۔
"لو بھئی! تمہارا یہ کام بھی ہوگیا۔" وہ اسے پیکٹ تھماتے ہوئے دبے دبے جوش سے بولے۔
پھر ان کی نگاہ نور کے چہرے پر پڑی اور وہ ذرا ٹھٹکے۔ "خیریت تو ہے نوری؟" انہوں نے پوچھا۔
"بس یونہی...... سر میں تھوڑا سا درد تھا۔" اس نے بہانہ بنایا۔
"تو آرام کرو بیٹی! کل تو تمہاری پریکٹس بھی نہیں ہے۔"
"جی تایا ابا۔" اس نے اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
تایا ابا کو دکھانے کے لیے اس نے پیکٹ کھولا۔ شوز پہن کر بھی دیکھے، تعریف بھی کی اور شکریہ بھی ادا کیا لیکن اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، وہی جانتی تھی۔
تایا ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نور! تمہیں پتا ہے چاند پر پہلا شخص کون پہنچا تھا؟"
"جی...... نیل آرمسٹرانگ۔" وہ ہولے سے بولی۔
"اور دوسرا؟"
"دوسرے کا نام...... نہیں...... دوسرے کا نام یاد نہیں۔"
انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اپنے لیے ہمیشہ نمبر ون کو ذہن میں رکھو۔" اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔
وہ دروازہ بند کرکے جیسے سسک اٹھی۔

☆☆☆

ایونٹ سے چھ سات دن پہلے تایا ابا کو بھی پتا چل گیا تھا کہ نور پوری طرح فٹ نہیں ہے لیکن پوری طرح پرعزم ہے اور ہر صورت ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ محکمے کے سینئر ڈاکٹر کے علاوہ بھی ایک دو بہترین اسپیشلسٹ اسے زیر معائنہ رکھے ہوئے تھے۔ نور کوشش کے باوجود اپنی بہترین ٹائمنگ حاصل نہیں کرپارہی تھی اور یہ اس کے لیے بے حد تکلیف دہ بات تھی لیکن ایک جنون تھا، ایک دیوانہ پن تھا، وہ ہر صورت میگا ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ ایک وجدان سا تھا اس کے اندر...... اس نے مسلسل محنت کی ہے۔ اپنی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اسے ضرور صلہ ملے گا...... مل کر رہے گا۔ یہی تو کہتے تھے تایا جان بھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن وہ اس مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہوگئی جس کا انتظار وہ ایک عرصے سے کررہی تھی......

(جاری ہے)